اشفاق احمد

زاویہ

زاویہ

اشفاق احمد

ترتیب

بہروپ

یہ ایک بھری برسات کا ذکر ہے۔ آسمان سے ڈھیروں پانی برس رہا تھا اور میری کیفیت اس طرح تھی کہ جیسے میرے دل کے اندر بارش ہو رہی ہے، کچھ ایسا ہی مینہ بستی کے اوپر بھی برس رہا تھا۔ میں تھوڑا سا زخم خوردہ تھا۔ اس زخم کا مداوا میرے پاس نہ تھا، ماسوائے اس کے کہ میں ڈیرے پر چلوں اور اپنے بابا کی خدمت میں اظہار کروں۔ بات یہ تھی کہ میرے ایک بہت ہی پیارے دوست، جو میرے ساتھی بھی تھے، وہ افسانہ نگار تھے اور کالم بھی لکھتے تھے۔ انہوں نے کالموں میں میری بڑی کھچائی کی تھی۔ اور جب کالم نویس رگید تا ہے تو جس کی کھچائی ہوتی ہے اس کے پاس کوئی اخبار نہیں ہوتا جس میں وہ جواب الجواب لکھ سکے۔ وہ بے چارہ غم زدہ ہو کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میرے ساتھی بھی انہوں نے کچھ ایسا ہی کیا تھا اور تابڑ توڑ چار سخت حملے کیے تھے۔

میں اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے ڈیرے پر چلا گیا اور بابا جی سے کہا، ”میں بڑا

دکھی ہوں اور اس بات کی مجھے بڑی تکلیف ہے۔ اس شخص نے جو میرے بظاہر دوست ہیں، ہم سے محبت کے ساتھ ملتے ہیں اور ٹی ہاؤس میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے ہیں اور لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اس طرح کی کارستانی میرے لیے کر سکتا ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟"

انہوں نے کہا: "اوہ پت! آپ اس کو سمجھے نہیں، یہ بڑی سمجھ داری کی بات ہے۔ دو صوفی تھے۔ ایک بڑا صوفی ٹرینڈ اور ایک چھوٹا صوفی انڈر ٹریننگ۔ چھوٹے صوفی کو ساتھ لے کر بڑا صوفی گلیوں، بازاروں میں گھومتا رہا۔ چلتے چلاتے اس کو لے کر ایک جنگل میں چلا گیا۔ جیسے کہ میں نے پہلے عرض کی، بڑی تابڑ توڑ بارش ہوئی تھی، جنگل بھیگا ہوا تھا اور اس جنگل میں جگہ جگہ لکڑیوں کے ڈھیر تھے۔ پتوں کے، شاخوں کے انبار تھے۔ اس بڑے صوفی نے دیکھا کہ شاخوں اور پتوں کے ڈھیر میں ایک سانپ کچھ مُرجھایا ہوا، کچھ سنگھڑایا ہوا پڑا ہوا ہے۔ وہ پہلے آگ کی حدت سے زخم خوردہ تھا اور پھر اس پر جو بارش پڑی تو وہ زندہ سانپوں میں سے ہو گیا۔ صوفی کو بڑا ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سانپ کو اٹھا لیا۔

چھوٹے صوفی نے کہا، حضور کیا کرتے ہیں، سانپ ہے موذی ہے، اس کو اٹھایا نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا: "نہیں بے چارہ ہے، مجبور ہے، زخمی ہے، زخم

خوردہ ہے اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی کچھ غور و پرداخت کرنی چاہیے" تو وہ سانپ
کو ہاتھ میں لے کر چلے۔ پھر دونوں باتیں کرتے کرتے کافی منزلیں طے کرتے
گئے۔ جب ٹھنڈی ہوا لگی، جھولتے ہوئے سانپ کو، تو اسے ہوش آنے لگا اور
جب ہوش آیا تو طاقتور ہو گیا۔ طاقتور ہو گیا تو اس نے صوفی صاحب کے ہاتھ پر
ڈس لیا۔ جب ڈسا تو انہوں نے سانپ کو بڑی محبت اور پیار کے ساتھ ایک
درخت کی جڑ کے پاس رکھ دیا کیونکہ وہ اب ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ اب
یہ یہاں پر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ریوائیو (Revive) کر لے گا۔ جہاں بھی
اس کا دل ہو گا، چلا جائے گا۔ چھوٹے صوفی نے کہا: "دیکھیں سر! میں نے کہا تھا نا
کہ یہ موذی جانور ہے، آپ کو ڈس لے گا۔ پھر کیوں ساتھ اٹھا کے لے جا رہے
ہیں؟ آپ تو بہت دانشمند ہیں، مجھے سکھانے پر مامور ہیں۔" تو انہوں نے کہا:
"ڈسا نہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ سانپ اسی طرح شکریہ ادا
کیا کرتے ہیں۔ یہ جو تمہارے خلاف لکھتا ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے کا یہی
طریقہ ہے۔ تم ناراض نہ ہو۔" میرے دل پر بڑا بھاری بوجھ تھا، دور ہو گیا اور میں
بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ تو خواتین و حضرات! یہ ڈیرے، یہ خانقاہیں یا جن کو تکیے کہہ
لیں، یہ اسی کا مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ دل کا بوجھ جو آدمی سے خود اٹھائے
نہیں اٹھتا، وہ ان کے پاس لے جائے۔ اور "بابے" کے پاس جا کر آسانی سے سمجھ

میں آنے کے لیے عرض کرے۔ فرض کریں ماڈرن دنیا میں کسی قسم کا ایک ڈیرہ ہو، جس میں سائیکی ایٹ رسٹ (Psychiatrist) بیٹھا ہو، لیکن وہ فیس نہ لے، یا سائیکالوجسٹ ہو جس کے پاس وہ بنچ نہ ہو جس پر لٹا کر Analysis کرتے ہیں، بلکہ بچھانے کے لیے صف ہو۔ اس پر ایسا سامان ہو کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ تو ان ڈیروں کو، ان تکیوں کو شمالی افریقہ میں، الجزائر میں تیونس میں "زاویے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کو "زاویہ" کہتے ہیں۔ کچھ "رباط" بھی کہتے ہیں وہاں پر، لیکن زاویہ زیادہ مستعمل ہے۔ حیران کن بات ہے، باوجود اس کے کہ زاویہ ایک خاص اسم ظرف مکان ہے شمالی افریقہ کا، لیکن اندلس کے زمانے میں اندلس کی سرزمین پر زاویے نہیں تھے۔ تیونس، الجزائر میں رباط تھے۔ یہاں صوفی لوگ بیٹھ کر لوگوں کو، آنے جانے والوں کو ایک چھت فراہم کرتے تھے۔ رہنے کے لیے جگہ دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی، پانی دیتے تھے۔ کچھ دیر لوگ بیٹھتے تھے۔ دکھی لوگ آتے تھے۔ اپنا دکھ بیان کرتے تھے اور ان سے شفا حاصل کر کے ڈائیلاگ کرتے تھے۔ سچ مچ! جو سائیکالوجسٹ کہا کرتے ہیں، وہ مہیا کرتے تھے، ہم نے بھی اسی تقلید میں پروگرام کا نام زاویہ رکھا ہے۔ اس لحاظ سے تو مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے۔ نقل بمطابق اصل ہے لیکن سپرٹ (روح) اس کی وہی

ہے۔ کوشش اس کی یہی ہے کہ اس طرح کی باتیں یہاں ہوتی رہیں اور طبیعت کا بوجھ، جو پروگراموں میں کالموں اور کتابوں سے دور نہیں ہوتا، وہ کسی طور پر یہاں دور ہو سکے۔

آپ جب بھی کسی ڈیرے پر، کسی بزرگ سے ملنے جائیں گے تو آپ کے لاشُعور میں ٹیسٹ کا ایک میٹر (Meter) ضرور ہو گا۔ میں دیکھوں، یہ کیسا آدمی ہے؟ آپ اکثر یہ کہہ کر چلے آتے ہیں کہ یار وہاں گئے تھے، وہ تو کچھ نہیں ہے۔ اپنے معیار کے ساتھ آدمی چیک کرتا ہے، لیکن جب آپ پوری طلب کے ساتھ، امتحان پاس کرنے کا اندازہ اختیار کیے ہوئے جائیں تو پھر آپ کو ان خاکستروں میں سے عجیب قسم کے لعل مل جاتے ہیں۔ مشکل تو ہو گی کہ وہاں سندھ چلے جائیں۔ تھرپارکر کے ڈیزرٹ میں چلے جائیں یا روہی میں چلے جائیں۔ کچھ نہ کچھ آپ کو دانش کی بات مل جائے گی۔ دانش کی بات جو ہے، یہ ایسے ہی لوگوں سے ملتی ہے، کتابوں سے نہیں ملتی۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ زاویہ، باوجود اس کے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے لیکن اس کی خوبی اس کی سپرٹ ویسی ہی رکھنی کی کوشش کی گئی ہے۔

سپرٹ سے یاد آیا کہ اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں ایک بہروپیا آیا اور اس

نے کہا: ''باوجود اس کے کہ آپ رنگ و رامش، گانے بجانے کو برا سمجھتے ہیں، شہنشاہِ معظم! لیکن میں فن کار ہوں اور ایک فن کار کی حیثیت سے آپ کے خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور میں بہروپیا ہوں۔ میرا نام کندن بہروپیا ہے اور میں ایسا بہروپ بدل سکتا ہوں کہ شہنشاہِ معظم، جن کو اپنے تبحرِ علمی پر بڑا ناز ہے، دھوکا دے سکتا ہوں، اور میں غچہ دے کر بڑی کامیابی کے ساتھ نکل جاتا ہوں۔''

اورنگزیب عالمگیر نے کہا: ''یہ بات توضیع اوقات ہے۔ میں تو شکار کو بھی بیکار سمجھتا ہوں۔ یہ تم جو چیز میرے پاس لائے ہو، اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔'' اس نے کہا: ''نہیں صاحب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ اتنے شہنشاہ ہیں اور دانش میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں بھیس بدلوں گا، آپ پہچان کر دکھایئے۔''

تو انہوں نے کہا: ''منظور ہے۔''

اس نے کہا: ''حضور آپ وقت کے شہنشاہ ہیں۔ اگر تو آپ نے مجھے پہچان لیا تو میں آپ کا دینے دار ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھے پہچان نہ سکے اور میں نے ایسا بھیس بدلا تو میں آپ سے پانچ سو روپیہ لوں گا۔'' ظاہر ہے اس وقت پانچ سو بہت ہوں گے۔ شہنشاہ نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ پانچ سو میرے لیے کچھ نہیں ہے، منظور

ہے، جاؤ۔" تو وہ شرط طے کر کے چلا گیا اور پھر سوچنے لگا۔ گھر جا کر بھی پریشان ہوا کہ میں شیخی میں ایسی شرط بد کر آ گیا ہوں۔ میں کون سا ایسا روپ بدلوں کہ بادشاہ کو پتا نہ۔ پھرتا پھراتا تحقیق و تفتیش کرتا رہا لوگوں سے پتہ چلا اورنگ زیب عالمگیر ساؤتھ انڈیا میں مرہٹوں پر اور برہمنی سلطنتوں پر اکثر حملے کیا کرتا تھا۔ انہوں نے کہا، یہ سال چھوڑ کر اگلے سال پھر ان پر حملہ کرے گا۔ یہ خبر بہروپیے کو جو وقائع نگار تھے، انہوں نے بتائی۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ چنانچہ وہ یہاں سے پاپیادہ سفر کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں برہمنی سلطنت تھی۔ وہاں جا کر اس نے ایک بزرگ کا روپ دھارا۔ ڈاڑھی بڑھالی۔ سبز کپڑے پہن لیے۔ بڑے بڑے منکے گلے میں ڈال لیے، اور اللہ کی یاد میں ایسا مستغرق ہوا کہ بڑی دیر تک بہت دور تک لوگوں کو اپنے اس سحر میں مبتلا کرتا رہا۔ ارد گرد کے لوگ جو تھے، بابا پیر کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ لوگ آنے لگے اور طرح طرح کے چڑھاوے چڑھانے لگے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کا رواج ہے۔ دور دور تک اس کا نام آنے لگا۔ لیکن استقامت کے ساتھ سال بھر اس کی ریاضت میں مصروف رہا جو بزرگ کیا کرتے ہیں۔

ایک سال کے بعد جب اپنا لاؤ لشکر لے کر اورنگ زیب عالمگیر ساؤتھ انڈیا پہنچا اور پڑاؤ ڈالا تو تھوڑا سا وہ خوف زدہ تھا۔ اور جب اس نے مرہٹوں کے پیشوا پر

حملہ کیا تو وہ اتنی مضبوطی کے ساتھ قلعہ بند تھے اس کی فوجیں توڑ نہ سکیں۔ پریشانی کا عالم ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ شاید اس کو ناکام لوٹنا پڑے اور اس کی حکومت پر برا اثر پڑے۔ چنانچہ لوگوں نے کہا، یہاں ایک درویش ولی اللہ رہتے ہیں۔ درخت کے نیچے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے جا کر ڈسکس کریں۔ پھر دعا کریں اور پھر ٹوٹ پڑیں۔ شہنشاہ پریشان تھا، بے چارہ بھاگا بھاگا گیا ان کے پاس۔ سلام کیا اور کہا: ''حضور میں آپ کی خدمت میں ذرا۔۔۔'' انہوں نے کہا: ''ہم فقیر آدمی ہیں۔ ہمیں ایسی چیزوں سے کیا لینا دینا۔'' شہنشاہ نے کہا: ''نہیں عالم اسلام پر بڑا مشکل وقت ہے (جیسے انسان بہانے کیا کرتا ہے) آپ ہماری مدد کریں۔ میں کل اس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو فقیر نے فرمایا: ''نہیں کل مت کریں، پرسوں کریں اور پرسوں بعد نمازِ ظہر۔'' اورنگزیب نے کہا جی بہت اچھا۔ چنانچہ اس نے نمازِ ظہر جو حملہ کیا اور ایسے زور کا کیا اور جذبے سے کیا اور پیچھے فقیر کی دعا تھی، اور ایسی دعا کہ وہ قلعہ ٹوٹ گیا اور فتح ہو گئی۔ مفتوح جو تھے وہ پاؤں پڑ گئے۔ بادشاہ مرہٹوں کے پیشوا پر فتح مند کامران ہونے کے بعد سیدھا درویش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجود کہ وہ ٹوپیاں سی کے اور قرآن لکھ کر گزارا کرتا تھا لیکن سبز رنگ کا بڑا سا عمامہ پہنتا تھا بڑے زمرد اور جواہر لگے ہوتے تھے۔ اس نے جا کر عمامہ اتارا اور کھڑا ہو

گیا۔ دست بستہ کہ حضور یہ سب کچھ آپ ہی کی بدولت ہوا ہے۔

اس نے کہا: ''نہیں جو کچھ کیا اللہ نے کیا ہے۔'' انہوں نے کہا کہ آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں حضور۔ درویش نے کہا: ''نہیں ہم فقیر لوگ ہیں۔'' اس نے کہا کہ دو پرگنے کی معافی دو بڑے قصبے۔ اتنے بڑے جتنے آپ کے اوکاڑہ اور پتّو کی ہیں۔ وہ ان کو دیتا ہوں اور زمین اور آئندہ پانچ سات پشتوں کے لیے ہر طرح کی معافی ہے۔

اس نے کہا: ''بابا یہ ہمارے کس کام کی ہیں ساری چیزیں۔ ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ تیری بڑی مہربانی۔''

اورنگزیب نے بڑا زور لگایا، لیکن وہ نہیں مانا اور بادشاہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس نے اپنے تخت کے اوپر متمکن ہو کر ایک نیا فرمان جاری کیا۔ جب شہنشاہ فرمان جاری کر رہا تھا، عین اس وقت کندن بہروپیا اسی طرح منکے پہنے آیا۔ شہنشاہ نے کہا:

''حضور آپ یہاں کیوں تشریف لائے۔ آپ مجھے حکم دیتے، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔'' کندن نے کہا: ''نہیں شہنشاہِ معظم! اب یہ ہمارا فرض تھا، ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو جنابِ عالی میں کندن بہروپیا ہوں۔

میرے پانچ سو روپے مجھے عنایت فرمائیں۔"

اس نے کہا: تم وہ ہو؟ اس نے کہا، ہاں وہی ہوں جو آج سے ڈیڑھ برس پہلے آپ سے وعدہ کر کے گیا تھا۔

اورنگزیب نے کہا: "مجھے پانچ سو روپیہ دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں، جب میں نے آپ کو دو پرگنے اور دو قصبے کی معافی دی۔ جب آپ کے نام اتنی زمین کر دی۔ جب میں نے آپ کی سات پشتوں کو یہ رعایت دی کہ اس میری مملکت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں رہیں۔ آپ نے اس وقت کیوں انکار کر دیا۔ یہ پانچ سو روپیہ تو کچھ بھی نہیں۔"

اس نے کہا: "حضور بات یہ ہے جن کا روپ دھارا تھا، ان کی عزت مقصود تھی۔ وہ سچے لوگ ہیں۔ ہم جھوٹے لوگ ہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ کہ روپ سچوں کا دھاروں اور پھر بے ایمانی کروں۔"

تو خواتین و حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارا زاویہ دو نمبر ہی سہی، بے شک بہروپ ہی سہی، تو آپ دعا کریں۔ اس میں کچھ ایسا باتیں، کچھ ایسے مسئلے، کچھ ایسی پیچیدگیاں، کچھ ایسے بوجھ دور ہوتے رہیں جو کسی اور طرح سے نہیں ہو پاتے۔

زاویہ کے پہلے پروگرام میں حاضرین کے جناب اشفاق احمد سے کچھ سوالات اور ان کے جوابات:

سوال: اس طرح کی نشست تو رورل ٹریڈیشن ہے ہماری۔ یہ بھی اسی کا ایک سلسلہ ہے۔ پرنٹڈ ورڈ (Printed Word) نے اس کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

جواب: ہاں یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ Oral Tradition طاقتور ہے۔ پیغمبروں کا علم عام کرنے کے لیے Oral Tradition ہی ہوتی ہے۔ پیغمبر بھی کھڑے ہو کر اپنی بات بیان فرماتے تھے۔ اسی لیے اللہ قرآن میں بار بار ہر پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے: "اے لوگو! دیکھو۔" اور اعتراض کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے۔ یہ تو بازاروں میں کھڑا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں سے باتیں کرتا ہے۔ فرعون نے بھی یہ کہا تھا کہ میں موسیٰ کو کیسے مان لوں، اس کے بازوؤں میں تو کنگن بھی نہیں ہیں۔ تو میں نہیں مانتا۔ Oral Tradition بالکل ہی چلا اور میں یہ سمجھتا ہوں، میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ یہ Oral Tradition پرنٹڈ ورڈ کے راستے سے ہو کر الیکٹرانک میڈیا کی معرفت Oral Tradition میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس کا روپ بہروپ ویسا ہی ہونا چاہیے۔ جس طرح ابتدائی قدیم زمانے سے ہے۔

سوال: ماڈرن ورشن میں میں سمجھتا ہوں اس کا روپ یقیناً ہو گا۔ لیکن یہ ہیومین Presence کی بات ہے۔ جو عوام تھے، Oral Tradition میں موجود تھے۔ اس کو ہم کیسے ریوائیو (Revive) کریں۔

جواب: اس کو ہم Revive کر سکیں گے۔ بالکل دوبارہ جنم دینے سے کر سکیں گے۔ جہاں انسان انسان سے ملے گا۔ انسان انسان سے بات کرے گا۔ ورنہ ہم اپنی سوچ ہر سوچ کو (Realize) کرتے رہ جائیں گے۔

سوال: سر! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جب ہم کسی شخص کو Condemn کرتے ہیں یا اس کا بطلان کرتے ہیں یا کسی شخص کو برا بھلا کہتے ہیں تو کیا ہمارے ذہن میں یہ آرزو تو نہیں پوشیدہ ہوتی کہ ہم خود ویسا بننا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ حسین آدمی کو کم حسین آدمی رد کرتے ہیں۔ امیر آدمی کو کم امیر آدمی رد کرتا ہے۔ طاقت ور کم صحت مند کو رد کرتا ہے تو کیا اس کے پیچھے کوئی ایسی آرزو تو نہیں ہوتی کہ کاش میں بھی ایسا بن جاتا۔

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یقیناً اس میں ہے۔ اگر کوئی محروم شخص ہے، کسی بھی اعتبار سے، تو پھر وہ کنڈم تو کرے گا، لیکن اس کی محرومی کے پیچھے کچھ اسباب ہیں۔ کہ جو جائز نہیں ہیں، مناسب نہیں ہیں یا جس کو

معاشرہ دور کر سکتا ہے یا کرنا چاہیے تو پھر اس کے کنڈم کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالص انسانی بات ہے کہ جو بنیادی محرومی ہے، کسی بھی حوالے سے، وہ ایک ری ایکشن (رد عمل) تو جنریٹ کرے گی، تو اب اس سے کیسے بچا جائے۔

سوال: بچنے کی بات بعد میں آتی ہے۔ کیسے پتا لگایا جائے کہ یہ شخص جس بات کا اظہار کر رہا ہے اس کے پیچھے عوامل جو تھے، وہ مختلف ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کو سچ مچ کنڈم کر رہا ہے۔ ان کے پیچھے یہ آرزو ہے کہ میں بھی ایسا ہوتا جب اس مقام پر بندہ پہنچتا ہے۔ اس مقام پر بندہ پہنچتا ہے۔ اس مقام کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے ایکٹ نہیں کرے گا۔ وہ دوسرے نیچے اتار دیں گے۔ جو بندہ غریب ہوتا ہے، ویسا کام نہیں کرے گا تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ جب بندہ امیر ہوتا ہے، اس کے پاس پیسا آتا ہے، دولت آتی ہے۔ ویسا Behave نہیں کرے گا تو لوگ اس سے چھین گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ جب غریب تھا تو بہت اچھا ہوتا تھا۔ اللہ میاں نے اسے دولت دی ہے تو بہت غلط ہو گیا ہے۔

جواب: برخوردار! یہ آدمی جو امیروں کو Run down کر رہا ہے کہ دیکھو جی کتنا ظالم ہے۔

سوال: یہ سر! کہیں ایسا تو نہیں کہ حسد بول رہا ہو؟

جواب: حسد بھی بولتا ہے۔ اگر حسد بولتا ہے تو پھر وہ خود ہونا چاہتا ہے نا۔ میں ڈرتا ہوں۔ میرے منہ میں خاک۔ میں کہیں جرات نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ مارکس کچھ اور تھا۔

کوئی بھی نظریہ آدمی جو دیتا ہے، کوئی فلسفہ ہے یا کوئی بات۔ اس کے پیچھے اصل محرکات کیا ہیں، اس بندے کی ذات کے اندر وہ کچھ اور ہی ہو سکتا ہیں۔ مطلب جو اس کے ظاہری نظریات ہیں، وہ بالکل مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً یہ بچپن کی محرومی اور شدید غربت مارکسزم کی طرف لے جاتی ہے یا کچھ اور وقت اس نے گزارا ہے۔ کسی اور طریقے سے تو ممکن ہے کہ وہ کوئی یہ نظریہ اختیار کر لے تو اب وہ اس بندے کی اسٹڈی بن جائے گی۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ جو اس نے پیش کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس کو الگ سطح پر جانچیں۔

آپ کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں اگر Human Dignity کو Ensure کر لیں، ہر آدمی کی عزت کو بحال کر دیا جائے تو پھر ایسی صورت حال بن جائے گی۔ پھر کنڈم کرنے کا سلسلہ کم ہو جائے گا۔

میرے خیال میں بھی کچھ کم ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود بھی ایک بے چینی

تو انسان میں رہے گی۔ ہمیشہ ایک بہت اچھا Player ہے۔ اچھی Games کھیلتا ہے۔ میں نہیں کھیل سکتا، میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے چاہیے کہ میں خوش ہوں۔ واہ جی واہ، کیا اچھا کھیلتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تو کچھ بھی نہیں، فضول ہے۔ اس میں کیا ہے۔

انسان میں اپنی کمزوریاں اور اپنے اندر جو خامیاں ہوتی ہیں، ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں جو ہے، وہ مجھ میں کیوں نہیں، تو ایک حسد کہہ سکتے ہیں یا انسان کی شخصی کمزوری کہہ سکتے ہیں۔ کچھ قدرتی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ قدرتی طور پر خوب صورت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ مارجن (Margin) لے کر آتے ہیں اور جس کے پاس مارجن نہیں، وہ کیا کرے؟ صورت کو ایک معیار بنا دیا گیا ہے۔ آدمی جتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا اس کا ظرف ہو جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو برداشت بھی کر لیتا ہے۔ سن بھی لیتا ہے کنڈم بھی نہیں کرتا۔ اگر ایسی صورتِ حال پیدا کی جائے کہ ہر آدمی کو عزّتِ نفس ملے۔ اس کو بڑا ہونے کا احساس دیا جائے تو پھر کنڈم نہیں کرے گا۔

بڑا ہونے کے لیے جو لیور (Lever) آپ اسے عطا کر رہے ہیں، وہ عزت نفس کا ہے۔ دولت یا شہرت یا حسن ہی سب کچھ نہیں ہیں۔

ابھی تک تو ہماری سوچ کا جو رخ ہے، وہ ذرا سا مختلف ہے۔ جس کی ہمیں پریکٹس ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آہستہ آہستہ جب یہ انٹرایکشن بڑھے گا جو آپ نے سوال کیا تھا، انسانی لیول کے اوپر اس کے اندر پہنچ کر سوچئے۔

آپ کا بہت بہت شکریہ اور مہربانی کہ آپ یہاں تشریف لائے اور آپ نے اس پروگرام کو رونق بخشی۔ انشاءاللہ پھر بھی آپ کے ساتھ ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔

بچوں کی نفسیات

آپ سب کی خدمت میں میر اسلام پہنچے۔

بچے کی نفسیات کے بارے میں بہت سی دلیلیں ایک دوسرے کے متضاد بھی ملتی ہیں کہ یہ بچہ کام کرتا ہے یا نہیں کرتا، تو میرا اس سے کوئی ایسا تعارف نہیں تھا۔ اور میں سائیکالوجی کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتا تھا جتنا کہ میرے ہم سفر جانتے تھے۔ میرا یہ واقعہ 1952ء کا ہے اور یہ مجھے شہزاد کی فرمائش پر پھر یاد آرہا ہے۔ بہت دیر کی بات ہے۔ میں 1952ء میں ملک روم میں تھا۔ روم یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ساتھ ساتھ فرانسیسی اور اطالوی پڑھتا ہے۔ وہاں پر ہمارا ایک دوست تھا مسودی ریاک۔ وہ بہت اچھا مصور تھا۔ میری بہت اچھے سے مراد یہ کہ اس کی تصویریں گاہے بگاہے بک جاتی تھیں اور وہ ہمارا دوست تھا۔ دوست تھا تو اس کے ساتھ ادھر اللّے تللّے کرنے میں گھوم پھر لیتا تھا۔ وہ اچھا شریف آدمی تھا۔ ہمیں بہت آسانی ہوتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ پیسے ہوتے تھے۔ ہم تین دوست تھے۔ ریاک، میں اور ایک ہری چند، جو ہندوستان کا تھا۔ ہم اس تاڑ میں رہتے تھے کہ کوئی اچھا سا موقع ہمیں ایسا ملے کہ جہاں پر ہم

پیسے خرچ بغیر گھوم سکیں اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ پتا نہیں کتنی دیر یورپ میں رہنا ہے۔ تو ان دنوں 31 دسمبر 1952ء کو ریاک کی ایک تصویر بک گئی تو اس نے کہا، میں تمہاری دعوت کروں گا۔ ویاوینی تو کے اوپر، جہاں پر ایمبیسیز ہیں۔ بہت قیمتی سڑک ہے جیسے ہمارے ہاں شارع قائد اعظم ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں جس کا نام علی بابا چالیس چور تھا۔ وہ ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ تھا۔ اور اس کے اوپر چھت اٹھائی ہوئی تھی اور اس کے اندر آرکسٹرا بڑا خوب صورت بجتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہاں عام طور پر ایکٹر لوگ زیادہ جاتے تھے۔ عام آدمی کی وہاں اتنی پہنچ نہیں تھی کہ وہاں پہنچ سکتا یہ جو ہمارا انتھونی کوئن تھا، اس کو وہاں آنے کا بہت شوق تھا۔ انتھونی کوئن کی ایک بڑی عجیب و غریب عادت تھی کہ عورتوں جیسا مزاج تھا اس کا۔ ہر وقت اپنے ساتھ ایک شیشہ رکھتا تھا، دو منٹ بعد نکال کے تھوڑی لپ اسٹک لگاتا تھا۔ اتنا نازک مزاج اور یوں کر کے بال۔ انتھونی کوئن سے ہم بہت متاثر تھے۔ اور پھر اس سے وہاں ملنا ہوا۔ انہی دنوں ہمارے مشرقی پاکستان کے ربیع الدّین وہاں پر فلم ڈائریکشن کی کچھ تعلیم لینے آ گئے۔ ہماری ایوننگ کلاسیں ہوتی تھیں، اس لیے انہوں کہا، چھ مہینے کا کورس ہے اس میں آپ کو پتا چلے گا کہ ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ لائٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ تو چینی چتا ہم جانے لگے۔

ہمارے جو استاد تھے، پر نسپل تھے، ریکٹر تھے وہ تھے وکٹوریا ڈسیکا۔ ان کی ایک بہت مشہور بائیسکل تھی۔ تو ڈسیکا صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن ہم ڈسیکا صاحب سے نہ تو اتنا ڈرتے کیونکہ ان کا مزاج اچھا نہ تھا، اور نہ ان سے اتنے زیادہ متاثر تھے جتنے ان ایکٹروں سے جن کا کہ پینترا اور طرح کا تھا۔ تو ایک دفعہ انہوں نے ہم سے کلاس میں سوال پوچھا: "بھئی بتاؤ کہ سب سے زیادہ مشکل رول کون سا ہے جو ایکٹر کر سکتا ہے؟" مجھے بات یاد آ گئی۔ ہم سب نے ہاتھ کھڑے کیے تقریباً لڑکے لڑکیوں کا مشترکہ جواب تھا کہ ہنچ بیک آف ناسٹ ڈم کا رول ہے۔ کیونکہ ٹوٹی ہوئی ناک، گندی شکل، بدنصیب آدمی، ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ، وہ رول تو کوئی بھی آدمی کر سکتا ہے۔ وہ تو سب سے آسان ہے۔ ہنچ بیک آف نوٹرے ڈم، اگر کسی نے کیا ہے تو آپ اسے بڑا ایکٹر نہ مانیں۔ مشکل ترین رول یہ ہے کہ عام گھرانے کا ایک عام باپ ہے۔ ٹوپی اتار کے رکھتا ہے، چھتری پکڑ کر رکھتا ہے۔ دفتر سے آتا ہے اور پھر اس کو اپنا رول کرنا ہے جو سب سے مشکل ہے۔ وہ کیا کرے، اس کے پاس کوئی سہارا نہیں؟

یہ بات دوسری طرف چلی گئی، تو ہم چلے گئے علی بابا چالیس چور والے ریسٹورنٹ میں۔ 31 دسمبر کی رات میں تمہاری وہاں لگواؤں گا، اور تم دیکھو گے کہ دن کس طرح طلوع ہوتا ہے اور سال کس طرح ختم ہوتا ہے۔ کیا کیا کچھ ہنگامہ ہوتا

ہے۔ ہم بڑے خوش تھے۔ ہم بڑے خوش تھے۔ ہم وہاں چلے گئے تو جا کے جب دیکھا تو چھما چھم بینڈ باجے بج رہے ہیں اور دنیا جہاں کے ایکٹر ایکٹرس آئے ہوئے ہیں۔ سارے تقریباً وہاں پر موجود تھے اور وہ بڑا اچھا زمانہ تھا۔ جب پوسٹ واسل میں اٹلی کی بن رہی تھیں عمارتیں، جب وہاں گئے تو وہاں سٹیج کے اوپر بلیک نیگرو تھے۔ اس زمانے میں بلیک ڈرمر کا بہت رواج تھا۔ اب نہیں رہا۔ بیٹ بہت پیاری تھی۔ ہر ایک کا ناچنے کو دل کر رہا تھا۔ اچانک ریاک اٹھا، ہم سمجھے شائد کوئی اپنی چیز ڈرنک، کوئی سگریٹ لیے گیا ہے۔ جا کر ان سے ملا، میوزک والوں سے۔ پھر لوٹ کر واپس آ گیا تو اچانک ایک اعلان ہوا۔ سینوری سینوری بونیر اچے اون کاپتن تے پاکستان وترادی نصرالی۔ میں تو یہی سمجھا کہ ہمارے درمیان کوئی پاکستانی موجود ہے جو بڑا اچھا گاتا بجاتا ہے۔ میں نے کہا، شائد ہو گا۔ میں تھوڑا سا کانپا۔ اعلی اے ای پروفسورے اعلیٰ ادنستی زاوی روما سوادنامے کاغذ اٹھایا اشفاق احمد۔ جب انہوں نے یہ کہا تو میری جان عذاب بن گئی۔

مجھے گانے کا پتا ہی نہیں ہوتا کیا ہے۔ شائد اب یاد ہو۔ اب یہ وہاں نہیں ہو سکتا کہ میر اگلا خراب ہے۔ یوں ہے وہ ہے میں نہیں آسکتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ برا لگتا ہے۔ یا اللہ مجھے کچھ ایسی بات یاد دلا کہ میں کیا گاتا، ہمیں لب پہ آتی ہے دعا

بن کے وہ اس پر ڈرم نہیں بجا سکتے تھے۔ کچھ میوزک نہیں بج سکتا۔ پھر ڈانس، تو الحمدللہ میں گاؤں کو رہنے والا تھا اور ہمارے سکھ علاقے میں بولیاں وولیاں بہت چلتی تھیں۔ میں اپنی کرسی سے سٹیج پر جاتے ہوئے سوچتا گیا۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ اچانک ایک بولی یاد آ گئی، شائد یہی کچھ کام دے جائے۔ سٹیج پر پہنچ گیا تو سٹیج فیئر (Stage Fear) ختم ہو گیا۔ کچھ پہلے بھی، ریڈیو کی دنیا سے تعلق تھا میرا، وہاں پہنچ گیا۔ اپنے کان پر ہاتھ رکھا، سٹائل اپنا جو ہوتا ہے، میں نے کہا" بودی والا چڑھیا کار کار ہوں۔ وچارا گیڑا گناماں پیالا لیا روپ ہینڈ اراں ہزار ہا بھیڈاں چار دیاں، بے قدراں دیاں ناریاں بھیڈاں چار دیاں" جب یہ شروع ہوا تو انہوں نے لہرا اٹھالی۔ جناب ادھر سے جم چکھدار جم چکھدار شروع ہو گئے۔ مجھے خالی یہی بند یاد آ رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں آ رہا، میں یہ گاتا رہا آدھا گھنٹہ تک اب Once More شروع ہو گیا۔ میں وہاں کا ہیرو بن گیا۔ اچھے اچھے گانے والے آئے ہوئے تھے۔ نامور گانے والے پیچھے ہو گئے۔ انہوں نے کہا، نہیں سینورے نہیں اشفاق احمد دے فی وے دنال ترولوتا اعلیٰ کنتار۔" میں نے کہا، جی بس میرا اتنا ہی گانا تھا۔

اب جب میں بیٹھ گیا تو میں نے کہا، تم سے بعد میں بدلہ لوں گا۔ اب چونکہ مجھے اپنی اتنی شیشک مل رہی ہے تو لوگ آ گئے مجھ سے دستخط کروانے، آٹو گراف

کے لیے، میں اس کو دے رہا ہوں، اُس کو دے رہا ہوں۔ اشفاق احمد۔ میں جس میز پر بیٹھا ہوں، وہاں پر ایک بہت معزز چودھری بنا ہوا تھا۔ دور ایک میز تھی۔ اس پر ایک نہایت گریس فل خاتون تھی۔ اکیلی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تو انہوں نے پلٹ کر ایسے میری طرف دیکھا تو میری بالکل سٹی گم ہو گئی۔ یعنی اس کا کچھ ایسا چارم تھا اس کی Personality اتنی بڑی تھی۔ میں اس کے پاس بہ ادب چلا گیا۔

اس نے کہا۔ "سی کم دا" میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا Give me Sign مجھے بھی دیں آٹو گراف۔ میں نے اس پر لکھا، بخدمت ملکہ عالیہ انگرڈ برگ مان اور نیچے اپنا نام لکھا۔ اب اس کے بعد وہ انگریزی میں پوچھتی ہے What you have written? تو میں نے کہا I have written your name اور یہ مجھے بڑی آرزو تھی۔ میں خود اس لیے اٹھ کر آ گیا تھا کہ اتنے قریب سے اتنی بڑی آرٹسٹ کو دیکھنے کی حسرت تھی۔ تو آپ کی خدمت میں آ گیا وہ کہنے لگی Thank you very much میں نے کہا، "سینوریو بیر تو رسیلنی سے بھی ملنے کو میرا بڑا جی چاہتا ہے۔ وہ اس کے خاوند تھے جو رسیلنی۔ تو اس نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا، مجھے رنگ کریں۔ میں آپ کو وقت دوں گی، فلاں دن اور پھر آپ آئیں۔ تو میں نے وہاں سے آ کر سب کو بتایا۔

ایک دن میں نے ٹیلی فون کیا۔ اس نے کہا، آپ آئیں اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ رسیلنی باوجود اس کے کہ وہ سیٹ پر ہوں گے، لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ میں آجاؤں گا اور کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ this will be sort of Family Union ہم تم کو ایک گھر کا ہی بندہ سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا، جی I am honoured عزت افزائی کی بات ہے۔

تو لو جی میں وہاں پہنچا، کار چلاتا۔ پولین اسے کہتے تھے۔ تو پولین کے معنی ہیں، چوہیا۔ چوہیا کار۔ صابن دانی تو آپ لوگوں نے یہاں نام رکھا ہے۔ اسی کو تو پولین چوہیا کار کہتے ہیں۔ اب میں تو پولینو میں وہاں پہنچا۔ Villa کوئی روم سے 21۔22 کلومیٹر کے فاصلے پر۔ جب میں وہاں پہنچا تو میرا خیال تھا کہ امیر لوگ ہیں تو اچھا خاصا بڑا سا گھر ہو گا۔ لیکن جی وہ تو اتنا بڑا تھا اور اتنے ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا کہ میری سٹی گم ہوئی اس کو دیکھ کے۔ باہر کھڑے دربان نے پوچھا، آپ کو کس سے ملنا ہے۔

سینوریو پاکستان میں نے۔ کہنے لگا، سی کماں دا، اس نے وہاں بڑا گیٹ کھول کے چھوٹی کار اندر داخل کی تو یہ زندگی کی شرمندگیوں میں سے ایک تھی۔ انہوں نے گڑ۔ڑ۔ڑ۔ڑ۔ بڑا دروازہ کھولا کہ کوئی ملنے والا ہے تو اس میں چوہیا جا رہی

ہے۔ مجھے افسوس ہوا، یا اللہ یہ ایسی کار۔ کاش اس وقت کے لیے اور بڑی مل جاتی، کم از کم لیموزین ہوتی۔ میں نے جا کے اس کو روکا۔ اس چوکیدار نے کہا، ابھی آپ کو تھوڑا سا پیدل چلنا پڑے گا۔ آگے آپ کو ایک اور برک انداز ملے گا، باوردی۔ وہ آپ کو لے جائے گا، تو میں نے کہا، بہت اچھا۔ میں پیدل چلتا رہا پٹڑی کے اوپر۔ دونوں طرف بہت خوب صورت لان تھے۔ آگے گئے تو ایک اور باوردی آدمی ملا، اُس نے بڑے خوبصورت اور اس کے اوپر بیلیں لٹکی ہوئیں۔ اس نے وہاں جا کر کہا، میری حد یہاں ختم ہوتی ہے۔ آپ اب ایک اور صاحب کے ساتھ چلے جائیں۔ ایک اور صاحب جو کہ عورت اور مرد تھے تو ان کو میں Greet کر کے ان کے ساتھ چلا، تو انہوں نے کہا، میڈم بہت خوش تھیں۔ سب کو بتایا تھا کہ ہمارا ایک معزز مہمان آ رہا ہے۔ میں آگے چلا گیا جا کر ایک بڑے ہال میں، انہوں نے مجھے اس خاتون نے اس مرد نے بٹھا دیا۔ ایک لمبی سی میز تھی۔ کالی سیاہ رنگ کی اور اس کے اوپر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ تو انہوں نے کہا، ہم نے میڈم کو اناؤنس کر دیا ہے، وہ آتی ہوں گی۔ میں نے کہا، بہت خوشی کی بات ہے۔ انہوں نے کہا، وہ معذرت کر رہی ہیں کہ تھوڑا سا آپ کو انتظار پڑے گا۔ اب بیٹھے بیٹھے مجھے کوئی مشکل سے چار پانچ منٹ ہوئے ہوں گے اور میں تھوڑا سا بور بھی ہو رہا تھا۔ وہاں سیڑھیاں تھیں آٹھ دس، وہاں سے ٹپ ٹپ کرتا

ہوا ایک لڑکا، جس نے نیلی نیکر پہنی ہوئی، کالے سیاہ بوٹ اور کتنے سارے بٹنوں
والی جیکٹ سی پہنی ہوئی وہ نیچے اترا۔ لڑکا کوئی سات آٹھ سال کا تھا۔ نیچے اترا
کھٹ کھٹ کرتا مجھ تک پہنچا۔ میں نے اس کو مُسکرا کر کہا، ہنجو جی۔ اس نے کوئی
جواب نہ دیا اور سیدھا میرے پاس آ کر کھڑا ہو کے غور سے میری شکل دیکھنے
لگا۔ اب میں بڑا ایمپریس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا ?How are you
.You belong to a rich class اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔
پھر اس نے کہنی رکھ کے میز کے اوپر، جہاں میں تھا، ایسے میری شکل دیکھی۔
اب ایک آدمی کا چہرہ اتنا قریب ہو، اس اینگل پر ہو، بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے
اس زمانے میں میں نے تھوڑی تھوڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک آرٹسٹ
تھا ڈالی، وہ اپنی مونچھوں کو موم لگا کے ذرا اونچی رکھتا تھا۔ میں نے بھی ڈالی کے
فیشن میں مونچھیں اوپر کی تھیں تو جب اس نے چہرہ قریب کیا تو وہ میرے بہت
نزدیک آ گیا۔ سیدھے کھڑے ہو کے اس نے میری ایک مونچھ کو پکڑا اور زور
سے کھینچا۔ میرا ہونٹ سارا اوپر کو کھنچ گیا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ ایک ملازم آ گیا اور
مجھے آ کے کہنا لگا، یہ رسیلنی کا بڑا بیٹا ہے اور میڈم کا بڑا لاڈلا بچہ ہے۔ میں نے کہا،
ہاں ماشاءاللہ بہت پیارا ہے۔ تھپڑ مار کے زور سے وہ بھاگ گیا، کہیں کھیلنے۔ پتا
نہیں کہاں چلا گیا۔ میں نے کہا، یا اللہ جتنی خوشی خوشی میں آیا تھا اور جتنا میرا

دبدبہ تھا، جو کچھ میں نے سنا تھا، یہ کیا ہوا میرے ساتھ۔ خیر رنج تو ہوا، آج تک
ہے۔ یہ ہو کیا گیا میرے ساتھ۔ وہ چلا گیا اور میں بیٹھا رہا، اتنے میں میڈم آ گئی
اور معذرت کرنے لگی، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے ابھی رسیلنی کو فون کیا ہے، اس
نے کہا، میرا ایک آخری شاٹ رہ گیا ہے۔ I hope بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔
جب تک ہم بیٹھ کے باتیں کریں گے۔ کہنے لگی Would you like
outside میں نے کہا، نہیں اندر ہی ٹھیک ہے۔ اندر میری کافی مرمت ہو گئی
ہے۔ میں دوبارہ باہر جا کے پھر کسی کے سامنے پیش ہوں گا۔ تو بیٹھ کے باتیں
کرنے لگ گئی۔ پاکستان کے بارے میں اس کو اتنا معلوم تھا کہ چھوٹا سا ملک ہے۔
دو ڈھائی سال کا۔ ابھی بنا ہے۔ میں نے کہا، آپ کے شوہر آئیں گے، ان کے
ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھر وہ معذرت کر کے چلی گئی۔ اس کا ایک ٹیلی فون آ گیا
تھا۔ میڈم کو ٹیلی فون بہت آتے تھے۔ چلی گئی تو اب میں بہت Conscious
ہو کے بیٹھا ہوا ہوں۔ یا اللہ وہ ظالم کا بچہ پھر نہ آ جائے۔ ایک ڈر ہوتا ہے نا آدمی
کو کہ ایک گھوم رہا ہے آفت کا پرکالہ۔ بعد میں یہ پتا چلا کہ رسیلنی نے کہا، آپ
کھانا کھائیں، میں آپ کو Join نہیں کر سکوں گا، کیونکہ میں Delay ہو گیا۔
میرا شاٹ تیار نہیں ہوا تو میں پھر اشفاق سے ضرور ملوں گا۔ یہ بات طے ہے، پھر
اس نے کہا، Would u like۔ میں نے کہا، جیسا کہیں ٹھیک ہے۔ وہ ڈونگے

لے کر آنے لگے۔ ان کے ملازم باوردی دستانے پہنے ہوئے چیزیں لارہے ہیں۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی کہ وہ چھری کانٹے سے کھاتے تھے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ کیسے کھانا ہے۔ جب بھی کبھی وہ آلو میرے آگے بھاگتا رہتا ہے، پکڑا نہیں جاتا۔ نہیں آتا، تو میں ڈرا ہوا ہوں۔ ایسی جگہ پر خاص طور پر بندے کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چیزیں آ گئیں۔ اتنے میں وہ چھوٹا آفت کا پرکالہ تھا، اس کے بجائے پھر ایک اور نکل آیا۔ چار سال کا چھوٹا پرکالہ سا۔ تو میڈم نے کہا، یہ میرا چھوٹا بچہ ہے۔ دو ان کے بیٹے تھے۔ تو میں نے کہا ہیلو ہائے ویری کیوٹ۔ جیسے کہتے ہیں۔

تو وہ چھوٹا آ گیا۔ اس نے کرسی میرے اس طرف ڈال دی اور میرے قریب بیٹھ گیا، اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتا جا رہا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، عجیب و غریب سی۔ کیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ کس قسم کا آدمی ہے۔ باوجود اس کے کہ دونوں بچے بہت اچھی اٹالین بولتے تھے۔ میں بھی ٹھیک ٹھاک بولتا تھا۔ باتیں ہم کرتے رہے۔ جب کھانا لگ گیا بڑے طلائی اور زریں برتنوں میں۔ تو ہم نے شوربہ ڈال دیا، جو آغاز کرنے والا شوربہ ہوتا ہے۔ تو وہ جو چھوٹا بچہ تھا، دوسرا بڑا ادھر بیٹھا تھا، دوسرا بھی آ گیا۔ کھانا تو کھانا تھا ناساتھ۔ تو چھوٹے نے کیا کیا، وہ دہی کا ایک پیالہ اس کو لے میرے شوربے میں ڈال دیا اور چمچہ لے کر اس میں

ہلا دیا اور اپنی چیز کچھ کھانے لگا۔ تو میں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ شوربے میں دہی پڑا ہے۔ اس میں کیا خرابی ہو سکتی ہے تو میں نے ایک آدھ چمچ لیا تو میڈم نے کہا : I am very sorry بچے نے misbehave کیا آپ کے ساتھ۔ ہم بچوں کو ٹوکتے نہیں ہیں۔ ہم ان کو نفسیاتی طریقوں پر پال رہے ہیں، کیونکہ اگر بچوں کو ٹوکا جائے، ان کو منع کیا جائے تو ان کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہ نئی نئی تحقیق آئی ہے۔ ہم سارے لوگ یورپ کی اس تحقیق پر چل رہے ہیں۔ ہمارے جیسے پڑھے لکھے والدین اس معاملے میں بہت ہی محتاط ہیں۔ ہم بچوں کو کچھ نہیں کہتے۔ ملازم سے کہا کہ یہ پلیٹ اٹھا دو۔ اس کی جگہ اس نے نئی لا کر رکھ دی تو میں نے شوربہ ڈالا تو اس کے بڑے بیٹے نے کیچپ کی ساری بوتل پلیٹ میں انڈیل دی۔ تو میں نے کہا، میں کھاتا نہیں ہوں۔ میں ذرا سی چکن اور آلو گول سے کٹے ہوئے، وہ لے لیتا ہوں۔ وہ ڈال دیئے تو وہ جو بڑا بیٹا تھا، اس نے دیکھا کہ یہ بڑے شوق سے کھانے والا ہے۔ ابھی ایک نوالہ لیا ہی تھا کہ اس نے اپنا آلو چڑھایا فورک کے اوپر اور یوں تلکا کے ٹھک کر کے جیسے غلیل نہیں ہوتی، میری ناک کے اوپر، میں بہت اچھے کپڑے پہن کے گیا تھا، ٹھنا ٹھن مرچیں ڈال کے، آلو وہ گیا۔ اس نے کہا، میں پھر معذرت چاہتی ہوں۔ اگر ہم ان کو کچھ کہیں گے، منع کریں گے تو ان کی شخصیت پر اثر پڑے گا۔ ہم نہیں چاہتے بچے کی شخصیت

خراب ہو یوں آگے چل کر وہ بہتر انسان بنتا ہے۔ تو میں نے کہا، ہاں کوئی بات نہیں۔ (پھر میں نے ہاتھ ایسے کیے) جو بھی آدمی Protection کر سکتا ہے، لیکن ہو نہیں سکی۔ ہاتھ ایسے کیا تو چھوٹے نے کھڑے ہو کر میرے پاؤں کے اوپر اپنا پاؤں بڑے زور سے مارا۔ اس کے نیچے لوہے کے وہ لگے ہوئے تھے نیلز میری چیخ نکلی خوفناک قسم کی۔ میں نے سوچا کس لیے یہاں آگیا۔ دفع کرو، لعنت بھیجو، یہ ایکڑوں کے گھر ہوتے ہیں۔ میں کہاں پھنس گیا۔ اتنے میں رسیلنی کا ٹیلی فون آگیا تو ملازم نے آکر اعلان کیا۔ اس نے کپڑا ر کھا ٹک ٹک کرتی اوپر چلی گئی۔ اب میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں، اوپر جا رہی ہے کہ ان اب جا کے ٹیلی فون سننے لگ گئی ہے۔ جب وہ ٹیلی فون سن رہی ہو گی، بچے دونوں تاک میں بیٹھے تھے۔ میں نے گالی دی۔ کی سور میں تیرا گاٹا اتار دوں گا کتے۔ اس بے چارے نے کبھی گالی نہیں سنی تھی۔ اتنی گندی گالیاں جتنی مجھے آتی تھیں، جو کہیں بھی نہیں آسکتیں تو وہ کانپ گیا۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسا دیکھا نہیں تھا، وہ بے چارے ڈر گئے اور رنگ فق ہو گیا۔ میں نے کہا، اگر تم نے آواز نکالی تو کوئی اٹالین نہیں۔ کوئی انگریزی نہیں۔ خالص پنجابی "جے توں فیر ایہہ کیتا نا گل وڈ کے تھالی وچ رکھ دیاں گا" اور اب چہرے سے پتا چل گیا اور دہشت آگئی ان پر۔ اتنے میں وہ اپنا فون سن کے واپس آگئی اور انہوں نے کہا، وہ پھر معذرت کر

رہے ہیں۔ کوشش میں کر رہا ہوں، موقع مجھے اگر مل جائے تو جانے نہ دینا، جوائن ضرور کروں گا۔ میں نے کہا، بڑے مہربانی۔ پھر وہ کھانا کھانے لگی۔ اور دونوں بچے بھی۔

ہم بھی کھاتے رہے تو کھانے کے دوران جب ہم اختتام پر پہنچے تو میڈم نے کہا، پروفیسر! دیکھا آپ نے، اگر بچوں کو ڈانٹا نہ جائے تو شخصیت کیسی ہوتی ہے۔ پر سکون ہوتی ہے۔ کس شرافت سے کھانا کھا رہے ہیں۔

ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ نفسیات کا اچھا اصول ہے۔

سائیکالوجسٹ کہتے ہیں چونکہ بچے میں اگریشن (Aggression) ہوتا ہے تو وہ اس کو نکالنے کے لیے تکیہ لے کر ڈنڈے کے ساتھ ستون کے ساتھ باندھ کے پنچ مارو۔ کسی پر لکھ دو، "اماں جی"، کسی پر لکھ دو "ابا جی" اماں پر غصہ آئے تو اماں پر اور ابا پر غصہ آئے تو ابا پر ٹھا ٹھا۔ اور اس طرح سے اگریشن نکل جاتا ہے۔ یہ ان کا خیال ہے۔ چنانچہ پوری ایک دہائی سے۔ میں کہوں گا، سائیکالوجی اس بات پر مصر ہے کہ ان کا اگریشن نکل جانا چاہیے۔ ماں باپ کے خلاف اگریشن تو ہوتا ہی ہے، بہتر یہی ہے۔ جو طریقہ اب خاص طور پر برٹش سائیکالوجی میں ہے، یہ کہتے ہیں، ڈانٹنا ڈپٹنا، اس کو اس کا مقام بتانا ضروری ہے۔

ناشکرا انسان

بہت ساری چیزیں طبیعت پر بوجھ ڈالتی ہیں اور تسلسل کے ساتھ ڈالتی رہتی ہیں، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ چیزیں جو خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، اور جو ہماری طبیعتوں کے اوپر بوجھ ڈالتی ہیں، ان میں تسلسل کا رنگ آ جاتا ہے، اور وہ بہت دور تک دیر تک پھیل جاتی ہے۔ ہم اسے اللہ کی مصلحت کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی تسلی نہیں ہوتی انسان کی، اور وہ زیادہ جاننا چاہتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا اور کیوں ہوتا رہتا ہے؟ مثلاً یہ کہ چھوٹا بچہ ہے۔ اس کو کینسر ہو گیا ہے تو انسان بڑا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کا کیا قصور تھا، کیا کوتاہی تھی۔ لیکن اس کا قصور یا کوتاہی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ عقلِ مطلق ہے۔ جانتا ہے کہ کہاں پر کیا ہونا چاہیے۔ اس کے بارے میں مغرب کے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ولایت کا ادب اس موضوع سے مالا مال ہے۔ اور نظم میں، نثر میں Plays میں۔ مجھے The Eight Man کا ناول یاد آرہا ہے Thonken Wilter اس نے بھی اس میں یہ موضوع لیا ہے، بلکہ اس نے تو زندگی بھر جتنی بھی کتابیں لکھیں، لوٹ لوٹ کر پلٹ کر اسی موضوع پر لکھیں۔ اس کی کہانی مختصر

یہ ہے کہ آٹھ آدمی دریا عبور کر رہے تھے۔(لوہے کے رسے والا دریا) آٹھوں
آدمی ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے اور خدا کا کرنا کیا ہوا کہ درمیان میں وہ
رسا ٹوٹ گیا اور وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پہاڑی دریا میں گرے اور فوت ہو گئے،
اور ان کا نام و نشان تک نہ ملا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایک آدمی گھر
سے نکلا حجامت بنوانے کے لیے اور وہ ابھی سیلون میں داخل نہیں ہو سکا کہ ایک
اندھی گولی، امریکہ میں عام رواج ہے، اس کو آ کر لگی۔ ایک عورت جو بس
سٹاپ پر کھڑی اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی اور اس کی سہیلی کو کسی بندے
نے نشانہ بنایا ہوا تھا، سہیلی تو چلی گئی، نشانہ وہ معصوم عورت بن گئی جس نے روک
کر اسے پوچھا تھا کہ تمہارے بیٹے کا کیا حال ہے اور تم کہاں ہو۔ ایسا کیوں ہوتا
ہے؟ ایک بیوہ نے اپنا بیٹا بڑی آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ پالا تھا۔ ایک ہی
اس کا بیٹا تھا۔ پلا بڑھا اور جوان ہوا اور اس نے C.S.S کیا، وہ A.C لگا۔ ماں
کے ہاں تو شبِ برات ہو گئی۔ اس نے گھنٹی سنی اور وہ دروازہ کھولا، اور دروازے
سے اس کی لاش گھر آئی۔ کچھ ایسا ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ تو تھا لیکن یہ کہتا ہے
کہ ایک غالیچے کو آپ دیکھو، اس کے اوپر ایک پھول بنا ہوا ہوتا ہے اور بڑا خوب
صورت پھول ہوتا ہے جو آپ اتنے مہنگے بھاؤ اس کو خرید کر لاتے ہیں، لیکن اگر
آپ اس غالیچے کو اٹھا کر دیکھیں تو وہ کچھ لمبے دھاگے کچھ چھوٹے دھاگے بے

ہو دہ قسم کے دھاگے ایسے ہوتے ہیں، ان پر نگاہ ڈالنے کو دل نہیں کرتا۔ لیکن ہوتا ایسے ہی ہے کہ پھول بننے کے لیے کچھ ایسے عمل کی ضرورت ہے، جو کہ آپ کو غالیچے کے لیے درکار ہے۔ ہاں بہت اچھی بات ہے لیکن انسان بے چارہ کیا کرے، اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے وہ ایسی باتیں کرتا ہے، لیکن اس کو تسلی ہو نہیں سکتی۔ میکلیش (MacLeish) کا معروف ڈراما J.B جو حضرات ایوب (علیہ السّلام) کی زندگی کے بارے میں ہے۔

اور جسے پڑھ کر ہم نے سبقاً سبقاً بہت کچھ سیکھا ہے۔ شیکسپئر کے Play آپ کے سامنے ہیں۔

مغرب نے اس پر بہت کچھ لکھا، اور وہ کہتے ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جس کا کوئی فیصلہ، کوئی "تُک" نہیں بنتا، ایسا کیوں؟ لیکن ہوتا رہتا ہے۔ وہ جو علیم مطلق ہے۔ جو مالک ہے سب کا، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے، کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کوئی راز ہوتا ہے۔ تو پھر ہم پوچھتے ہیں، اس میں کیا راز ہے؟ کچھ ہم بھی تو دانش رکھتے ہیں، عقل رکھتے ہیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں، اگر کوئی چار پانچ سال کا بچہ اتفاق سے ہسپتال کے کسی تھیٹر میں چلا جائے، اور دروازہ کھلا ہوا ہو اور سرجن کام کر رہے ہوں ایک بندے کے اوپر، ان کے ہاتھ میں چھریاں، اور

نشتر پکڑے ہوں اور ان کے منہ پر ربڑ چڑھائی ہوئی ہو، ماسک وغیرہ، تو وہ چیخیں مارتا ہوا باہر نکلے گا اور کہے گا کہ ظلم ہو رہا ہے، اچھے بھلے آدمی کا پیٹ کاٹ رہے ہیں، چھریوں کے ساتھ۔ اے لوگو! جاؤ اور بچاؤ۔ تو کچھ ایسا ہی حال انسان کا ہے۔ وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ میری عقل و دانش کے مطابق ہے۔ میں نے جیسے پچھلی مرتبہ کہا تھا کہ چیونٹی جیسے ایک سمندر کو نہیں سمجھ سکتی، انسان اللہ کے راز، افعال اور اس کا کام اور قانون کو نہیں جان سکتا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نے ہمیں احکام دیئے ہیں۔ بڑی خوش قسمتی ہے۔ میں نے اپنے ایک پروگرام میں عرض کیا تھا کہ میں تو اس دنیا میں آگیا، اپنی مرضی کے خلاف حکم دیا کہ تم چلو، ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ یہاں آکر ایسے گھر میں پیدا ہو گیا جو غریب سا گھر تھا، میں امیر گھرانے میں پیدا ہونا چاہتا تھا۔ میری آرزو تھی کہ فرسٹ کلاس موٹریں ہوں، لیکن جہاں حکم ہوا، وہاں آگیا، اور میں جمعرات کو پیدا ہونا چاہتا تھا، ہفتہ کو پیدا ہو گیا۔ تاریخ مجھے یہ پسند نہیں تھی، ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک کیا۔ جب یہ برسا کوزہ (میں) بن گیا تو کوزہ گر (خدا) سے دست بدست پوچھا کہ اے کوزہ گر اس میں ڈالنا کیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔ میں تو بن کے یہاں آیا ہوں۔ تو پھر اس کی مہربانی ہے، اس کا کرم ہے کہ اس نے فرمایا کہ میں نے انسان نبی کے ذریعے سب کچھ جان چکنے، سمجھ لینے کے لیے ایک پروگرام، ایک فریم ورک دے دیا

گیاہے۔

تو کچھ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جن کو ہم بہت قریب سے جا کر دیکھتے ہیں۔ میں ان کو بڑے شوق سے دیکھتا ہوں، اور میں ان کو بابے کہتا ہوں کہ اللہ کے دیئے ہوئے احکام کو کس خوش دلی کے ساتھ اور کس محبت کے ساتھ مانتے ہیں، مانتے چلے جاتے ہیں۔ کوتاہی ہوتی ہے تو پھر اٹھ کر ماننا شروع کر دیتے ہیں۔

میں حرم شریف میں جب پہلی مرتبہ گیا، بڑی دیر کی بات ہے۔ جب حرم شریف کی شکل وصورت ایسی نہیں تھی جیسی اب ہے۔ ماشاءاللہ جب بھی پیاری تھی لیکن اس کے اندر سخت پتھر تھے۔ کھڑے ہونے کے لیے کچا راستہ تھا، وہاں پر زم زم کے پاس، کسی نے زم زم سے اپنی پگڑی دھو کے ان پتھروں پر ڈالی ہوئی تھی سوکھنے کے لیے۔ تو میں وہاں بیٹھا تھا۔ مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ حرم شریف میں کپڑے سوکھنے کے لیے، لیکن لوگ ڈالتے تھے، کہہ بھی کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ آدمی جب پگڑی سوکھی ہوئی اٹھانے کے لیے آیا، تو میں نے پوچھا، بھائی صاحب آپ کہاں کے ہیں؟ کہنے لگا، میں پاکستان سے ہوں۔ میں نے کہا، بڑی خوشی کی بات ہے۔ پگڑی سے اندازہ لگایا تھا کہ آپ وہیں کے ہوں گے۔ ویسے آپ کون سے علاقے سے ہیں؟ کہنے لگا، سائیں میں سندھی ہوں۔ میں نے کہا، بڑی برکت

والی بات ہے۔ چونکہ آپ مذہب کے بہت قریب ہوتے ہیں، بڑے ماننے والے لوگ ہوتے ہیں، اور ان میں بڑی محبت اور جذبہ ہوتا ہے، تو میں نے کہا، سائیں آپ یہاں کب سے ہیں۔ کہنے لگا، بابا میں تو اٹھارہ برس سے ہوں۔ تو میں نے کہا، آپ یہاں کیا کرتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کسی خاص پروجیکٹ کے ساتھ آئے ہیں۔ کہنے لگا، ہم ایسے ہی چل کے آگئے تھے یہاں رہنے کے لیے۔ صبح سویرے اٹھ کے منڈی میں بوجھ ڈھوتے ہیں۔ اس کے دو چار پانچ ریال مل جاتے ہیں۔ اس سے ہم اپنا روٹی کھانا کرتے ہیں۔ پھر ہم آ کے حرم میں بیٹھ جاتے ہیں اور اس پر نگاہ لگا کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ جب یہاں آجاتے ہیں اور حرم میں بیٹھتے ہیں تو آپ حرم میں کیا کرتے ہیں، یعنی ۔۔۔کہنے لگا، سائیں ہم گر پڑتے ہیں اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر گر پڑتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اٹھارہ برس سے۔ میں نے کہا، ” بہت خوش نصیب انسان ہیں جو گر بھی پڑے اور اٹھ کے کھڑا بھی ہو جائے۔ پھر گر پڑے، پھر اٹھ کے کھڑا ہو جائے۔ “تو یہ بڑی برکت کی بات ہے۔ ان ماننے والے لوگوں کی جو تسلیم کر لیتے ہیں اس بات کو، جو ہمیں فریم ورک عطا کیا گیا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ مناسب ہے اور اسی کے مطابق ہم زندگی کو بسر کریں گے۔

لیکن اس کے ساتھ انسانی کمزوری ہے۔ گرنے والا جو مقام آتا ہے تو وہ بھی ساتھ

چلتا ہے۔ اس وقت آدمی یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ میرے ساتھ، میرے دوستوں کے ساتھ، میرے عزیزوں کے ساتھ کیا ہوا؟ تو اس میں عزیزانِ گرامی، زیادہ کوتاہی اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان جو ہے، وہ بڑا بے صبرا اور ناشکرا ہے، اور اس کی خاصیت ہے۔

چھوٹے سے دھبے کو پھیلا کر نہ صرف اپنی زندگی پر، نہ صرف اپنے علاقے پر، بلکہ ساری دنیا پر محیط کر لیتا ہے اور اس کے دائرے کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو مصائب اور مشکلات اتنی ہی شدید ہوتی ہیں، جتنا کہ آپ نے ان کو بنا دیا ہوتا ہے، اور وہ آپ کی ساری میری زندگی ہے اور وہ برباد ہو گئی، تباہ ہو گئی۔ مجھے یاد آیا، آپ سے بات کرتے ہوئے ایک منگ بادشاہ کے عہد میں ایک غریب آدمی تھا۔ گاؤں کا رہنے والا۔ بہت ہی غریب آدمی تھا، لیکن تھا وہ صوفی آدمی۔ روحانیت سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ تو اس غریب آدمی کے پاس ایک خوب صورت گھوڑا تھا، اعلیٰ درجے کا گھوڑا۔ دنیا اسے دیکھنے کے لیے آتی۔ اس نے بڑے پیار کے ساتھ اپنے گھر کے قریب ایک چھوٹا سا اصطبل بنا رکھا ہوا تھا۔ اس کا عشق اور کچھ نہیں تھا۔ ایک گھوڑا ہی تھا اس کے پاس۔ بادشاہِ وقت کو پتہ چلا کہ ایک گھوڑا اس کے پاس ہے جو کہ بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو یہ حاصل کرنا چاہیے۔ تو بادشاہ اپنے حواریوں کے ساتھ امیروں، وزیروں کے ساتھ اس

کے پاس آیا۔ کہنے لگا، " اے فقیر مانگ کیا مانگتا ہے اس گھوڑے کے بدلے ؟"
اس نے کہا، "حضور یہ بکاؤ مال نہیں ہے۔ یہ شوق سے رکھا ہوا ہے۔ یہ بیچا نہیں جا
سکتا۔ یہ تو بیچنے والی چیز ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا، نہیں ہم تجھے منہ مانگی قیمت
دیں گے۔ اس نے کہا، نہیں جی میں نے بیچنا نہیں ہے۔ اس نے کہا، پھر غور کر
لے۔ ہم تجھے پرگنہ ایک ریاست دیں گے۔ اس کے بدلے ہمیں یہ گھوڑا دے
دے۔ وہ پھر بھی نہیں مانا۔ ضدی آدمی تھا۔ سودا چلتے چلتے معاملہ یہاں تک پہنچ
گیا کہ اس نے کہا، " آدھی سلطنت لے لے، گھوڑا مجھے دے دے۔" اس نے
کہا، " جناب عالی! میں نے بتایا کہ اس کا مول کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ بکنے والی چیز
ہوتی تو میں دے دیتا آپ کو، لیکن یہ بکنے والی چیز نہیں ہے۔" تو اس نے کہا، اچھا
تیری مرضی۔ جب بادشاہ چلا گیا تو گاؤں کے لوگوں نے کہا تو کتنا نالائق، بے
وقوف اور کتنا جاہل ہے کہ بادشاہِ وقت تیرے پاس آیا۔ اس نے آدھی سلطنت
آفر کی۔ اگر ظالم تجھے مل جاتی تو ہم بھی مزے کرتے۔ سارے گاؤں کے مزے
ہوتے۔ تو ہمارا بادشاہ ہوتا۔ ظالم تو نے یہ کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ کتنی بڑی خوش
نصیبی کو گھر آئے، دھکا دے دیا، باہر پھینک دیا۔ تو اس نے کہا، وہ عجیب و غریب
آدمی تھا۔ کہ میرا گھوڑا ہے، اس نے اس کا مول لگایا، میں نے نہیں دیا۔ اس میں
خوش نصیبی یا بد نصیبی کی کیا بات ہے۔ یہ تو میری زندگی ہے۔ میرا گھوڑا ہے۔

خوش نصیبی تم کدھر سے نکال رہے ہو۔ میں نہیں دیتا۔ انہوں نے کہا تو ضدی آدمی ہے۔ تو شروع ہی سے ایسا ہے اور تیرا مزاج ہی ایسا ہے۔ یہ کہہ کر چلے گئے۔

تھوڑے عرصے بعد کیا ہوا۔ صبح اٹھا چارہ ڈالنے کے لیے تو وہاں دیکھا کہ اصطبل خالی تھا۔ گاؤں کے لوگ آئے، روتے پیٹتے۔ کہنے لگے ہمارے گاؤں کا حسن تباہ ہو گیا۔ تجھ سے کہا تھا ناکہ بادشاہِ وقت کے ساتھ زور آزمائی نہیں کرتے۔ تیرا گھوڑا تیرے پاس نہیں رہا۔ تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا تو تباہ ہو گیا، برباد ہو گیا۔ اس نے کہا، میں کہاں سے تباہ ہو گیا۔ کہاں سے برباد ہو گیا۔ ایک گھوڑا تھا، چھوٹی سی چیز تھی۔ میری زندگی تو بہت بڑی ہے۔ یہ اس کا حصہ تھا۔ حصے کے اوپر میری ساری زندگی کو کیوں پھیلا کر کہہ رہے ہو، کہ چونکہ تمہارا گھوڑا چلا گیا، اس لیے تم برباد ہو گئے۔ معمولی سی بات ہے۔ انہوں نے کہا، نہیں تو بے وقوف آدمی ہے۔ تجھے اللہ نے عقل نہیں دی۔

وہ پھر واپس چلے گئے۔ کوئی ایک مہینہ گیارہ دن کے بعد اس کا گھوڑا ہنہناتا ہوا واپس آگیا۔ اس کے ساتھ گیارہ نئے جنگلی گھوڑے تھے۔ وہ کہیں بھاگ گیا تھا جنگل میں، اور جنگل میں جا کر انہیں سیٹ کرتا رہا اور وہ سارے اس کے عشق

میں مبتلا ہو گئے۔ تو گیارہ گھوڑے نئے، اعلیٰ درجے کے ساتھ لے کر آ گیا۔ جب اس نے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ انہوں نے رسے ڈال کر سب کو وہاں کھڑا کر دیا۔ گاؤں کے لوگ آئے۔ انہوں نے کہا "تو بڑا خوش نصیب ہے تیرا گھوڑا کھو گیا تھا اور دیکھ تجھے کمال کی چیز لا کر دی۔" اس نے کہا، میری کہاں خوش نصیبی ہے۔ گھوڑا تھا، چلا گیا تھا۔ واپس آ گیا۔ تو میری ساری زندگی کچھ اور ہے، اور تم ایک واقعہ پکڑ لیتے ہو۔ تم اتنے نالائق لوگ، سمجھتے نہیں ہو۔ تم آ کر کہتے ہو، کیا خوش نصیبی ہے۔ وہ جو گھوڑے جنگل سے آئے تھے اور وہ جنگلی گھوڑے تھے۔ اب ان کو سدھانا بڑا مشکل کام تھا۔ تو اس آدمی کا ایک اکلوتا بیٹا تھا۔ بہت پیارا، جی جان سے عزیز تھا۔ ایک باپ تھا، ایک بیٹا تھا۔ اس نے کہا، باپ یہ جنگلی گھوڑے ہیں۔ میں ان کو سدھاؤں گا۔ بریک ان کروں گا ان ہارس کو۔ چنانچہ اس نے ایک کو رسہ پھینک کر پکڑا۔ پکڑ کر اس کے منہ میں لگام دے کر اس کے اوپر چڑھا۔ چڑھ کے سب سے صحت مند جنگلی منہ زور گھوڑے سے گر گیا اور اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کا باپ آیا، اس کو اٹھا کر لے گیا گھر۔ گاؤں کے لوگ روتے پیٹتے آئے، تیری بدقسمتی ہے۔ تیرا ایک ہی بیٹا تھا تو مارا گیا۔ تباہ ہو گیا۔ برباد ہو گیا۔ ہم تو رونے، سیاپا کرنے آئے ہیں۔ اتنا جوان سال بیٹا اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب یہ تیرے کسی کام کا نہیں رہا۔ اس نے کہا، بھائی

اس میں میری بد قسمتی کدھر سے آ گئی۔ یہ میری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ایک بیٹا ہے۔ بیٹے کی ران ٹوٹ گئی ہے۔ مشکل آئی ہے تو ٹھیک ہے۔ تم مجھے سارے کے سارے کیوں کہہ دیتے ہو کہ تو تو مارا گیا، تو تو برباد ہو گیا۔ تیرے گھر میں بد نصیبی آئی ہے۔ تاؤ ایک مذہب ہے۔ اس کے پیرو کار بڑے وحدانیت کے قائل ہوتے ہیں۔ Oneness کے ماننے والے۔ تو یہ جو ٹوٹے آتے ہیں، ان کو نہیں مانتے۔ پوری زندگی کو مانتے ہیں۔ اب وہ بد نصیب باپ اور بد نصیب بیٹا اور ان کے بارہ گھوڑے رہ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد بادشاہ کی قریبی ہمسایہ بادشاہ سے جنگ لگ گئی اور گھمسان کا رن پڑا۔ جنگ طول اختیار کر گئی تو بادشاہِ وقت کو جبری بھرتی کی ضرورت پڑی۔ اس نے ڈنکا بجا دیا گاؤں گاؤں میں ڈونڈی پھیر دی اور جو نوجوان بچے تھے، ان کی زبردستی جبری بھرتی کے لیے وہ گاؤں میں آ گئے۔ جتنے خوب صورت تگڑے بچے تھے، ان کو کان سے پکڑ کر چلے گئے۔ اس کے بیٹے کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، وہ کسی کام کا ہی نہیں تھا وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس آ کر کہنے لگے، یار ہمارے تو پیارے بیٹے تھے، سب کو ہانک کر لے گئے۔ تو بہت اچھا رہا، خوش قسمت ہے۔ اس نے کہا، یار تم بندے اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ رہا جائے۔ یہ گاؤں ہی نالائق لوگوں کا ہے جو زندگی

کے چھوٹے سے حصے کو ساری زندگی پر پھیلا کر اس کا نتیجہ نکال دیتے ہیں۔ تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہارے درمیان نہیں رہوں گا اور میری اور تمہاری جدائی ہے۔

چنانچہ وہ اپنے گھوڑے اور بیٹا لے کر کسی اور گاؤں چلا گیا۔ اس کا یہ فلسفہ چینی فلسفہ ہے۔ دائرے کا ایک بہت بڑا حصہ بنا کر زندگی کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے اور اس کو آنکنے کے لیے، ایک فٹا لے کر اس کا دائرہ کارطے کرنے کے لیے۔ کبھی مت کہیے۔ آپ کی زندگی میں اگر کوئی برا واقعہ ہوا ہے۔ کوئی ایک دھبا آیا ہے کہ وہ ساری کی ساری آپ کی زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔ لیکن انسان کا یہ خاصا ہے کہ جب ذرا سی تکلیف پڑتی ہے تو وہ چیختا چلاتا ہے۔ جب ذرا سی خوشی کا لمحہ آتا ہے وہ اس کو بھی پھیلاتا ہے۔ کہ میں سارے کا سارا خوش ہو گیا۔ حالانکہ اس میں خامیاں، کمزوریاں، کوتاہیاں بدستور موجود ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ خوشی کا لمحہ آگیا ہو۔

مجھے آپ سے بات کر کے اچانک یاد آیا۔ میرا پوتا چھوٹا، وہ آرہا تھا، گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کے بازو پر بٹھایا۔ میں نے کہا، دیکھو یار کیسا اچھا موسم ہے ذرا دیکھ باہر نکل۔ اس دن موسم بہت اچھا تھا۔ ہمارے بڑے بڑے

شیشے تھے۔ آگے درخت لہلہا رہے تھے۔ پودے لگے ہوئے تھے بانس کے، جو زیادہ خوب صورت لگتے تھے۔ کالے سیاہ بادل تھے۔ ان کے اندر سے بادلوں کی قطاریں جا رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ میرے پوتے کو حسن و جمال میں دلچسپی ہو۔ وہ دیکھے اور اس کو پسند کرے بجائے اس کے کہ، وہ لکڑی کے اور پلاسٹک کے واہیات کھلونوں سے کھیلے، جن سے زیادہ قاتل اور حملہ کرنے والے ہیں۔ پتا نہیں، آج کل ان کو کیا کہتے ہیں، عجیب و غریب۔ ان سے کھیلتا رہتا تھا۔ جب میں نے اسے گود میں اٹھا کر کہا، دیکھو باہر کا منظر اور اس کا حسن، یہ بادل اور پرندے اور یہ درخت اور یہ لہلہاتی شاخیں، تو وہ بالکل نہیں دیکھ رہا تھا اور گھٹن سی اس کے اندر ہے، اور ایک ہی جگہ اس کی نگاہیں مرکوز ہیں، اور گھبرایا ہوا ہے، اور میری گود میں چڑھا ہوا ہے۔ میں نے جب اس کی نگاہوں کو غور سے دیکھا تو وہ شیشے کے پار ہی نہیں جا رہی تھیں۔ میں نے کہا، یہ کیا مسئلہ ہے۔ اتنا معصوم بچہ اور یہاں پر پھنسا ہوا ہے۔ تو خواتین و حضرات! میں نے دیکھا کہ وہ جو بڑا سا شیشہ، جس میں سے میں اسے جمال اور خوب صورتی سے متعارف کروا رہا تھا، اس شیشے کے ساتھ ایک مری ہوئی مکھی چپکی ہوئی تھی۔ مر گئی ہو گی کب کی۔ جیسے ہم کہتے ہیں چھی چھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ساری کائنات چھوڑ کر سارا حسن و جمال چھوڑ کر اپنی نگاہیں اس چھی چھی پر مرکوز کی

تھیں، اور منہ بسور کے بیٹھا ہوا تھا کہ یہ دنیا جو ہے ساری کی ساری، چھی چھی ہے، اور مری ہوئی مکھی ہے اور وہ نالائق چیز ہے اور میں ان ساری چیزوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا جن سے میر ادا کرنا چاہتا ہے۔

تو جب مشکلات اور مصیبتیں آتی ہیں، تو اگر آپ غور سے دیکھیں کہ ان کا ایک حصہ بالکل چھوٹا سا فریکشن، آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن ہم نے وہ دھبا پھیلا کر اتنا وسیع کر لیا ہوتا ہے کہ پھر وہ اپنے ہمارے اختیار میں نہیں رہتا، اور وہ پھر پھیلا ہوا دھبا ہمارا حکمران بن جاتا ہے، اور جہاں جہاں چاہتا ہے، ہم کو اٹھائے پھرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مرتبہ کہا، اگر اللہ کی ذات اور اس کے افعال کو جاننے کی آرزو ہے تو پھر اس کے احکام کے اندر داخل ہونا پڑے گا، اور اس فریکونسی کو حاصل کرنا پڑے گا جس فریکونسی کو پکڑ کر، اچھی طرح سے اختیار کر کے ہم ان افعال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

مایوسی

یہ جو مایوسی کا بھنور ہوتا ہے۔ یہ بڑا ظالم گرداب ہوتا ہے۔ اس کے کنارے کنارے پر آدمی چلتا رہے تو بچنے کی کچھ امید ہوتی ہے۔

لیکن جب بہت گہرا اتر جائے تو بچنے کی کوئی آس باقی نہیں رہتی۔ میں ابھی ایک ایسی محفل سے اٹھ کر آیا ہوں جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہے تھے، اور ان کے اندر مایوسی اور نا امیدی کی ویسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جیسی کہ کسی زمانے میں جب ہم ان کے ہم عمر تھے، ہمارے اندر پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے زمانے میں چونکہ کوئی Psychiatrist ، کوئی ڈاکٹر، کائی ماہر نفسیات نہیں تھے ، اس لیے ہم اپنے دکھ کا مداوا کرنے کے لیے ان بڑوں کی طرف بھاگتے تھے جن کے پاس کوئی ایسا پوشیدہ نسخہ ضرور ہوتا تھا، جس کو آپ ہمارا "بابا" کہہ لیں، تو وہ ہماری مشکلات کے حل ڈھونڈ کر ہمیں دے سکتے تھے۔ جب ہم بابوں سے پوچھتے تھے کہ آپ ایسا نسخہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟ تو وہ کہتے تھے کہ آپ بھی یہ فن، طب روحانی کا علم سیکھ سکتے ہیں کیونکہ نسخہ سائل کے پلے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو صرف کھولنا ہوتا ہے اور اس کے

حوالے کر دینا ہوتا ہے۔ آدمی اس کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے، تکرار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ڈائیلاگ میں شریک ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے پلو میں بندھا نسخہ کھولنا مشکل ہو جاتا ہے، اور اس کا پھر کوئی علاج نہیں ہو پاتا۔ ہم بڑی گہری مایوسی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا، آپ کو کم از کم مایوس ہونے ناامید ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ لوگ جو آپ سے پہلے گزر گئے یا جن کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا، جن کے بارے میں لوگ جانتے نہیں ہیں یا جن کا صفحہ ہستی پر کوئی مواد تحریر نہیں، ان کو تو مایوس ہونے کا حق ہے، لیکن آپ کو حق نہیں ہے۔ میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ جو ہیں، آپ کے جو بڑے پر دادا تھے وہ پورس کی فوج میں ملازم تھے اور وہ سکندر اعظم سے لڑے، اور انہوں نے بڑی داد شجاعت دی اور ان کا ایک بازو کٹ گیا، لیکن زندہ و سلامت گھر پہنچے، اور ان کے گھر جو بیٹا پیدا ہوا، اور اس کٹے ہوئے بازو والے سورما کے گھر میں جو آپ کا جبڑ دادا تھا، وہ اس دنیا میں آیا اور زندہ رہا، سلامت رہا۔ اس کی نسل آگے چلی اور آپ کا جو سکڑ دادا تھا، وہ پانی پت کی دوسری لڑائی میں شامل ہوا۔ اور خوب بے جگری کے ساتھ لڑا اور فاتح ہو کر واپس آیا، لیکن اس کے گھر جو بچہ پیدا ہوا، وہ جوان، توانا، خوبصورت تھا، اور وہ طاعون کے ہاتھوں مارا گیا، لیکن اس کے گھر ایک بچہ پیدا ہو چکا تھا، جو آگے پھلتا پھولتا رہا، اور آپ کے جبڑ

دادا کے متوازی ایک اور آپ کا گھگر نانا تھا جس کے گھر ایک عورت، بیٹی پیدا ہوئی جس کی شادی اس پورس والے سے ہوئی۔ ایک سسٹم بنا کے لا رہے ہیں۔ کہتے ہیں قدرت گھیر گھیر کے ان کو زندہ سلامت رکھ رکھ کے آپ کو یہاں تک اس ڈیٹ تک لائی ہے، اور وہ لوگ جو قدرت کو منظور نہیں تھے جنہیں وہ زندہ نہیں رکھنا چاہتا، وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی نیست و نابود ہو گئے۔ ان کے والدین پہلے مر چکے تھے، ختم ہو چکے تھے، نابود ہو چکے تھے۔ آپ جو اس دنیا میں میرے ساتھ موجود ہیں، تو آپ نہایت محترم، نہایت اعلیٰ نہایت سپیریئر نہایت Strongنہایت Important لوگ ہیں۔ ورنہ قدرت ایسی غلطی ایسی حماقت کبھی نہیں کرتی، اور آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا، آپ مایوس ہوں اور اس نعمت کا شکر اس طرح سے ادا کریں جیسے کہ آپ کرتے ہیں۔

ہمارے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ انہوں نے کہا آپ اتنی ارفع قوم ہیں، اور آپ کے ارد گرد چلنے والے یہ ٹانگے والے، یکے بان، ویلڈنگ کرنے والا، یہ ترکھان، یہ لوہار، یہ پروفیسر، یہ ڈاکٹر یہ سارے کے سارے اگر یہ موجود ہیں، اگر آج ہیں، تو قدرت چھانٹ چھانٹ کر ان کو لائی ہے، اور کچھ لوگوں کو اپنی چھلنی میں سے گزارتے ہوئے لے آئی، تو آپ کیسے مایوس ہو گئے۔ بڑی بے حیائی کی بات ہے اگر آپ مایوسی میں، ناامیدی میں، یا نامُرادی میں داخل ہوں۔

ہم نے کہا، لیکن ہم تو ہو جاتے ہیں، اور کوئی لمحہ ہم پر ایسا نہیں گزرتا کہ ہم مایوس نہ ہوں، گھبرائے نہ ہوں۔ باوجود اس کے کہ اللہ بار بار فرماتا ہے۔ میری رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اس میں بڑا کوئی راز ہے تو فرمایا ہے، فرمانے والے نے کہ چونکہ آپ کی زندگیوں میں خواہش، آرزو، Desire اتنی گہری اتر چکی ہے اور آپ سوائے مایوسی کی بیٹری کا چارج لینے کے، اس Desire کو رکھ لیتے ہیں، کیونکہ ہر لمحہ آپ کے اندر کسی نہ کسی شئے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور وہ ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے آپ مایوسی کے ساتھ چلیں گے۔ جب خواہش کم ہوتی چلی جائے گی، اور آپ کی وہ جائز Desires آپ کے ساتھ رہیں گی جو کہ رہنی چاہئیں پھر آپ کو کبھی مایوسی نہیں ہو گی۔ آپ ایسے ہی پھریں گے جیسے ایک بلبل ہوتا ہے، جس طرح ایک چڑیا چہچہاتی ہے۔ آپ کو پتا ہے، بابے کہتے ہیں کہ بلبل کو پتا نہیں ہوتا کہ موت آرہی ہے۔ وہ گانا گارہی ہوتی ہے، اور موت آجاتی ہے۔ آپ ہر روز مرتے ہیں، ہر روز خوفزدہ ہوتے ہیں۔ خوف کے مارے آپ کا دم ہر وقت سے پہلے ہی نکلا ہوتا ہے، بلکہ "Every moment every day you keep on them" چڑیا کو اس کا نہیں پتا، گھوڑے کو نہیں پتا، شیر کو نہیں پتا۔ وہ بڑے مزے سے آزادی کے ساتھ چلے جاتے ہیں، لیکن ان کے اندر یہ Desire نہیں ہے جو ہمارے اندر اشتعال پیدا کرتی ہے۔ یا ہمارے اندر تصوّر

پیدا کرتی ہے۔ یہ تصویر ہمارے ہاں منع ہے، اور عام طور پر سمجھ دار سیانے، بڑے کہتے ہیں۔ یہ کیوں منع ہے؟ تصویر آپ کے اندر خواہش، اور انگیخت پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مجھ سے پوچھتے ہیں میرے بچے کہ بابا تصویر اگر آپ کہتے ہیں، نہیں چاہیے۔ تو ہم پاسپورٹ پر کیا لگائیں گے؟ میں نے کہا وہ تصویر نہیں ہے۔ وہ تمہارے دستخط ہیں، وہ تمہارے تصویری دستخط ہیں۔ یہ وہ تصویر نہیں ہے جو ان رسالوں میں چھپتی ہے جن کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ تصویریں آپ کو مایوس کرتی ہیں۔ بہت خرابیاں گناتی ہیں۔ اگر ان سارے رسالوں سے جو آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔ آپ کے گھروں میں بھی ہیں میرے گھر میں بھی ہیں، پڑے ہوئے ہیں۔ بہت بہت رنگین چیزیں ان میں ہوتی ہیں۔ ایک لمحے کو سوچیئے ان میں رنگین تصویر بھی نکل گئی، اور صرف متن رہ گیا تو آپ کی زندگیوں میں سے میری کیلکولیشن (Calculation) کے مطابق، میری سوچ کے مطابق، آپ کی زندگیوں میں سے 50،60 فیصد ناامیدی اور مایوسی کم ہو جائے گی۔

خیر یہ بات عرض کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ہمارے ساتھ اتنی ساری کالک کیوں لگ جاتی ہے۔ جب ہم اٹھتے ہیں تو اندر باہر کالک لگی ہوتی ہے۔ کہنے لگے اس کالک کو دور کرنے کا فن آپ کو آنا چاہیے۔ اس کے سیاہ دھبے زندگی پر حاوی ہوتے

رہتے ہیں۔ کس طرح سے؟ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں آپ نے بھی محلوں، گلیوں میں وقت گزارا ہو گا، ہمارے محلے میں دیگچیاں قلعی کرنے والا ایک شخص آیا کرتا تھا۔ وہ عین گلی کے اندر اڈا جما کے گیلی مٹی لگا کے دھونکنی فٹ کر کے اپنے چمڑے کو باندھتا۔ وہ ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا، ہم سکول جانے کی بجائے اس کے گرد کھڑے ہو جاتے۔ کالی سیاہ دھونکی۔ کوئی دیگچی جن کی شکل دیکھنا آپ گوارا نہیں کرتے، ان کو ذرا سا دھو کر کوئلوں کے اوپر لٹا کر سوکھنے دیتا۔ دھونکی سے ہوا دے کر وہ قلعی کے ساتھ قلعی کی ایک جھریٹ خراش دیتا تھا، اور اس کے پاس ایک لوگڑ ہوتا تھا جس کو نوشادر کے ساتھ لگا کر وہ اس کا مانجھا دیتا تھا، اور دیگچی دیکھتے دیکھتے بقعۂ نور بن جاتی، اور جی چاہتا کہ آدمی اس کو دیکھتا رہے، اور دیر تک دیکھتا رہے۔ ہماری ساری کالک جو ہے، وہ یوں دور ہو سکتی ہے کہ میں کہوں، اے اللہ میں اس سیاہی کو شکریہ کے برش کے ساتھ، اور شکر گزاری کے لوگڑ کے ساتھ، جس کے ساتھ نوشادر لگا ہے، میری تسلیم و رضا کا، میں اس کو چمکا سکتا ہوں، اور میں ان کو اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں، جہاں پر اور چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ انسان بہت کچھ جاننے کے باوصف شدید احساس کمتری میں رہنا پسند کرتا ہے۔ میں، اور آپ، اور ہمارے جو ساتھی زندہ سلامت ہیں، جن کو احساس کمتری میں اترنے کا حق نہیں پہنچتا، جو

احساس کمتری میں خود اترتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ خواہشیں پوری ہوتی ہیں، کچھ نہیں پوری ہوتیں، اور زیادہ بھی آدمی پوری نہ کر سکے تو کوئی بات نہیں، لیکن تھوڑا سا مُسکرا تو سکتا ہے۔ مثلاً آپ بہت اعلیٰ درجے کے صابن سے نہیں نہا سکتے تو لال صابن ہے نا تو اس سے نہا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خرابی کی بات نہیں ہے، لیکن جب آدمی مجبور کرتا ہے، اور اس کے ساتھ والے جب مجبور کرتے ہیں کہ دیکھو تمہارے پاس یہ ہے۔ اس نے کہا، تم تو کنگلے ہو۔ وہ ڈرتا رہتا ہے، کانپتا رہتا ہے، خوف زدہ رہتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بہت ساری صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کو سہارا بنا کر وہ بری آسانی کے ساتھ ان لوگوں کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔ اپنے وجود سے، اپنے ہونے سے، اپنی Entities سے۔ کہ دیکھیے! یہ بات میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جو آپ کرتے ہیں۔ اب میں جانتا ہوں، زندگی میں، مایوسی میں، ناامیدی میں اگر بہت زیادہ تاریکی ہے۔ اگر ہم یہ پروگرام دیکھیں اور اس کے بعد سو جائیں گے۔ پھر ایک بڑی کالی ساہ رات ہم پر چھا جائے گی، اور پھر اس کالی سیاہ رات کے اس کنارے سے اس کے کنارے کے اندر سے روشنی کی ایک کرن پھوٹے گی۔ وہ روشنی کی کرن ابھی پہنچی نہیں ہو گی کہ میرے گھر کے پاس نیم کے درخت میں ایک بلبل گھونسلے میں بیٹھی ہے۔ وہ اپنی گردن پیچھے اکڑا لے گی۔ ابھی روشنی نہیں پہنچی، اور وہ چہچہانا شروع کر

دے گی۔ پتا نہیں اس کا کیا کنکشن ہے اس کے ساتھ۔ میں اکثر غور سے دیکھتا ہوں۔ ابھی روشنی آئی نہیں ہے لیکن وہ ہدہد ہے، بڈھا ہو گیا ہے۔ پاکیزہ، نیک لمبی چونچ والا گردن کو پیچھے کھینچتا ہے، اور اس کے بعد چہچہانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی چہچہاہٹ کے ساتھ ہی پھر اس کے دوسرے ساتھی شریک ہو جاتے ہیں چہچہانے میں۔ جیسے مایوس آدمی کی محفل میں بیٹھ ہوئے لوگ بھی ناامیدی مایوسی کے گہرے سمندر میں اترنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن اگر آدمی تگڑا ہو، اور یہ سمجھے کہ میں اتنا لمبا سفر طے کر کے، اتنی مشکلات سے اتنی بیماریوں کو پھلانگتا ہوا، سمندروں کو عبور کرتا ہوا پہاڑوں کو چیرتا ہوا، بے شمار جنگوں میں شریک ہوتا ہوا، نسل در نسل پیڑھی در پیڑھی یہاں تک پہنچا ہو تو میں نہایت اہم ہوں۔ میں نہایت قیمتی چیز ہوں۔ میں اور آپ یقین کریں، اور جتنے آدمی آپ بھی بیٹھے ہیں، اور آپ جو اس پروگرام کو دیکھ رہے ہیں، اتنے قیمتی ہیں۔ آج اگر آپ کاغذ لے کر Calculation کریں تو اپنے فیملی شجرہ نسب ہونے کے باوصف پیچھے چلتے جائیں تو پھر آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کتنے اہم ہیں۔

ہمارے وہاں روم کے پاس ایک جھیل تھی "لاگو براشانو" اسے کہتے تھے۔ بڑی خوبصورت جھیل تھی۔ لوگ وہاں سیر و تفریح کے لیے جاتے تھے۔ ہم کو بھی جب دو تین چھٹیاں اکٹھی ہوتی تھیں تو وہاں پہنچ جاتے تھے۔ ایک دن موسم گرما

میں بڑی اچھی ہوا چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ وہاں آئے ہوئے تھے اور اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں اٹالین لوگ بہت موج میلا کرتے ہیں۔ ایک نوجوان تھا، بڑا اچھا خوبصورت سا۔ وہ کشتی کے پتوار پر چڑھ کر کچھ ڈانس سا کرنے لگا۔ کشتی ڈگمگائی، اور ڈولی، اور وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ جھیل میں گر گیا۔ اب اس کو تیرنا نہیں آتا تھا تو اس نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ اس کو میں نے بھی دیکھا لیکن ہم لوگ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ بھئی خطرے کا معاملہ ہے، ہم اس میں خوامخواہ کیوں پڑیں تو میرے ساتھ باسٹھ تریسٹھ سال کا ایک بڈھا بیٹھا تھا۔ میں اس وقت جوان تھا۔ میری 27 برس عمر تھی۔ اس نے کوٹ اتارا، اپنی پینٹ سمیت، اور بوٹوں سمیت اس نے چھلانگ لگا دی، اور میں نے اپنی چالاکی لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنے بوٹ کے تسمے کھولنے شروع کر دیئے تا کہ تھوڑی سے شمولیت میری بھی رہے۔ لوگ کہیں گے اچھا آدمی ہے، لیکن مجھ سے بوٹ کے تسمے کھل نہیں سکے۔ اس نے اس کو جا پکڑا۔ الحمد للہ اس کا سر وغیرہ اندر نہیں گیا تھا، بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کو ٹھوڑی کے نیچے دیتے ہوئے وہ بابا تیرتا ہوا اس کو کشتی کے پاس لے آیا، اور لا کر اس کو سہارے سے کشتی میں داخل کر دیا اور بیٹھ گیا۔ ہم نے بڑے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ اب وہ جو گرنے والا تھا، وہ بڑا شرمندہ ہوا، اور پریشان بھی تھا۔ خوفزدہ بھی تھا، تو اس

نے بڑی دبی ہوئی مری ہوئی آواز میں کہا، میں آپ کا بڑا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اتنی بڑی فیور کی ہے۔ مجھے بچایا۔ تو اس بابے نے کہا، No, No, No۔ یہ کیا بات تم نے کی، کچھ نہ کہو مجھے۔ اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہو ہی اتنے قیمتی کہ جب تم گرتے کوئی بھی تمہیں بچاتا۔ اس میں کیا بات ہے شکریہ ادا کرنے کی۔ تو مجھے آج آپ سے باتیں کرتے ہوئے یہ واقعہ یاد آگیا، تو وہ بابا بیٹھ کے آرام کے ساتھ اپنے کپڑے سکھاتا اور نچوڑتا رہا۔ اپنا Underwear زیر جامہ، اور بوٹ کھول کے سکھاتا رہا۔ تو جب آپ کے ذہن میں یہ بات طے پا جائے کہ ہم جب اتنا لمبا سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ کسی بھی صورت میں کسی بھی حالت میں کسی بھی صحت کے ساتھ کسی بھی شکل کے ساتھ کسی بھی رنگ و روپ کے ساتھ تو پھر ہم اہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کی بڑی توقیر فرمائی ہے۔ اور بہت عزت عطا کی ہے۔ یہ غالباً شیطان ہے جو آدمی کو مایوس کرتا رہتا ہے، اور وہ بہت ٹھیک ٹھیک اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے لیکن اگر آدمی کو اپنے آج کے اوپر پورا بھروسا ہو، اگر وہ آج سے اپنے صبحانے والے کل، اپنے Tomorrow کو اپنی گرفت میں اچھی طرح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، پھر اس پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے۔ مجھے صبحانے کا لفظ اس لیے پسند ہے کہ میں سندھ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ سندھ ہمارا ایک بہت

پیاراصوبہ ہے۔ اس کے لوگ بڑے پیارے میٹھے لوگ ہیں۔ اچھے سائیں لوگ
گانے بجانے والے، ادب کرنے والے۔ میں نے وہاں بڑا وقت گزارا ہے۔ تھر
پار کر میں۔ میں انہیں آج بھی یاد کرتا ہوں۔ میرے دوست جو مکھی نہال چند پتا
نہیں کیسے ہوں گے، کاپری خان تھے۔ انہوں نے مجھے بڑی محبت دی۔ میں اس کا
بدلہ نہیں دے سکتا۔ میں کبھی کبھی ایسے الفاظ ڈھونڈ کے استعمال کرتا ہوں۔ "
صبحانے" ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں آنے والی کل۔ ہمارے پاس چونکہ نہیں
ہیں اردو میں۔ میں صبحانے لفظ استعمال کرتا ہوں۔ آنے والی کل میں، اور یہ اپنے
جلو میں، اور اپنی جھولی میں بہت ساری خوشیاں، ڈھیر ساری نعمتیں لے کر تیار
رہتی ہے لیکن آدمی صبحانے سے آنے والی کل سے خوفزدہ ہو جائے تو اس کی
جھولی میں وہ کچھ نہیں پڑتا جو کچھ پڑنا چاہیے۔ میں ابھی یہاں آنے سے پہلے ایک
بڑا اچھا سا سیب کھا رہا تھا سیب کھا چکنے کے بعد بڑی براق اور سفید طشتری میں
اس کا ایک بیج، سیب کا بیج بڑا چمکدار سا ہوتا ہے، مجھے بڑا اچھا لگا۔ میں اسے بڑے
غور سے دیکھنے لگا تو میں نے کہا، دیکھو بی بی یہ تو بیج ہے۔ اس میں صبحانے کا سیب
پوشیدہ ہے۔ ایسی باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگی، آپ کون سے سیب کی بات کر رہے
ہیں۔ اس میں تو تین چار سو سیب پوشیدہ ہیں، یہ آپ کس سیب کی بات کر رہے
ہیں۔ میں نے کہا یہ اچھی بات ہے کہ اس آنے والے کل کے لیے اپنے آپ کو

تیار کرنا ہے۔ اور مایوسی کی بات یہ ہے کہ اس میں سے نکلنے کے لیے بہت ساری چالاکیاں اختیار کی جا سکتی ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں، اور میرے بابوں نے یہی بتایا ہے کہ اگر آپ اپنی خواہش کو، اپنی آرزوؤں کو، ذرا سا روک سکیں، جس طرح آپ اپنے ڈوگی کو کہتے ہیں، تم ذرا باہر دہلیز پر ٹھہرو، میں اپنا کام کر تا ہوں۔ پھر میں تمہیں لے چلوں گا۔ تو Desire کو سنگلی ڈال کر چلیں، اور Desire کو جب تک آپ پیار نہیں کریں گے، کتے کی طرح سنگلی ڈال کر سیر نہیں کروائیں گے۔ اسے نچائیں گے نہیں، اس کو گلستان کی سیر نہیں کروائیں گے، وہ چمٹ جائے گی۔ آپ اس کے ساتھ اٹیچ رہیں۔ ایک آپ، اور ایک آپ کے محبوب کے درمیان اور ایک چھوٹی سی سنگلی ہوتی ہے، اور ایک عجیب طرح کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کی Desire اور آپ کے درمیان ایک فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس کو کھلائیں، ساتھ ساتھ رکھیں، لیکن Desire کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔ یہ سب سے ضروری اور مشکل امر ہے، اگر آپ شروع کر دیں سنگلی تو پھر کوئی مشکل بھی نہیں۔ ایک Pet کی ایک لمبی کہانی یاد آئی تھی۔ پھر کسی وقت عرض کروں گا، لیکن اس کا گہرا تعلق Desire ، سے انسان سے انسان کی ذات سے ہے۔ کسی طرح سے وہ پالتو جانور آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ

حافظ۔

صاحبانِ علم

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔ جن بابوں کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں، اور جن میں خاص طور پر بابا نور والے کا ذکر رہتا ہے۔ ان کے بات کرنے کا اندازہ، اور بات کو سمیٹنے کا، پیش کرنے کا جو رویہ تھا، عام لوگوں سے بے حد مختلف تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں، ان کی باتیں کوٹ ایبل کوٹس، افورسیزم کا درجہ رکھتی تھیں۔ مثلاً کہا کرتے تھے: جو خیر کو قبول نہیں کرے گا، خیر اس کے گلے پڑ جائے گا۔ کہتے تھے: نماز کی قضا ہے، خدمت کی قضا نہیں۔ پھر ایک اور اسی طرح لمبا بیان جس کے اوپر ہم ذرا الجھ گئے تھے، اور اب میں اس الجھن سے تھوڑا سا آزاد ہوا ہوں، وہ یہ تھا: بھیجنے والے نے انسان کو کسی کام کے لیے، کسی عمل کے لیے بھیجا ہے، صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو عمل سمجھتے ہیں، وہ عمل کے لیے دیا گیا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب یہ بڑی بوجھل سی بات تھی۔ ہم لوگ جو لکھنے لکھانے والے تھے، پڑھنے پڑھانے والے تھے، ان کے لیے گویا یہ ایک بم، شیل تھا۔ لیکن ایمانداری سے سوچا جائے، اس پر غور کیا جائے۔ ڈیرے پر بیٹھ کر اس قسم کی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ جس قسم کی ہم ٹی وی پر بیٹھ کر یا پروگرام میں یا یونیورسٹی کی کلاسوں میں یا کالج

کے کمروں میں کیا کرتے ہیں۔ ہم نے اس پر غور کیا، اور غور کرنے والوں میں حبیب جالب مرحوم بھی تھے۔ وہ بھی وہاں آیا کرتے تھے، اور خاص طور پر صفدر میر، وہ بھی مرحوم ہو گئے ہیں، وہ بحث میں شریک تو نہیں تھے لیکن موجود تھے۔ پھر ہمارے ساغر صدیقی۔ سوچتے سوچتے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جو ریٹ آف لٹریسی، ہماری شرح تعلیم ہے، اور اس کے بارے میں ہم نے قول فیصل دیا ہے کہ شرحِ تعلیم 17۔18۔20۔21 فیصد ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے۔ تو بابا جی نے کہا کہ جس تعلیم کو یا جس علم کی شرح آپ یہاں محدود کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق پاکستان میں شرحِ تعلیم جو ہے، وہ 90 سے 92 فیصد ہے۔ اب یہ ایک عجیب و غریب بات تھی۔ انہوں نے کہا جب آپ تعلیم کو جانچتے ہیں، آنکتے ہیں، بیٹھ کے تولتے ہیں تو آپ صاحبانِ علم کو نہیں لیتے، صاحبانِ قلم کو لیتے ہیں۔ اور صاحبانِ علم میں، اور صاحبانِ قلم میں آپ تخصیص کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کو ملا کر رکھنا چاہیے۔۔۔

صاحبانِ علم میں وہ سارے لوہار، ترکھان، ویلڈر، ٹیکنیشن، دھوبی، اعلیٰ درجے کے درزی خاص طور پر شامل ہیں۔ اسی طرح گاڑی والے سب لوگ شامل ہیں، کیونکہ ان کے پاس اپنا ایک علم اتنی شدت، اور اتنی ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے جس طریقے کا دوسرا علم۔ لیکن ہم لوگ صرف اہلِ قلم کو یا حرف شناس کو

ہی صاحبانِ علم سمجھتے ہیں۔ یہ زیادتی کی بات ہے تو وہاں سے کچھ متاثر ہو کر جب میں آیا، گھر پہنچا تو میں نے اپنی بیوی (بانو قدسیہ) سے بات کی۔ انہوں نے کہا لا حول ولا قوۃ یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ صاحبانِ علم تو ہم ہیں، کیونکہ لکھتے ہیں، ہم رائٹر، ہم ادیب ہیں۔ ہماری تو کتابیں چھپتی ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ایک بڑھئی جو ہے، وہ بھی ایسا ہے تو وہاں ہمارے ایک پرنسپل صاحب بیٹھے تھے جو کہ اب بھی ایک بہت بڑے کالج کے پرنسپل ہیں۔ اشفاق یہ بالکل زیادتی کی بات ہے، انہوں نے کہا۔ ہم ان کو کیسے صاحبانِ علم کہیں۔ میں نے کہا، آپ کا کیا شعبہ ہے۔ انہوں نے کہا، کیمسٹری۔ وہ کیمسٹری کے پروفیسر تھے۔ میں نے کہا، دیکھیے پروفیسر صاحب اگر کیمسٹری کے شعبے کے، اور آپ کی لیبارٹری کے دروازے خراب ہو جائیں، اور آپ انہیں تبدیل کرنا چاہیں تو آپ کس کو بلائیں گے تو جب وہ کارپینٹر آئے گا، اس کا جائزہ لے گا تو وہ کہے گا، دیکھیے یہ تین دروازے ہیں، آپ ڈھائی مکسر لکڑی منگوالیں۔ اب آپ کا سارا کالج بتا دے کہ ڈھائی مکسر لکڑی کتنی ہوتی ہے۔ وہ ایک پورا علم ہے نا اس کا۔ اب جب وہ ڈھائی مکسر لکڑی کہہ چکے گا تو پھر کہے گا۔ پرنسپل صاحب چونکہ یہ دروازہ اندر کے ہیں، اور ان کو بارش کا پھانڈا یورش نہیں ہو گی، اور جب ہم یہاں دیار لگانے کے بجائے پڑتل استعمال کریں گے تو بہتر ہے کہ آپ ڈھائی مکسر لکڑی پڑتل کی

منگوالیں، اور جب آپ کا اکاؤنٹ آفیسر جانے لگے گا تو پھر وہ کہے گا۔ یہ پورے چھے فٹے کا دروازے نہیں ہیں، ساڑھے پانچ فٹ ہیں۔ اس لیے آپ شہتیری نہ لیں، پھاڑالے لیں۔ تو یہ کچھ Terms ہیں، پورے کا پورا علم ہے۔ وہ آپ کے دیکھتے دیکھتے ان چوکھٹوں کے دروازے چڑھا دے گا تو وہ صاحب علم ہے یا نہیں۔ کہنے لگے ہم تو صاحبِ نہ کہیں گے لیکن ہم اسے فن کا ماہر کہیں گے۔ ویسے آپ بھی اپنے فن کے ماہر ہیں، وہ بھی ہے۔ آپ اسے تسلیم کریں۔ لیکن ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل تھا۔

پھر تھوڑے دن ہوئے، میں یہ بوجھ لے کر، یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ ایک یہاں پر ہماری محفل تھی۔ ایک ہوٹل میں تو حکیم سعید مرحوم کیا کرتے تھے۔ وہاں بڑے دانش مند لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ وہاں میں نے کہا، یہ ایک مسئلہ ہے۔ آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم ہے؟ تو وہاں ایک جج صاحب ریٹائرڈ تھے۔ کہنے لگے اشفاق صاحب! آپ خدا کا خوف کریں۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک معمار، مستری، راج، چنوائی کا کام کرنے والا صاحبِ علم ہے۔

میں نے کہا، جناب میں ان کو صاحبِ علم نہیں کہتا۔ میں ان کو آپ کے، اور اپنے

برابر سمجھتا ہوں۔ وہ اتنی تعلیم کا مالک ہے جتنے ہم ہیں۔ کہنے لگے خدا کا خوف کریں۔ بڑے پریشان ہوئے۔ کہنے لگے، آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ وہ کیسے اس درجے میں آسکتے ہیں؟ میں نے کہا، دیکھیے جج صاحب پاکستان میں جتنی بھی ہائی کورٹس ہیں، ان کے نیچے بیٹھنے والے جج جن چھتوں کے نیچے بیٹھتے ہیں جو ان پڑھ مستریوں نے بنائی ہوئی ہیں، اور آپ اپنے فیصلے لکھتے ہیں۔ آپ ان کو کہاں پلیس کریں گے۔ خدا کا خوف کریں۔ کہنے لگے چلیے یہ بات ہے تو ٹھیک ہے لیکن یہ بڑا مشکل ہے، اس کو اس حد تک برداشت کرنا۔ پھر انہوں نے کہا دیکھیے میں آپ کو یہ رعایت دیتا ہوں۔ پروفیسر کہنے لگے، آپ ان کو Skilled Labour کہہ لیں۔ میں نے کہا، آپ انہیں ٹیکنیشین کہیں۔ جب بھی آپ بات کرتے ہیں، بڑے بڑے مضمون لکھتے ہیں۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں۔ سائنس تک آپ پہنچتے ہیں۔ ٹیکنالوجسٹ تک آپ نہیں پہنچتے تو پھر اس ملک کا کیا بنے گا۔ ہاں کیوں کہیں گے ان کو Skilled Labour کیوں کہیں گے؟ کہنے لگے، نہیں۔ اس بات پر کچھ دیر جھگڑا چلا۔ وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے اشفاق صاحب دیکھیے اتنی رعایت آپ کو دے دی ہے کہ Skilled Labour کہہ لیں۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کے خوب صورت ہسپتال کے اندر جہاں آپ ہارٹ کا بائی

پاس کرتے ہیں۔ اس کے باہر ایک ویلڈر رہے۔ وہ ویلڈر بھی ٹانکا لگاتا ہے۔ آپ بھی ٹانکا لگاتے ہیں۔ تو آپ میرے حسب سے دونوں برابر ہیں۔ دیکھیں ویلڈر بھی تو کمال کا کام کرتا ہے۔ کہنے لگے، یہ برابر کیسے ہو گئے۔ میں نے کہا، دیکھیے۔ میں ویلڈر کی گن آپ کو دے دیتا ہوں۔ کتنے بڑے آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کہتا ہوں، مجھے ایک ٹانکا لگا کر دے دیں تو آپ نہیں لگا سکتے۔ تو کہنے لگے، یہ تو کبھی ہم نے سوچا ہی نہ تھا، اس کے بارے میں اب کیا فیصلہ کریں۔ میں نے کہا اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ آپ اتنے بڑے اپنے صاحبانِ علم کو کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ اپنے، اور ان کے درمیان بڑی خلیج پیدا کر رہے ہیں جس نے آپ کے ملک کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتایئے، کیا آپ ان لوگوں کو وہ عزّتِ نفس لوٹا کے دینا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وہ Self Respect جس کے وہ حق دار ہیں۔ جیسا کہ ولایت کے مہذب ملکوں میں ان کو تنخواہیں زیادہ نہیں ملتیں۔ پیسے ان کو زیادہ نہیں ملتے، لیکن عزت تو ان کو وہی ملتی ہے جو بونڈز سٹریٹ کے ایک لارڈ کو ملتی ہے یا چلی کے ویلڈر کو ملتی ہے۔ کہنے لگے ہمارے ہاں چونکہ ایک ہندو کا نظام ذہنوں میں چلتا آ رہا ہے، منوں کا براہمنوں، کھشتری، ویش، شودر، وہ نکل نہیں سکا ہے، اس لیے اس پر بڑی شدت سے غور کیے جانے کی ضرورت ہے۔

شروع میں ڈیرے پر باباجی علاج باخلۃً ابھی کرتے تھے، ہمارے بابا لوگ کرتے ہیں علاج Alternate Medicine (متبادل ادویات) سے۔ وہیں اس کا پتا چلا۔ وہاں کچھ لڑکیاں آئی ہوئی تھیں۔ بڑی پیاری خوب صورت بہت گہرے سانولے رنگ کی، چار پانچ چھ برس کی، ایک بڑی عمر کی عورت تھی۔ ساتھ ایک بابا تھا۔ وہ اس کا علاج کروانے کے لیے آئی تھیں تو میں نے باباجی سے پوچھا، یہ کون بچیاں ہیں جو اپنا علاج کروانے کے لیے آئی ہیں۔ انہوں نے کہا اپنے تائے کو لے آئی ہیں، اور یہ بچیاں وہ ہیں جو بہاولپور، ملتان میں کاٹن Pickers (کپاس چننے والی) ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی وہ خواتین ہیں جو کپاس چنتی ہیں یا رائس پلانٹر ہیں۔ یہ خواتین ہیں جن کا نام اخباروں میں آتا ہے یا جو روز اپنی برتری کے دعوے کرتی ہیں۔ نہ نہ نہ وہ تو ہمارے جیسی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کے ہیں۔ یہ آپ کا پاکستان جس کی ساری اکانومی کا دارومدار کاٹن کی اکانومی پر ہے، اور جو آپ کے لیے اتنے سارے ڈالر، پاؤنڈ، ڈچ مارک، ین حاصل کرتی ہیں، وہ ہی لڑکیاں ہیں جو Cotton Pickers ہیں۔

میری چونکہ تجسس کی عادت ہے تو میں نے پوچھا، بیبیو! یہ کپاس چننے کا کام اتنا مشکل ہے؟ ہاں جی بابا! یہ جو پھٹی چگنا ہوتا ہے، بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا، تمہاری بڑی شیخی ہے یعنی میری نگاہوں میں تمہاری عزت سب سے زیادہ

ہے۔ اخبار والی عزت نہیں۔ اس نے کہا، نہیں آپ کی بڑی مہربانی۔ میں نے کہا، مجھے بتاؤ۔ یہ جو تم کاٹن چنتی ہو تو کافی یہ مشکل کام ہے۔ کیا میں یہ نہیں کر سکتا؟ تو کہنے لگی مرد یہ کام نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا، کیوں۔ کہنے لگی: ”ان کی انگلیاں موٹی ہوتی ہیں، وہ پھٹی نہیں پٹتے پورا جوٹا پٹ کے لیے جاندے نیں“۔ تو اگر مردوں کو یہ کام دے دیا جائے خدانخواستہ تو آپ کی اکانومی جو ہے، یہ جو آپ تھوڑا بہت فارن ایکسچینج کماتے ہیں، یہ بھی نہ ہو۔ اسی طرح یہ جو رائس پلانٹ کی بات ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا، گاؤں میں دیکھا ہو گا۔ وہ عورتیں جو پانی میں کھڑی ہو کے لگاتی ہیں اور وہ پیچھے کو چل رہی ہوتی ہیں تو پیچھے کو جب آپ دیکھتے ہیں۔ حیرانی سے کہ وہ لائن بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ پھر وہ پیچھے ہٹتی جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنا گانا گائے جاتی ہیں۔ پھر وہ اس میں پلانٹ کرتیں ہیں تو کم از کم میرے حساب سے رائس پلانٹنگ کی یا رائس ایگریکلچر کی ایم ایس سی ہوتی ہیں۔

اور ان کے ساتھ جو بوڑھے کام کرنے والے ہوتے ہیں، وہ .Ph.D کا حق رکھتے ہیں، تو ان لوگوں کو جو ہمارے ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، اور صاحبانِ علم کو جن میں عملی طور پر موجود ہے، ان کو کوئی ایسی صورت پیدا کریں کہ ان کے پاس یہ جو تحریری، اور حرف شناسی کا علم ہے، وہ بھی پہنچ جائے۔ پہنچ اس لیے نہیں رہا کہ ان کو ہم نہیں مانتے۔ اس بارے جہاں جہاں میرا جھگڑا چلا صورتِ حال ایسی

ہی تھی۔ ایک فوجی تھے، وہ کہنے لگے کہ یہ آپ کی باتیں عجیب عجیب سی ہیں، ہم ان کو کیسے مان لیں۔۔۔

میں نے کہا، سر آپ اپنے ساڑھے 32 لاکھ کی موٹر محمد صدیق ان پڑھ مستری کو دے آتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں، دو دن میں ٹھیک کر دیں۔ وہ کہتا ہے نہیں دو نہیں تین دن لگیں گے۔ یہ کمپنی بے عقل ہے، اس کو بنانی نہیں آتی۔ تو اب میں آپ لوگوں سے آپ کی وساطت سے اپنے سارے حضرات سے پوچھتا ہوں، کیا پاکستان میں یہ وقت آ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے لیے اپنے آپ کو طاقتور رکھنے کے لیے ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں۔ ان کے ساتھ کوئی رشتے داری نہیں کرنی۔ ان کے ساتھ کوئی محبتیں نہیں کرنی۔ ان کے ساتھ کوئی پیسے میں ترقی نہیں، لیکن جب آپ جائیں تو ان کو اتنی عزت ضرور عطا کریں جتنی جب آپ ولایت جاتے ہیں تو ایک ٹیکسی ڈرائیور کو عطا کرتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں یہ سوال پیش کر رہا ہوں، اور اپنے ناظرین، اور سامعین کی خدمت میں بھی کہ اس کو کیسے حل کیا جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کل غروبِ آفتاب سے پہلے ہم سارے مل جائیں، اور اس مضبوطی کو اپنا لیں جو آپ بڑے فخریہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ ہوتا ہے، وہ ہوتا ہے میری خیال میں ہم کوئی ایسا ڈھانچہ بنائیں جس میں صاحبانِ

قلم کے ساتھ تھوڑا سا عملی طور پر ان کو اپنے کام کرنے کا موقع ملے۔

انہیں تھوڑے سے حروف وہ بتائے جائیں کہ آپ جو عمل کر رہے ہیں۔ ایک بندہ تیسا چلا رہا ہے، رندہ مار رہا ہے، اس میں اس کو پتا چلے کہ اس میں کیا کیا دنیا نے کمال دکھایا ہے، اور کیا کیا کام ہو رہا ہے۔ تھوڑی سی حروف شناسی بھی آنی چاہیے۔ اشفاق صاحب! جیسے انہوں نے پیچھے سے شروع کیا تھا۔ کئی دفعہ حکومت نے تعلیم بالغاں۔ ا۔ ب۔ پ۔ سے شروع کر دیتے ہیں، اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر اس لائن میں جیسا آپ نے فرمایا، جو عملی کام کرتے ہیں۔ اب ان کو Push کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی ادارہ یا کوئی نظام قائم کیا جائے۔ واقعی یہ ان کی تھوڑی سی کمی ہے جو عملی طور پر سب کچھ جانتے ہیں۔ اب یہ ہے دوسروں کو سمجھانے کے لیے یا کچھ کرنے کے لیے، یہی چیز وہ کوئی صاحبِ علم ہو جیسے کہ نجمہ نے کہا، ہم اپنے علم پر تھوڑا سا فخر کرنا شروع کریں گے تو ہم میں تقویت آئے گی۔ ابھی ہم تھوڑا سا ڈرے ہوئے ہیں۔ میری بھانجی ہے وہ، M.Sc. ہے۔ پروفیسر ہے ہوم اکنامکس کی، اور اس نے سپیشلائز کیا ہے کھانا وغیرہ پکانے میں۔ لیکن ہمارے گھر میں جب کوئی دعوت ہوتی ہے تو ہم صدیق باورچی کو بلاتے ہیں۔ ایک مرتبہ شادی پر، دیر کی بات ہے، بیالیس دیگیں پکانی تھیں، اور وہ باورچی بیالیس دیگوں کو کس ترتیب سے تیار

کر رہا تھا، اور کتنی مستعدی سے، اور اس کے پاس کتنا علم تھا۔ آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تو میں یہ درخواست لے کر آیا تھا۔ آپ کی خدمت میں کہ لوگوں کو Self Respect جو کہ ان کا حق ہے، جو ان کی توقیر ہے، وہ ان کو لوٹا دینی چاہیے۔ بہت ضروری ہے، ورنہ پھر ہم اسی غلط فہمی، اور کوتاہی میں مبتلا رہیں گے جس میں اب ہیں۔ یہ تو میری بات جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔

کچھ الجھنیں میری بھی ہوتی ہیں جس سے میں آپ کو زحمت دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک بہت ہی ذہین انسان، غیر معمولی ذہین انسان، بہت زیادہ۔ کیا بات ہے وہ عام لوگوں سے مل نہیں سکتا۔ ان کے درمیان زندگی نہیں بسر کرتا۔ ان سے کچھ کٹا کٹا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنی تخلیقی قوتوں میں اتنا مگن ہوتا ہے کہ اس کو شاید دنیا کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید یہ بات ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کٹا رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے میں اتنا مگن ہے جس طرح ہمارے ملنگ بابا ہیں۔ وہ اتنا پر سکون ہے کہ باہر کی دنیا میں آنا چاہتا ہی نہیں۔ جہاں تک ذہانت کا تعلق ہے جس کی Latest Definition یہ ہے۔ کہ "وہ شخص ذہین ہے جو خود کو ماحول میں ایڈجسٹ کرے"۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر رہا۔ اس کا مطلب ہے اس کی ذہانت میں کوئی خرابی ہے، میرا خیال ہے کہ اس کو اپنی ایک مکمل دنیا ملی ہوئی ہے۔ ایک انٹلکچوئل ڈسکورس اپنے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ جینئیس کی بات کر رہا

ہے۔ غیر معمولی ذہانت کی بات ہے۔ جس طرح آپ نے شروع میں مثال دی ہے، بابا جی نور والے کی جو کبھی سکول نہیں گئے تھے۔ کبھی کالج نہیں گئے تھے، لیکن جو ان کا نالج تھا، اس کی بنیاد پر شاعر، اور آپ جیسے اسکالر ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے، اور شیئر کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے ان میں ذہانت اوسطاً زیادہ تھی۔ وہ آپ لوگوں کو متاثر کرتے تھے اور وہ پوری طرح لوگوں کے اندر گھلے ملے بھی رہتے تھے، انہوں نے پوری طرح ایڈجسٹ بھی کیا خود کو، اپنے آپ کو۔ یہ آخری فقرہ آپ کا غور طلب ہے کہ گھلے ملے رہتے تھے، بلکہ گھلنے ملنے کے بغیر ان کا علم نکلتا ہی نہیں تھا۔

یہ کیوں ہے؟ میں نجمہ کی بات یہاں تک تو مانتا ہوں، یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ وہ اپنے آپ میں اپنے کام میں، اپنی لگن میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ اپنا رابطہ قائم نہیں رکھ سکتا لیکن اگر وہ ملنگ بابا ہے تو پھر وہ (Irritant) کیوں ہوتا ہے؟ ملنگ بابا (Irritant) نہیں ہوتا۔ میں آپ سے سوال یوں نہیں کر رہا کہ اس کا جواب یوں دیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، لیکن یہ لوگوں سے میل ملاقات کرنے میں لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں وہ اتنا کیوں پابند ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے اندر وہ آگے نہیں چل سکتا۔

اگر وہ ملے تو بہت کچھ فائدہ پا سکتا ہے۔ اس کی ذات کو بھی معاشرے کو بھی۔ یہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی پیچیدگیاں ہیں جو کہ انسان کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں، لیکن ان پہ غور کیا جانا بہت ضروری ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ڈیروں میں تکیوں پر زاویوں ہر ایسی باتوں کا بڑا پالن ہوتا ہے، اور ان پر غور کیا جاتا ہے، اور آپس میں مل کے بات کی جاتی ہے۔ اور ہمارے بابے جو ہیں، میں آخری بات عرض کر دوں۔

ان میں جو بالکل صحیح بابے ہیں، وہ علم کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ ڈیرے کو مانتے ہیں۔ یہاں علم ملتا ہے۔ یا پھر وہ سائنس لیبارٹریوں کو مانتے ہیں، جہاں سائنسدان کھڑا ہو کے کام کرتا ہے۔ جہاں ڈائی سیک ٹنگ ٹیبل ہے جہاں پر کام ہو رہا ہے۔ جہاں پر سر الیگزینڈر فلیمنگ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی بابے بہت عزت کرتے ہیں، اور سائنسدانوں کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی وہ میٹا فزکس کی عزت کرتے ہیں۔ خواتین و حضرات اتنی ہی فزکس کی عزت کرتے ہیں۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ بڑا شکریہ آپ کا۔ انشاءاللہ پھر کسی اگلی نشست میں ملاقات ہو گی تو کچھ اور چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کر کے پھر آپ سے فائدہ اٹھاؤں گا، اور پھر اس کو مجتمع کر کے آئندہ کسی وقت میں کچھ اور لوگوں کو دینے کی کوشش کروں گا بشرطِ زندگی۔ اللہ حافظ۔

ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں

علم کے بارے میں انسان ہمیشہ سر گرداں رہا ہے، اور آج کے دور میں حصولِ علم کے لیے بہت سی کوششیں ہیں، یہ انسان کے ایک بہتر مستقبل کی نوید کے لیے یقیناً ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

علم حاصل کرنے کے لیے جب ہم بھائی اپنے گاؤں سے لاہور آئے، تو ہمارے ابا جی نے ایک گھر لے کر دیا، فلیمنگ روڈ پر۔ وہاں اختر شیرانی رہتے تھے۔ میں تو چونکہ فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا، اس لیے ان کے نام سے یا ان کے کام سے اتنا آشنا نہیں تھا، لیکن میرے بڑے بھائی ان کو جانتے تھے اور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ بہر حال جہاں ہمارے ابا جی نے، اور بہت ساری مہربانیاں کی تھیں، وہاں یہ کہ ایک خانساماں بھی دیا تھا جو ہمارا کھانا پکاتا تھا۔ اس کا نام عبدل تھا۔ عبدل کو زندگی میں دو شوق بڑے تھے، ایک تو انگریزی بولنے کا، انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا جیسے آج کل بہت زیادہ انگریزی ہی کو علم سمجھا جاتا ہے، اور انگریزی کے حصول کے لیے ہی جان لڑائی جاتی ہے۔ عبدل کو بھی اس کا بڑا شوق تھا۔ دوسرے اس کو اچھی کنوئیں کا بڑا چسکا تھا۔ چنانچہ کبھی اسے

بھائی خط پوسٹ کرنے کے لیے جی پی او بھیجتے تو وہ کہتا تھا، اگر آپ اپنی سائیکل دے دیں تو میں بڑی خوشی سے جاؤں گا، اور آؤں گا۔ ان کی سائیکل کے قریب سے جب ہم گزرتے تھے سلام کر کے، لیکن ہم نے بھی اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، تو عبدل پر وہ کبھی مہربان ضرور ہوتے تھے، اور وہ سائیکل لے کر ان کا خط پوسٹ کرنے کے لیے فلیمنگ روڈ سے جی پی او جاتا تھا۔ اور میرے حساب کے مطابق چار ساڑھے چار منٹ میں واپس آ جاتا تھا، اور اس کی حالت میں سانس اس کی پھولی ہوئی اور ماتھے پر پسینہ ہوتا تھا۔

میں اس کی مستعدی سے بہت خوش تھا کہ یہ جو اپنی سائیکل ہے اس کو اتنے شوق سے، اور اتنی مستعدی سے استعمال کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے دیکھا بازار میں وہ واپس آ رہا تھا، جی بی اور سے خط پوسٹ کر کے۔ اس طرح کہ سائیکل کا ہینڈل اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے اوپر سوار نہیں تھا۔ تو میں نے اسے روک لیا۔ میں نے کہا، عبدل یہ کیا۔ کہنے لگا، "میں بھا جی دا خط پا کے آیاں تے جلدی واپس آیاں۔" میں نے کہا تو سائیکل لے کر گیا تھا۔ کہنے لگا ہاں جی۔ تو میں نے کہا، اس پر سوار کیوں نہیں ہوا۔ کہنے لگا، عزت کی خاطر لے کر جاتا ہوں۔ سائیکل مجھے چلانی نہیں آتی۔ تو آج بھی تقریباً ہمارا معاملہ عبدل جیسا ہی ہے۔ دوسرے اس کو

جب چھٹی ملتی تھی، وہ انگریزی فلم دیکھنے جاتا تھا۔ مال روڈ پر یہاں دو سینما تھے، جن میں انگریزی فلم لگتی تھی۔ اس کو اس کی بڑی دیوانگی تھی، انگریزی سیکھنے کا چسکا، اور انگریزی سیکھنے کی لگن۔ آج ہی نہیں اس وقت بھی بہت زیادہ تھی تو جب وہ فلم دیکھ کر آتا تھا تو میرے بھائی پوچھتے، کیسی تھی۔ کہتا بہت کمال کی تھی۔ اس میں ایک مس تھی، وہ تیرتی بہت اچھا تھی۔ ویری بیوٹی۔ لیکن وہ فلمیں دیکھ دیکھ کے اندازے لگاتا مگر اس میں اتنی استعداد نہ تھی کہ سمجھ سکتا۔ کوئی لفظ اسے انگریزی کا سمجھ نہیں آتا تھا۔ نہ ہی وہ اس کا تلفظ ادا کر سکتا تھا، نہ ہی اس کو بیان کر سکتا تھا، لیکن ایک دن میرے بھائی نے پوچھا کہ تو اتنا وقت ضائع کرتا ہے، اتنے پیسے ضائع کرتا ہے، اور اس توجہ، اور لگن کے ساتھ اپنی زندگی مستغرق کی ہوئی ہے۔ اگر تو مجھے انگریزی کے چار حرف بتا دے، پورے چار۔ چار الفاظ، تو میں تمہیں پورا ایک روپیہ دوں گا۔ تو اس نے کہا کہ میٹرو گولڈ ون میئر۔ انہوں نے کہا یہ تو چار نہیں ہوئے تین ہوئے ہیں۔ کہنے لگا "اوں" چوتھا بھی اس نے ادا کر دیا۔ تو وہ انگریزی جو جانتا تھا، وہ اس قسم کی تھی اب بھی ہم کوشش کر رہے ہیں، اور انگریزی کے اندر کچھ ایسے ہی پھنسے ہوئے ہیں۔ شیر کی بھوگی مارتے ہیں۔ انگریزی چلتی نہیں۔

یہ تو تھی بات جو بر سبیل تذکرہ آگئی۔ میرا آج کا موضوع تھا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

پروفیسر صاحب یہاں آج تشریف فرماہیں۔ جس زمانے میں میں روم میں لیکچرر
تھا، روم یونیورسٹی میں، اور میں سب سے Youngest پروفیسر تھا۔
یونیورسٹیوں میں چھٹیاں تھیں۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت ریڈیو
اسٹیشن پر مجھے اردو براڈکاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ لوٹ کے آ رہا تھا تو خواتین و
حضرات روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ قیلولہ کرتے تھے۔ ۴ بجے تک
سوتے تھے، اور روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوتی تھیں، اور کارپوریشن نے یہ
انتظام کر رکھا تھا کہ وہاں پر پانی کے حوض لگا کر سڑکیں دھوتے ہیں، اور شام
تک سڑکیں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، خوشگوار بھی ہو جاتی ہیں، صاف بھی ہو جاتی
ہیں۔ تو وہ سڑکوں کو دھو رہے تھے۔ اکادکا کوئی ٹریفک کی سواری آجا رہی تھی۔ تو
میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اب دیکھیے انسان کے ساتھ ایک دیسی مزاج
چلتا ہے کہ آدمی کہیں بھی چلا جائے، تو میں گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ
گول دائرہ ہے اس کے اوپر سے میں چکر کاٹ کے آؤں گا۔ پھر میں اپنے گھر کی
طرف مڑوں گا تو یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ بیچ میں سے چلتے ہیں۔ اس وقت
کون دیکھتا ہے، دوپہر کا وقت ہے۔ تو میں بیچ میں سے گزرا وہاں ایک سپاہی کھڑا
تھا، اس نے مجھے دیکھا، اور اس نے پروا نہیں کی۔ جانے دیا کہ یہ جا رہا ہے یہ
نوجوان تو کوئی بات نہیں۔ جب میں نے دیکھا شیشے میں سے گردن گھما کے کچھ

مجھے تھوڑا سا یاد پڑتا ہے۔ میں طنزاً مُسکرایا۔ کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔ میں نے خوشی منانے کے لیے ایک مسکراہٹ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس نے میری یہ عزت کی ہے تو اس نے سیٹی بجا کے روک لیا۔ اب وہاں پر سیٹی بجنا موت کے برابر تھی اور رکنا بھی، میں رکا، وہ آگیا، اور آ کے کھڑا ہو گیا۔ پہلے سلیوٹ کیا، ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی آپ کا چالان کرتے ہیں۔ آپ کو پکڑنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے آ کر سلیوٹ مارتے ہیں۔ تو اس نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا اب میں اندر تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ شیشہ میں نے نیچے کیا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ کا لائسنس۔ تو میں نے اس سے کہا میں زبان نہیں جانتا۔ اس نے کہا، چنگی بھلی بول رہے ہو۔ میں نے کہا میں نہیں جانتا تم ایسے ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تو نہیں جانتا۔ اس نے کہا، نہیں آپ اپنا لائسنس دیں۔ تو میں نے کہا، فرض کریں جس کے پاس اس کا لائسنس نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے گا۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا چالان کر دیتا ہوں۔ پرچی پھاڑ کے تو یہ آپ لے جائیں اور جرمانہ جمع کروا دیں۔ میں تو ایسے ہی مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا غلطی ہو گئی تھی تو چلے جاتے۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھے کاپی نکالی اور چالان کر دیا، اور چالان بھی بڑا سخت، بارہ آنے جرمانہ۔ میں نے لے لی پرچی۔

میں نے کہا، میں اس کو لے کر کیا کروں۔ اس نے کہا اپنے کسی بھی قریبی ڈاکخانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروادیں۔ بس وہاں کچہری نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ بس آپ کا جرمانہ ہو گیا، آپ ڈاکخانے میں دیں گے تو بس۔ میں جب چالان کرواکے گھر آ گیا تو میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے کہا، میرا چالان ہو گیا ہے۔ کہنے لگی، آپ کا۔ میں نے کہا، میں کیا کروں۔ اب ان کو ایسے لگا کہ ہمارے گھر میں جیسے ایک بڑا مجرم رہتا ہے۔ اور اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہو گیا ہے۔ بڈھی مائی تھی۔ اس کی ایک ساس تھی اس کو بھی بتایا، سارے روتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ میں بڑا ڈرا کہ یا اللہ یہ کیا۔ کہنے لگے تو شریف آدمی لگتا تھا۔ اچھے خاندان کا اچھے گھر کا لگتا تھا۔ ہم نے تجھے یہ کرائے پر کمرا بھی دیا ہوا ہے لیکن تو ویسا نہیں نکلا خیر گھر خالی کرنے کو تو نہیں کہا۔ جو بڈھی مائی تھی، ان کی ساس، اس نے کہا۔ ہو تو گیا ہے برخوردار چالان۔ لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محلے داری کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ اس کا چالان ہو گیا ہے تو بڑی رسوائی ہو گی۔ لوگوں کو پتا چلے گا۔ میں نے کہا، نہیں میں پتا نہیں لگنے دوں گا۔ میری لاابالی طبیعت، ۲۶ سال کی عمر تھی۔ چالان جیب میں ڈالا اور نکل گیا دوستوں سے ملنے۔ اگلے دن مجھے جمع کروانا تھا، بھول گیا۔ پھر سارا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے اصولاً جمع کروادینا چاہیے تھا تو میں نے کپڑے

بدلے تو اس پرانے کوٹ میں رہ گیا۔ شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کی محترمی جناب پروفیسر صاحب فلاں فلاں مقام پر فلاں چوراہے پر آپ کا چالان کر دیا گیا تھا، فلاں سپاہی نے۔ یہ نمبر ہے آپ کے چالان کا۔ آپ نے ابھی تک کہیں بھی چالان کے پیسے جمع نہیں کروائے یہ بڑی حکم عدولی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے جمع کروادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ تقریباً ۲۱ روپے کا تار تھا۔ میں نے سارے لفظ گنے۔ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں پھر بھول گیا، اور ان کا پھر ایک تار آیا۔ اگر آپ اب بھی رقم جمع نہیں کروائیں گے تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش کر دینا پڑے گا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی، نہیں جا سکا۔ تب مجھے کورٹ سے ایک سمن آ گیا۔ کہ فلاں تاریخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں، اور یہ جو آپ نے حکم عدولی کی ہے، قانون توڑا ہے، اس کے بارے میں آپ سے پورا انصاف کیا جائے گا۔ ان کی بولی، چونکہ رومن لاء وہیں سے چلا ہے تو بڑی تفصیل کے ساتھ۔ اب میں ڈرا، میری سٹی گم ہوئی۔ پریشان ہوا کہ اب میں دیارِ غیر میں ہوں۔ کوئی میرا حامی و ناصر مددگار نہیں ہے۔ میں کس کو اپنا والی بناؤں گا۔ میرا ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر بالدی اس کا نام تھا، نوجوان تھا۔ میں نے اس سے کہا، مجھے وکیل کر دو۔ اس نے کہا، میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا، یہ تھوڑا سا پیچیدہ ہو جائے گا۔ اگر میں گیا عدالت میں۔ بہتر

یہی ہے پروفیسر صاحب جائیں، اور جاکر خود Face کریں عدالت کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ میں چونکہ اس قانون کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا۔ میں یہاں پر ایک غیر ملکی ہوں تو مجھے معافی دی جائے۔ میں ایسا آئندہ نہیں کروں گا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔ اگر آپ کو روم جانے کا اتفاق ہو تو "پالاس آف دی جستی Palace of Justice" وہ رومن زمانے کا بہت بڑا وسیع و عریض ہے، اسے تلاش کرتے کرتے ہم اپنے جج صاحب کے کمرے میں پہنچے تو وہاں تشریف فرما تھے۔ مجھے ترتیب کے ساتھ بلایا گیا تو میں چلا گیا۔ اب بالکل میرے بدن میں روح نہیں ہے، اور میں خوفزدہ ہوں، اور کانپنے کی بھی مجھ میں جرأت نہیں۔ اس لیے کہ تشنّج جیسی کیفیت ہو گئی تھی، انہوں نے کہا حکم دیا، آپ کھڑے ہوں اس کٹہرے کے اندر۔ اب عدالت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا چالان ہوا تھا، اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ بارہ آنے ڈاک خانے میں جمع کروائیں، کیوں نہیں کروائے؟ میں نے کہا، جی مجھ سے کوتاہی ہوئی، مجھے کروانے چاہئیں تھے، لیکن میں۔۔۔۔ اس نے کہا، کتنا وقت عملے کا ضائع ہوا۔ کتنا پولیس کا ہوا، اب کتنا "جستیک کا" ہوا (جسٹس عدالت کا ہو رہا ہے) اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ہم اس کے بارے میں

آپ کو کڑی سزا دیں گے۔ میں نے کہا، میں یہاں پر ایک فارنر ہوں۔ پردیسی ہوں۔ جیسا ہمارا بہانہ ہوتا ہے، میں کچھ زیادہ آداب نہیں سمجھتا۔ قانون سے میں واقف نہیں ہوں۔ تو میرے پر مہربانی فرمائیں۔ انہوں نے کہا، آپ زبان تو ٹھیک بولتے ہیں۔ وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں تو میں چپ کر کے کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ عدالت آپ سے پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں، اور آپ کا پیشہ کیا ہے؟ میں نے کہا، میں ایک ٹیچر ہوں۔ پروفیسر ہوں۔ روم یونیورسٹی میں۔ تو وہ جج صاحب کرسی کو سائیڈ پر کر کے کھڑا ہو گیا، اور اس نے اعلان کیا Teacher in the Court. Teacher in the Court. جیسے اعلان کیا جاتا ہے، اور وہ سارے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ منشی، تھانیدار، عمل دار جتنے بھی تھے، اور اس نے حکم دیا کہ Chair should be brought for the teacher has come to the court.

اب وہ کٹہرا چھوٹا سا، میں اس کو پکڑ کر کھڑا ہوں۔ وہ کرسی لے آئے۔ حکم ہوا کہ تو Teacher ہے، کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تو پھر اس نے ایک بانی پڑھنی شروع کی۔ جج نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترم انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت کا، اور عدل کا حکم دیا ہے، اور آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے، اور آپ ہی کی بدولت ہم اس

جگہ پر براجمان ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔ عدالت نے جو ضابطہ قائم کیا ہے، اس کے تحت آپ کو چیک کریں، باوجود اس کے کہ ہمیں اس بات کی شرمندگی ہے، اور ہم بے حد افسردہ کہ ہم ایک استاد کو جس سے محترم، اور کوئی نہیں ہوتا، اپنی عدالت میں ٹرائل کر رہے ہیں، اور یہ کسی بھی جج کے لیے انتہائی تکلیف دہ موقع ہے کہ کورٹ میں، کٹہرے ایک استادِ مکرم ہو اور اس سے Trail کیا جائے۔ اب میں شرمندہ اپنی جگہ پر یااللہ یہ کیا شروع ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، حضور جو بھی آپ کا قانون ہے، علم یا جیسے کیسے بھی آپ کا ضابطہ ہے، اس کے مطابق کریں، میں حاضر ہوں۔ تو انہوں نے کہا، ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ، اور نہایت دکھ کے ساتھ، اور گہرے الم کے ساتھ آپ کو ڈبل جرمانہ کرتے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ ہو گیا۔ اب جب میں اٹھ کے اس کرسی میں اس کٹہرے میں سے نکل کر شرمندہ، باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو جج، اس کا عملہ تھا، اس کے منشی تھے، وہ سارے جناب میرے پیچھے پیچھے (A teacher in the court) جارہے تھے کہ ہم احترام فائقہ کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ میں کہوں، میری جان چھوڑیں۔ یہ باہر نکل کر میرے ساتھ کیا کریں گے۔ آگے تک میری موٹر تک چھوڑ کے آئے۔ جب تک میں وہاں سے سٹارٹ نہیں ہو گیا، وہ عملہ وہاں پر ایسے ہی کھڑا تھا۔ اب میں

لوٹ کے آیا تو میں سمجھا یا اللہ میں بڑا معزز آدمی ہوں، اور محلے والوں کو بھی آ کر بتایا کہ میں ایسے گیا تھا، اور وہاں پر یہ یہ ہوا۔ وہ بھی جناب، اور میری جو لینڈ لیڈی تھی، وہ بھی بڑی خوشی کے ساتھ محلے میں چوڑی ہو کے گھوم رہی تھی کہ دیکھو ہمارا یہ ٹیچر گیا، اور کورٹ نے اتنی عزت کی۔ اس کی عزت افزائی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گا، دیسی آدمی جو ہے نا وہ چاہے ٹیچر بھی ہو، وہ گریڈ کا ضرور سوچے گا۔ کتنی بھی آپ عزت دے دیں، کتنا بھی احترام دے دیں، وہ پھر بھی ضرور سوچے گا کہ مجھے کہیں سے چار پیسے بھی ملیں گے کہ نہیں، میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا، تو اس نے کہا، نہیں تنخواہ یہاں پروفیسر کی اتنی ہی ہے جتنی تمہارے پاکستان میں ہے۔ وہ کوئی مالی طور پر اتنے بڑے نہیں ہیں، لیکن عزت کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں۔ رتبہ ان کا بہت زیادہ ہے، اور کوئی شخص یہاں کوئی بیوروکریٹ ہو، یہاں کوئی جج ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہاں کا تاجر ہو، یہاں کا فیوڈل لارڈ ہو، وہ استاد کے رتبے کے پیچھے اسی طرح چلتا ہے، جیسے روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔ مالی طور پر وہ بھی بے چارے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے کہ مالی طور پر کمتر ہیں، لیکن رتبے کے اعتبار سے بہت اونچے ہیں۔ جیسے سقراط جو تھا، وہ اپنے کھنڈروں میں، اور فورم میں کھڑا ہو کے ننگے پاؤں بات کرتا تھا، لیکن اس کا

احترام تھا۔ وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا۔ میرا باس کہا کرتا تھا۔

You have changed your profession for a handful silver.

دیے سے دیا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نیا نیا ولایت وے آیا تھا، تو اس بات کی دھن سوار تھی کہ کسی سے ہمارے یہاں جسے Wisdom of the East کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں، تو اس سلسلے میں مجھے مختلف علاقوں، میں مختلف جگہوں پر، مختلف کونوں کھدروں میں جانا پڑا۔ خاص طور پر میں نے ایسے ڈیرے تلاش کیے جہاں بابے لوگ رہتے تھے، اور آپ نے یہ لفظ میرے منہ سے بارہا سنا ہو گا تو میں حضرت سائیں، حضرت شاہ کے ڈیرے پر جاتا تھا، اور ان سے اس علم کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا جو علم کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اور وہ میرے علم کے ساتھ بڑی بری طرح سے ٹکراتا تھا، کیونکہ میں ایک اور طرح سے کیا گیا تھا علم کے معاملے میں۔ وہاں کا علم ایک اور طرح کا علم تھا لیکن مجھے اس میں دلچسپی تھی لیکن اس کے ساتھ

ساتھ ایک خرابی تھی کہ جو میرے ساتھی، اور میرے ہم عصر ادیب تھے، لکھنے والے تھے، اس بات کو بہت برا سمجھتے تھے کہ ہمارا ایک پڑھا لکھا آدمی سیانا بیانا اتنی دور سے ہو کر آیا ہے، ولایت میں پڑھتا بھی رہا۔ یہ کس بے ہودہ کاروبار میں لگ گیا ہے اور ان کو بڑی تکلیف بھی ہوتی تھی، اور میرے خلاف بڑے کالم بھی لکھے گئے۔ میری بیوی بہت ناراض ہوئی کہ آپ یہ کیا کام کرتے ہیں۔ تو میں چھپ چھپا کے ڈر ڈرا کے جاتا تھا۔

ایک دن میں شام کے وقت گیا اور ہم وہاں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے تو بابا جی میرے ساتھ کھڑے تھے۔ مولوی صاحب نماز پڑھا رہے تھے تو ایک آدمی روتا چیختا چلاتا ہوا آیا۔ کہنے لگا کہ جلدی چلو یونس کو تو مرض الموت ہو گیا ہے، اور اس کا گھنگھرو بج رہا ہے، اور وہ مرنے کے قریب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ بابا جی کو بُلا کر لاؤ۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین پڑھیں۔ اس وقت ہم نماز پڑھ رہے تھے۔ تو بابا جی نے مجھے کہنی مار کے کہا، بیٹا نیت توڑ دو۔ نماز پڑھتے ہوئے نیت کیوں توڑی جائے؟ میں پہلے ان کی اس بات کو نہیں سمجھا، لیکن انہوں نے کہا، نیت توڑ دو۔ میں نے کہا اچھا جی۔

میں چونکہ انڈر ٹریننگ تھا تو میں نے کہا جیسے یہ کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ کہنے لگے،

دیکھو اعلان ہو گیا ہے ایک آدمی مشکل میں ہے، پہلے اس کی مشکل دور کی جانی چاہیے۔ پھر آ کر نماز پڑھ لیں گے۔ بعد میں پڑھ لیں گے، کیونکہ نماز کی قضا ہے۔ خدمت کی قضا نہیں۔ کوئی آدمی سائیکل سے گر جائے، زخمی ہو جائے۔ آپ کہیں میں مغرب پڑھ آؤں، پھر آ کر اٹھاتا ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اب یہ بات میرے لیے بالکل نئ تھی، اور عجیب تھی۔ خیر اٹھے، جس گھر جانا تھا گئے۔ وہ بھی دیکھا۔ خیر وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔ اور وہ دلچسپ ہے۔ واپس اپنی جگہ پر ہم لوٹ کے آئے، رکشہ سے اترے تو میں نے رکشہ والے کو کچھ پیسے دیئے۔ اس کے کوئی تین روپے اسی پیسے بنتے تھے۔ میں نے اس کو چار روپے دے دیئے۔ وہ یہ سمجھا کہ میں نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے تو بابا جی نے پوچھا، پُت پیسے دے دیئے؟ میں نے کہا دے دیئے۔ کہنے لگے کتنے دیئے؟ میں نے کہا چار روپے تو کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا، اس کے تین روپے پچاس پیسے یا اسی بنتے تھے میں نے اسے چار دے دیئے۔ انہوں نے کہا، نہیں پنج دے دینے سی۔ میں نے کہا، پانچ؟ مجھے بڑا دھچکا لگا کہ پانچ کیوں دے دوں۔ میں نے کہا، "کیوں؟" کہنے لگے "تسیں وی تاں دتے وچوں دینے سی، تسیں کیہڑے پلیوں دینے سی" (خدا کے دیئے ہوئے پیسوں میں سے دینے تھے کون سے اپنی جیب سے ادا کرنے تھے)۔ پھر اس نے مجھے تھوڑا سا ہلایا، لیکن میں نے اس کو

سمجھا عقلی طور پر۔ اقتصادی طور پر Emotionally - میرے اندر نہیں اتری وہ بات لیکن اس کے بارے میں سوچتا رہا، غور کرتا رہا۔

اگلے دن ہمارے اک دوست بہت پیارے دوست ابنِ انشاء وہ کراچی سے آئے۔ وہ مجھے گھر ڈھونڈتے رہے پھر انہیں پتا چلا کہ میں اس وقت کہیں اور جگہ موجود نہیں ہوں۔ کسی لائبریری میں نہیں۔ انہوں نے سوچا میں (اشفاق) ضرور ڈیرے پر گیا ہو گا۔ چنانچہ وہ اتنا ایک بڑا ڈنڈا لے کر، وہ بانس کا تھا، مجھے ڈھونڈ تا ڈھونڈ تا ڈیرے پر آ گیا۔ اسے پتا تھا۔ اب اندر تو داخل نہیں ہوا، باہر کھڑا رہا۔ اس کو تکلیف بھی تھی، شرمندگی بھی کہ یہ آدمی کس جگہ پر آکر بیٹھتا ہے۔ میں اندر بیٹھا رہا۔ میں ڈرا ہوا تھا۔ اس نے کہا، باہر آؤ تم۔ خیر ڈرتا ہوا صاحب اس کے قریب پہنچا۔ اس نے کہا تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے، یہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ تم کس فضول جگہ پر آکر بیٹھ جاتے ہو، اور کیا سیکھتے ہو یہاں پر۔ میرے دو دوست تھے۔ ایک ابنِ انشاء اور ایک ن۔ م۔ راشد۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہت مرعوب تھے، اور کہتے تھے، کمال ہی کر دیا ہے سائنس نے۔ میں U. N. O میں گیا۔ ن۔ م۔ راشد کے دفتر میں- اوپر کی منزل سے کوئی بیالیسویں منزل تھی۔ جب نیچے اترے تو میرے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے تو جب ہم ایک ڈاک خانہ پر رکے، تو کہنے

لگے، خیر آ گئے ہو تم گاؤں سے، نہ تمہارے پاس تعلیم ہے، نہ حسن ہے، نہ صحت ہے۔ تم لوگ کس طرح سے زندگی گزارتے ہو۔ تم نے یہ ڈاک خانہ دیکھا ہے؟ میں نے کہا جی دیکھا ہے۔ امریکہ کا ڈاک خانہ ہے۔ واقعی بڑا خوب صورت ہے۔ کہنے لگے خوب صورتی کی بات نہیں ہے۔ یہ دیکھو تمہیں آواز آ رہی ہے۔ کر- کرز- کرززز- اس میں سے آواز آ رہی تھی۔ پتا ہے یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ ٹکٹوں کہ مہریں لگ رہی ہیں۔ اور مشین خود بخود لگا رہی ہے۔ نہ کوئی آدمی ہے نہ کوئی بندہ ہے۔ نہ کوئی پرندہ ہے۔ یہ دیکھو وہاں پر لا کر پیکٹ رکھ دیتے ہیں۔ ٹرززز-- اسی طرح سے sorting ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں نوٹ گننے کی مشین دکھاتا ہوں۔ میں نے کہا، راشد صاحب ان چیزوں سے اتنا متاثر نہ ہوا کریں۔ کہنے لگے، نہیں- تم گھامڑ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں۔ تو یہ خیر مجھے بیچ میں یاد آ گیا، اللہ بخشے بڑے پیارے آدمی تھے دونوں- تو ابنِ انشاء کو غصہ تھا اس بات کا، تو وہ مجھے ہٹانا چاہتا تھا۔ باہر کھڑے اسی طرح سے بانس کا وہ باریک سا ڈنڈا لیے۔ کہنے لگے مجھے یہ بتاؤ یہاں کیا ہے؟ جو تمہیں کسی کتاب میں کسی لائبریری میں نہیں ملتا۔ کونسی چیز ہے۔ میں نے کہا انشا کچھ خاص نہیں، کچھ ایسی چیزیں مشاہدے سے گزرتی ہیں جو مختلف ہوتی ہیں۔ کہنے لگا کیا۔ میں کہا، کل ہم گئے تھے۔ اس طرح رکشہ کا کرایہ دیا۔ اس رکشہ میں سے اترے۔ اس طرح سے میں نے پیسے دیئے۔ اس

طرح سے بابا جی نے کہا، تو نے پانچ ہی دے دینے تھے، تو کیا تھا۔ تو نے "دیتے سے دینا ہے۔ تو نے کون سا پلے سے دینا ہے۔" تو انشا خاموش ہو گیا یہ سن کے۔ اب وہ شاعر آدمی تھا۔ اس کی روح بہت پیاری تھی۔ وہ یہ تو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ بڑی اچھی بات ہے، لیکن اس نے سن لی، ختم ہو گیا یہ سین۔

اس کے کوئی دو مہینے بعد میں کراچی گیا تو انشا جی کے دفتر ملنے پہنچا۔ انشا بیٹھا کام کر رہا ہے، ہم گپ لگا رہے ہیں۔ ادھر کی باتیں ادھر کی باتیں، بہت خوش۔ ایک لڑکی آئی۔ اس کی صحت بہت خراب تھی، اس کی آنکھوں میں یرقان اتنا نمایاں تھا کہ جیسے رنگ بھرا ہو پیلا۔ اس نے چھپانے کے لیے اپنی آنکھوں میں سرمے کی بہت موٹی تہہ لگا رکھی تھی تو کالا برقع اس نے پہنا ہوا، آ کر کھڑی ہو گئی انشاء جی کے سامنے۔ اس نے ایک خط ان کو دیا وہ خط لے کر رونے لگا۔ پڑھ کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر میز پر رکھا، پھر دراز کھولا۔ کہنے لگا بی بی میرے پاس اس وقت یہ تین سو روپے ہی ہیں۔ یہ تو تم لے لو، پھر بعد میں بات کریں گے۔ کہنے لگی، بڑی مہربانی۔ وہ بچکی سی ہو گئی بیچاری، اور ڈر سی گئی، گھبرا سی گئی۔ اس نے کہا، بڑی مہربانی دے دیں۔ وہ لے کر چلی گئی۔

جب چلی گئی تو میں نے انشا سے کہا، انشاء یہ کون تھی۔ کہنے لگا پتہ نہیں۔ میں نے

کہا، اور تجھ سے پیسے لینے آئی تھی۔ تو نے تین سو روپے دے دیئے تو اس کو جانتا نہیں۔ کہنے لگا، نہیں میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ یہ خط ہے۔ اس میں لکھا تھا۔ محترم انشا صاحب میں آپ کے کالم بڑے شوق سے پڑھتی ہوں، اور ان سے بہت خوش ہوتی ہوں، اور میں یہاں پر لیاری میں ایک پرائمری سکول میں ٹیچر ہوں، اور میری 130 روپے تنخواہ ہے۔ میں اور میرا ابا ایک کھولی میں رہتے ہیں، جس کا کرایہ ایک سو ساٹھ روپے ہو گیا ہے، اور ہم وہ ادا نہیں کر سکتے، اور آج وہ بندہ سامان اٹھا کر باہر پھینک رہا ہے۔ اگر آپ مجھے 160 روپے دے دیں تو میں آہستہ آہستہ کر کے 10-10 روپے کر کے اتار دوں گی۔ میں کراچی میں کسی اور کو نہیں جانتی سوائے آپ کے، وہ بھی کالم کی وجہ سے۔ میں نے کہا، اوئے بے وقوف آدمی اس نے تجھ سے ایک سو ساٹھ روپے مانگے تھے تو نے تین سو دے دیئے۔ کہنے لگا، میں نے بھی تو "دِتوں میں سے دیا ہے، میں نے کون سا پلے سے دیا ہے۔" اس کو بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ یہ نصیبوں کی بات ہے یعنی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں جو بڑے دھیان سے جاتا تھا، ڈکٹیشن لیتا تھا، کوششیں کرتا تھا جاننے کی۔ میں نے کہا، اوئے یہ فقرہ تو میں نے کہیں سنا ہوا ہے۔ کہنے لگا، میں نے کچھ کالم لکھے تھے یہ ان کا معاوضہ تھا۔ یہ تین سو روپے میرے پاس ایسے ہی پڑے تھے۔ میں نے دے دیئے۔

تو کوئی آٹھ مہینے بعد میری پھر اس سے ملاقات ہوئی۔ لاہور آیا تو کہنے لگا، وہ جو فلسفہ تیرے بابا کا ہے، بڑا خوفناک ہے، اور بہت بڑا ہے۔ اس میں سے تو آدمی باہر نہیں نکل سکتا۔ میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا، میں نے اس لڑکی کو تین سو روپے دیئے تھے تو میری جان عذاب میں پڑ گئی میں ٹوکیو ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے گیا تھا۔ وہاں مجھے یونیسکو سے خط آیا۔ تمہارے ایک ہزار ڈالر ہمارے پاس پڑے ہیں، وہ بتائیں ہم آپ کو کہاں بھیجیں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا، میں چونکہ سرکاری ملازم ہوں، اور سرکاری حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس لیے میرے گورنمنٹ نے مجھے سارا T.A. D.A دے دیا تھا۔ انہوں نے کہا اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہماری طرف سے ہے جو سارے Participants کو تحفے میں دی ہوئی رقم ہے، تو میں نے فوراً خط لکھا کہ خبردار اس کو ہاتھ نہ لگانا، وہیں رکھنا۔ اس زمانے میں یہی حالات تھے، ڈالر کے، جو آج کل چل رہے ہیں۔ میں وہاں آ کر لے لوں گا۔ اس کی یہ کیفیت ہوئی، اس ایک سال کے اندر اندر یورش ہو گئی پیسوں کی۔ ایسی جگہ سے آنے شروع ہو گئے کہ اس نے سوچا تک نہیں تھا۔ دو سال اس کی یہ کیفیت رہی۔ پھر وہ وہی ڈنڈا لے کر میرے گھر آیا۔ لڑائی کرنے کہ تو نے مجھے یہ بڑی لعنتی بات بتا دی ہے۔ میں اتنا تنگ آ گیا ہوں، اس سے اتنے پیسے میرے پاس آنے لگے ہیں

کہ میں بھرتا نہیں ہوں۔ اب میں نے دینے بند کر دیئے ہیں۔ خدا نہ کرے میرے سامنے کوئی تڑپ کر مر جائے۔ میں کچھ نہیں دیتا یہ تو عذاب ہے، دیتے جاؤ تو آتے جاتے ہیں۔ دیتے جاؤ تو آتے جاتے ہیں۔ What is this میں نے کہا، اس کا علم تو مجھے بھی نہیں۔ میں تو ابھی پوچھ رہا ہوں، اور سیکھ رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ تو میں نے یہ بات زندگی میں عجیب و غریب دیکھی کہ اگر آپ دیتے ہیں تو وہ لوٹ کر آپ کے پاس آتا ہے۔ یہ صدائے بازگشت ہے جو کہ لوٹ کر واپس آتی ہے۔ آدمی سوچتا لے۔ یہ 70 روپے تھے۔ اس میں سے میں نے 30 روپے دے دیئے تو میں نے ابھی تھیسسز لکھنا ہے۔ .Ph.D کرنی ہے تو بعد میں خرچ کرنے ہوں گے۔ کہاں سے آئیں گے۔ حالانکہ یہ بات اس طرح نہیں ہے۔ اب اللہ میاں کا عجیب و غریب System ہے۔ وہ یہ کہ جو کچھ آپ دیتے رہتے ہیں، وہ کچھ آپ کا جمع رہتا ہے، اور اللہ میاں وہ رجسٹر کبھی نہیں دیکھتا۔ وہ دوسرا لیجر مانگتا ہے جس میں سے آپ چھوڑ آئے ہوتے ہیں، اور پیچھے رہ گیا ہوتا ہے۔

مجھے یاد آ گیا، حضرت مجدد الف ثانی – وہ بہت سخت، اصولی بزرگ تھے، لیکن ایک بات میں ان کی کبھی نہیں بھولتا۔ انہوں نے فرمایا، جو شخص تجھ سے مانگتا ہے، اس کو دے۔ کیا یہ تیری انا کے لیے کم ہے کہ کسی نے اپنا دستِ سوال

تیرے آگے دراز کیا ہے۔ بڑے آدمی کی کیا بات ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی ہے، اور وہی سر چشمہ ہے پھر فرماتے ہیں، اور عجیب و غریب انہوں نے یہ بات کی ہے کہ جو حقدار ہو اس کو بھی دے، اور جو ناحق کا مانگنے والا ہے، اس کو بھی دے، تاکہ تجھے جو ناحق کا مل رہا ہے، کہیں وہ ملنا بند نہ ہو جائے۔ دیکھیں نا، ہم کو کیا ناحق مل رہا ہے۔ اس کی ساری مہربانیاں ہیں، کرم ہے اور ہمیں اس کا شعور نہیں ہے کہ ہمیں کہاں کہاں ناحق مل رہا ہے۔ کبھی آپ آرام سے بیٹھ کر اپنی زندگی کو اپنے کام کو اپنے آپ کو بیلنسنگ شیٹ بنانے کی کوشش کریں، تو آپ کو پتا چلے گا 90-80 فیصد تو ایسے ہی آ رہا ہے۔ یہ میرا استحقاق نہیں بنتا، لوگ ایسے ہی روتے ہیں کہ میرا حق، اور میں اپنے حق کی خاطر لڑوں گا، اور مروں گا- یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔ ایسا کبھی ہوتا نہیں۔ بعض اوقات ایسی جگہ سے آ جاتا ہے جہاں آدمی تصور نہیں کر سکتا بلکہ بیشتر ایسے ہوتا ہے، اور آتا چلا جاتا ہے، لیکن آدمی گھبراتا ہے کہ اگر میں کچھ دے دوں گا اور دتے میں سے دے دوں گا، کمی ہو جائے گی، ہوتی نہیں، لیکن وہ ہمارے جیسے پڑھے لکھے لوگ سیانے اس قسم کی بات کرتے ہیں۔

ایک ہمارے ماڈل ٹاؤن میں قلعی گر تھا، بہت اچھا، امیر دین قلعی گر ہمارا بہت پیارا تھا۔ بھانڈے وغیرہ قلعی کرتا تھا۔ فوت ہو گیا تو مولوی صاحب نے مسجد میں

اعلان کیا کہ امیر علی فوت ہو گیا ہے اس کی دعا کروانی ہے مغرب کے بعد علاقے کے سب لوگ، بلاک میں اکٹھے ہوں، تو ہم ابھی کچھ پڑھ ہی رہے تھے کہ ایک لڑکا آگیا، اور اس نے آکر کہا، جی میرا والد تو بہت بیمار ہے۔ اس نے امیر علی قلعی گر کے لیے دعا بھیجی ہے۔ تو ہم نے کہا، دعا بھیجی کیا ہوتا ہے۔ دعا تو آدمی آکر کرتا ہے۔ اس نے کہا میرا والد، اس کا بڑا یار تھا، دونوں بہت پکے دوست تھے۔ اس کو درد ہے، شیاٹیکا پین (Sciatica Pain) وہ چل پھر نہیں سکتا۔ میں اس کی دعا لیکر آیا ہوں۔ تو ہم نے کہا، دعا کیا لے کر آیا ہے، ہم لوگ گٹھلیاں وغیرہ پڑھ رہے تھے، اٹھ کے ایک آدمی نے باہر دیکھا تو لڑکا ٹریکٹر لے کر آیا تھا، پیچھے ٹرالر تھا اور اس کے باپ نے دو بوری گندم، آٹا، ایک بوری چاول، گڑ کا پورا ایک گٹھا، اور اس قسم کی چیزیں تھیں۔ کبھی اس قسم کی باتیں سوچنے کا، دینے کا، بھیجنے کا، یعنی درویش کا یہ طریقہ ہوتا ہے۔

میری بہو ہے، بڑی اچھی، پیاری، نیک۔ اُس کو خیال آیا کچھ خیرات کرنی چاہیے، لیکن اس کو طریقہ نہیں آتا، یہ بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اب کیا کریں خیر وہ اپنا پرس لے کر، اور اس میں کچھ پیسے ڈال کر چلی گئی۔ جھگیوں میں، کوارٹرز میں۔ وہاں جا کر کھڑی ہو گئی تو ایک بی بی آئی اس کے پاس۔ اس نے کہا، ”کڑیئے کس طرح آئی ایں“ (لڑکی کس کام کو آئی ہو)۔ اس نے کہا، میں آئی

ہوں، آپ لوگوں سے ملنے تو میں کچھ آپ لوگوں کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ تو اس نے کہا، تو اناڑی معلوم ہوتی ہے۔ کہنے لگی، ہاں جی۔ کہنے لگی، ”ٹھہر جا میں تیری مدد کرنی آں“ (میں تمہاری مدد کرتی ہوں)۔ تو وہ جھگیوں میں سے ایک کرسی کھینچ کر لے آئی۔ کہنے لگی ”اس پر بیٹھ جا۔ سانوں پنج چار حدیثاں سنا۔ دوبارہ نیک گلاں سنا۔ سانوں اچھے رہن دی تعلیم دے تے اک اک روپیا پھڑا جا ساریاں نوں“ (آپ اس پر بیٹھ جائیں، ہمیں چار پانچ احادیث سنائیں۔ دس بارہ اچھی اچھی نیکی کی باتیں سنائیں، اچھے رہن سہن کی تعلیم دیں اور سب کو ایک ایک روپیہ دے دیں)۔ تو اصل میں یوں بی بی آتی ہو گی، اور ساری بیبیاں ایسی آتی ہیں۔ نیکی بھی سکھاتی ہیں، یہ ان کا کریکٹر ہے۔ اس طرح سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی داد و دہش میں اپنا آپ بھی پروجیکٹ کرتا ہے۔

ہم جو اپنے آباؤ اجداد سے، بزرگوں سے، اپنے بڑوں سے سنتے آئے، کتابوں میں بھی کبھی کبھی پڑھنے کو مل جاتا تھا۔ ہم اپنی اس ثقافت کو کہیں رکھ کے بھول گئے ہیں، یا ہم نے دانستہ ان سے نظر بچالی ہے، ہٹالی ہے، کسی نئی ترقی کی جانب۔

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ہم رکھ کے بھولے نہیں ہیں، اور نہ ہی دانستہ نظر بچائی، ہماری مصروفیات کا عالم کچھ اس طرح سے ہو گیا ہے کہ آپ اپنے آپ کو

گروی رکھ چکے ہیں۔ ہر طرح کی مصروفیات کے ہاتھوں ضروری بھی غیر ضروری بھی۔ آپ جانچنے، اور آنکنے بیٹھے ہوں گے تو آپ دیکھیں گے کہ غیر ضروری مصروفیات ضروری مصروفیات سے کہیں زیادہ ہیں۔ میرا پوتا ہے اس کو ہم نے سکول ابھی داخل کروایا ہے۔ ابھی سے مراد چھٹیوں سے چار پانچ مہینے پہلے۔ تو اُسے کاغذ تختی وغیرہ سب کچھ لے کر دے دیا، وہ سکول جاتا رہا، آتا رہا۔ تو ایک دن اس کے والد کہنے لگے، یار تجھے سکول میں داخل کروایا ہے تو کبھی پڑھتا نہیں۔ کہنے لگا کیا کروں، ڈیڈی ٹائم ہی نہیں ملتا، ٹائم نہیں ملتا، ڈیڈی کیا کروں؟

حاضرین میں موجود ایک صاحب بولتے ہیں، آپ کی خیرات سے مجھے اپنی دادی کا واقعہ یاد آیا۔ وہ بچپن میں ہمیں کہا کرتی تھیں کہ مٹھی کو آپ جتنا کس کے بند کریں اس میں اتنی چیز کم آتی ہے۔ اگر مٹھی ڈھیلی بند کریں گے تو اس میں زیادہ آئے گا تو خیرات دینے کا یہی ہے کی ہم جتنا اپنا پیسا کس کے رکھتے جائیں تے- اللہ میاں اس میں اتنی کمی کرے گا۔

یہی تو آذر کہہ رہے ہیں۔ یہ جو چیزیں تھیں، ہماری قسمت سے نکلتی جا رہی ہیں۔ (حاضرین میں موجود ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے)

دیکھیں نا خان صاحب نے بات شروع کی، اس وقت کچھ ذکر آیا تو انہوں نے

اپنی تعلیم کا حوالہ دیا پھر یہاں کے بابوں کی بات کی، جو اَن پڑھ لوگ ہوتے تھے، خان صاحب آپ اجازت دیں تو اس کو وہ حصوں میں تقسیم کر لیں۔ ایک کچھ لوگ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ پڑھا لکھا ہو، لیکن وہ جو ہمارے بزرگ ہوتے تھے، بڑے لوگ ہوتے تھے، بابے ہوتے تھے، یہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے۔ ان کا مشاہدہ، ہر چیز کو جانچنے کا، ان کا طریقہ، گہرائی میں جانا، اور پھر تجزیہ کرنا اپنے طور پر، اور وہ تجزیہ سو فیصد درست ہوتا۔

آپ کے بھی نواسے پوتے انہی کے ہیں۔ نسل چلی آ رہی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، ایک سوال میرے ذہن میں آ گیا ہے۔ میں نے آپ سے اتنی باتیں کیں تو آپ بھی میری مدد کریں کہ انسان جس شخص پر تنقید کرتا ہے، اور جس میں کیڑے نکالتا ہے، اور جس کو بہت برا سمجھنے لگتا ہے، کیا خود اس جیسا ہونا چاہتا ہے یا آپ کے مشاہدے میں آیا ہے کہ اس کے جیسا ہو جایا کرتا ہے۔ ہاں ہے تو یہی اگر آپ نگاہ ڈالیں اور دیکھیں۔ آپ کا کوئی سیاستدان ہے جو آپ کی وزارتِ داخلہ پر تنقید کر رہا ہے۔ پھر آپ دیکھتے ہو کہ پلٹ کر خود وہ ہوم منسٹری میں آ جاتا ہے، ہے نا بات۔ میں نے یہ سوال آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ مجھے یہ دقت ہو رہی تھی مگر ارد گرد دیکھتا ہوں کہ غریب امیر آدمیوں پر بڑی تنقید

کرتا ہے۔ لیکن ہم ان کو کوئی مارکسزم وغیرہ لا کے دیں کہ اس میں تمہاری بڑی بہتری ہوگی تو وہ اسے فیل کر دیتے ہیں۔ وہ خود چاہ رہے ہوتے ہیں۔ خود موقع ملے تو ہم بھی امیر ہو جائیں۔

(انسان کی فطرت میں، لاشُعور میں ہے نا، وہ اک بات جو اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ بنیادی طور پر تنقید کی ایک وجہ، یہ بھی ہے۔ انسان کے لاشُعور میں ایک بات ہوتی ہے۔ کوئی Aim ہوتا ہے، Goal ہوتا ہے۔ اس کو نہیں حاصل کر سکتا تو جو اس کو حاصل کر چکا ہوتا ہے، اُس پر وہ تنقید کرتا ہے)۔

مثلاً لڑکیاں دیکھیں کسی دوسری لڑکی کو دیکھ کر کہتی ہیں۔ کیا شکل اس کی کو ہجی سی لگتی ہے۔ اکثر لڑکیاں تو یہ کہتی ہیں۔ اس کے کان چھوٹے ہیں وغیرہ، رنگ نہیں گورا لیکن فرض کریں کہ وہ اچھی نہیں ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ تنقید کر رہی ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہوتا ہے کہ جو جو کچھ خوبیاں بیان کر رہی ہوں میں ویسی بن جاؤں، اور اس میں اس کو کچھ کچھ خوبیاں محسوس ہوتی بھی ہیں۔ ہمارے گھروں میں رشتے وغیرہ کے لیے جاتے ہیں جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیا دیکھ کے آئی ہیں- جواب ملتا ہے، اگر ملا جلا کر دیکھیں تو خوب صورت لگتی ہے۔ اک اک چیز تو کچھ بھی نہیں تھی۔ لاحول ولا قوۃ یہ کیا بات کرتی ہیں۔ نہیں

نقص، تو ٹھیک تھی۔ یہ جو Cosmetics کی اتنی بڑی انڈسٹری ہے جو کہ سٹیل کے بعد دنیا میں دوسری بڑی انڈسٹری ہے، تو شاید اس خوف سے تو نہیں پیدا ہوئی کہ دیکھو میں تنقید کرتی ہوں یا کرتا ہوں اور پھر اس کے بعد مجھ میں یہ چیز پیدا ہو جائے تو میں ذاتی طور پر ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ تنقید کر رہا ہوتا ہے، وہ آرزو مند اس بات کا ضرور ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ مہربانی۔ اللہ حافظ۔

بابا کی تعریف

ہم زاویہ کے بیشتر پروگراموں میں بابوں کی بات کرتے ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ بابوں کی Definition سے یا ان کی تعریف سے ہیئتِ ترکیبی سے آپ یقیناً بہت اچھی طرح واقف ہوں گے، لیکن میرا یہ اندازہ بالکل صحیح نہیں تھا۔ اب میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں، اور اس کی ایک چھوٹی سی تعریف بھی کروں، بابا کی۔

بابا وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے انسان کو آسانی عطا کرے۔ یہ اس کی تعریف ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ آتا ہو گا کہ بابا ایک بھاری فقیر ہے۔ اس نے سبز رنگ کا کرتا پہنا ہوا ہے۔ گلے میں منکوں کی مالا ہے۔ ہاتھ میں اس کے لوگوں کو سزا دینے کا تازیانہ پکڑا ہوا ہے، اور آنکھوں میں سرخ رنگ کا سرمہ ڈالا ہے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ ایک تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے اعلیٰ درجے کی سرخ رنگ کی ٹائی لگائی ہے۔ بیچ میں سونے کا پن لگائے ہوئے ایک بہت اعلیٰ درجے کا بابا ہوتا ہے۔ اس میں جنس کی بھی قید نہیں ہے۔ مرد عورت، بچہ، بوڑھا، ادھیڑ نوجوان یہ سب لوگ کبھی نہ کبھی اپنے وقت میں بابے ہوتے ہیں، اور ہو گزرتے

ہیں۔ لمحاتی طور پر ایک دفعہ کچھ آسانی عطا کرنے کا کام کیا۔ اور کچھ مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں اس شیوے کو۔ اور ہم ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ میری زندگی میں بابے آئے ہیں اور میں حیران ہوتا تھا کہ یہ لوگوں کو آسانی عطا کرنے کا فن کس خوبی سے کس سلیقے سے جانتے ہیں۔

میری یہ حسرت ہی رہی۔ میں اس عمر کو پہنچ گیا۔ میں اپنی طرف سے کسی کو نہ آسانی عطا کر سکا، نہ دے سکا اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ نہ ہی آئندہ کبھی اس کی توقع ہے۔

جب ہم تھرڈ ائیر میں تھے تو کرپال سنگھ ہمارا ساتھی تھا۔ ہم اس کو کرپالا سنگھ کہتے تھے۔ بیچارہ ایسا ہی آدمی تھا جیسے ایک پنجابی فوک گانے والا ہوتا ہے۔ لال رنگ کا لباس پہن کے بہت ٹیڑھا ہو کے گایا کرتا ہے۔ ایک روز ہم لاہور کے بازار انار کلی میں جا رہے تھے تو سٹیشنری کی دکانوں کے آگے ایک فقیر تھا۔ اس نے کہا بابا اللہ کے نام پر کچھ دے تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے کرپال سنگھ کو مخاطب کر کے کہا کہ اے بابا سائیں کچھ دے۔ تو کہنے لگا کہ بھاجی اس وقت کچھ ہے نہیں، اور اس کے پاس واقعی نہیں تھا۔ تو فقیر نے بجائے اس سے کچھ لینے کے بھاگ کر اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور گھٹ کے جپھی (معانقہ) ڈال

لی۔ کہنے لگا، ساری دنیا کے خزانے مجھ کو دیئے، سب کچھ تو نے لٹا دیا۔ تیرے پاس سب کچھ ہے۔ تو نے مجھے بھاجی کہہ دیا۔ میں ترسا ہوا تھا اس لفظ سے۔ مجھے آج کسی نے بھاجی نہیں کہا۔ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ان دنوں ہم سارے ہوسٹل کے لڑکے چوری چھپے سینما دیکھنے جاتے تھے۔ تو لاہور بھاٹی کے باہر ایک تھیٹر تھا اس میں فلمیں لگتی تھیں۔ میں اروند، غلام مصطفیٰ، کرپال یہ سب۔ ہم گئے سینما دیکھنے، رات کو لوٹے تو انار کلی میں بڑی یخ بستہ سردی تھی، یعنی وہ کرسمس کے قریب کے ایام تھے سردی بہت تھی۔ سردی کے اس عالم میں کہرا بھی چھایا ہوا تھا۔ ایک دکان کے تختے پر پھٹا جو ہوتا ہے، ایک دردناک آواز آرہی تھی ایک بڑھیا کی۔ وہ رو رہی تھی اور کراہ رہی تھی، اور بار بار یہ کہے جارہی تھی کہ ارے میری بہو تجھے بھگوان سمیٹے تو مر جائے نی، مجھے ڈال گئی، وہ بہو اور بیٹا اس کو گھر سے نکال کے ایک دکان کے پھٹے پر چھوڑ گئے تھے۔ وہ دکان تھی جگت سنگھ کواترا کی جو بعد میں بہت معروف ہوئے۔ ان کی ایک عزیزہ تھی امرتا پریتم، جو بہت اچھی شاعرہ بنی۔ وہ خیر اس کو اس دکان پر پھینک گئے تھے۔ وہاں پر وہ لیٹی چیخ و پکار کر رہی تھی۔ ہم سب نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی کہ دیکھو کتنا ظالم سماج ہے، کتنے ظالم لوگ ہیں۔ اس غریب

بڑھیا بیچاری کو یہاں سر دی میں ڈال گئے۔ اس کا آخری وقت ہے۔ وہاں اروند نے بڑی تقریر کی کہ جب تک انگریز ہمارے اوپر حکمران رہے گا، اور ملک کو سوراج نہیں ملے گا ایسے غریبوں کی ایسی حالت رہے گی۔ پھر وہ کہتے حکومت کو کچھ کرنا چاہیے۔ پھر کہتے ہیں۔ اناتھ آشرم (کفالت خانے، مقیم خانے) جو ہیں وہ کچھ نہیں کرتے۔ ہم یہاں کیا کریں۔ تو وہ کرپال سنگھ وہاں سے غائب ہو گیا۔ ہم نے کہا، پیچھے رہ گیا یا پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔ تو ابھی ہم تقریریں کر رہے تھے۔ اس بڑھیا کے پاس کھڑے ہو کے کہ وہ بائیسکل کے اوپر آیا بالکل پسینہ پسینہ سردیوں میں، فق ہوا، سانس اوپر نیچے لیتا آ گیا۔ اس کے ہوسٹل کے کمرے میں چارپائی کے آگے ایک پرانا کمبل ہوتا تھا جو اس کے والد کبھی گھوڑے پر دیا کرتے ہوں گے۔ وہ ساہیوال کے بیدی تھے۔ تو وہ بچھا کے نا اس کے اوپر بیٹھ کر پڑھتے وڑھتے تھے۔ بدبودار گھوڑے کو کمبل جسے وہ اپنی چارپائی سے کھینچ کر لے آیا بائیسکل پر، اور لا کر اس نے بڑھیا کے اوپر ڈال دیا، اور وہ اس کو دعائیں دیتی رہی۔ اس کو نہیں آتا تھا وہ طریقہ کہ کس طرح تقریر کی جاتی ہے۔ فنِ تقریر سے ناواقف تھا۔ بابا نور والے کہا کرتے تھے انسان کا کام ہے دوسروں کو آسانی دینا۔ آپ کا کوئی دوست تھانے پہنچے، اور وہ تھانے سے آپ کو ٹیلی فون کرے کہ میں تھانے میں آ گیا ہوں۔

تو کبھی یہ مت پوچھو کہ کیا ہوا، کس طرح ہوا، کیسے پہنچے۔ یہ پوچھو کون سے تھانے میں ہو، بس یہ آسانی عطا کرنے کا طریقہ ہے، اور یہ فن ہم نے سیکھا نہیں تھا۔ ہمارے کورس میں، کتاب میں اس قسم کی چیزیں ہی نہیں تھیں تو میرے ایک بھائی ہیں۔ میرے تایا زاد میری عمر کے۔ تو وہ مجھ سے تھوڑے دن خفا ہوئے۔ اس نے کہا، یہ تم نے کیا پروگرام شروع کیا ہے۔ دنیا ترقی کر رہی ہے، زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور تم پیچھے مڑ کے بابوں کی طرف لیے جا رہے ہو۔ جب آدمی ترقی کا مطلب لیتا ہے تو وہ بہانہ، اور سہارا دوسروں کا لیتا ہے۔ اپنی زندگی بنانے کا صرف اکیلا خواہش مند ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اس میں کسی اخلاق یا موریلٹی کی ضرورت نہیں، چھوڑو انسان کو۔ اب تم کوئی ایسا کام کرو جو ٹیکنالوجی کے ساتھ تعلق رکھتا ہو، اور علم عطا کرو، اور ان کو بتاؤ۔ تو جب وہ مجھ سے بات کر رہے تھے، مجھے اپنے بابا جی کا زمانہ یاد آ رہا تھا کہ یہاں پر سبّی میں ایک میلہ ہوتا ہے۔ سالانہ مویشیوں کا میلہ وہ ہمارے پاکستان میں بہت مشہور ہے۔ میلہ بہت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے وہاں کے کچھ لوگوں نے مجھے خط لکھا، بڑی محبت کے ساتھ کہ ہمارا بھی آپ کے اوپر کوئی حق ہے، تو آپ کبھی اشفاق صاحب یہاں پر تشریف لائیں۔ تو میں نے سنا تھا کہ سبّی میں بہت گرمی ہوتی ہے، اور میں کیا کروں گا جا کر۔ میں کچھ ٹال جاتا تھا۔ خط تقریباً چار سال تک آتا رہا۔ پھر مجھے بہت شرمندگی

ہوئی، اور ضمیر نے ملامت کی۔ بھئی ایسی کون سی مصیبت ہے آپ نہیں جاسکتے
میں نے کہا، میں تیار ہوں جانے کے لیے۔ میں نے ارادہ باندھا تو میں قادری بابا
سے جا کر پوچھا۔ اجازت لینے کے لیے۔ ہم زور لگا کے یہ رسم سیکھ رہے تھے،
ورنہ کون اجازت لیتا ہے۔ میں نے کہا، سرکار وہ مجھے سبّی جانا ہے۔ کہنے لگے بہت
خوشی کی بات ہے۔ بڑی اچھی بات ہے، ضرور جاؤ۔ میں نے کہا، جی وہاں کے
لوگ نے بلایا ہے۔ کہنے لگے، نہیں نہیں اس میں پوچھنے کی بات ہی کوئی نہیں،
اور تم جانا اور ضرور جانا۔ میں نے کہا، جی آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ کہنے
لگے ضرور ہاں، بالکل اجازت ہے۔ میں بلکہ بہت خوش ہوں۔ تو میں ان سے
اجازت لے کر چلا۔ ابھی میں ڈیرے سے دروازے تک پہنچا، باہر جھاڑ جھنکار کی
جسے کہتے ہیں نا ایک باڑ لگی ہوئی تھی، وہاں سے مجھے آواز دے کر پھر بلایا۔ کہنے
لگے بیٹا بات سنو، جب میں لوٹ کے آیا تو مجھ سے کہنے لگے، سبّی جا رہے ہو، بڑی
خوشی کی بات ہے۔ وہاں جا کر لوگوں کو اپنا علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا، ان کو محبت
دینا۔ میں نے کہا، سر محبت تو ہمارے پاس گھر میں دینے جوگی نہیں، وہ کہاں سے
دوں۔ میرے پاس علم ہی علم ہے۔ کہنے لگے نہ انہیں علم نہ دینا۔ انہوں نے
محبت سے بلایا ہے، محبت سے جانا اگر ہے تو لے کر جانا، لیکن ہم تو ظاہر علم
سکھاتے ہیں کہ اتنا اونچا روشن دان رکھو، مویشی کو اندر مت باندھو، ناک سے

سانس لو، منہ سے ایکسیل کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ محبت! میں نے کہا، جی یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میں کیسے یہ کر سکوں گا۔ میں گیا کوششیں بھی کیں، لیکن بالکل ناکام لوٹا، کیونکہ علم عطا کرنا، اور ان کی نصیحتیں کرنا بہت آسان ہے، اور محبت دینا بڑا مشکل کام ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بابے وہ ہوتے ہیں جن میں تخصیص نہیں ہوتی۔ اگر آپ زندگی میں کبھی کسی شخص کو آسانی عطا کر رہے ہیں تو آپ بابے ہیں۔ اگر آسانی عطا نہیں کر رہے تو پھر آپ اپنی ذات کے ہیں۔ ان بابوں کی بات کیا کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ اس میں جنس کی بھی تخصیص نہیں ہوتی، قید نہیں ہوتی، عمر کی، Age کی۔ میری چھوٹی پوتی نے اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک عجیب و غریب بات کی جو میں تو نہیں کر سکا، اس نے سکول کی تھرماس لے کے اس میں سکنجبین بنائی۔ بہت اچھی ٹھنڈی، اور برف ڈالی، اور اس کو جہاں ہمارا لیٹر بکس لگا ہے، درخت کے ساتھ ہے، اس درخت کی کھوہ میں رکھ دیا۔ اور ایک خط لکھ کے پن کر دیا اس کے ساتھ۔ اس نے لکھا، انکل پوسٹ مین۔ آپ گرمی میں خط دینے آتے ہیں، تو آپ بائیسکل چلاتے ہو، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے لیے یہ سکنجبین بنائی ہے۔ یہ آپ پی لیں۔ میں آپ کی بڑی شکر گزار ہوں گی۔ ہاں جی تو دوپہر کو ہم روز زبردستی سلا دیتے

تھے بچوں کو۔ شام کو جب جاگی تو وہ لے آئی، تھرماس دیکھا تو وہ خط تھا اس کا۔
اس کے اوپر ہرکارے نے جو خاص کان میں رکھتے ہیں بال پوائنٹ، ان کا خاص
انداز ہوتا ہے، تو اس نے لکھا تھا، پیاری بیٹی تیرا بہت شکریہ۔ میں نے سکنجبین
کے دو گلاس پیئے، اور اب میری رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ میں ایک پیڈل مارتا
ہوں تو دو کوٹھیاں آسانی سے گزر جاتا ہوں، تو جیتی رہ۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔
کل جو بنائے گی، اس میں چینی کے دو چمچ زیادہ ڈال دینا۔ یہ اس کی محبت ہے نا۔ یہ
بچی جو ہے چھوٹی سی خواتین و حضرات اس نے بابا کی طرح آسانی دی تھی۔ اس
نے ایک Relatedness ایک تعلق محسوس کیا اس نے۔ اس طرح سے میں
کہا کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں میں ہمارے اس جلتے ہوئے ماحول میں تکلیفوں
بھرے ماحول میں آپ اکثر دیکھا ہو گا کہ دفاتر، سرکاری دفاتر سے بیوروکریسی
سے کوئی خیر نہیں پڑتی۔ لوگ بہت دکھی رہتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارا ایک
محکمہ ایسا ہے جو خیر بانٹتا ہے، اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ وہ ڈاک کا محکمہ
ہے یعنی آپ بڑی آسانی کے ساتھ اپنی چیز لے جائیں، اور ٹھپا لگا کر آپ کو رسید
دیتا ہے میں دعا کرتا ہوں۔ آپ یقین کریں میں سچی بات عرض کرتا ہوں کہ
جس طرح سے وہ لوگ کسی درگاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے سلام کرتے
ہیں، میں جب بھی کسی ڈاک خانے کے پاس سے گزرتا ہوں، چاہے میں گاڑی

میں جارہاہوں میں انہی سلام ضرور کرتاہوں کہ میں آپ کی، اور کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ اب آپ کہنے والے ہوں گے۔ جناب یہ منی آرڈر چوری کر لیا تھا، انہوں نے اخبار میں آتی ہیں ایسی چیزیں۔ میں مجموعی طور پر بات کر رہاہوں۔ وہ بڑی خوبی کے مالک ہوتے ہیں، اور وہ آپ کو آسانیاں عطا کرتے ہیں۔

آپ اپنا پارسل لے کر جائیں، اور وہ بابو جو بیٹھا ہوا کہے، جناب اس پر پیلا کاغذ لگا کر لائیں۔ یہ نیلا نہیں قابلِ قبول۔

آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرا یہ کہ ڈوری اس پر سرخ باندھیں۔ یہ جو سیبا (دھاگہ) آپ نے باندھا ہے یہ قابلِ قبول ہے، کچھ بھی اعتراض کر سکتا ہے، یعنی آپ دیکھیے ایک چیز جو میرا استحقاق ہے جس پر مجھے پورا حق ہے، اور جس پر ریاض صاحب، قادری صاحب کوئی بھی اس کے اوپر حق نہیں رکھتے۔ اتنی وہ چیز میری ہے کہ اس دنیا میں اس دنیا میں اس کرہ ارض پر، اور کسی کی نہیں، اور اس میں شامل ہی نہیں، اور میرا نام، اور میری تاریخ پیدائش ہے۔ اگر مجھ کو وہ خدانخواستہ تاریخ پیدائش دفتر سے لینی پڑ جائے۔ کئی دفعہ Date of Birth نکلوانی پڑتی ہے نا۔ تو وہ کہتے ہیں، اشفاق صاحب چھ مہینے کے اندر اتنی جلدی آپ کیسے نکال دیں گے۔ اب رویے کی بات ہے۔ وہ آسانی کے بجائے

Objection لگا دیتے ہیں اس کے ساتھ۔ وہ لگائیں اپنا شناختی کارڈ، وہ لگایا، پھر کہا، جی اس کی دو کاپیاں کر کے لائیں، کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تو میں بڑی دعا کرتا ہوں، اور دعا دیتا ہوں، اور یہ جو بابا پن ہے، ڈاکخانے نے اپنا قائم رکھا ہوا ہے، اور جس میں ہلکی ہلکی کوتاہیاں آتی رہتی ہیں۔ اللہ کے واسطے وہ انہیں دور کریں، تاکہ ہم فخر کے ساتھ اس کو دنیا کے اور اداروں کے ساتھ موازنے اور مقابلے میں پیش کر سکیں۔

میں جب نیا نیا آیا ولایت سے آیا تو میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ ڈیرے کیا ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں جو پہلی بات نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ ہم لوگ اندر بیٹھے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ بابا سے باتیں ہو رہی ہیں تو جب ہم باہر نکلتے تھے تو ساروں کی جوتیاں ایک قطار میں ہوتی تھیں، اور ان کا رخ باہر کی طرف ہوتا تھا۔ آدمی جوتی اتار دیتا ہے۔ اونچی نیچی پڑی رہتی ہیں تو ڈیروں پر اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میں نے جب دیکھا تو یہ مباح، اچھا فعل ہے۔ لوگوں کی جوتیاں ٹھیک کرنا، اور مجھ میں کیونکہ تھوڑا سا استکبار تھا، گھمنڈ تھا کہ میں ولایت سے پڑھ کے آیا ہوں، بڑا کوالیفیکیشن والا ہوں، ہوتا ہے عام طور پر۔ میں نے ہمت کر کے جوتیاں سیدھی کرنے کی کوشش کی۔ یہ مشکل کام تھا، لیکن میں نے زور لگا کے، اور آنکھ بچا کے (میری بھی عزت کا سوال تھا)۔ تین چار پانچ ٹھیک کی تھیں تو اوپر سے بابا جی آ

گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا(کہ نہ نہ نہ پت تسیں ایہہ کم نہ کرو۔ بالکل نہیں کرنا)۔ آپ نے نہیں کرنا۔ میں نے کہا نہیں جی۔ میں شرمندہ سا تھا، اٹھا لیا مجھے۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں، مجھے منع کر دیا، منع تو ہو گیا۔ لیکن میری طبیعت پر بڑا بوجھ رہا، اور میں یہ سوچتا رہا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ میں ایک اچھے فعل میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ہاں جی میری ساتھ یہ کیوں کیا تو دوپہر کے وقت ہم اکیلے تھے۔ میں نے کہا، جی میں عرض کروں ایک بات، کیونکہ میری طبیعت پر اس کا بڑا بوجھ ہے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے کہا، یہ ٹھیک ہے جو علم آپ کو عطا کرنا ہے، وہ زیادہ بہتر ہے۔ میں نے کہا، لیکن وہ سر میں تو اچھا کام کر رہا تھا۔ کہنے لگے آپ کے لیے ضروری نہیں تھا کہ ایسا فعل آپ کے تکبر میں، اور اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ چند لوگ دیکھتے کہ جناب سبحان اللہ اشفاق صاحب یہ کام کر رہے ہیں۔ آپ نے، اور "پاٹے خان" بن جانا تھا۔ آپ اس کو دیکھیں ہمارے ذہن میں بات نہیں آتی نا۔ بڑی دور کی بات ہے۔ نہیں آتی تو اس لیے ہم نے ان لوگوں کی خدمت میں یہ عرض کیا، ہم ہر گز ہر گز پیچھے کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ ہم تو بہت آگے ذرا زیادہ Advance جا رہے ہیں۔ ہم لوٹ کے آنا چاہتے ہیں۔ اس استحکام، اور مضبوطی کی طرف جو کسی زمانے میں ہمارا طرہ امتیاز تھا۔

ہمارے ایک یہاں پروفیسر تھے۔ بہت اچھے سائیکالوجی کے بھلے آدمی۔ میرا بھانجا ان سے پڑھتا تھا تو وہ ایک دن آیا، کہنے لگا، ماموں وہ ہماری ایکسٹرا کلاسیں لیتے ہیں شام کے وقت اور دس Student ان کے پاس بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ امی تو پیسے نہیں دے سکتیں، ابو کا ہاتھ کچھ تنگ ہے۔ تو آپ ایسے کریں کہ پروفیسر صاحب سے مل کر کچھ طے کریں۔ ابو کہتے ہیں کہ ہم ان کو 500 روپیہ دے سکتے ہیں، تو میں ان پروفیسر صاحب کے پاس گیا۔ شام کے وقت گھاس پر پرانے انداز میں بیٹھے ہوئے پڑھا رہے تھے۔ بڑے انہماک، اور لگن کے ساتھ۔ تو میں نے گستاخی کی۔ میں نے کہا، پروفیسر صاحب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگے، اچھا۔ وہ چھوڑ کے آئے۔ میں نے کہا، میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ کہنے لگے، ہاں جی ہاں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہ میری بہن زیادہ صاحبِ حیثیت نہیں ہے وہ صرف پانچ سو روپیہ آپ کو دے سکیں گے۔ کہنے لگے اشفاق صاحب مجھے پڑھانے کے پیسے تو ملتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ دوسرے لڑکے آپ کو زیادہ دیتے ہوں گے۔ کہنے لگے، نہیں نہیں مجھے سرکار سے ملتے ہیں۔ میری تنخواہ ہے۔ میں نے کہا، وہ تو کالج میں پڑھانے کے ملتے ہیں یہ تو آپ ایکسٹرا پڑھا رہے ہیں۔ کہنے لگے نو نو نو All the time

Teacher is Teacher وہ صبح پڑھائے یا شام۔

اس کے پیسے تو مجھے سرکار ہی دیتی ہے۔ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ میں 500 روپیہ لیتا ہوں۔ آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے، اور یہ میری محبت ہے، اور یہ بڑی محبت کے ساتھ لوگ آئے ہیں۔ تو وہ پروفیسر تھے جو آسانی عطا کرتے تھے، اور ان کے پاس اور کلاسیں آتی رہیں، میں ان کو دیکھتا رہا، اور ان کو سلام کرنے جاتا رہا، کیونکہ وہ بھی ایک بابا تھے، جس طرح میری پوتی ایک بابا ہے۔ میں اسے سلام کرتا ہوں، ڈاکخانے ایک بابا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں سچ مچ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا سا جھٹکا اس لیے لگتا ہے کہ اس میں ایمپوسٹرز تو ضرور آ ہی جاتے ہیں۔ جعلی بندے شامل ہو ہی جاتے ہیں جس طرح کئی دفعہ ٹھگ جو ہوتا ہے، وہ فوجی میجر کی وردی پہن کر دکان چیک کرنے چلا جاتا ہے۔ کہ تمہارے کیا حساب و کتاب ہیں، اور گلے میں سے ہزار روپیہ کھسکا کے لے آتا ہے تو آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جو میجر ہوتا ہے، وہ ٹھگ ہوتا ہے اس لیے آرمی میں سے میجر کا رینک نکال دیں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ایمپوسٹرز جو ہے، ٹھگ جو ہے، وہ اپنے انداز کا ہے، ویسا ہی رہے گا۔ آپ کو اب یہ دیکھنا ہے، اور ذرا سا اس کا آسان ٹیسٹ یہ جو آپ اپنی ذات پر بھی Apply کر سکتے ہیں کہ اس نے کسی سطح پر کسی طریقے سے بنی نوع انسان کو

آسانی عطا کی یا نہیں۔

آپ نے اپنے بچپن میں دیکھا ہو گا۔ آپ کے محلے کے آپ کے گاؤں کے، اور آپ کے قصبے کے یا آپ کے شہر کے بزرگ جو تھے وہ جب راہ چلتے تھے تو اپنی چھڑی کے ساتھ کوئی کیلے کا چھلکا پڑا ہوا ہے یا کوئی ایسی گری پڑی چیز اینٹ، روڑا ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ بد نصیبی ہے۔ جس دن اپنی چھڑی کے ساتھ، ایک اکیلا آدمی اس آلائش کو دور کرتا چلا جائے گا، اور مجھے یقین ہے کہ وہ پیچھے چلنے والے آتے جائیں گے، اور ملتے رہیں گے۔ ہماری یہ کوتاہی رہی ہے کہ ہم اس کے بارے میں علم عطا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ بابا جی نے جو کہا تھا کہ علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا۔ ان کو محبت دینا۔ آپ کو مجھ سے محبت دینے کی ضرورت ہے ورنہ علم اندر نہیں جاتا۔ وہ پروفیسر جو گھاس پر بیٹھ کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا، اس کا علم جاری رہا تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کے پاس ایک ایسا پرنالا تھا جو محبت کا تھا، اور وہ پھسل پھسل کر لڑکوں میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ اس کے بغیر نہیں ہو گا۔ خواتین و حضرات آج ہلکی سی وضاحت یہ بابے کی ہوئی، اور آپ کے ذہن سے بہت سے شکوک، میرا خیال ہے دور ہوتے رہیں گے، نہ ہوتے ہوں تو کوئی ایسی بری بات نہیں۔ شکوک کو ساتھ لے کر چلنا ہی اچھی بات ہے۔ کیونکہ شک جو ہے خلافِ ایمان نہیں ہے۔ ایمان کا ایک حصہ

ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں شک پیدا ہو گا جو ایمان والا ہے، اللہ کو مانتا ہے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں، لیکن مجھے خوشی ہے کہ ہر ہفتے آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے، اور کچھ ایسی باتیں ہو جاتی ہیں، جو میں اپنے لیے جاننا نہیں چاہتا، کیونکہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

کلچر

زاویہ پروگرام میں بڑی دیر سے ہم بابوں کی باتیں کرتے رہے ہیں، اور یہ بابے اپنے عہد کے فلسفی، اور دانشور، اور ضمیر کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے لوگ تھے، جنھوں نے اپنے ارد گرد، اپنے ماحول سے، اپنے زمینی ماحول سے، بہت ساری خوشیاں، اور آسانیاں اکٹھی کر کے ہمارے حوالے کیں، اور ورثے میں ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ مجھ سے خاص طور پر فرمائش کی گئی کہ کلچر کے بارے میں کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ اس اعتبار سے شاید آج کا پروگرام تھوڑا سا مختلف ہو، لیکن میں کوشش ضرور کروں گا کہ آسانی سے ان مشکل مراحل سے گزر جاؤں جو ہماری زندگی کے کلچر کی تلاش کے سلسلے میں یا کلچر کو Define کرنے میں پیش آتے رہے ہیں، یا آتے ہیں۔

خواتین و حضرات کلچر کے بارے میں تقریباً ۶۲ کے قریب مختلف Definitions یا اس کے بارے میں باتیں میری نظر سے گزری ہیں، لیکن ماہرینِ علمِ انسان، اور علمِ معاشریات کسی خاص حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ یعنی ہماری بہت لائق اینتھروپالوجسٹ "Benedict" جیسی خاتون یا فرانس کے

بہت بڑے عالم "لیوی سٹاس" سے اور پھر ادبی لیول پر "ٹی ایس ایلیٹ" ان سب نے اس کی Definition کی ہے لیکن میں، سچی بات یہ کہ حوصلہ کر کے، اور دل پر پتھر رکھ کے بڑی جرات کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ مغرب والوں کو کلچر کی صحیح Definition یوں کرنی نہیں آتی کہ وہ کلچر کو انسانی زندگی کے ساتھ ہی وابستہ سمجھتے ہیں۔ یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں، لیکن اس کے لیے اس زندگی کو دور تک پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جب تک آپ زندگی کو جس کا تعلق پیدائش اور موت کے درمیانی حصوں سے نہیں، بلکہ زندگی کے اس لامتناہی سفر کے ساتھ ہے، جو Here سے Hereafter تک چلا جاتا ہے تو ان بے چاروں کو یہی زندگی اور اسی کا علم ہے، اور اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس لیے وہ اکثر و بیشتر یہی کہتے رہے کہ کسی طے شدہ، کسی مخصوص، کسی گروہِ انسانی کے آپس کے تعلقات، ان کے اعتقادات، ان کے کھیل کھلونے، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کی جرات و صداقت۔ ان کے کلچر کا حصہ ہیں۔ اور حصہ بنتے ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ واقعی یہ بات ٹھیک ہے، اور صحیح ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں جب تک زندگی کے ساتھ آپ موت کو شامل نہیں کریں گے۔ اس وقت تک زندگی کا پورا مقصد، وزن واضح نہیں ہوتا۔ یہ بہت اہم چیز ہے، اور خاص طور پر ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت ہی آسان ہے، جہاں پر ہم اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے

موت خریدتے ہیں، اور Hereafter پر Believe کرتے ہیں۔ اس Definition میں ہم اگر بہت پیچھے جائیں، اور اس کو ٹٹولنے کی کوشش کریں کہ کلچر دراصل کیا ہے تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ میلادِ آدم سے لے کر اب تک انسان قدیم زمانے میں پتھر و دھات کے زمانے سے بھی پہلے زمانے میں انسان پہلی دفعہ اکیلا بیٹھ کے یہ سوچنے پر مجبور ہوا، اور اس نے اپنی ذات کے ساتھ پانچ بہت اہم سوال کیے، اور اس کا جواب نکالنے کی کوششیں کرتا رہا۔ پہلا سوال اس کا یہ تھا کہ:

"یہ جو میرے ارد گرد کائنات ہے، یہ سورج، چاند، بادل، ستارے، بجلی، زلزلے، طوفان، سمندر، یہ کیا ہے؟ اور یہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟ اور کیسے آئی ہیں۔" دوسرے اس نے یہ سوچا کہ "میں خود کون ہوں، اور میں کہاں سے آیا ہوں، اور ان ساری چیزوں کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟ اور کس Relatedness کے ساتھ میں ان کے درمیان زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

تیسرا سوال اس نے یہ سوچا:

ابھی جو میرے ساتھ مچھلی پکڑنے جایا کرتا تھا، میرا ماموں، میری ماں کا بھائی، وہ کہاں چلا گیا اچانک، اور میری ماں کیوں روتی رہتی ہے، اور ہم اس کو پتھروں

میں رکھ کے واپس چلے آئے ہیں۔ وہ کیا ہوا۔ اور اگر وہ اس طرح کا زندہ نہیں رہا، تو کیا اس طرح کا زندہ ہے جس کا میں شعور نہیں رکھتا اور اگر وہاں اس کی زندگی بھی کچھ ہے، تو کیا اس زندگی میں کوئی Audit Objection ہوتا ہے کہ پیچھے کیسی زندگی بسر کرکے آیا ہوں یا نہیں۔

یہ پانچ سوال انسان کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ میرے، آپ کے، ہمارے، ہمارے پرکھوں کے، ہمارے بزرگوں کے، اور انہوں نے ان پانچ سوالوں کے جواب اپنی اپنی استعداد، اور اپنی اپنی سوچ، اور اپنے اپنے مشاہدے، اور تجربے کے مطابق نکالے۔

اب خواتین و حضرات! میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس گروہِ انسان نے ان پانچ سوالوں کے جواب ایک طرح کے نکالے ہیں۔ ان کا کلچر ایک ہے، اور جنہوں نے اس کے جواب، اور طرح سے نکالے ہیں۔ ان کا کلچر مختلف ہے۔ یہ سیدھی سی ایک تقسیم ہو گی۔ ہم سے کوتاہی یہ ہوئی ہے، اور ہوتی رہی ہے، کہ ہم طرزِ بود و باش کو، زندگی بسر کرنے کو، رہن سہن کو، معاشرت کو، کلچر سمجھتے ہیں، اور آج تک یہی سمجھتے آئے ہیں کہ معاشرت یہ ہے کہ ہم کیسے رہ رہے ہیں۔ گانا بجانا مہندی بیاہ اسی کو کلچر سمجھتے ہیں۔ یہ یقیناً کلچر کا ایک حصہ ہو سکتا ہے، لیکن سارا

نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پانچ سوال جو ہیں، وہ اس سے مختلف ہیں، اور اس سے ماورا ہیں۔ اب جب پانچ سوالوں کے جواب آپ نے تو نہیں نکالے، آپ کے بڑوں نے نکالے ہیں، اور ورثے کے طور پر دے دیئے تو پھر آپ کے لیے یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ مل کر رہیں اس طرح سے، جس طرح سے، ان لوگوں کے گروہ نے سوالوں کے جواب نکالے۔ آپ کے اپنے ہیں، اُن کے اپنے ہیں۔ آپ ایک زمین پر بڑی آسانی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن سوالوں کے جواب کے حساب سے آپ کا کلچر اور ہو گا۔ ان کا کلچر اور ہو گا۔ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کوئی کہے گا کہ بابا دیکھو ہم بھی وہی گانے گاتے ہیں۔ ہمارے فوک Folk Songs بھی وہی ہیں۔ ہم بھی گانا گاتے ہیں۔ "جتی کھل دی مروڑا نہیں جھل دی۔" وہ بھی یہی گاتے ہیں۔ ہم بھی مہندی پر وہی گاتے ہیں تو ہمارا کلچر ایک ہی ہوا۔ نہ نہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے فوک گیت ایک جیسے ہیں۔ آپ کے رہنے سہنے کا آپ کا بود و باش کا طریقہ ایک ہو سکتا ہے۔ آپ کا لباس، لیکن ہر گز ہر گز آپ کا کلچر جس کو آپ ثقافت کا نام دیتے ہیں، وہ وہ نہیں ہے، اور بالکل مختلف ہے۔

پھر آپ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یا آپ خود اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ "کیا ایک ہی سرزمین میں رہتے ہوئے، اور ایک سا پانی پیتے ہوئے، ایک سے

روٹی کھاتے ہوئے، اور ایک ہی معاشرت بسر کرتے ہوئے، اور ایک اندازِ زیست اپناتے ہوئے، کیا ہمارے اندر ایک ہی Intervene نہیں کر جاتا۔ آپ اس میں مدغم نہیں ہو جاتے ان کے ساتھ۔ تو آپ اسے جب کبھی آپ کو موقع ملے۔ غور سے دیکھیں گے کہ باوجود اس کے معاشرتی انداز، رہنے سہنے کا طریقہ، یہ بالکل ایک جیسا ہے، لیکن پیچھے، پس منظر میں ہمارے لاشُعور سے بھی بہت پیچھے ہمارے آرکی ٹائپ (Archetype) نے جو طے کیا تھا، ہم اس کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باوجود اس کے ہمارا روزمرہ کا چلن بظاہر نظر آتا ہے کہ ہم اس طرح کے لوگ لیں، جس طرح کے ہیں۔ اب آپ کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ گزرا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب کسی عظیم بڑے کلچر کا دباؤ آپ پر پڑا۔ آپ پر، خاص طور پر اس کمیونٹی پر، جس میں آپ رہ رہے ہیں، اور اس نے قبول کیا، اور اپنے کئی سوالوں کے جواب نکالے ہوئے چھوڑ کے اس نے نئے سوالوں کے جواب اپنا لیے۔ اور اس نے کہا، آج سے میرا ایمان یہ ہے، جو سوالوں کے جواب ہیں تو آپ میں بالکل تبدیلی پیدا ہو گی۔ اب کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہوئی کہ جس طرح سے ایک نہایت ترش آم کے اوپر ثمر بہشت کا پیوند لگتا ہے۔ اکثر لوگ آپ سے یہ کہتے ہیں، ہماری Grass roots ہمارا جو درخت ہے اس کی روٹس تو وہی چلی آ رہی ہیں، اور اس کا تنا بھی وہی ہے لیکن

اب ہم پہچانے جاتے ہیں کہ ثمر بہشت کے درخت کا طور پر اب ہم کھٹی امبی نہیں ہیں۔ تو جب بھی کوئی کسی سے کہے گا، یہ ثمر بہشت کا درخت ہے، اور جب آپ پھل لائیں گے، ہر سال پھل دیں گے۔ جب جب بھی دیں گے تو اس کا پھل اُس پھل سے مختلف ہو گا جو پہلے ہوا تھا۔

اب یہ اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا دوسرے کلچر، اپنے کلچر پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دوسرے رہن سہن بود و باش تو اثر انداز ہوتے ہیں، اور وہ تو آپ اپنی روزمرہ زندگی میں تبدیلیاں کر لیتے ہیں، لیکن آپ کے کلچر کا جو مضبوط تنا ہے، وہ قائم رہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ خواتین و حضرات آپ کی جڑیں جو ہیں، وہ پرانی چلی آرہی ہیں۔ میں نے پیوند کی مثال دی، یہ ذرا سی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر کبھی ایک خطہ زمین پر، ایک چھوٹے سے خطہ زمین پر، پانچ مرلے کی جگہ پر دو درخت ہوں، ایک جامن کا ہو اور ایک آم کا ہو، اور دونوں درختوں کے پتے، اور شاخیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوں، اور دونوں درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ کھا کے تنومند ہو رہے ہوں، اور آکسیجن چھوڑ رہے ہوں۔ دونوں درخت اتنے قریب ہوں کہ شاید نیچے ان کی جڑیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوں، اور چکر کاٹتی ہوں۔ اتنی قربت اوپر بھی، نیچے بھی، ہوا کے لینے میں بھی، نشوونما حاصل

کرنے میں بھی، پانی بھی اُسی جگہ کا لے رہے ہوں، اور یہ سب چیزیں لینے کے با وصف آم جب اپنے سوالوں کے جواب نکالے گا تو، اور نکالے گا، جامن جب اپنے سوالوں کے جواب نکالے گا تو اور نکالے گا۔ حالانکہ وہ ایک ہی جگہ پر ہیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہو گا کہ جڑوں کے آپس میں ملنے پر کوئی کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی فرق، تبدیلی نہیں آسکتی۔ شکل وصورت، اس کے پتے چھال سب جیسے نظر آئیں گے۔ آپ کہیں گے۔ لیکن جواب نکالنے میں فرق پڑ جائے گا۔ جواب وہی ہو گا اس کا، جو چلا آرہا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا، اور کہا جاتا ہے کہ اگر ہم اپنے پرکھوں کو دیکھیں، تو ان میں یہ بات آپ کو نظر آئے گی کہ ان کی تہذیب، ان کا تمدن جو ہے وہ آپ کے اوپر اثر انداز ہوتا ہے ان جڑوں کے ذریعے سے۔

تو ایک روز میں نے اس پاتال میں جانے کی کوشش کی جو Grass Roots کے حوالے سے مجھ کو نیچے لے جا سکتا تھا۔ تو میں بہت نیچے اتر گیا۔ اتنی دور کہ میں ہڑپہ بھی کراس کر گیا۔ موہنجو داڑو بھی کراس کر گیا، اور آگے جا کر میں نے دیکھا، ایک بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس کا دروازہ، اور وہاں ایک چوب دار گیٹ پر تھا۔ اس نے کہا، تم کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا، میں اندر جا رہا ہوں۔ اس شہر میں داخل ہونے۔ اس نے کہا، نہیں تمہیں پہلے بتانا پڑے گا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا، میں انسان ہوں۔ اس نے کہا، انسان کوئی شناخت نہیں۔ تم بتاؤ تم کس

نسل سے، کس ورن سے تعلق رکھتے ہو۔

میں نے کہا، میں انسان ہوں۔ اس نے کہا نہیں، یہاں تم برہمن ہو یا کھتری ہو یا ویش ہو یا شودر۔ تو بتاؤ تم کون ہو؟ تو میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں برہمن ہوں۔ میں نے کہا، میں ویش ہوں۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ اپ اندر چلے جائیں، اور آپ کو اجازت ہے۔ آگے ایک اور چوب دار کھڑا تھا۔ اس نے کہا، بہت اچھا تُو آ گیا۔ مہاراج ادیراج کا جو ہاتھی ہے، وہ نکلنے والا ہے جو چکر لگائے گا تُو اس کے پیچھے ڈھولک بجاتا ٹل بجاتا جا، کیونکہ مہاراج کی پوجا جو ہے۔ وہ ضروری ہے ہمارا حصہ ہے۔ تو میں نے اس کے ہاتھ سے گھڑیال لے لیا، اور اس کے پیچھے پیچھے بجاتا چلا، اور بھی نوجوان لڑکے تھے۔ مہاراج کے ساتھ سارے شہر کا جو چکر تھا، وہ ہم نے پورا کیا۔ واپس آ گئے۔ تھکا ہارا شام کے وقت جب میں اپنے گھر گیا تو میری ماں نے مجھ سے کہا کہ تیری بہن کا شوہر یعنی تیرا بہنوئی فوت ہو گیا تو تیری بہن جوان ہے، طاقتور ہے، تیرا باپ بڈھا ہے۔ ہم نے اس کو اٹھا کر چتا میں پھینکنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ مانتی نہیں ہے۔ تُو آ گیا ہے اس کو پکڑ۔ اس کو چتا میں پھینک، تو میں نے اس کو اٹھایا، میں طاقتور آدمی تھا اور لے جا کر جلتی ہوئی چتا میں اس کے خاوند کے ساتھ بھسم کر دیا۔ اور یہ سین اپنے بہت پاس سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا، یہ تفریق انسانوں کے ساتھ چلی جا رہی

ہے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھ کو یہ حکم مل چکا ہے کہ گورے کو کالے پر، اور کالے کو گورے پر، عجمی کو عربی پر، اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اور آج سے چودہ سو برس قبل، یہ ڈیموکریسی تو آج آئی ہے نا، ہم مانیں یا نہ مانیں۔ اب یہ بات الگ ہے کہ ہم اس پر عمل کر سکیں، یا نہ کر سکیں۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے۔ جس دن ہمارا پیوند لگا تھا ثمر بہشت کا، اس کے ساتھ ہی یہ پرچی ٹانک دی گئی تھی میں یہ سمجھتا ہوں۔ ہماری امت اتنی مختلف ہے۔ دنیا کی ساری امتوں سے کہ اس کے اوپر ایک، اور ثقافت کا اثر ہوا، اور شدت کے ساتھ ہوا، اور یہ پورے کے پورے ان کے ساتھ 90 ڈگری کے اوپر گھوم گئے، اور انہوں نے اس سوالوں کے جواب کو اپنا لیا۔ اپنی خوشی کے ساتھ، اور اپنی ایمانداری کے ساتھ، اور اپنے دل کی لگن کے ساتھ کہ آج کے بعد ہم سہی۔

اب ایک مشکل پیدا ہوتی ہے۔ مجھ سے کبھی پوچھتے ہیں کہ جی آپ یہ بتائیں اس طرح سے تو بہت دھچکا سا لگتا ہے نا جی، کیونکہ ہم اکثر یہ سوچتے رہے ہیں کہ یہ ہمارا کلچر ہے جو ہمارے ارد گرد کے لوگ ہیں، جن میں ہم رہتے بستے رہے ہیں، وہ کس طرح سے ایک دم سے ہم سے مختلف ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں، نہیں وہ بالکل مختلف نہیں ہوتے۔ اس کو میں، اور آسانی کے لیے آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ فرض کریں ہم جہاز کے اوپر سمندر کا سفر کر رہے تھے، اور اچانک

سمندر بپھر گیا، اور طغیانی آ گئی۔ اور لہروں کی لپیٹ میں جہاز آ گیا، اور جیسا کہ کہانیوں میں ہوتا ہے، جہاز بالکل تختہ تختہ ہو گیا، اور ہم لوگ ایک ایک تختے پر چمٹ کر ایک جزیرہ قریب تھا، وہاں آ گئے۔ اب مختلف قوموں کے لوگ مختلف بولیوں کے لوگ وہاں جمع تھے تو ظاہر ہے کہ میں نے اس گروہ کی قربت اختیار کی جو میری بولی سمجھتا تھا۔ اس سے آسانی ہوتی ہے اور میں ان کے پاس جا کر بیٹھا تھا، اور جو یہ گانے پسند کرتے۔ "جُتی کھل دی مروڑا نہیں جھل دی" تاکہ مجھے آسانی رہے۔ سارا دن میں ان کے ساتھ گزارتا اور ساری رات۔ تو زندگی اس آس میں اچھی بسر ہو رہی تھی کہ اب کوئی ہمیں آئے گی باہر سے مدد۔ تو ہم شاید اپنے گھروں کو واپس جائیں، لیکن بہت زیادہ وقت وہاں پر گزر رہا تھا۔ میں دن تو ان کے ساتھ گزارتا تھا، اور اپنا سارا وقت بھی ان کے ساتھ گزارتا تھا، لیکن جب مجھے یہ خدشہ محسوس ہوا کہ میرے آخری ایام آ گئے، اچانک مرنے لگا ہوں تو میں نے اپنے انہی لوگوں سے کہا کہ اس گروہ کو جو انڈونیشیا والے ہیں، اور جن کی بولی میں نہیں سمجھتا، ان کے حوالے کر دینا، اور جو سلوک وہ میرے ساتھ کریں مجھے قابلِ قبول ہے، تو وہ ان کے پاس میرا سفر جو Hereafter کی بات کر رہا تھا، وہ میں ان کے حوالے کرتا ہوں، کیونکہ ان لوگوں نے سوالوں کا جواب وہی نکالا ہوا ہے، جو ہم نے نکالا ہوا ہے۔

میں آپ کے ساتھ زبان کے حوالے سے بات چیت کرتا ہوں اور میں بڑا خوش ہوں۔ بڑا احترام بھی کرتا ہوں آپ کا اور آپ سے ملتا جلتا بھی ہوں۔ چنانچہ جب بڑا فیصلہ آئے گا، میرا یا میری نسل کے بڑھنے کا معاملہ ہو گا تو پھر میں ان کے ساتھ تعلق پیدا کروں گا، لیکن جہاں تک بات چیت کرنے کا تعلق ہے۔ میں بسم اللہ حاضر ہوں تو میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ کلچر کا مسئلہ ہمارے لیے یا کم از کم میرے لیے اتنا پیچیدہ، اور مشکل نہیں ہے، اور سوالوں کے جواب سمجھ جانے کے بعد یا ان کو ذہن نشین کرنے کے بعد ذرا آسانی کے لیے میں نے یہ عرض کیا ہے۔ یہ آئندہ کے لیے، اور آپ کے لیے اس میں کوئی زیادہ الجھن نہیں رہنی چاہیئے۔ زندگی کے بارے میں اکثر یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ

"Matter of life and death where it is matter of birth and death."

کیونکہ Life کا جو ریلا ہے، وہ چلتا چلا جا رہا ہے۔ یہ جو موت ہے، میں نے پہلے اس کا ذکر کیا۔ اس کی بڑی اہمیت ہے، جو Warrior (جنگجو) ہوتا ہے، جو صاحبِ سیف ہوتا ہے، وہ بڑا مضبوط آدمی ہوتا ہے، اور وہ اپنی موت کے ساتھ ایک رشتہ، اور ایک تعلق ہر وقت قائم رکھتا ہے۔

خواتین و حضرات! اگر آپ نے بہت قدیم فرقوں کے بارے میں، بہت قدیم نسلوں کے بارے میں، کچھ اینتھروپالوجیکل اسٹڈی کی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جو Red Indian تھے، امریکہ کے اصل باسی، ان میں بڑی عجیب و غریب صلاحیتیں موجود تھیں، وہ ہماری طرح سے یا ہم سے تھوڑا سا زیادہ ہی اپنی موت کے ساتھ وابستہ رہتے تھے۔ ایک اینتھروپالوجسٹ کارلوس کوپیبزا جو تھا، وہ گیا کچھ ایسی تحقیق کرنے کے لیے پرانے ساؤتھ امریکی سے ملنے۔ اپنے دشمن سے۔ یہ لمبی کہانی ہے، مختصر عرض کروں، اس نے جو باتیں بتائی ہیں یا بیان کی ہیں، یہ سب اچھی ہیں۔ اُس کا نام ڈان جوان ہے۔ امریکی اسے کہتا ہے! میں یہ پوچھتا ہوں۔ ہماری زندگیوں میں ہم جو شہری لوگ ہیں، جن کا تعلق امریکہ کی طرزِ زندگی سے ہے، ہم بہت گھبرا جاتے ہیں۔ ہمارے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں، تو بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتے تو اس کا کیا کریں، اس ریڈ انڈین نے کہا، سوال اتنے پیچیدہ تو نہیں ہیں جتنے تم نے بنا لیے ہیں۔ اس نے کہا، دیکھو فرض کرو۔ میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اور میری زندگی میں ایک دوسری لڑکی آ گئی۔ اب میں فیصلہ نہیں کر پاتا، اور میں اپنے آپ کو بے ایمان بھی نہیں ٹھہرانا چاہتا۔ میں دغدغہ (Confusion میں بھی ہوں۔ میں کیا کروں؟ تو آپ مجھے رائے دیں۔

اس وقت کیسے کرتے ہیں، اور آپ لوگ جو قدیم Red Indian ہیں، اور جو ایک Separate Reality کے حامل ہیں۔ اس نے کہا، او ہو یہ تو بڑا اسید ھا سا معاملہ ہے۔ جب ایسی مصیبت پیش آئے، جب کبھی ایسی دغدغہ میں ہو تو ہمیشہ اپنی موت سے پوچھو۔ اب مسئلہ آگیا، اس سے وہ کیسے پوچھیں؟ اس نے کہا، ہر آدمی کی موت جو ہے، وہ پانچ فٹ کے فاصلے پر لفٹ ہینڈ سائیڈ پر ساتھ ساتھ چلتی ہے، کیونکہ وہ اس کو protect کرتی ہے۔ جو خدانخواستہ فوت ہو جائے تو موت پاس موجود نہ ہو تو وہ تو مارا گیا۔ لائن حاضر ہو گیا تو اس کی موت کا فرض ہے ساتھ رہے۔ چنانچہ کہنے لگے، اس سے پوچھا جانا بہت ضروری ہے، تو تم کبھی بھی اس سے سوال کر کے پوچھو۔ اس نے کہا، کیسے جواب دے گی۔ تو کہا، پہلے تمہیں Emotionally Vibration کا پتا چلے گا۔ پھر ایسا موقع بھی آنے لگا ہے کہ ہمارے بڑوں کی زندگی کو وہ بالکل Vocal ہو کر بات بتا دیتی ہے کرنا ہے یا نہیں کرنا۔

تو انسانی زندگی کو اس زندگی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ Here ، اور Here after جب ملتا ہے تب جا کر یہ سفر مکمل ہوتا ہے یا زندگی یا حیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی، اور شکریہ آپ کا بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ

حافظ۔

تعریف و توصیف

میں آپ کی خدمت میں اپنا، اور اپنے ساتھیوں کا سلام تو پہنچا دیا کرتا ہوں، لیکن میں نے جائزہ لیا کہ شکریہ ادا کرنے کے معاملے میں میں بھی تھوڑا بخیل ہوں اور جن لوگوں کے درمیان میں رہتا ہوں، ان میں بھی یہ عادت بیدار نہیں کی جا سکی۔ اس کی پتا نہیں کیا وجہ ہے۔ ہم بہت اچھے لوگ ہیں، پیارے لوگ ہیں۔ اچھی خوش بختی کا سامان مہیا کرتے ہیں ایک دوسرے کے لیے، لیکن تعریف و توصیف کے معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ رواج بھی بن نہیں سکا اور ہم نے اس کے بارے میں غور نہیں کیا کہ تعریف و توصیف بھی واجب ہے۔ کہیں واجب نہیں ہے تو بھی کی جانی چاہیئے تا کہ انسانوں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی، اور ایک Unity پیدا ہو۔ بد قسمتی سے ہمارے یہاں آدمی کے چلے جانے کے بعد اس کی تعریف ہوتی ہے۔ اگر آپ لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں جا کر دیکھیں تو بہت سے کتبے آپ کو

ایسے نظر آئیں گے جن کے اوپر مرحوم کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات لکھی ہو گی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ توصیفی کلمات بھی ہوں گے۔ اب وہ بیچارہ باہر نکل کر تو نہیں دیکھ سکتا کہ کتبے پر کیا لکھا ہے، یہ تو اس کے کام نہیں آیا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کی کچھ تعریف و توصیف ہو جائے تو اس کو کچھ سہارا ہو۔ اس کو پتا چلے کہ میرے ارد گرد رہنے والے لوگ جو ہیں، وہ بہت تقویت عطا کرنے والے لوگ ہیں۔

ایک واقعہ ہے۔ نبی کریم کے پاس کچھ صحابی آئے۔ کچھ صحابی وہاں پہلے تھے۔ نئے آنے والوں نے عرض کی، یا رسول اللہ یہ جو آپ کے صحابی ہیں۔ یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں اور یہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں ان سے زیادہ متعارف تو نہیں ہوں، لیکن یہ بہت دل والے ہیں۔ حضورِ اکرم نے فرمایا کہ کیا آپ نے ان سے یہ بات کہی تھی، انہوں نے کہا کہ جی میں نے تو نہیں کہی تھی۔ کہنے لگے فوراً جایئے۔ ان کے پیچھے، اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہیئے، آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، مجھے پیارے لگتے ہیں۔ تو وہ ان کے پیچھے بھاگے، اور جا کے کہا کہ میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ تو انہوں نے ظاہر ہے، محبت کا جواب محبت سے دیا ہو گا۔ ہمارے ہاں محبت کی کچھ کچھ کمی ہو رہی ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں نہیں ہے، میرے خیال میں ہمارے دلوں میں تو کافی محبت ہے۔

ہمارے لوک گیت، اور لوک داستانیں بتاتے ہیں۔ ہم بڑی محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ لیکن زبان سے اظہار نہیں کرپاتے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے، اور تعریف اور توصیف کا اظہار، بے اختیار، بے ساختہ ہونا چاہیے۔ کتابوں کی رونمائی ہوتی ہے، تعریف و توصیف کی جاتی ہے مصنف کی۔ کتاب کی۔ وہ ایک طرح سے زبردستی کی تعریف ہوتی ہے۔ اچھی بات ہے وہ بھی ہونی چاہیئے۔ اب دیکھیئے کسی نے کتاب لکھی ہے جیسے کہ وہ صاحبِ اولاد ہوا ہے، صاحبِ کتاب جو ہوا ہے، تو جو صاحبِ اولاد ہو، اس کے گھر جا کر ودھائی تو دینی پڑتی ہے نا، اور بعض اوقات تو یہ تعریف و توصیف آپ کا سہارا بھی بنتی ہیں، آپ کی مدد بھی کرتی ہیں۔ آپ کو محفوظ بھی رکھتی ہیں۔

ہمارے ایک پروفیسر تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے، دیکھو جب آپ ہوٹل میں جائیں یا ریستوران میں جائیں، اور کھانا کھائیں، اور آپ کسی وجہ سے ناراض ہوں تو آپ بلا کر ہوٹل کے منیجر کو جو چاہے کہہ لیں، کوئی اس میں بری بات نہیں ہے۔ ریستوران کے مالک کو بلا کر ذلیل و خوار کرلیجیئے کوئی بات نہیں، لیکن خدا کے واسطے کبھی بیرے کے ساتھ سختی سے پیش نہ آیئے گا، کیونکہ اگر آپ بیرے سے سختی سے پیش آئیں گے تو اس کا نتیجہ بڑا خطرناک نکل سکتا ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ میں نے دیکھا، یہاں ایک بڑے ہوٹل میں دو بیرے اپنی اپنی

سینی جو ہوتی ہے، تھالی لیے چوکھٹ کے ساتھ لگے کھڑے تھے، اور ایک صاحب بڑے جنٹلمین کھانا کھارہے تھے۔ ایک بیرے نے دوسرے بیرے کو بلا کر کہا، وہ دیکھو کھا گیا، کھا گیا۔ پتا ہی نہیں لگا اس کو تو۔ تعریف و توصیف اس اعتبار سے فوائد پہنچانے والی چیز بھی ہے۔ ہمارے ہاں البتہ اس کی بہت کمی ہے۔ جس کی طرف میرا خیال ہے توجہ دی جانے چاہیئے۔ دوکاندار اور گاہک کے درمیان شکریہ کا جو چلن ہے وہ نہیں ہے۔ جب آپ پٹرول لیتے ہیں تو اس لڑکے سے جس نے آپ کا پٹرول ڈالا ہے، کبھی آپ نے شکریہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ آپ بڑے آدمی ہیں، تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے شکریہ ادا کرنے کی۔ کیونکہ ہمارے یہاں پر بڑے عرصے سے حکمرانی رہی ہے، بڑے بادشاہوں کی، پھر کمپنی بہادر کی، اور ہم نے یہ طریقہ کار، اور چال چلن سیکھا ہی انہی سے ہے۔ شکریہ ادا کرنے سے آدمی مفرح ہوتا ہے، اور اس کی روح پر، اور اس کے وجود پر، اور اس کی شخصیت پر، اور اس کی فردیت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہ ہمیں ہمارے بڑوں نے ہمارے اُستادوں نے سکھایا ہی نہیں۔ ان کو Thank You کہنا سکھایا ہی نہیں گیا۔ اگر بتایا جاتا تو ہم یقیناً اس کا پالن کرتے۔ جو ہمارے پروفیسر تھے جن کا میں نے ذکر کیا، وہ پروفیسر نہیں تھے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، یعنی استاد الاساتذہ، اور استادِ مکرم تھے، یعنی پروفیسر کے اوپر کی ڈگری

تھی، وہ تشریف اسی لیے لائے تھے کہ سٹاف روم میں پروفیسر حضرات سے ملیں، اور ان کو زندگی آموز، اور زندگی آمیز چیزوں سے روشناس کرائیں۔ تو وہ کہا کرتے تھے کہ دیکھو یہ انسانوں کی بات ہے۔ جب کبھی پودا زمین سے اکھاڑو تو پہلے اس سے اجازت لو کہ میں تمہیں اکھاڑنے لگا ہوں، اور میں تمہارا بڑا احترام کرتا ہوں، اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں اکھاڑوں گا، تمہیں اپنے استعمال میں لاؤں گا، لیکن اس کے ساتھ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔ میں جب مٹ جاؤں گا، میں جب کھاد بن جاؤں گا تو تیری نسل کے تیرے خانوادے کے کام آؤں گا۔ یہ بڑے لوگوں کی بات ہے۔ تو ہمیشہ اس سے اجازت لے کے کہ اس سے محبت کی گفتگو کر کے اکھاڑو، اور پھر فرماتے تھے کہ اس سے ہمیشہ اونچی آواز میں بات کرو۔ "مِن مِن" کر کے نہیں تاکہ اوروں کو بھی سنائی دے کہ آپ اس کے شکر گزار ہو رہے ہیں۔ اسے اکھاڑ رہے ہیں۔ دھنیا کے پودے، پودینہ ہے، بے شمار چیزیں ہیں۔ میں نے کہا، سر کبھی میں نے تو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کیا یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جب میں غور سے دیکھتا ہوں تو ہمارے معاشرے میں ہماری معاشرت میں بھی کبھی ایسے آدمی مل جاتے ہیں جن کے اندر تشکّر کا جذبہ ہوتا ہے۔

کئی سال کی بات ہے، میرے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی جو پٹرول سے چلتی
تھی۔ جسے N. S. U. Quickly کہتے تھے۔ وہ میں نے 925.35 میں
خریدی تھی، اور وہ بڑی طاقتور تھی۔ آج کل کے موٹر سائیکل سے بہت آگے
نکل جاتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب پٹرول ختم ہو جاتا تھا تو
اسے سائیکل کی طرح پیڈل مار کر چلا سکتے تھے۔ جرمنی کی بنی ہوئی تھی۔ مجھے بڑی
مہربانی سے ڈائریکٹر آف انڈسٹری نے پرمٹ دیا تو ہم نے 935 روپے اکٹھے کر
لیے، ساتھ کچھ پیسے دیئے اور خریدی۔ یہ کافی دیر کی بات ہے 61-1960 کی تو
میں اس کو چلاتا تھا۔ ایک دفعہ چلاتا ہوا اس کو چلا آ رہا تھا۔ بڑے فخر کے ساتھ
بڑی اچھی سواری تھی۔ لوگ پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے تھے کہ کتنا عزت والا آدمی
ہے۔ اس کے پاس Quickly موٹر سائیکل ہے۔ ایک دفعہ میں آ رہا تھا تو
سنٹرل جیل کے پاس ایک نوجوان تھا۔ اس نے مجھے روکا۔ وہ بُشرٹ پہنے تھا۔
پاؤں میں اس کے چپل تھی، اور پرانی وضع کی ایک جینز پہنے ہوئے تھا۔ اس نے
کہا، جی مجھے آپ جتنی دور تک بھی لے جا سکتے ہیں، لے جائیں۔ میں نے کہا ٹھیک
ہے آیئے بیٹھیے۔ لیکن وہ مجھے تھوڑا سا مشکوک سا لگا تو میں نے کہا، آپ یہاں
کہاں تھے؟ تو اس نے کہا، جی میں اپنے کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔ یہاں سے جیل
سے۔ میں پرسوں رہا ہوا تھا مگر میں اپنی چٹ بھول گیا۔ پتا نہیں کیا چیز تھی۔ میں

نے کہا، یہاں آپ قید تھے ؟ کہنے لگا، ہاں جی میں بہت مشہور جیب تراش ہوں۔ گرہ کٹ۔ وہ کہنے لگا جی میر اعلاقہ جو ہے وہ مصری شاہ ہے۔ مصری شاہ ایک علاقہ ہے لاہور کا میں وہاں کا ہوں۔ مجھے پکڑ کر انہوں نے زبردستی مقدمہ کر دیا میرے اوپر۔ حالانکہ میرے خلاف لوگوں کی گواہیاں بھی نہیں تھیں۔ میں نے کہا۔ تم گرہ کٹ ہو تو سہی۔ کہنے لگا، ہاں ہوں تو سہی لیکن اس مقدمے میں میرے ساتھ بے انتہا ناانصافی ہوئی، اور مجھے نو مہینے کی سزا دے دی تو میں نو مہینے کی سزا پوری کر کے اب گھر جا رہا ہوں۔ میں نے کہا، اچھا پھر تو آپ بڑے معزز آدمی ہیں۔ جب آپ نے شرافت کے ساتھ دیانت داری کے ساتھ یہ سارا واقعہ سنایا ہے۔ آپ بیٹھیں۔ وہ پیچھے بیٹھ گیا تو ہم چلتے رہے۔ جب ہم فیروز پور روڈ پر وہاں پہنچے جہاں فیروز پور روڈ آگے جا کر لٹن روڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے، تو وہاں پر جا کر اس نے کہا، آپ ادھر سے چلیں ٹمپل روڈ کی طرف سے۔ میں ادھر چلا آگے۔ درمیان میں پہنچے۔ اس سڑک پر تو سپاہی کھڑا تھا سیٹی بجا کے روک لیا۔ تو اس نے کہا، یہ تو ون وے ہے۔ میں نے کہا، سر یہاں کوئی بورڈ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس نے کہا، نہیں، سرکار کا یہ کام نہیں کہ بورڈ لگائے۔ اس کا کام حکم دینا ہے۔ سرکار نے حکم دیا ہے۔ یہ ون وے ہے تو آپ ادھر سے کیوں آئے۔ میں تو آپ کا چالان کروں گا۔ میں نے بڑی ان کی منت خوشامد کی کہ آپ چالان نہ

کریں، وہ جو تھا میرا ساتھی، وہ بھی اتر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا، سنتری بادشاہ جانے دیں۔ یہ کیا ہے۔ غلطی ہو گئی ہم سے، پتا نہیں تھا۔ اس نے کہا، نہیں میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے کچھ بحث کرنے کی کوشش کی کہ آپ کو باہر بورڈ لگانا چاہیے تھا۔ آپ نے بورڈ نہیں لگایا۔ اس نے کہا بورڈ لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ کسی اور محکمے کا کام ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ اس نے کہا، قانون سے ناآشنائی جو ہے، وہ ہمارا قصور نہیں ہے۔ آپ کا قصور ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ لاہور کی کون سی سڑکیں ون وے ہیں اور کون سی نہیں ہیں۔ تو میں نے کہا، اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ کافی بحث مباحثے کے بعد اس نے کاپی نکالی۔ کاربن رکھا، اور میرا نام پوچھ کے لکھ کے چالان کر کے بھاڑ کے کاغذ مجھے دے دیا، اور کاربن اگلے کاغذ کے نیچے رکھ کے وہ کاپی جو تھی، اپنی بُشرٹ کی جیب میں ڈال لی۔ اب وہ جو میرا ساتھی تھا، جس کو میں پیچھے بٹھا کے لا رہا تھا، وہ بے چارہ ظاہر ہے بڑا پریشان ہوا کہ میری وجہ سے۔ یہ ہوا تو اس نے ہاتھ باندھ کر کہا، سنتری بادشاہ یہ صاحب کا قصور نہیں ہے۔ یہ میرا قصور ہے۔ میں ان کو اس طرف لے آیا تھا، تو آپ ان کو خدا کے واسطے معاف کر دیں۔ اس نے کہا، نہیں، قانون قانون ہے۔ وہ میرا ساتھی اس کے گلے لگ کے جپھی ڈال کے پھر کھسک کے نیچے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ پاؤں سے پھر اونچا اٹھا، پھر اس کو دیئے خدا کے واسطے، اس نے پرے

دھکیل دیا۔ تو اس نے کہا، ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ کوئی بات نہیں۔ سپاہی نے بتا دیا کہ فلاں مجسٹریٹ کی عدالت میں بدھ کے روز حاضر ہونا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ تو جب پھر میں موٹر سائیکل چلانے لگا تو ہم دونوں ہی بڑے پژمردہ تھے۔ پھر اس نے کہا مجھے بھاٹی کی طرف لے چلیں۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے، جہاں چاہو لے چلو۔ بھاٹی کے باہر اتار دیں۔ پھر وہاں سے میں اپنا کوئی بندوبست کر کے چلا جاؤں گا۔ جو جب میں بھاٹی پہنچا۔ تو اس نے کہا، میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں۔ آپ نے بڑی محبت کے ساتھ، محنت کے ساتھ، اور بڑی دید کے ساتھ مجھے یہاں تک پہنچایا۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، اور اس نے کہا، میں آپ کی خدمت میں کیا شکرانہ پیش کروں، اور پھر اس نے جیب سے نکال کر سپاہی کی کاپی مجھے دے دی، وہ جس کے اوپر چالان لکھتے ہیں نا، جس میں نیا کاربن بنا کے رکھا ہوا تھا، جس میں میرے بھی چالان کی نقل تھی، یہ آپ کی۔ یہ آپ کی۔ جب وہ جپھی ڈال رہا تھا، اس کے نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ اب گرہ کٹ بھی کمال کا تھا۔ انہوں نے کہا، جی میری یہ یادگار آپ رکھیں۔ سارے چالان پاس رکھیں۔ ایسے ہی مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ ایک آدمی کے اوپر جب کسی نے کوئی چھوٹا سا معمولی سا بھی کرم کیا ہو، اس کا ایک بوجھ پڑتا ہے۔ اس بوجھ کی ادائیگی جو ہے، فوری طور پر بہت ضروری ہے کہ کر دی جانے چاہیئے۔ کم از کم شکریہ ادا

کرنا چاہیئے۔ جی بالکل کم از کم شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ ہمارے ہاں رواج نہیں ہے جی، سکھایا نہیں کسی نے۔ اگر ہمیں سکول میں سکھایا گیا تو ٹیچر، اور اسٹوڈنٹ کا جو تعلق ہے یا بڑوں کے ساتھ ہے یا کہیں سے آپ کا کام ہو گیا ہے، لیکن ان چھوٹی چھوٹی جگہوں کے اوپر جہاں میں نے دیکھا ہے، دکانوں کے اوپر کبھی ہم نے شکریہ ادا کیا ہی نہیں۔

اگر ہمیں یہ بات بتائی جائے تو ہم کیا کریں گے۔ جیسے ہمیں السّلام علیکم کہنا بتایا گیا ہے۔ وہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں، میں صبح سیر کرنے جاتا ہوں تو آدمی سلام کیے بغیر ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ ورنہ آپ جا کر دیکھیں فرانس میں خاص طور پر جانتے نہیں ہیں ایک دوسرے کو، لیکن کہتے چلے جاتے ہیں بدستور۔ بڑی محبت، بڑی دلجمعی کے ساتھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں میں نہیں سمجھتا کہ کسی قسم کا بوجھ ہے یا کوئی اس کے اوپر ہمارے اندر جیلسی ہے، یا کوئی جھگڑا۔ ہمارے اندر ایک بات البتہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس مرتبے کا سمجھتا ہے کہ وہ کہتا ہے، میں اس کا کیا شکریہ ادا کروں۔ مثلاً آپ سڑک سے گزر رہے ہیں تو سڑک پر سے گزرتے ہوئے خاکروب جو ہے وہ جھاڑو دے رہا ہے۔ خاکروب عام طور پر اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ جھاڑو روک لیتا ہے، اور آپ گزر جاتے ہیں۔ تو آپ کبھی اس کو شکریہ مہربانی نہیں کہتے ہیں۔ ہمارے بابا

جی نور والے فرماتے ہیں کہ مجھے خاکروب سے بات یاد آئی کہ جب بھی کبھی
دھول اڑاتے ہوئے سڑکیں صاف کرتے ہوئے خاکروب یا خاکروبوں کے گروہ
کے درمیان سے گزرو تو کبھی ناک کے اوپر رومال نہ رکھو یا ہاتھ نہ رکھو، کیونکہ وہ
بھی انسان ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں، اور آپ ناک رکھ کے ان کی تذلیل کر رہے
ہیں۔ کہ دیکھو میں ایک بڑا سپیریئر آدمی ہوں۔ میں ایک افضل آدمی ہوں۔
میں جب سانس لیتا ہوں تو اس گرد میں نہیں لیتا جس میں تم لیتے ہو تو اس لیے
وہاں سے ویسے ہی گزرو۔ ہم چونکہ ہمیشہ بیچ میں حجت کی بات کوئی نہ کوئی نکالا
کرتے تھے، تو ہم کہتے تھے کہ حضور۔ ہمارے بڑے کہتے ہیں کہ آکسیجن کو
Inhale کرنا چاہیے، گرد و غبار سے بچنا چاہیے۔ کہنے لگے، زیادہ سے زیادہ یہ کر
سکتے ہو کہ جب ان کے درمیان سے گزرو تو سانس روک کر گزرو، لیکن یہ نہیں
کرنا چاہیئے کہ آپ اپنی مٹھی بنا کر ناک پر ہاتھ رکھ کر گزریں۔ ان کو انسان
سمجھیں۔ ہمارے لیے یہ نیا درس تھا کہ ان کو انسان سمجھنے کی کوشش کی جائے۔
ہمیں یہ بتایا نہیں تھا کسی نے، کیونکہ ہمارا ایک برہمن سسٹم ہے جو ہندوؤں سے
مُستعار لیا ہے ہم نے۔ کیونکہ برہمن، کھتری، ویش، شودر یہ سلسلے ہیں ارفع
آدمی ہونے کے۔ ایک چھوٹا ہوتا ہے، اور ایک اس سے چھوٹا ہوتا ہے، جبکہ
ہمارے ہاں یہ جو حکم دیا جا چکا ہے، آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے کہ بنی نوع

انسان ایک نفس، ایک آدمی کی اولاد ہیں، اور عربی کو عجمی پر اور عجمی کر عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر، لیکن بد قسمتی سے ہم اس درس کے قریب ایک صاحب حال ہونے کی حیثیت سے نہیں گزرے، صرف اکتسابی طور پر ہم نے پڑھا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے۔ اسی کو لے کر آگے چلتے رہے ہیں۔ مجھے اپنے وہ استاد ماسترو یاد آرہے ہیں کہ کئی دفعہ چھٹی کے دن یا جب آدھی چھٹی ہوتی تھی، یونیورسٹی میں، تو ہم پروفیسر ان سے درخواست کرتے تھے کہ آپ ہم کو ساتھ لے کر چلیں، اور ہم اپ کی معیت میں گھومنا چاہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کے اندر سے لے کر گزرتے ایک نالہ آتا تھا۔ ایک برساتی نالہ کہہ لیں، اس کے اوپر کوئی پندرہ بیس فٹ لمبا پل ہو گا۔ پرانی وضع کا جیسے آپ نے دیکھا ہو گا، ہمارے شمالی علاقوں میں۔ تو جب ہم اس کے اوپر سے گزرے باتیں کرتے ہوئے، اٹکھیلیاں کرتے ہوئے، گپیں کرتے ہوئے تو ماسترو بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم گزر چکے اُس پُل پر سے تو وہ گھومے۔ کہنے لگے Thank you very much. Thank you پُل کا شکریہ ادا کیا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ جب بھی کبھی پل پر سے گزرتے تھے یا کسی ایسی مشکل اوگھٹ گھاٹی سے تو اس کا شکریہ ضرور ادا کرتے تھے۔ میں اس سے گزرا ہوں تو ان کی محبت کہ یہ پہلو، اور ان کی نرت اتنی

خوبصورت ہوتی تھی کہ جب وہ پلٹتے تھے ناہاتھ اٹھاتے شکریہ ادا کرنے کے لیے، جی چاہتا تھا کہ ہماری راہ میں ایسی مشکلات آتی رہیں کہ شکریہ ادا کرنے کے لیے کیسے کیسے رموز ہیں، اور اس کے کتنے کتنے زاویے ہیں، اور کیسے کیسے ان کے پہلو ہیں۔

میں یہ آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ہمیں بدقسمتی سے بتایا نہیں گیا۔ ورنہ ہم کافی اچھے لوگ ہیں۔ میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم میں کافی خوبیاں ہیں، ہم محنتی لوگ ہیں۔ آپ نے دیکھا، چاہے گھر میں ہم محنت نہ کریں، باہر جا کر بحرین، امریکہ، دوبئ میں ہم نے وہاں اپنا سکہ کمال دکھایا ہے۔ یہاں بھی بڑی تیزی کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اور انشاء اللہ تعالیٰ اپنے ملک کو بھی Build کر کے رہیں گے۔

میں معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے سیاستدانوں نے ہماری ایک ہی ٹریننگ کی کہ اپنا حق حاصل کروں اور کرنے کے لیے لڑو، اور کوشش کرتے رہو۔ کسی نے اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ اگر آج سے، اس تاریخ سے یعنی 1999ع میں یہ شروع کر لیا جائے کہ کچھ ہمارے حقوق ہیں، کچھ ہمارے فرائض ہیں، اور یہ ہم پورے کریں گے، اور پھر ہم اپنے حقوق مانگیں گے تو فائدہ ہو گا۔ میں پھر

دبی زبان میں عرض کروں گا کہ ہمارے سیاستدانوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ اگر دی ہو گی تو دوسری طرف لے جانے کی دی۔ اب اگر ان کو خیال آ جائے، اور ہم پر مہربانی فرمانا چاہیں تو ہم کو فرائض کی طرف بھی متوجہ کریں۔ میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں، اپ کی طرف سے، اور سارے Viewer's کی طرف سے کہ ہم اپنے حق ادا کرنے میں بھی خدا کے فضل سے فرائض ادا کرنے میں بھی ویسے ہی ثابت ہوں گے جیسے کہ ہم اپنے حقوق مانگنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے سسٹم میں خرابی ہے۔ سسٹم میں خرابی نہیں۔ سسٹم میں بے خیالی ہے۔ ان ڈیفرنس (Indifference) ہے۔ اگر آپ یہ پورا تہیہ کر لیں ایک فریم ورک کے اندر اندر میں "آپ" ہم سارے تو پھر وہ سسٹم جو کہ خراب سسٹم ہے، وہ رہتا ہی نہیں۔ اور وہ رواں دواں قافلہ ہو تا جاتا ہے تخلیقات کی طرف۔ لیکن لڑکیاں تو شکریہ ادا کرتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کا شکریہ ادا کرتی ہیں یا نوکروں کا بھی کرتی ہیں۔

آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ یہاں تشریف لائے، اور خواتین و حضرات کا اس سے بھی زیادہ شکریہ کہ آپ نے اس پروگرام کو برداشت کیا۔ پھر انشاء اللہ،

اگلی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔اور کچھ مزید ایسی ہی باتیں کریں گے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اندر کی تبدیلی

یہ ایک بڑی خوشگوار صبح کا ذکر ہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بری شدت کا جاڑا تھا اور بڑی روشن صبح طلوع ہو چکی تھی۔ ہم ڈیرے پر موجود، بابا جی نور والے سے ان کی کچھ باتیں سننے کی آرزو لے کر بیٹھے تھے۔ جب میں آپ سے ''ڈیرے'' کا یا ''بابا'' کا ذکر کرتا ہوں تو آپ کو سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اگر اس کی بجائے یہ کہتا کہ ہم ایک روز انسٹیٹیوٹ آف ہیومن ریلیشن کے لان میں بیٹھے تھے، اور ہمارے ڈائریکٹر مسٹر بشکنی ہم کو Relatedness ٹو ہیومن ریس کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے تو آپ کو سمجھنے میں غالباً آسانی ہوتی۔ بات یہ ہے کہ الفاظ کی بھی اپنی دنیا ہے۔ پہلے واضع طور پر، الفاظ کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسے گل کے معنی پھول ہیں یا آہن کے معنی لوہا ہیں، یا بالِ جبریل کے معنی جبریل کے پَر ہیں۔ لیکن الفاظ کے معنی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی اپنی شخصیت بھی ہے۔ ان کا ایک قد و قامت بھی ہوتا ہے۔ ان کا ایک مزاج بھی ہوتا ہے۔ ان کی تلخی بھی ہوتی ہے اور ان میں شفقت بھی ہوتی ہے، اور ان کی ساری شخصیت، اور ساری ترتیب جو ہوتی ہے، وہ اپنے طور پر پڑھنے والے، اور سننے والے پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اس لیے ڈیرے کا لفظ اپنے تمام Connotation

کے باوجود ہماری گرفت میں اس لیے نہیں آتا کہ ہم نے دیکھا نہیں، ہم وہاں سے گزرے نہیں۔ وہ ہمارا کبھی مصرف نہیں رہا۔

تو ہم وہاں بیٹھے تھے، اور اپنے اپنے انداز میں پاکستان کی بہتری اور بھلائی کے لیے کچھ تجاویز پیش کر رہے تھے۔ کچھ پروگرام بنا رہے تھے۔ وہاں پر مولوی موسیٰ آف دی مسٹری Mystery ہوتے تھے۔ برے تیز طرار، اور بڑے دانشور، اور اللہ نے ان کو ایسا ذہن رسا دیا تھا کہ بہت جلد بات کو سمجھ جاتے تھے۔ بہت جلد پیش کر دیتے تھے اپنی رائے۔ کونے میں ہمارے ڈاکٹر اشرف صاحب بادام روغن نکال رہے تھے۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ ڈیرے پر چونکہ لوگوں کا علاج بالغذا ہوتا تھا، غذا دے کے بیماری کا علاج کیا جاتا تھا، اور بابا جی یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی غذائیں پیدا کی ہیں، جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں، ان میں سے ہر جڑی بوٹی ہر غدا، ہر اناج ہر گوشت کی قسم ایک خاص بیماری کے لیے مفید ہے، تو بادام روغن جو نکلتا تھا، وہ مشین سے نہیں نکلتا تھا، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مشین سے نکالا جائے تو لوہے کے دو پہیوں کے درمیاں آکر Residue کچھ حصہ لوہے کا شامل ہو جائے گا اور وہ خالص نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہاں پر بادام روغن ہاتھ سے نکالا جاتا تھا۔ اچھا یہ بات میں نے جب پہلی بار سنی تو یقین نہ آیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پہلوان آتا ہے، بادام کی گریاں لے کر اور یوں دباتا

ہے، اور چرررایک دھار نکلتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا، لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ بادام کو کوٹتے ہیں۔ کوٹ کر ایک خاص ٹمپریچر پر گرم کرتے ہیں۔ پھر اسے پرات میں رکھتے ہیں، اور پرات کا ایک حصہ اونچا کر دیتے ہیں۔ کچھ تو ان گرم ہوئے ہوئے سیدھے باداموں میں سے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں خود بخود، اور کچھ ان کو آٹا گوندھنے کے انداز میں بعد میں نکالا جاتا ہے، اور تقریباً اتنا ہی نکل آتا ہے جتنا کہ ایک مشین نکالتی ہے لیکن اس کی رنگت، اس کی خوشبو یقیناً بہت اچھی ہوتی ہے۔

یہ تو میں درمیان میں آپ سے ضمنی بات کر گیا، تو وہاں پر جو رائے پیش کی جارہی تھی، ان میں ہم نے بڑے پروگرام بنائے۔ جیسے آپ ہم سب جب مل بیٹھتے ہیں، پاکستان کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں اگر یہ کیا جائے تو بہتر ہو گا، اگر یہ کیا جائے وغیرہ۔ تو باباجی یہ باتیں سنتے رہے تو انہوں نے کہا انسان کو راستے پر لانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو خرابی ہو، جو خطا ہو، جہاں جہاں پر کوئی خامی ہو، جہاں پر کوئی نیگیٹو پوائنٹ ہو، اس کو دور کیا جائے، سیاستدان اور حکمران، اور جہاں بان یہ سارے اس طرح سے علاج کرتے ہیں کہ جہاں پر کوئی خرابہ ہو، اسے دور کرنے کے لیے وہاں پہنچا جائے، اس کو دور کر سکتے ہیں یا نہیں، یہ اب اللہ کے اختیار میں

ہے۔ انبیا کا طریقہ کار، بابا جی نے کہا، اس سے مختلف ہے۔ وہ وہاں پر جو خرابی ہوتی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ وہاں کے رہنے والے انسانوں کے اندر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب ان کا اندر تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود اپنی خطا کو ٹھیک کر لیتے ہیں، اپنی خامی کو دور کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دیں اور ان کی کوتاہیاں دور کرنے کی کوشش کرتے رہیں تو بادتک یہ سلسلہ چلتا رہے گا، اور آپ دیکھتے رہیں گے کہ آپ کے ہاں بڑی خرابی ہے اسے دور کیا جائے۔ تو اندر کا درست کیا جانا بہت ضروری ہے، اور جب تک اندر ٹھیک نہیں ہو گا، اس وقت تک کوئی بھی مشین ٹھیک نہیں چلے گی۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ ان کے ابا مخدوم صاحب کے پاس ایک کار ہوتی تھی کرائسلر۔ پتا نہیں اب ہے کہ نہیں، ختم ہو گئی ہو گی۔ بڑی سبک، خوبصورت سی اچھی سی۔ مخدوم صاحب کے پاس سارے بہاولپور میں نواب صاحبان کے بعد ان کی کاریں ہوتیں۔ ہمارے دوست رفیق ان کے صاحبزادے تھے۔ وہ کار چلاتے رہے اور ایک عرصہ گزر جانے پر جب اس کا معین وقت آیا تو گاڑی چلنے سے انکاری ہو گئی۔ اب مخدوم صاحب نے اسے احتیاط کے ساتھ، ادب سے ساتھ، عزّت افزائی کے ساتھ ایک چھپر کے نیچے اینٹوں کے اوپر کھڑا کر دیا۔۔

کچھ عرصے کے بعد مخدوم صاحب فوت ہو گئے، اور رفیق نے یہ سوچا کہ یہ اتنی اچھی کار ہے، اور اس کا انداز، اور اس کی ساخت بہت بہتر ہے، تو اسے چلایا جانا چاہیے۔ تو وہ کوشش کرتے رہے۔ جہاں سمجھدار لوگ ہوتے ہیں جو بڑے صاحب کی خوشامد وغیرہ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا، صاحب اس کا رنگ بدل دیں۔ جب تک اس کے اوپر اچھا، اور نیا رنگ نہیں ہو گا نا، یہ ٹھیک نہیں ہو گی۔ ہمارے بھی گھروں میں اکثر جب خواتین اصلاح کریں، سب سے پہلے کہا جاتا ہے ڈرائنگ روم بدل دیں۔ کرسیاں ادھر رکھیں۔ میز ادھر چلا جائے تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اکثر آدمی بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہی رائے دی۔ انہوں نے کہا، یہ بات ٹھیک ہے۔ انہوں نے سارا رنگ اتروا کر اس پر نیلا رنگ کروایا تب سٹارٹ کی، لیکن سٹارٹ نہ ہوئی۔ اس لیے کہ نیلے رنگ سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں کے ایک پٹواری تھے انہوں نے کہا کہ کرائسلر کا رنگ نیلا نہیں ہوتا، سٹیل گرے ہوتا ہے، عام طور پہ یا کالا ہوتا ہے، تو آپ اس پر سٹیل گرے کریں تو اچھا ہے۔ تو سٹیل گرے کروایا گیا، تو پتہ یہ چلا جب تک اس کا اندر ٹھیک نہیں ہو گا یہ نہیں چلے گی۔ ہماری بھی یہی کیفیت ہے۔ ہم اپنے اوپر سٹیل گرے رنگ کروا کے گھوم رہے ہیں، اور اب سوچتے ہیں کہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ نے دیکھا ہو گا سیاسی جماعتیں آتی ہیں، آتی رہتی ہیں، چلی

جاتی ہیں، اور ہر ایک یہ دعویٰ کر کے آتی ہے، بڑی راستی سے نیک نیتی سے کہ جناب ہم آئیں گے تو تمہاری کایا پلٹ دیں گے۔ اچھا وہ آتے ہیں تو ان کا بھی طریقہ کار وہی ہوتا ہے۔ اتنا صبر ان میں ہوتا نہیں کہ وہ انبیا کا راستہ اختیار کر سکیں، اور لوگوں کو تبدیل کر سکیں۔ چھوٹے سے گروہ کو تبدیل کر دیں، نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں چلیے ہم یہ کر دیں گے، یہاں سڑک بنا دیں گے۔ پل تعمیر کر دیں گے یہ کوچے آپ کے ٹھیک کر دیں گے۔ صفائیاں کر دیں گے۔ لگے رہتے ہیں بے چارے لیکن ہو نہیں پاتا، کیونکہ وہ گروہِ انسانی جو اس کجی کے مقام پر رہتا ہے، جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو گا اس وقت تک وہ مقام ٹھیک نہیں ہو گا، چاہیں کچھ بھی کر لیں۔ اور آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے اندر کجی کب، کیسے، کیوں واقع ہوئی۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ میرے ارد گرد کے ماحول کی ساری خرابی ہے۔ میری کوئی خرابی نہیں۔ اپنی خرابی پر کوئی غور نہیں کرتا اور وہ ساری ذمہ داری دوسروں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے یہ ہونا چاہیے، وہ ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے یہ کرے، ان کو چاہیے وہ کریں۔ بوٹی مافیا کیوں ہوتا ہے۔ اس کو ختم کیا جانا چاہیے۔ فلاں چیز کیوں ہوتی ہے، اس کا ازالہ ہو، لیکن اگر بیٹھ کے آدمی کبھی مراقبے کے انداز میں سوچے اور غور کرے، اور اپنے سیلف کو جانے، اور نکھارنے کی کوشش کرے تو پھر اس کو پتہ چلے گا کہ میرے اگر سیلف Self کی

کنڈی اس مچھلی کو پھنسا لے تو پتا چلے گا۔ اس کے اندر بہت کوتاہیاں، اور خامیاں موجود ہیں جو میں اگر دور کروں گا، جیسے کہ بابے نے کیا تھا تو میرا ماحول ٹھیک ہو جائے گا۔ آدمی کو یقین نہیں آتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنا آپ ٹھیک کر لوں، اور ارد گرد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میرے پاس ایک اچھا کلاک تھا۔ پرانی وضع کا۔ میرے ابا جی کا تھا۔ انہوں نے بڑے شوق سے اپنے بچپن میں اپنے باپ سے یا دادا سے کہہ کر لیا تھا۔ آبنوس کی لکڑی تھی، اور لمبی لٹکن جو تھی پینڈولم۔ اور ہندسے جو تھے وہ رومن ہندسے تھے، جیسے ریلوے اسٹیشنوں پر گھڑیوں میں ہوتے ہیں۔ بالکل کالی سیاہ سوئی، اور لگا ہوا وہ گھر میں بڑا اچھا، اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے، اور اس کا ارتعاش جب وہ گھڑیال بجاتا ہے تو دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔ اچانک اچھا بھلا چلتا چلاتا وہ کلاک ایک دن رک گیا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی، اور پریشانی ہوئی۔ میں نے اس کو کھول کے اس کا جو لٹکن تھا، اس کا جو پینڈولم تھا اس کو ہلایا، جو آدمی کیا کرتا ہے تو وہ چلا، تو سات بجے میں نے ہلایا، سو آٹھ بجے تک چلا۔ پھر بند ہو گیا۔ اکثر آپ کو تجربہ ہوا ہو گا۔ پھر مجھے کسی سیانے نے بتایا کہ اس کی اندر کی سوئیاں گھمائیں تو پھر یہ ٹھیک ہو گا۔ تو میں نے پینڈولم کو بھی چلا دیا، سوئیوں کو بھی چھیڑا، وہ بھی چلا تو بجائے ایک گھنٹہ چلنے کے دو گھنٹے چل گیا۔ اب سوئیوں کی

حرکت سے فرق پڑا لیکن پھر بند ہو گیا۔ تو میں اس کو اتار کر بڑی احتیاط کے ساتھ بڑی محبت کے ساتھ، مزید کوشش بھی کی۔ یا اللہ یہ کیسے ٹھیک ہو گا۔ اس کو پھر میں لے گیا ایک بڑے گھڑی ساز کے پاس جو مال روڈ پر ہے۔ ان کو جا کر میں نے دکھایا۔ انہوں نے دیکھا اور کہا، اشفاق صاحب یہ بہت پیچیدہ کلاک ہے، اور پرانے زمانے کا ہے، اور اس کی مشینری جو ہے، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے میں اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے آپ اسے ایک تاریخی چیز سمجھیں اور عجائب گھر کا ایک حصہ بنا لیں۔ یہ چلے گا نہیں اسے نوادرات سمجھیں۔ میں جب بہت مایوس ہوا، اور اس نے میرا اداس چہرہ دیکھا تو اس نے کہا، آپ اسے چھوڑ جائیں، میں اسے دیکھوں گا۔ شاید اس میں کوئی صلاحیت ہو کہ خود ہی مجھے بتا دے اپنی طرف سے ورنہ میرے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے۔ نہ میرے استاد نے پڑھایا ہے۔ میں اسے چھوڑ آیا۔ دوسرے دن میں شام کو گیا تو اس کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور کھٹا کھٹ چل رہا تھا۔ اتنی خوشی ہوئی مجھے، تو میں نے کہا، ٹھیک ہو گیا؟ کہنے لگا ہاں جی۔ میں نے کہا اب تو نہیں رکے گا۔ کہنے لگا، نہیں جی۔ میں نے کہا آپ تو کہہ رہے تھے، پیچیدہ ہے۔ ہاں جی پیچیدہ بدستور ہے۔ تو میں نے کہا، بڑی مہربانی بتایئے اس کی کیا اجرت، کتنے پیسے ہوئے؟ کہنے لگا کوئی پیسہ نہیں۔ میں نے کہا، کیوں، آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اتنا پیچیدہ کلاک

آپ نے ٹھیک کیا ہے۔ اس کی کوئی اجرت نہیں لے رہے۔ کہنے لگا، دیکھیے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں نے کھول کے دیکھا تو اس کی گراریوں میں "پھوس"، "کھدڑ" جھاڑ دینے سے جو اڑتا ہے، پچیس سالوں کا وہ گرد و غبار وہ سارے پھنسے ہوئے تھے۔ میں نو وہ صاف کر دیا اور کچھ نہیں کیا۔

حاضرین میں سے: بات تو سر اس کی ہے جو دیدہ بینا کی ہے، جو انسان اپنی خامی دیکھ سکے۔

اشفاق صاحب: بجا، بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بھی آپ کو بتا سکتا ہے۔ لیکن یہ آپ کے ارادے پر منحصر ہے، آیا اپنی اصلاح کرنے کو خواہش رکھتے ہیں یا نہیں۔ میں اتنی عمر کا، آپ سب سے بڑا ہوں عمر میں۔ میں نے کبھی ایسی خواہش نہیں کی کہ میں تو کہتا ہوں کہ لوگ ٹھیک کریں، لوگ ٹھیک ہوں جائیں۔ میں تو اکثر یہ کہتا رہا۔ اب جا کے مجھے سمجھ آئی لیکن اب ٹائم تھوڑا رہ گیا ہے۔ اب ہم اپنے آپ کو Correct کرنے سے معذور ہوئے ہیں۔ تو جب کلاک چل گیا تو میں نے لگا دیا، گھر آ کے، تو میں بیٹھ کے سوچنے لگا کرسی پر کہ میری ذات کے اندر بھی بڑا کدڑ پھوس جمع ہوا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے نہیں چل رہا ہوں، اور جگہ جگہ رک جاتا ہوں۔

حاضرین میں سے: جب ہر بندہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے تو پھر یہ سارا ہو سکتا ہے، اندر کی صفائی ممکن ہے۔

اشفاق صاحب: میں سمجھتا ہوں کہ جب بندہ تہیہ کر لے، اس کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بہت سی چیزیں جو ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے یہ غلط ہے۔ لیکن میرا تہیہ نہیں بن رہا، ارادہ مضبوط، کہ میں نے اب اس کو سیٹ رائٹ کرنا ہے۔ جس طرح ایک جرنیل ہوتا ہے، تو وہ بزن کر کے لشکر میں گھس جاتا ہے۔ وہ ایک ارادہ ایک تہیہ ہوتا ہے ایسا نہیں بنتا۔

حاضرین میں سے: مجھے ایک بندے نے کہا، میں اچھا ہونا چاہتا ہوں۔ اندر کی جون سی گرد اس کو صاف کرنا چاہتا ہوں، اور معیت کرنا چاہتا ہوں کسی بھی بزرگ کی، اور میں ڈھونڈ رہا ہوں، تو کہاں تک ٹھیک ہے کہ ڈھونڈنے سے یہ ہوتا ہے یا پہلے تہیہ تو بندہ کرے۔

اشفاق صاحب: دیکھیں وہ تو صاحب جو ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ خدانخواستہ کہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ان کو سمجھ نہیں آرہا اور وہ بیعت کرنے سے یا کسی آدمی کا ہاتھ پکڑنے سے اپنے آپ کو ٹھیک صحیح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایسا پروگرام پہلے سے موجود ہے جو ٹھیک راستوں پر ان کو لے جا سکتا ہے۔ مثال

کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ساری زندگی مجھے کبھی یہ الجھن نہیں ہوئی کہ کلام پاک میں کوئی چیز ایسی پیچیدہ ہے جو مجھے سمجھ میں نہیں آتی ہو۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جو چیزیں میری سمجھ میں آ گئی ہیں۔ مجھ سے ان پر عمل نہیں ہوتا۔ باقی میں دوسری طرف جاتا ہی نہیں۔ مثلاً پچھلے 75 برس سے مجھے ایک بات سمجھ میں آئی ہے کہ قولوا اللناس حسنا: لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو، اور میری یہ حسرت ہی چلی آرہی ہے کہ مجھ سے سچی بات ہو نہیں پاتی۔ غصہ آجاتا ہے۔ طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے، اور طرح کا ایک کانٹا تبدیل ہو جاتا ہے تو جب ایک آدمی کا تہیہ ہو جائے کہ میں نے اس راستے سے اس راستے پر جانا ہے تو اللہ پھر اس کو برکت دیتا ہے، اور پھر وہ آدمی جس کی تلاش میں ہوتا ہے، وہ ایک دن خود صبح پانچ بجے آ کے اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تہیہ ہو تو پھر ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو، پھر مشکل ہے۔ پھر آدمی ڈھونڈتا رہتا ہے کہ بتائیں اشفاق صاحب کوئی اچھا سا بابا، ہے نا، کیونکہ ابھی اس کا ارادہ نہیں، اس کا صرف پروگرام یہی پوچھنا ہے کہ نارووال کی گاڑی کب جاتی ہے۔ کہیں جانا ہے، کہے گا، میں نے جانا تو نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔

ہمارے بابے جس کو کہتے ہیں تلاوت الوجود، جب آپ اپنے وجود کی تلاوت

شروع کرتے ہیں، اور پھر دیکھیں کیا عجیب ٹرم (Term) ہے۔ پھر آپ کو پتا چلنے لگتا ہے۔ ہم نے تو کبھی کی نہیں۔ ہم تو اپنے وجود سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ اس کو قریب نہیں آنے دیتے۔ آپ کبھی اپنے ساتھ اکیلے بیٹھ کے دیکھیں، پندرہ منٹ کو گھڑی بند کر کے۔ پتا ہے، قید تنہائی سب سے خوفناک سزا ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ بیٹھو گے تو بہت سارے سچ آ کر آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ آدمی چیخ مارتا ہے، بھاگتا ہے۔ یہ بڑے ارادے اور تہیّے والوں کا کام ہوتا ہے۔ جو ایسی باتیں کریں کہ مجھے اپنے اندر کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نپولین اعظم جب فریڈرک کی قبر پر گیا تو اس نے دیکھا کہ فریڈرک کی قبر کے اوپر اس کی تلوار لٹک رہی ہے۔ بڑی روشنی اس پر پڑ رہی ہے۔ اس نے حکم دیا اپنے جرنیل سے کہ تلوار کو اتار کر پیرس کے عجائب گھر کی نظر کر دو تو وہ تلوار اتاری گئی، اور بعد میں اتار کے نپولین کے حکم پر اس کو پیرس کے عجائب گھر میں رکھوا دیا گیا۔ بہت بڑے بادشاہ کی یہ تلوار ہے۔ جرنیل نے تلوار اتار کر کہا، جیسا کہ ہم کرتے ہیں، خوشامدی انداز میں کہ سَر اگر ایسی تاریخی تلوار مجھ کو ملتی تو میں کبھی اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا۔ تو نپولین سے زور سے اپنی تلوار پر ہاتھ مارا، اور کہا، کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے۔ تو آپ کے پاس آپ کی تلوار ہے۔ اس لیے جب تک آپ اس تلوار پر ہاتھ مار کے

شدت سے نہیں کہیں گے کہ میں اور یہ میری تلوار ہم دونوں ایک ہیں تو پھر آپ کسی اور طرف نہیں جھانکیں گے۔ تو میں عرض کر رہا تھا، کیا کبھی ایسا ہوا، کیا کبھی ایسا ہو سکے گا۔ میں اسلم صاحب سے جو ہمارے بہت بڑے شاعر ہیں، اور اخبار نویس بھی ہیں، ماشاءاللہ اسلم صاحب کبھی میں اپنے طور پر ایسے سوچتا ہوں کہ ہم لیٹرز تو دا ایڈیٹرز لکھتے ہیں، اور اس میں اکثر و بیشتر شکایات ہوتی ہیں کہ ہمارے ہاں گند کے ڈھیر پڑے ہیں۔ توجہ نہیں دی کارپوریشن والوں نے، حالانکہ انکے الیکشن بھی ہو گئے، اور بالکل بیٹھے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہاں سسٹم میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں یہاں پر نقل بہت بڑھ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا کبھی آپ کے نہاں خانوں یا آپ کے خیال میں یا آپ کی یادداشت میں کبھی کوئی ایسا خط تو ایڈیٹر لکھا گیا ہے۔ محترمی جناب ایڈیٹر صاحب! السّلام علیکم، ہمارے یہاں پر گندگی کے ڈھیر پچھلے دس ہفتوں سے پڑے ہیں، اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے سٹاف میں سے کوئی نیک، دردمند بندہ بھیجیں جو آ کر ہمارے دلوں کو تبدیل کر دے، اور ہم گندگی اٹھانے والے کی بجائے خود اس کی صفائی کریں۔ میرے خیال میں ایسا لیٹر کوئی چھپا نہیں کہ ہم دردمندی کے ساتھ کہتے کہ ہمارے ہاں یہ خرابی پیدا ہو گئی، آپ ایسا کریں کہ آپ ہم کو ایسا بندہ بھیج دیں جو ہمارے اندر وہ سویا ہوا جوہر

جو ہے، اس کو جگا دے، اور پھر ہم اپنے پیروں پر خود کھڑے ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہے یہ۔ یہ امتحان دینا، یہ سکول میں بیٹھنا، یہ آگے چلنا، یہ صفائی رکھنا۔ اب دیکھیں نا سرخ بتی پر کھڑے ہونا ہمارے لیے جان کا عذاب بنا رہتا ہے۔ اب ہم چاہیں گے کہ ہم کسی اخبار کے اڈیٹر کو ضرور خط لکھیں۔ آج کے بعد کہ مہربانی فرما کر کوئی ایسا آدمی ہمارے درمیان بھیجیں جو ہمارے اندر یہ بات پیدا کر دے، جاگزیں کر دے کہ ہم نے سرخ بتی پر کھڑے ہونا ہے۔ بالکل کچھ اس طرح سے۔ میں کچھ عرض کروں جیسا کہ بابا جی نے کہا تھا، انبیا کی تعلیم میں کیا فرق ہے؟ ہم جیسے لوگوں کو جب آپ کے سامنے ہماری کوتاہیاں، خرابیاں، آپ کے پاس موجود ہیں، آپ جانتے ہیں، میں جانتا ہوں، لیکن ان کی تعلیم کا اثر کیسا چلا آ رہا ہے۔ ہم اپنی تمام تر خرابیوں کے باوصف تمام تر کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے جب انبیا کے بتائے ہوئے حکم پر روزہ رکھ لیتے ہیں تو ہم کبھی غسل خانے میں، کوٹھری میں جا کر کچھ نہیں کھاتے۔ حالانکہ سپاہی کھڑا ہوتا ہے نہ ہی وہاں پر گورنمنٹ کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی چالان ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گرمیوں کے جب روزے آتے ہیں، پیاس سے مر جاتے ہیں، کھپ جاتے ہیں، بری حالت ہو جاتی ہے۔ غسل خانے میں جا کر تین تین مرتبہ نہایا کرتے تھے، لیکن وہاں بڑے مزے سے چلو لگا کر آدمی پانی پی لے، کون دیکھ رہا ہے، کون روک سکتا

ہے، لیکن نہیں پیتا۔ وہ یہ کہ اندر تبدیل ہوتا ہے۔ لیکن اب جب آتے ہیں۔ اب جب اندر تبدیل نہیں ہوتا، اور اردگرد تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو بابے کہتے ہیں، جب اردگرد تبدیل ہوتا رہے گا، آپ مرہون منت رہیں گے لوگوں کے، اور آپ کی زندگیوں میں وہ استقامت، اور استواری پیدا نہیں ہو گی جو کہ ہوتی ہے۔ تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ آئندہ سے ہم ایسے ہی ایک دو لیٹرز تو دا ایڈیٹر لکھیں۔ ہاں ایک رسم پڑنی چاہیے کہ جناب ہم ٹھیک ہونا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ پوچھ رہے تھے کیسے؟ ایک دفعہ کسی بزرگ نے دیکھا کہ بغداد کی دانہ منڈی کے باہر ایک پتھر کے اوپر شیطان بیٹھا رو رہا ہے، تو بزرگ بڑے حیران ہوئے۔ وہ اس کے قریب گئے اور کہنے لگے ابلیس کیا ہے تو رو رہا ہے؟ اس نے کہا، جی میرا بہت برا حال ہے۔ انہوں نے کہا، نہ بھئی نہ تو نہ رو۔ تمھیں تو اتنے کام بگاڑنے ہیں لوگوں کے۔ اگر تو ہی رونے لگ گیا تو کیا ہو گا؟ اس نے کہا، بابا جی میرا دکھ۔ انہوں نے کہا، دکھ کیا ہے؟ کہنے لگا جی میرا دکھ یہ ہے کہ میں اچھا ہونا چاہتا ہوں، اور مجھ سے ہوا نہیں جاتا۔ تو یہ تو دکھ ہم سب کا ہے۔ ہم زور تو لگاتے ہیں، بڑی کمال کی بات کی۔ اس نے کہا ہم اچھے ہونا چاہتے ہیں، ہوا نہیں جاتا۔ چاہیے کہ ہم ہونے کی کوشش تو کریں، یہ خواہش تو کریں کہ ہم اچھے ہو جائیں تو اس سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

ہماری بات تو ہوتی رہتی ہے۔ گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے، لیکن ہم روئے کبھی نہیں۔ ابلیس ہم سے بہتر تھا کہ سچ مچ رویا۔ وہ بازی لے گیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب اس گفتگو کے بعد ہم ضرور یہ کوشش کریں کہ لوٹ کے اپنی ذات تک صرف اپنی ذات تک کہ ہم اپنا کلام جو ہے، اس کے اندر جو کھڈر پھوس پھنس گیا ہے، اس کو نکالیں گے۔

آپ کا بہت شکریہ خواتین و حضرات۔ مہربانی اس پروگرام کو دیکھنے کی۔ آپ کا بھی بہت شکریہ، ہم سب آپ کے بڑے ممنون ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

محبوب کون؟

خواتین و حضرات جب عید آتی ہے تو ایک تو اس کی اپنی خوشی ہوتی ہے۔ ایک اس کے ساتھ بہت ہی چھوٹی چھوٹی عیدیں وابستہ ہوتی ہیں جو ماضی میں ایک پرانی لڑی کے ساتھ لٹکتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ ہوتا ہے، یا ایک زمانہ تھا، جب ہم اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر عید پڑھنے جاتے تھے۔ پھر یہ وقت آیا ہم انگلی چھڑوا کے، بالکل آزاد ہو کے، نوجوان، لڑکوں کی طرح اکیلے اکیلے عید پڑھنے جانے لگے اپنے دوستوں کے ساتھ۔ پھر یہ وقت آیا کہ اپنے بچوں کے بچوں کو ساتھ لے جا کر، اور انہوں نے پیچھے مڑ مڑ کر اپنے باپوں کو یہ کہہ کر کہ دادا بہت پیچھے رہ گیا، آہستہ چلو۔ پھر بھی ہم عیدیں پڑھنے گئے۔ اس عید کے رشتے سے مجھے بات یاد آئی، آج سے ٹھیک بائیس برس پہلے میں اپنی مسجد کی چار دیواری سے عید پڑھ کے نکل رہا تھا، اور ہم لوگوں سے مل رہے تھے، جب آپ عید کی نماز پڑھ چکے ہوتے ہیں، تو پھر اپنے دوستوں، ساتھیوں، عزیزوں، دوسرے نمازیوں سے گلے ملتے ہیں، اور ایک خاص انداز کا معانقہ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ سر ادھر ایک دفعہ ادھر کرتے ہیں، تو یہ کرتے کراتے جب ہم باہر نکلے، بہت سارے پرانے دوست ملے، تو مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ ہم اپنے دوستوں کو تو

ملتے ہیں جن کو جانتے ہیں، اور جو اس مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر ہمارے دوست نہیں ہوتے لیکن ان کا ہماری ذات کے اوپر کسی نہ کسی حوالے سے احسان ضرور ہوتا ہے تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں، اس علاقے کا جو تھانیدار ہے، جو رات کو سیٹی بجانے والے سپاہی بھیجتا ہے، جو بائیسکل پر گشت کرتے ہیں، وہ کون ہیں؟ مجھے ان کے ساتھ بھی جا کر عید ملنی چاہئے، اور ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ ہمارے محافظ ہیں، اور آپ اس کے لیے اتنی ساری کوششیں، اور "کھیچل" کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ ہمارا تھانہ کہاں ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا، اے بلاک میں، تو میں گاڑی لے کر وہاں گیا کہ ان سے ملوں۔ جب میں گیا تو اس تھانے میں ہُو کا عالم تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی نماز ادا کرنے کے لیے جا چکے تھے۔ جوانوں کو چھٹی دی گئی تھی۔ تھانیدار صاحب ایس ایچ او صاحب اپنی پرانی وضع کی میلی، سلوٹوں بھری وردی پہن کر، اور یہاں انگلی میں پھنسا کے سگریٹ اور چٹکی بجا کر گل جھاڑنے کے لیے کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے پاؤں میز کے اوپر رکھے ہوئے تھے اور وہاں تھا کوئی نہیں۔ میں جب اندر داخل ہوا تو میں نے کہا، جناب اجازت ہے۔ کہنے لگے، فرمایئے جنابِ اعلیٰ۔ میں نے کہا نہیں میں تو آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ کہنے لگے جی حکم۔

انہوں نے پاؤں نیچے اتار دیئے میز سے، اور بیٹھ گئے۔ تھانے والے جناب عالی یا
جناب اعلیٰ کہہ کر بلاتے ہیں۔ ان کا ایک انداز ہے۔ تو کہنے لگے، جنابِ عالی کیا
کام ہے۔ میں نے کہا کوئی کام نہیں۔ میں تو ایسے ہی آیا ہوں۔ کہنے لگے یہ کیسے ہو
سکتا ہے کو کوئی آدمی تھانے میں آئے، اور اس کو کوئی کام نہ ہو۔ میں نے کہا،
نہیں آج میں اس غرض سے نہیں آیا۔ آپ ایس ایچ او ہیں۔ کہنے لگا جی میں
ایس ایچ او ہوں۔ میں نے کہا، میں آپ سے عید ملنے کے لیے آیا ہوں تو وہ
بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ بڑی مہربانی و علیکم عید مبارک۔ میں نے کہا
دیکھیئے تھانیدار صاحب و علیکم عید مبارک ایسے تو نہیں ہو جاتی۔ آپ کو اٹھ کر
کھڑے ہونا پڑے گا، اور پھر میرے ساتھ عید ملنی پڑے گی۔ یہ تو کوئی طریقہ نہ
ہوا عید ملنے کا۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں۔ ان کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی تو
میں نے گستاخی کرتے ہوئے ان کے کندھوں سے پکڑ کر جہاں ان کے سٹارز لگے
ہوئے تھے ان کو اوپر اٹھایا تو کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہو کر میں نے ان کو ایک
"جپھی" ڈالی تو وہ ذرا سے گھبرائے۔ جب میں نے دوسری طرف سر کر کے
معانقہ کیا جو انداز ہوتا ہے، تو انہوں نے اتنی زور سے رونا شروع کیا، آں او آں
کر کے کہ میں ڈر گیا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ بہت اونچی آواز میں۔ اتنا بڑا تھانیدار،
بھاری بھر کم جسم کا آدمی اونچی آواز میں رونے لگا۔ تو میں لرزہ بر اندام ہو گیا تو وہ

جو تیسرا معانقہ ہوتا ہے، وہ میں نہیں کر سکا، کیونکہ میں گھبرایا ہوا تھا، روتے ہوئے انہوں نے کہا، جناب عالی اگر آپ سچے آدمی ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انیس برس کی سروس میں یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی شخص مجھے عید ملنے آیا ہے۔ کسی نے آکر مجھے جپھی ڈالی ہے۔ ورنہ میں اور میری ساری قوم جو ہے تھانے کی، اچھوت ہے، ہم چنڈال ہیں، اور ہم چور ہیں، اور ہم کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ انیس برس کی سروس میں آج پہلی مرتبہ مجھے انسان سمجھا ہے۔ اگر آپ۔۔۔۔ میں نے کہا، بالکل میں اتنی دور سے چل کر آیا ہوں، اور آپ جیسا، اور کوئی انسان ہے بھی نہیں، لوگوں نے ہمارے درمیان بہت بڑا خلا، اور بہت بڑی خلیج پیدا کر رکھی ہے۔ لوگ ہمارے قریب نہیں آتے۔ ہم لوگوں کے قریب نہیں جاتے۔ یہ غلطی پتہ نہیں کہاں سے شروع ہوئی ہے، اور کیوں ہوئی ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم ملیں، لیکن ہمارے اوپر ایک ایسی شرمندگی کی چادر تنی ہوئی ہے کہ ہم مل نہیں سکتے۔ آپ لوگ چونکہ بڑے لوگ ہیں، اس لیے آپ ہمارے قریب نہیں آتے۔ تو پھر بار بار مجھ سے پوچھتے، کیا آپ سچ مچ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تو میں نے کہا، میں سچ مچ آپ سے ایمانداری سے اللہ رسول کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، میں مسجد سے نکلا ہوں۔ ابھی میں گھر نہیں گیا۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ تو پھر کہنے لگے، آپ بیٹھیں میرے ساتھ چائے پئیں۔

میں نے کہا، میں ضرور بیٹھوں گا اور ضرور چائے پئیوں گا۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

جب میں ان سے مل کر چلا، تو میرے دل میں خیال آیا، گھر جاتے جاتے کہ یہ محبت کی وہ کمی ہے جس کی آمدورفت ہمارے درمیان میں رُک چکی ہے، اور ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں ہیں۔ اور ایک دوسرے کہ پہچانتے نہیں ہیں۔ اور اس میں بہت بڑی اونچی دیواریں ہیں جو ہمارے درمیان کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنے ادیب دوستوں کو، صحافیوں کو اور دانشوروں کو بلا کے، اور تھانے کے ان لوگوں کو جو پولیس کے محکمے سا تعلق رکھتے ہیں، ملاؤں گا، اور ان کی آپس میں گفتگو کرواؤں گا تاکہ ان میں ارتباطِ باہمی پیدا ہو، اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں، تو اس کا انتظام کیا گیا۔

ہمارے ہاں لاہور میں ایک جگہ ہے الفلاح، ہمارا ایک دفتر تھا نیشنل ری کنسٹرکشن کا۔ تو وہاں ایک ہال تھا۔ اس میں بندوبست کیا۔ تو پولیس والے بہت خوش ہوئے وہ اپنی نئی نئی وردیاں اچھی کلف لگی ہوئی استری کی ہوئی، اچھے بوٹ چمکا کے آ گئے۔ ان میں ڈی آئی جی، ایس ایس پی، انسپکٹر، ایس ایچ او، اور کافی ہال جو تھا، بھرا ہوا تھا۔ پھر الگ کرسیاں بھی تھیں، اور ہم لوگ جو تھے، ہمارے

ساتھی دانشور، ادیب، صحافی وہ بھی موجود تھے۔ یہ ہمارے درمیان بڑا خلا ہے اور بہت بڑی خلیج ہے۔ اس کو پُر کرنا چاہیئے، اور اس کو Bridge Over کر چاہیئے تو میں نے ان کو زحمت دی ہے۔ آئیں، آپ بھی کچھ بات کریں۔ یہ بھی کریں۔ اچھی ہے یہ ابتدا جس طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں خاص طور پر انگلستان میں جو "بوبی" محبت کی نظروں سے دیکھتا ہے، "بوبی" جاسپاہی ہوتا ہے، اس کا بچوں نے پیار سے نام "بوبی" رکھا ہوا ہے، اور جتنے بچے سکول جاتے ہیں، اور راستے میں کوشش کرتے ہیں کہ بوبی ان کو ملے جو ٹریفک کنٹرول کر رہا ہوتا ہے، وہ اسے ہاتھ ملا کر جائیں۔ بوبی کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کی سکول جاتے بچوں کو ساتھ چمٹا کے تھپکی دے کے، اگر اس کی جیب میں کوئی میٹھی گولی، لیمن ڈراپ ہو، وہ رکھتا ہے جیب میں، وہ ان کو ضرور دیتا ہے۔ ان کے درمیان محبت کا بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو راستہ پوچھنے والے کوئی بھی، آپ کو مشکل ہو تو آپ اپنے بوبی سے پوچھتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

میں لندن میں تھا تو ایک مائی بڈھی ہمارے یہاں کی، کوئی اس کو زبان بھی نہیں آتی تھی تو وہ بوبی اس کے ساتھ بیچارہ لگا رہا۔ اب وہ بول رہی تھی پنجابی وہ انگریزی۔ اب باہمی گفتگو جاری تھی۔ وہ ایک ہی بات کہہ رہی تھی کہ برہمی گاؤں میں جانا ہے۔ برہمی گاؤں جانا ہے وہ سمجھتا نہیں تھا۔ میں نے بھی مائی سے

پوچھا میری بیوی بھی ساتھ تھی کہ "تو اُیھتے کتھے برہما کر رہی ایں"۔ "سنیں

مینوں میرے پت نے لہیا سی اوتھے ہے گا۔ میں سارا لبھ لاں گی"۔ تو وہ بعد میں

پتا چلا کہ وہ برمنگھم جانا چاہتی تھی اور برہمی گاؤں تلاش کر رہی تھی۔ تو اتنا ہمیں

پتا چل گیا۔ اس نے کہا Thank you very much میں اس مشکل سے نکل

گیا ہوں۔ وہ برمنگھم گاؤں جانا چاہتی تھی۔ I would help her آپ

گھبرائیں نہیں۔ میں نے کہا، کیسے۔ اب نہ اس کے پاس ٹکٹ ہے، لندن تک تو وہ

پہنچ گئی جہاز نے اتار دیا۔ کہنے لگا، Now it is my duty تو میں اس کو لے کر

جاؤں گا۔ تو میں نے کہا آپ کیسے جائیں گے۔ کہنے لگا، نہیں ہمارے پاس روزمرہ

کے اخراجات میں سے سرکار نے اتنے پیسے دیئے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی مشکل

میں ہو تو اس کی مدد کریں۔ تو میں لے جاؤں گا۔ اپنا بھی ٹکٹ خرچ کروں گا، اس

کا بھی کروں گا، اور اس کو منزل تک پہنچاؤں گا تو اگر اس کا بیٹا جس کا پتہ اس نے

بتایا ہے، اس کے ہاں سے پیسے مل گئے تو ٹھیک لے، ورنہ میں آکر اپنے محکمے کو بتا

دوں گا۔ تو میں یہ چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان بھی اس قسم کا رشتہ قائم ہو تو کیسی

محبت کی بات ہے۔ ہال میں یہ بات کر چکنے کے بعد پھر میں نے اپنے ایک جو

سینیئر دوست تھے، ان سے کہا، کہ آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ آئے روسٹرم

کے اوپر، مائیک پر کھڑے ہو کر کے انہوں نے کہا، بڑی خوشی کا موقع ہے۔

اشفاق صاحب نے یہ بندوبست کیا ہے ہم بہت خوش ہیں۔ آج بہت سارے پولیس والوں سے ملنے کا اتفاق ہو گیا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آج کل رشوت کا کیا ریٹ ہے تو سارے کیے دھرے پر انہوں نے پانی پھیر دیا۔ ایک ہی بات کہہ کے۔ انہوں نے کہا، اچھا اشفاق صاحب، السّلام علیکم، بڑی مہربانی آپ کی، آپ نے ہمیں بلایا تھا، اور اس طرح سے ذلیل و خوار کر کے بھیج دیا ہے۔ اب ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ بڑی ان کی منتیں کیں، لیکن وہ سارے سیٹوں سے اٹھ گئے اور کہا، یہ ہمارے ساتھ ہونا تھا۔ اس کو بھی کہا، بابا ہم یہ تو آپس میں محبت پیدا کرنے کی کوششوں میں تھے، کہنے لگے جی نہیں۔ یہ نامعقول لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ محبت نہیں کی جا سکتی۔ تو پھر مجھے خیال آیا۔ کہ یہ جو محبت کا معاملہ ہے اس کو بھی ہم لوگ اچھی طرح سمجھے نہیں ہیں۔

میری بیوی اپنے بیٹے کو، جو سب سے بڑا ہے، اس کو غالب پڑھا رہی تھی، وہ اسٹوڈنٹ تو تھا سائنس کا، .B.Sc کا، اردو اس کا آپشنل مضمون تھا۔ غالب پڑھا رہی تھی تو وہ اوپر بیٹھا کچھ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہماری ایک میانی سی ہے، اس پر بیٹھ کر پڑھ رہے تھے تو میری بیوی نے آواز دے کر شکایت کی کہ دیکھو جی یہ شرارتیں کر رہا ہے، اور کھیل رہا ہے کاغذ کے

ساتھ، اور توجہ نہیں دے رہا۔ میں اس کو پڑھا رہی ہوں۔ تو اس نے کہا، ابو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ امی کا قصور ہے۔ اس سے پوچھ رہا ہوں۔ امی محبوب کیا ہوتا ہے، اور یہ بتا نہیں سکتیں کہ محبوب کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا بیٹے میں بتاتا ہوں کہ محبوب وہ ہوتا ہے جس سے محبت کی جائے۔ کہنے لگا، یہ تو آپ نے ٹرانسلیشن کر دی۔ ہم تو سائنس کے اسٹوڈنٹ ہیں، ہم اس کی Definition جاننا چاہتے ہیں کہ محبوب کیا ہوتا ہے۔ یہ امی نے بھی نہیں بتایا تھا۔ آپ ایک چھوڑ دو ادیب ہیں۔ دونوں ہی ناقص العقل ہیں کہ آپ سمجھا نہیں سکے۔ میں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ تو ہم نے اس کا ٹرانسلیشن کر دیا۔ لیکن محبوب کی Definition تو نہیں دے سکے اسے۔ میں نے کہا۔ بانو قدسیہ اور وہ میرا بیٹا نیچے اتر آئے۔ میں نے کہا، چلو بابا جی کے پاس چلتے ہیں ڈیرے پر، وہاں سے پوچھتے ہیں۔ یہ محبوب کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا چھوڑیں آپ ہر بات میں بابا کو لے آتے ہیں۔ وہ بے چارے ان پڑھ آدمی ہیں۔ بکریاں وکریاں رکھی ہیں، گڈریا قسم کے، وہ کیا بتائیں گے۔ میں نے کہا نہیں، مجھے جانے دیں پلیز ضرور۔

بانو قدسیہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی لے کر ہم نکلے، وہاں پہنچے۔ انفنٹری روڈ پر۔ بابا جی ہانڈی وغیرہ پکانے میں مصروف تھے۔ دال پکا رہے تھے۔ ساتھ تنور تھا۔ روٹیاں لگوانے کے لیے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تو یہ میری بیوی اتری جلدی سے

جیسے آپ پنجابی میں کہتی ہیں اگل واہنڈی پہلے ہی پہنچ کے، اس نے جلدی سے اونچی آواز میں یہ کہا کہ جو باہر مجھے سنائی دی۔ میں تالا لگا رہا تھا گاڑی کو۔ ان نے اونچی آواز میں کہا، بابا جی محبوب کیا ہوتا ہے۔ تو بابا جی کی عادت تھی کہ وہ انگلی اٹھا کر بات کرتے تھے، اور انہوں نے ایک انگریزی کا لفظ، پتا نہیں کہاں سے سیکھا تھا۔ نوٹ (Note) تو ہم اٹینٹیو (Attentive) ہو جاتے تھے کہ اب اس کے بعد کوئی ضروری بات آ رہی ہے۔ تو انہوں نے ڈوئی چھوڑ دی جو پھیر رہے تھے۔ کہنے لگے نوٹ "محبوب وہ ہوتا ہے جس کا نہ ٹھیک بھی ٹھیک نظر آئے۔" یہ Definition تھی۔ بچوں کی کافی چیزیں نہ ٹھیک ہوتی ہیں، لیکن ماں اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی ہر چیز نہ ٹھیک ہوتی ہے۔ محبوب وہ ہوتا ہے جس کے نہ ٹھیک کا پتا ہوتا ہے کہ نہ ٹھیک ہے، لیکن ٹھیک نظر آتا ہے۔ میں نے کہا آ جاؤ بھئی۔ تو ہم یہ جو پڑیا تھی ساتھ لے کر آئے۔ میرے ذہن پر اس کا اثر تھا۔ جب میں نمازِ عید پڑھنے گیا، تھانیدار سے ملنے، تو میں نے یہ سوچا کہ باوجود اس کے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ ٹھیک آدمی ہے، لیکن اب اگر کوئی ہم کو محبت کی پڑیا دینا چاہ رہے ہیں تو ان کہ نہ ٹھیک والوں کو ٹھیک سمجھ کر ہی اپروچ کی جا سکتی ہے نا، تو بڑی کوششیں کی، لیکن ابتدا میں ایسا نہ ہو سکا۔

پھر مجھے آہستہ آہستہ پتہ لگنے لگا کہ یہ طبقہ اپنے طور پر بڑا مظلوم ہے۔ میں ان

سے ملتا رہا۔ اپنے اس دوست سے، جس سے نئی نئی دوستی پیدا کی تھی۔ تو میں نے کہا، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ تو وہ مجھے کہنے لگے، اگر آپ کو کبھی موقع ملے تو ایک دستہ کاغذوں کا تھانے میں دے دیں۔ ایک دستہ کاغذوں کا بارہ آنے کا آتا تھا، اور دو پنسلیں جس کے پیچھے ربڑ لگا ہوا ہو۔ تو میں نے کہا، آپ کو سٹیشنری نہیں ملتی سرکار کی طرف سے۔ کہنے لگے ملتی ہے۔ سارے تھانے کی گیارہ روپے مہینے کی سٹیشنری ہوتی ہے ساری۔ (اور وہ ضمنیاں بھر بھر کے جو ان کا سٹائل ہے، لکھنے کا بے شمار کاغذ بھرتے ہیں) تو میں نے خود اپنے دوستوں سے کہہ کے ان کو تحفتاً سٹیشنری جتنی بھی ہم مہیا کر سکتے تھے، انہیں دیتے رہے۔ اور وہ خوش ہوتے رہے۔ پھر میں سوچتا تھا، ان کہ "بوبی" میں کیسے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو بہت مشکل بات ہے کہ ہم نے پورا تعلق ہی ان سے توڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ہم سے توڑا ہوا ہے، کسی وجہ سے ٹوٹ گیا، تو اب استوار ہو نہیں سکتا۔

پھر بھی میں نے دیکھا، میرا دفتر مال روڈ پر تھا۔ میاں میر پُل پر، وہاں سپاہی سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوتے تھے، اور کسی سربراہِ مملکت کو ائیرپورٹ جانا ہوتا تھا۔ وہ گورنر ہاؤس سے نکلتا تھا۔ ائیرپورٹ جاتا تھا، اور گرمی میں دھوپ میں بری حالت میں کھڑے ہوتے تھے۔ اب پتا نہیں وہ کب نکلے سربراہِ مملکت

صدر ہو یا وزیر اعظم۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ صبح دس بجے کے کھڑے شام کے تین بج گئے۔ میں دو تین دفعہ دفتر سے نکلا۔ میں نے دیکھا تو ان سے پوچھا، گزرا نہیں صاحب ائیر پورٹ کو جانے کے لیے۔ انہوں نے کہا، جی وہ نکلے تھے گورنر ہاؤس سے، پھر ان کو کچھ کام پڑ گیا، اور پھر واپس چلے گئے۔ وہاں کوئی پیغام ٹیلکس آ گیا۔ وہ وہاں پر بیٹھے ہیں میٹنگ ہو رہی ہے۔ تو میں نے کہا، آپ یہاں کھڑے ہیں، بہت زیادہ گرمی ہے، آپ کیسے کھڑے ہیں۔ کہنے لگے ہم ہل نہیں سکتے۔ میں نے کہا، آپ نے پانی پیا ہے۔ کہنے لگے نہیں جی، ہمارا کوئی ایسا بندوبست نہیں ہے۔ میں اپنے دفتر گیا تو ہمارے پاس فضول پرانی بالٹیاں گندی قسم کی تھیں، ان میں پانی جو گھڑے کا تھا، ٹھنڈا ابھی نہیں کر سکے، کوئی ایسا انتظام تھا ہی نہیں، ڈال کے، دو گندے مندے گلاس لے کر آیا۔ ان کو پانی پلایا تو بے چارے بڑے شکر گزار ہوئے۔ وہ مجھے بہت اچھا، اور نیک آدمی سمجھنے لگے کہ لاہور میں ایک اچھا آدمی ہے۔ ورنہ ان کو پانی کون پلاتا ہے۔ جب شام کو ہمارا دفتر بند ہوا، اور ہمارے سربراہ مملکت چلے گئے تو پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے ہلتے ہوئے واپس جانے لگے، تو میں جا رہا تھا گھر کو، جب میں نے ان کو دیکھا تو پوچھا، آپ کے جانے کا کوئی بندوبست ہے، تو انہوں نے کہا، ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔ صبح ہم کو پھینک جاتے ہیں یہاں پر، ہم ظلم کر کے ڈنڈا دکھا کے کسی کو روک لیتے

ہیں کہ ہمیں سڑک پر یہاں اتار دو۔ ہماری یہاں ڈیوٹی ہے۔ شام کو واپس جاتے وقت ہمارا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تو پھر میں نے گاڑی روکی اور کیریئر اور انہیں کہا کہ بیٹھیں۔ اب وہ پچیس تیس سپاہی، اور آپ نے اگر چھوٹی کیریئر گاڑی چلائی ہو، اور اس میں پیچھے اتنا لوڈ ہو، اور آپ مڑیں ایک دفعہ تو آپ گرتے گرتے بچیں۔ وہ کہنے لگے اگر آپ ہم پر بہت مہربانی کرنا چاہتے ہیں تو آپ چیئرنگ کراس تک پہنچا دیں۔ وہاں سے ہم کوئی بندوبست کر لیں گے تو انہیں لے کر وہاں گیا۔ یہ بات جو تھی میرے لیے بڑی تکلیف دہ جب بھی تھی، اب بھی ہے۔ اور میری آرزو جب بھی تھی، اب بھی ہے کہ ان کہ میں "بوبی" سے بھی بہتر روپ میں دیکھوں۔ اور ہمارے اور ان کے درمیان ایک محبت کا رشتہ قائم ہو۔ یہ نہ ہو سکا، لیکن یہ آرزو میرے اپنے طور پر پروان چڑھتی رہی۔ تو پھر ایک آئی جی آئے۔ بہت ادیب نواز تھے۔ چوہدری سردار محمد ان کا نام تھا۔ ان سے جب بات ہوئی تو انہوں نے کہا، جی بسم اللہ آپ آئیں، اور ان کو ایڈریس کریں، اور ملیں، کچھ اور ادیبوں کو بھی ساتھ لیکر گیا۔

ان کے ساتھ بات چیت ہم نے شروع کی۔ تو ان کو یہ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ یہ عطاءالحق قاسمی ہیں، یہ امجد اسلام امجد ہیں، یہ اصغر ندیم صاحب ہیں۔ بڑا حوصلہ ہوا ان کو۔ اور یہ ہماری عزت افزائی کے لیے آئے ہیں، تو انہوں نے ہمیں

دعوت دی کہ گوجرانوالہ آ کے ہم سے بات کریں۔ گوجرانوالہ جا کے ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ اتنے خوش ہوئے، اتنے متاثر ہوئے، وہاں پر ایک حملہ کر دیا تھا ڈاکوؤں نے اوجلہ کلاں ایک جگہ تھی، جہاں پر ان کی جگہ ہے، وہاں پر مقابلہ ہوا، اور آٹھ پولیس آفیسر جو تھے، وہ شہید ہوئے، انہوں نے کہا، کوئی بات نہیں، ہم تیار ہیں۔ اگر ہمیں عزت کی دولت ملتی ہے۔

تو خواتین و حضرات! ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ لوگوں کو پیسے کی، روپے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی، جتنی احترام کی، عزت نفس کی، توقیرِ ذات کی ہوتی ہے۔ اور ہمارے ملک میں بد قسمتی سے اس کا رواج بڑا کم ہے، اور ہم نے کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ آپ حیران ہو کے سوچتے ہوں گے کہ وہ لوگ جو پیسا کماتے ہیں، چراتے ہیں، رشوت لیتے ہیں، اور ہم نے ان کو انٹرویو کر کے پوچھا ہے کہ آپ کیوں رشوت لیتے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آپ ایسے قبیح فعل میں داخل ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، ہم بہت سارا روپیہ لے کر، اکٹھا کر کے اس سے عزت خریدتے ہیں۔ پیسا زیادہ ہو گا تو دیکھیئے نا پھر آپ ان کو سلام کریں گے۔ وہ عزت خریدتے ہیں، ناجائز طریقے سے، اور جب خرید چکتے ہیں تو پھر معتبر بنتے ہیں۔ بڑی کار میں بیٹھتے ہیں، ہاتھ میں ٹیلیفون اٹھاتے ہیں، دوسرے میں کلاشنکوف ہوتی ہے اور آپ کہتے ہیں سلام چوہدری صاحب۔ اگر یہ سب کچھ

کیسے بغیر صاحبانِ عزت کو عزت عطا کی جائے یا دجو آدمی جس مقام پر ہے، اس کو عزت عطا کر کے اتنا زچ کر دیا جائے، زچ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ کوئی بد فعل کر ہی نہیں سکتا کہ میں ایک صاحبِ عزت آدمی ہوں، تو ترقی یافتہ معاشروں نے اسی ٹرک کو اپنایا ہے کہ انہوں نے لوگوں کی وہ Due عزت عطا کر دی ہے اور وہ لوگ اپنی عزت کی تلوار اپنے پہلو کے ساتھ لٹکا کر کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتے، جو ان کو تذلیل کی طرف، بے عزتی کی طرف مائل کرے۔ وہ کہتے ہیں، ہم عزت دار آدمی ہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ جس طرح میں پچھلی مرتبہ عرض کر رہا تھا کہ جب آپ روزہ رکھتے ہیں تو آپ روزے داروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی عزت اپنی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ پھر چاہے آپ کہیں بھی ہوں، غسل خانے میں ہوں، بند کوٹھوں میں ہوں، چھپے ہوئے ہوں، پانی چوری نہیں پیتے، کوئی چیز نہیں کھاتے، کوئی آپ کے اوپر سپاہی نہیں ہوتا، تھانیدار نہیں ہوتا، کوئی اس کی قدغن نہیں ہوتی۔ کہ یہ بندہ جو ہے اس کے اوپر نگاہ رکھی جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری حکومتیں جو ہیں، ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جانی چاہیئے۔ میں یہ سمجھتا ہوں حکومتیں تو بڑی بے معنی، اور لایعنی سی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی بیمار پرسی ایک دوسرے کی مزاج پرسی انسان ہی کرتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے کا پالن کر سکتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے

کو سہارا دے سکتے ہیں۔ حکومتیں کبھی نہیں دے سکتیں، تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ چیز بتدریج کم ہو رہی ہے، اور ہمیں ایسے مراکز کی، اور ایسے ڈیروں کی ضرورت ہے، جہاں چاہے ہمیں تعلیم نہ ملے، جہاں چاہے ہم کو گرائمر نہ سکھائی جائے، جہاں چاہے ہم کو درس نہ ملے، لیکن لوگوں کی تکریم ضرور ہو اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ صاحبِ علم نہیں ہے، اس لیے ہم عزت نہیں کرتے۔ ہم یہ کہیں گے، چونکہ یہ انسان ہے، اور یہ حضرت آدم کی اولاد ہے، اس لیے ہم اس کی عزت ضرور کریں۔

ہمارے ڈیرے پر ایک دفعہ ایک نوجوان آیا، اسلامیہ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا، بڑا اچھا، اور وہ سائیکل پر چڑھا ہوا سائیکل کے ساتھ ہی اندر آ گیا تو جہاں باباجی بیٹھے تھے چارپائی کے اوپر وہاں پائے پر پیر رکھ کر کہنے لگا کہ "او باباتوں کیا لوگوں کہ غلط تعلیم دے رہا ہے، اور اِن کو اُلٹی اُلٹی باتیں پڑھا رہا ہے۔" اس پر ہم بہت ناراض ہوئے کہ جناب یہ کیا بات ہوئی۔ تو اس نے کہا، "تجھے پتا ہے کہ انسان جو ہے یہ Evolution کے ساتھ انسان بنا ہے۔ پہلے انسان بندر ہوتا تھا۔" باباجی نے کہا، بیٹا تم کم از کم یہ بات نہ کرو۔ ہماری تو عزت افزائی ہوئی ہے۔ تُو تو پیغمبروں کی اولاد سے ہے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ کہنے لگے، یہ بابا آدم کا بیٹا ہمارے پاس تشریف لایا ہے۔ اپنے آپ کو کبھی بھی بندروں کی اولاد نہ کہنا۔ تم

نبیوں کی اولاد ہو۔ اب جب اس نے یہ بات سنی کہ وہ نبیوں کی اولاد ہے تو وہ اس بات پر بہت خوش ہوا اور پھر ایک اور طرح سے ایک اور رخ لے کر چلا گیا۔

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے، باتیں سنیں، اور آپ کا بھی جو ہم سے دور ہیں، لیکن دلوں کے قریب ہیں۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ کا نظام

ہم جو یہ اپنے زاویے کی محفل سجاتے ہیں، اور آپ تک پہنچتے ہیں تو یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ ہم سے کتنا خوش ہیں، کیونکہ یہ یک طرفہ معاملہ ہے، اور یہ بات میں آپ کو بتادوں کہ ابلاغ کی دنیا میں یہ جو ہم نے نئ کھڑکی کھولی ہے۔ اس کے بارے میں لوگ اکتسابی طور پر، کتابی طور پر تو یقیناً بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کا یہ حال رہا ہے کہ انہوں نے بابوں کے ساتھ بلا واسطہ طور پر رابطہ قائم کیا، اور ان سے کچھ پوچھا، اور علم حاصل کیا۔ ولایت کے لوگوں نے ایسے کام کیے ہیں، لیکن ہماری سطح پر ایسا نہیں ہوا، لیکن ایک دردناک بات بھی اس کے درمیان میں یہ ہے کہ ہم جو ان کے پاس جاتے رہے تو ہم بھی پورے طور پر ان کی خوشنودی کا باعث نہیں بن سکے، کیونکہ میں اکثر اپنے بابا سے لڑ پڑتا تھا۔ کچھ معاملات ایسے آجاتے تھے کہ وہ میری دنیاداری کی راہ میں حائل ہوتے تھے، اور یوں بھی ہوا کہ دس دس مہینوں تک میں کبھی ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا یا ان سے جا کر کچھ پوچھا نہیں۔ بڑے مسائل ہوتے تھے۔ پھر بات یہ تھی کہ ان کی سوچ کا انداز اور ان کی زندگی بسر کرنے کا رویہ ہماری سوچ سے، اور ہمارے چلن سے بالکل مختلف ہوتا تھا، اور ان کے اوپر قابو

پانا بڑا مشکل کام تھا۔

ایک مرتبہ جیسے ہم شاکی لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں، وہاں ڈیرے پر بیٹھ کر یہ شکایت کر رہے تھے کہ دیکھیں اللہ کا نظام کس قدر تکلیف دہ ہے کہ ایک آدمی اعلیٰ درجے کی کار پر چڑھا پھرتا ہے اور دوسرے کو پیدل چلنا بھی میسر نہیں۔ ایک لڑکی وہاں آئی تھی۔ ایک سال ہوا اس کی شادی ہوئی تھی لیکن پھر اس کو طلاق ہو گئی۔ اس کا خاوند چھوڑ گیا۔ ایک اور بی بی تھی اس پر آبلے پڑے ہوئے تھے، چھالے جن کو ہم "پھلوئے" کہتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے پھلوئے، اور میں عرض کرتا تھا ان سے کہ اس کا کچھ علاج کریں تو وہ کہتے، ٹھہریں ابھی دیکھتے ہیں۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے۔ تکلیف ہوتی تھی کہ اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ اور بہت سی چیزیں، جن میں ہم ہر وقت اپنی زندگی کے ایام میں، مہینوں میں ہفتوں میں شکایت کرتے ہیں وہ وہاں بھی چلتا تھا۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اللہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس کا خاطر خواہ جو جواب ملتا تھا، وہ ان کی مسکراہٹ سے ملتا تھا۔ لیکن ہم چاہتے تھے کہ ہم کو خصوصی طور پر Specifically یہ بتایا جائے کہ اللہ ہم پر کیسے مہربان ہوتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ دیکھو زندگی بسر کرنے کے لیے، زندگی گزارنے کے لیے جس شے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر زندگی کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی، اور اس

کا تانا بانا نہیں بن سکتا، وہ اللہ نے Free of cost دی ہے اور سب لوگوں کو دی ہے۔ کالے، پیلے، نیلے، گورے، موٹے، دبلے۔ سب سے ضروری چیز ہے آکسیجن۔ اگر آکسیجن کسی وجہ سے جاکے کسی صاحب کو لانی پڑے ڈاکٹر کی دکان سے اور ہر صاحب صبح اٹھ کر اپنے اپنے کنستر اٹھاکے گئے ہوں تین بچوں کے لیے بھی لانی ہے۔ دو اپنے لیے کنستر تو باباجی جو گھر ہے، وہ روتا نہ جائے کہ مجھ بُڈھے کو پوچھتا نہیں۔ میرا کنستر گھر ہی بھول گئے تھے۔ تو جائیں اور صبح کنستر بھرواکر لائیں، اور پھر لوگوں کو دیں یا ہمارے یہاں پر ایسے پمپ لگے ہوں، پٹرول پمپ جیسے، وہاں جاکر اپنی آکسیجن حاصل کریں تو زندگی عذاب بن جاتی۔ لیکن اللہ نے کچھ اس کا ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر شخص کو وہ نہ بھی چاہتا ہو تو اس کو آکسیجن ملتی رہتی ہے۔ آپ سر کے اوپر رضائی لے لیں، اور بالکل اس کے اندر سر گھسیڑ کے، یہ کوشش کریں تو ایک دم آپ کا Reaction ہوگا کہ آپ اس کو اٹھاکے، اور چھپاک سے اس دائرے میں آجائیں گے، جہاں آپ کو آکسیجن مل سکتی ہے تو یہ تو Free of Cost چیز ہے۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز تو کوئی ہے ہی نہیں۔

پھر دوسری قیمتی ترین چیز جو ہے، وہ پانی ہے۔ پانی کا بھی اللہ نے ایسا انتظام کیا کہ 3/4 حصہ کرہ ارض کا پانی رکھا ہے۔ بادل آتے ہیں۔ بارش برستی ہے۔ ہر ایک

کو یہ نعمت جو ہے آسانی سے بغیر کسی Cost کے بغیر کسی پیسا خرچ کرنے کے
ملتی ہے، ہر آدمی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور ہر کوئی شخص میری خیال میں اس
کرہ ارض پر ایسا نہیں ہے جس نے یہ کبھی کہا ہو کہ میں پانی کے ذائقے سے نا آشنا
ہوں، کیونکہ یہ بہت مہنگی چیز ہے، اور صرف امیر آدمی پانی پی سکتا ہے، ہم تو
نہیں پی سکتے۔ دور سے لانا پڑے، نزدیک سے لانا پڑے، مشکل سے لانا پڑے،
لیکن پانی جو ہے وہ ہماری زندگی میں داخل ہے۔ اس طرح سے خواتین و حضرات
کھانے کا سلسلہ ہے۔ روٹی جو ہے وہ بھی کوئی اتنی مہنگی نہیں ہے۔ وہ بھی ایک
عام آدمی کو بڑی آسانی کے ساتھ مل جاتی ہے، اور واقعی یہ کوئی آدمی نہیں کہہ
سکتا کہ میں نے آج تک روٹی کا ذائقہ نہیں چکھا ہے کہ اس کی خوشبو کیسی ہوتی
ہے۔ جو سارے ظلم ہیں، یہ انسان نے انسان کی ذات پر کیے ہیں، دوسرے
جانوروں کے خلاف۔ دوسرے جانور اپنی Species کو کچھ نہیں کہتے، لیکن
انسان ایک ایسا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس آدمی کو جو میرا بھائی ہے، پڑوسی
ہے یا رشتے دار ہے فائدہ پہنچے، اور یہ بھی آسائش میں داخل ہو جائے جس
آسائش میں مَیں داخل ہوں۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس بات پر غور کیا
جائے، اور اس کو قریب سے دیکھا جائے، اور جو ہم شکایت کرتے ہیں، اکثر شاکی
ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تو نکلے گا گھوم پھر کے بالآخر

انسان ہی جس نے ہمارے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا ہے۔

باقی رہ گئی بیماری کی بات۔ مثلاً وہ جو بی بی آئی تھی، وہ عجیب و غریب سی بیماری میں مبتلا تھی، اور میں ذرا شکایت میں باباجی سے کہتا تھا کہ اس کو تین دن ہو گئے ہیں تو ہمیں پتا نہیں چلا کہ آپ نے اس کا علاج کب شروع کرنا ہے، تو وہ کہتے تھے کہ ٹھہر و بیٹا، ذرا جب میں اس کا صاحبِ حال ہوں گا، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ بیماری کیا ہے تبھی اس کا علاج کر سکوں گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی بیماری کا صاحبِ حال کس طرح سے ہوا جاتا ہے۔ چار دن کے بعد خود ان کے بازو پر ویسے ہی چھالے پڑنے شروع ہو گئے، اور تقریباً ان کا بازو بھر گیا تو پھر انہوں نے کہا کہ فلاں مرہم لگا کے دیکھتے ہیں۔ اب ان کو پتا چلا کہ تکلیف کیسی تھی۔ یہ درد کس نوعیت کا ہے، اور میں اس میں سے گزر رہا ہوں، تو پھر میں اس کو Apply کروں گا اپنی دوائی، تو پھر مجھے پتہ چلے گا کہ اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے، کیا تکلیف اس کے اوپر طاری ہے۔ چنانچہ خیر اس کا علاج شروع ہوا، اور ہم خوش ہوئے کہ اس کی کیفیت جو تھی، وہ ٹھیک ہونا شروع ہو گئی، لیکن اس سے ہماری جو شکایت تھی اس کے جذبے میں تو کمی ہو گئی لیکن شکایت کی نوعیت، اور اس کی Volume کم نہیں ہوئی اور ایسی ایسی باتیں کیں کیونکہ ہم پڑھے لکھے لوگ تھے، اور اس زمانے میں نیٹشے کا فقرہ زبان زدِ عام تھا کہ God is jet ۔

نیٹشے نے کہا ہے تو ہم بھی ایسی باتیں کرتے تھے کہ Religion is the opium of people ہم اس کا ترجمہ کر کے انہیں بتاتے تھے۔ انہوں نے کبھی اِس بات کا برا نہیں مانا۔ لیکن ایک تکلیف دہ بات ضرور کہ، جس سے ہم ناراض ہوئے ان سے۔ اور وہ رشتہ کٹا، اور مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ اتنا دس ماہ کا گیپ کیوں آیا ہے۔ کئی دفعہ آیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ جو لوگ غربت کی، اور عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور آپ کے گروہِ انسانی کے درمیان رہتے ہیں، اور آپ تو جانتے ہیں ان کی بہت ساری ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ مجھ سے پوچھا کہ آپ کے کوئی غریب رشتہ دار ہیں۔ میں نے کہا، ہاں جی ہیں۔ کہنے لگے، کہاں ہیں۔ میں نے کہا جی وہ لاہور میں ایک علاقہ ہے، اس کو ہم مصری شاہ کہتے ہیں، اور وہ دو موریہ پل عبور کر کے وہاں جایا جاتا ہے، ہم لوگ چونکہ صاحبِ حیثیت لوگ ہیں۔ ہم تو کبھی ان سے ملتے ہی نہیں۔ وہ چونکہ ہمارے غریب رشتہ دار ہیں۔ اس لیے وہ بہ امرِ مجبوری ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ عید کو سلام کرنے آتے ہیں۔ بہت قریبی یعنی میری پھوپھی کے بیٹے اور میری ایک دور کی خالہ کا سارا کنبہ۔ تو ہم ان سے ملنے اس لیے نہیں جاتے کہ ہم ان کو برا سمجھتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا، اور ہماری مصروفیات اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ ہم ان کے ساتھ اتنا سارا وقت نہیں گزار سکتے۔ تو وہ کہنے لگے کہ

دیکھیں بات یہ ہے کہ آپ کو جتنی تنخواہ ملتی ہے وہ ساری کی ساری آپ کی نہیں، چونکہ آپ کے غریب رشتہ دار یا آپ کے غریب ساتھی مفلوک الحال ساتھی ہمسائے، اتنے لائق نہیں ہیں جتنے آپ ہیں، اس لیے آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ ذہین آدمی ہیں، آپ دانشور ہیں، آپ نامی گرامی آدمی ہیں، آپ اشفاق صاحب ہیں، اور اللہ کو بھی یہ پتا ہے کہ آپ ان کے مقابلے میں زیادہ لائق، اور سمجھدار ہیں، اس لیے ان کو کم عقل سمجھتے ہوئے ان کے حصے کے پیسے بھی آپ کو پہنچا دیے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ بیچارے نہیں جانتے نا کہ کیا کرنا ہے۔ تو آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ میری اس وقت تنخواہ نو ہزار روپے تھی، تو انہوں نے کہا، بالکل ٹھیک ہے۔ سات ہزار تو آپ کے، تو دو ہزار اللہ میاں ہر مہینے آپ کو مزید دے دیتا ہے کہ آپ عقل مند آدمی ہیں، لائق آدمی ہیں، ایماندار ہیں، Honest ہیں، اور سمجھدار ہیں، اور آپ کے وہ عزیز و اقارب جو دو موریہ پل کے اس طرف رہتے ہیں، وہ اتنے لائق نہیں۔ تو ان کے پیسے یہ دو ہزار آپ کو دے دیے گئے تو مہربانی فرما کر یہ آپ ان کو دے آیا کریں۔ تو یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی۔ میں نے انہی دونوں اپنی سنٹرل گورنمنٹ کو اپنی منسٹری اف ایجوکیشن کو لکھا تھا کہ میری تنخواہ کم Calculate ہوئی ہے۔ اس میں دو ہزار کا اضافہ ہونا چاہیے، اور میرے منسٹر نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ

آپ کا دعویٰ ٹھیک ہے، اور ہم نے بھیج دیا ہے، منسٹری آف فنانس میں پھنسا ہوا ہے۔ وہاں ایسے وہ Objection لگا دیتے ہیں، لیکن ملے گا۔ جہاں میں دو ہزار کا اور متمنّی تھا، اور سمجھتا تھا کہ میں لوٹا گیا، میں مارا گیا، میری تنخواہ اتنی کم ہے۔ اس میں اضافہ ہونا چاہیے، میرا بابا مجھ سے یہ کہ رہا تھا۔ جس کو میں اتنا پراپیگیٹ کر رہا تھا، اور اتنی عزت افزائی کرتا تھا کہ جو نو ہزار مل رہا ہے، اس میں سات ہزار تو آپ کے ہیں، اور دو ہزار ان بے وقوف لوگوں کے ہیں جو پیسے کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتے۔ آپ چونکہ سنبھال کر رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو دے آئیں۔ اب بتایئے صاحب! یہ کوئی عقل کی بات ہے، تکلیف دہ بات ہے، اور تھی۔ میں نے کہا، صاحب السّلام علیکم، میں اس جگہ آنے کے لیے تیار نہیں، آپ تو بدراہ کرتے ہیں۔ واقعی لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ رہبانیت کی طرف مائل کرتے ہیں لوگوں کو۔ اکثر یہ کہتے ہیں نا جی کہ یہ رہبانیت ہوتی ہے، اور یہاں بھنگ وغیرہ پیتے ہیں لوگ۔ تو آپ چاہیے تھا کہ آپ رہبانیت کی طرف مائل نہ کریں۔ یہ کیا الٹا سلسلہ آپ نے شروع کر دیا ہے، تو وہ گیپ آیا میری زندگی میں۔ آج میں اُس کا ذکر کرنا چاہتا تھا، آپ کی خدمت میں۔ وہ کافی تکلیف دہ تھا، اور اس گیپ کے اندر اس ویکیوم کے اندر جا چیزیں حاصل کی جا سکتی تھیں، وہ میں حاصل نہیں کر سکا۔ اس لیے ان لوگوں کی باتیں جو کتابوں میں یا

ابلاغ کے دوسرے ذرائع میں ملتی ہیں۔ اب آ گیا شکر گزار ہونے کا موقع، اس میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو وہاں آتے تھے، اور جن کو شکر گزار ہونے کا فن آتا تھا۔ اب شکر گزار ہونے کا فن بھی بڑا مشکل فن ہے۔ ہماری پوتیاں، نواسیاں، لڑکیاں خاص طور پر ایک لڑائی ہوتی ہے۔Why me? ۔ یہ لڑکیوں نے Why me کا بڑا محاورہ نکالا ہے کہ یہ میرے ساتھ ایسا کیوں گزر رہا ہے۔ میں جو اتنی شاہ زور لڑکی ہوں، اور اتنی پڑھی لکھی ہوں۔ میں نے M.A. انگلش کیا ہے، اور میں نے فرسٹ ڈویژن لی ہے۔ میں نے 2nd Division میں کیا ہے۔ تو کیا مجھے یہ بتایا جائے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کیا کیا ہو گا، کہنے لگی، میرے ناک پر پمپل نکلا ہے تو Why ۔ میں نے کہا، یہ سب کے نکل آتا ہے۔ تو کہنے لگی، نہیں آپ دیکھیں کہ میری اتنی خوبصورت ناک ہے۔ چہرہ اچھا ہے۔ میں نے کہا اگر آیا ہے تو چلا جائے گا، اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا Why me لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ تو ناشکری کا جو سبق ہم کو پڑھایا جاتا ہے یا ہم پڑھتے ہیں یا ہماری زندگی میں داخل ہے۔ جان بوجھ کر نہیں، ہمارے ماحول کی وجہ سے، ہمارے گرد و پیش کی وجہ سے، ہماری تربیت کی وجہ سے، یہ ہماری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو میں نے ایسے دیکھا ہے، اپنی زندگی میں

ظاہری طور پر، جسمانی طور پر، آسودہ نہیں ہوں گے، لیکن اس کے چہروں پر ایک تمانت کا رنگ ہوتا ہے، اور سکون ہوتا ہے، وہ یہ کیسے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ایک بڑا مشکل کام ہے جو میں زندگی میں کسی طرح بھی اپنی گرفت میں نہیں لا سکا۔

ہم نے ایک دفعہ آج سے پہلے، کئی برس کی بات ہے جب گلگت میں ریڈیو اسٹیشن کھولا، تو میں چونکہ پرانے لوگوں میں سے تھا، گیا تو وہاں جا کر ایک جگہ سلیکٹ کی، منتخب کی۔ وہ اچھا ایک کھلا باغ ہے۔ آپ کبھی جائیں گے تو دیکھیں کے وہاں ہم کو دو کمرے مل گئے۔ وہاں چھوٹا اسٹیشن چلانے کے لیے کچھ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تو وہاں پر ایک عارضی ملازمت کے لیے آدمی مل گیا۔ بنارس خان پٹھان تھا۔ اس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ مجھ میں ایک خرابی ہے کہ میں کچھ اور طرح کے آدمی سے بہت جلد متاثر ہوتا ہوں۔ بہت پڑھا لکھا آدمی مجھے اتنا متاثر نہیں کرتا، لیکن اگر وہ مجھ سے اعلیٰ و ارفع ہو سینئر، تو میں اس سے دبک جاتا ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں یہ تجسس بھی ہوتا ہے کہ میں اس کے قریب جا کر اس سے معلوم کروں۔ میری تو قسمت میں شاید نہیں ہوتا کہ میں ویسا بن سکوں۔ بنارس خان میں ایک یہ خوبی تھی کہ جو کام اس کو سونپ دیا جاتا، ایک تو وہ خوش اسلوبی سے کرتا تھا، اور پھر اس کی طبیعت کے اوپر بوجھ نہیں پڑتا

تھا، اور جو کام دے دیا گیا، وہ کر رہا ہے۔ یہ وہ نہیں کہ مارے گئے صبح سے آئے ہوئے ہیں، چھ بجے تک روٹی نہیں ملی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بنارس خان تم شاکی آدمی نہیں ہو، شکوہ نہیں کرتے۔ کہنے لگا، صاحب ہم بہت شکوہ کرتا تھا، یہ تو ہماری زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر ہم ادھر تو آ گیا۔ شکوہ کرتا کہ ادھر تو کوارٹر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم نے ادھر آ کر کام کیا۔ تو میں نے کہا، اب تم نہیں کرتے ہو؟ کہنے لگا جی میں ادھر آیا تھا سکون کی تلاش میں۔ بڑا اپر باش رہنا چاہتا تھا۔ بڑی کوشش کی، بڑے لوگوں سے ملا، بڑے پیروں فقیروں کے پاس گیا کہ جناب ہم کو سکوں کی تلاش ہے تو نہیں ملا۔ ایک شام کو کھانا کھاتے کھاتے میں نے فیصلہ کیا۔ میرے ہاتھ میں لقمہ تھا، رکھ دیا۔ میں نے کہا، یار دفع کرو سکون کو۔ ہم نے اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔ ہم سکون کے بغیر ہی زندگی بسر کرے گا۔ کوئی بات نہیں ایسے ہی چلتے رہتے ہیں تلاش میں۔ اس دن سے مجھے سکون ملنا شروع ہو گیا۔ تو میں نے کہا، تم نے یہ کمال کی بات کی ہے۔ کیسے سوچا؟ کہنے لگا بس یہ اللہ کی طرف سے میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے کہ آپ نے سکون کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا، اور اپنے آپ کے ساتھ ایک مصالحت کر لی لیکن یہ خوش دلی آپ میں کیسے آئی، میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا جی یہ بھی بڑا مشکل کام تھا۔ کہنے لگا، جی یہ بھی ہمارے اوپر ایک مشکل

آئی تو ہماری اس جھگی میں، جس چارپائی پر سوتا تھا، تو ہر شخص جو دنیا میں سوتا ہے اور صبح اٹھتا ہے تو میں بھی صبح اور لوگوں کی طرح اٹھا تھا تو اپنا پیر چارپائی سے نیچے اتارنے سے پہلے، میں نے کہا یارا بنارس خان قدم تو نیچے اتارنا ہی ہے تو کلفت میں کیوں اتاریں۔ خوشی میں کیوں نہ دن گزاریں، تو سارے دن میں جب کبھی جس مقام پر بھی جاتا، تنور پر روٹی کھانے، دوستوں سے ملنے یا کہیں مصیبت " اڑچن" میں گزرنے، تو مجھ کو یہ بات یاد آجاتی کہ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ "کلفت" میں یہ دن نہیں گزارنا، آرام کرنا ہے۔ اس کے بعد صاحب عادت پڑ گئی۔ اگر انسان فیصلہ کر لے، اور تہیہ کر لے، اور اس پر قائم ہو جائے تو یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ وہ تہیہ کرنے کی بات کر رہا تھا۔ بڑے سالوں کے بعد، پندرہ سولہ سال کے بعد پھر مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا گلگت میں۔ تو میں نے پوچھا بنارس خان۔ تو پتہ چلا وہ ادھر نہیں ہوتا۔ میں نے کہا، وہ ہے یہیں پر۔ ہمارا وہ تو اب بہت بڑا استاد ہے، گرو ہے، ہمارا پیر ہے، میں اس سے ضرور ملوں گا۔ کہنے لگے ہے تو ادھر ہی، لیکن اب کام نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، ہم کو اس کے ڈیرے پر لے جاؤ۔ ہم جائیں گے۔ تو میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ جھگی میں تھا۔ لیکن معذور تھا، اور تکلیف میں تھا۔ اس کو گاؤٹ ہو گیا تھا، گنٹھیا۔ اور وہ جڑا ہوا تھا، اور چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا،

بنارس خان کیسی طبیعت ہے۔ کہنے لگا، اللہ کا شکر ہے۔ میں نے کہا، سنا ہے بیمار ہو گیا۔ کہنے لگا، ہاں صاحب مجھے گنٹھیا ہو گیا ہے، اور چل پھر نہیں سکتا آسانی سے۔ تو میں نے کہا تم تو شکر ادا کرتے ہو۔ کہنے لگا، ہاں بڑا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے کہا، کیوں شکر ادا کرتے ہو۔ کہنے لگا صاحب اس لیے کہ میرے گھٹنے تو قائم ہیں۔ گوڈے میرے ہیں نا۔ اگر میرے گوڈے نہ ہوتے تو گنٹھیا کہاں ہوتا۔ پھر تو یہ اللہ کی بہت مہربانی ہے کہ میرے پاس گھٹنا ہے۔ صاحب اگر نہ ہوتا، کہیں کٹ جاتا تو پھر مجھے گنٹھیا کہاں سے ہوتا، تو میں اللہ کا بڑا شکر گزار ہوں۔ اس نے مہربانی فرمائی ہے۔ یہ ساری بات سننے کے باوجود، سمجھنے کے باوصف یہ ہمارے حال کا ایک حصہ نہیں بنتیں۔

ہمارے بابا کہا کرتے تھے کہ وہ مومن جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو، اور مستقبل کے خوف سے آزاد نہ ہو اس کو صاحبِ حال کہتے ہیں۔ کہ جو حال اس کو عطا کیا گیا ہے، وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرے، اور خوش و خرم بڑی چاہت کے ساتھ بسر کرے، اور جب تک اس کو تحفہ دیا گیا ہے اس کو ساتھ لے کر چلے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس وہ زمانہ آگیا ہے جو خود تو ناساز گار نہیں ہے، اس نے ہماری سوچ کو ہمارے رویئے کو بہت ساری ناساز گاری میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں زندگی کے اس حصے میں پہنچ کر کہ جب تک اللہ کا

ساتھ نہ ہو اور اللہ کو اس طرح سے نہ مانا جائے جس طرح سے ماننے کا حق ہے۔ صرف کتابی طور پر نہیں۔ مثلاً میری خرابی یہ ہے میں بڑا اس کا ایمانداری سے اعتراف کرتا ہوں، اور بڑا مجھے دکھ بھی ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں لیکن کتابی طور پر۔ میری ماں کہتی تھی نماز پڑھو لیکن میں نے کبھی یہ ارادہ یا تہیہ نہیں کیا کہ میں اس کے ساتھ ایک ربطِ باہمی قائم کروں گا۔ ہمارے بابا جی کہتے ہیں۔ لفظ خدا، خدا نہیں ہے۔ خدا تو، اور ہے نا، جو لکھا ہوا ہوتا ہے یا جو ہم گانا گاتے ہیں۔ ٹی وی پر خدا کا نام لیتے ہیں۔ وہ ایک اور چیز ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ہونا اس کو زندگی کے اندر سے گزارنے کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ اور میں یہ بات آپ کو گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ لوگوں سے بہت Privileged ہوں۔ میں ایک اونچے مقام پر ہوں کہ میں ایک ایسے بندے سے ملا ہوں، اور میں ان کا تجربہ، اور مشاہدہ اور مطالعہ رہا ہوں اور وہ لوگ بہت بڑے لوگ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی جھگی میں بادشاہ جوتے اتار کر جانے کو سعادت تصور کرتے ہیں، یعنی کیا کمال ہوتا ہے۔ کچھ یہ تو نہیں ہوتا کہ ان کے پاس پیسے ہوتے ہیں یا دولت ہوتی ہے یا توپ خانہ ہوتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ دیو جانس کلبی سے سکندر ملا۔ اور میں شاید پہلے بھی عرض کر

چکا ہوں کہ ساحل کے اوپر گرم گرم کلکنی ریت میں قلابازیاں لگا رہا تھا۔ تو سکندر نے جا کر کہا، اے آقا میں تیری کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تم میری خدمت کیا کرو گے۔ دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ دھوپ آ رہی تھی۔ وہ ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا سائیں تو وقت کا بڑا فلسفی ہے اور بہت عظیم انسان ہے۔ یہ جس طرح سے تو مزے سے کر رہا ہے۔ قلابازیاں لگا رہا ہے، میں بھی لگانا چاہتا ہوں۔ تو اس نے کہا، تو بڑا نالائق آدمی ہے۔ کپڑے اتار اور قلابازیاں لگانی شروع کر دے۔ اتنا بڑا ساحل پڑا ہوا ہے۔ یہ تو مجھ سے کیا ڈسکس کر رہا ہے۔ تو سکندر نے کہا، معافی چاہتا ہوں۔ میں سکندر اعظم ہوں، مقدونیہ کا شہنشاہ۔ اس وقت میں نے آدھی دنیا فتح کر لی ہے، اور باقی کی مجھے ابھی فتح کرنی ہے، اور مجھے یقیں ہے، اور میرے دیوتاؤں نے کہا ہے کہ تم وہ آدھی دنیا بھی فتح کر لو گے، تو اے آقا جب میں وہ آدھی دنیا فتح کر لوں گا، تو پھر انشاء اللہ آ کر آپ کے ساتھ قلابازیاں لگاؤں گا۔ تو اس نے کہا، تم کیسے بد نصیب ہو۔ میں آدھی دنیا فتح کیے بغیر قلابازیاں لگا رہا ہوں۔ تو جائے گا آدھی دنیا فتح کر کے آئے گا، پھر ایسا کرے گا۔ تو خواتین و حضرات یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آر وائے خان

پچھلی مرتبہ ایک بات چل رہی تھی جو بیچ میں ہی رہ گئی۔ گو وہ اپنے انداز میں تکمیل تک بھی پہنچی۔ وہ یہ کہ لفظ خدا، خدا نہیں ہے، اور اللہ کا تصور اور چیز ہے، اور اللہ کی ذات کا ادراک جو ہے وہ اس سے مختلف چیز ہے۔ انسان کی اچھی عادتوں میں سے اور اس کے مباح کاموں میں سے سب سے اچھی بات جو ہے، وہ عبادت ہے، اچھی عادت ہے عبادت کی آرزو ہے، جس کے لیے روح آپ کی تڑپتی رہتی ہے۔ ہم جو بڑے تھکے ہارے ولایت سے آئے تھے، نوکریاں کر کے، دھکے کھا کے تو ہماری یہ آرزو تھی کہ اپنے وطن واپس جائیں گے، اور ہمارے وطن میں جو ڈیرے ہوتے ہیں، بابے لوگ ہوتے ہیں، اور وہاں رہبانیت ہوتی ہے، جیسے وہاں بھنگ وغیرہ پئیں گے، چرس کے سوٹے لگائیں گے۔ کام وام تو وہاں ہوتا نہیں۔ یہی عام طور پر کیا جاتا ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی ہوگی، تو ہم نے اس لیے پر بھی توجہ دی کہ کم سے کم اتنی ساری مشکل کی، پیچیدہ، زندگی گزارنے کے بعد ایسا ماحول بھی میسر آئے کہ آدمی آرام سے رہ سکے۔ لیکن خواتین و حضرات! وہاں پہنچ کے پتہ چلا کہ اس سے زیادہ مشقت سے بھری زندگی، اور جدوجہد، اور کوششیں، اور Struggle ، اور کسی جگہ پر ہے ہی

نہیں، کیونکہ عبادت کر لینا اور دین کے بارے میں کچھ گفتگو کر لینا، یہ تو بڑا آسان کام ہے، لیکن اس کے اندر اتر کر اسے عملی طور پر اختیار کرنا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ یعنی تصوف شریعت سے جدا نہیں ہے۔ یہ وہی نماز روزہ ہے۔ صرف علم کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی زور دیا جاتا ہے، اور عمل کے تو ہم ایسے عادی نہیں تھے کہ یہ کیسے کیا جائے۔ اور جس بابے کے متعلق ہم بات کر رہے تھے، بابا نور والے، ان کا انداز اپنی طرز کا تھا، اور جو بات وہ کرتے تھے، وہ مختلف ہوتی تھی، جو ہمیں کتابوں میں، کتابی پلندوں میں نہیں ملتیں۔ اور ان کے قریب کے لوگ بڑے شاکی ہوتے تھے۔ یہ بات اندر کی ہے، لیکن آج میں اس کا اظہار کروں گا، کیونکہ ان کے صاحبزادے نے خود مجھ سے شکایت کی کہ دیکھیں بابا جی لوگوں پر اتنی مہربانی کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اتنے Kind ہیں، ان کو چیزیں بھی دیتے ہیں، رضائیاں بنا کے دیتے ہیں، کھانے کا سامان سب فراہم کرتے ہیں، لیکن میرے اوپر بالکل مہربان نہیں ہیں۔ میں ان سے کوئی چیز مانگتا ہوں تو یہ کنٹرول کر کے اس کے اوپر شرط عائد کر کے، اور جتنا حصہ یا جتنا کچھ مجھے درکار ہوتا ہے، وہ مجھے نہیں دیتے۔ تو ان کی اس بات کا میرے دل پر بھی بڑا اثر ہوا۔ میں نے کہا، یہ ایسے ہونا نہیں چاہیے۔ واقعی یہ جو کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ذرا سی تنگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اور ان کی شاید ٹریننگ

ہے، یا شاید تربیت، جو ہو رہی ہے۔ قدرے سختی کی بات ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ میں تھوڑا سا منہ چڑھا ہوا تھا۔ میں ان سے بات کر سکتا تھا۔ میں نے کہا، دیکھیے بابا جی یہ صاحبزادے جو ہیں، یہ شکوہ کناں ہیں، اور آپ ان کو وہ کچھ مراعات نہیں دیتے جو کہ مل جانی چاہئیں۔ کہنے لگے، میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔ میری آرزو ہے کہ اس کو انسان کی مدد، اور انسان کی آرزو، اور انسان کے سہارے کی عادت نہ رہے۔ یہ بلاواسطہ طور پر خدا سے مانگیں، کیونکہ جوں جوں آدمی دوسرے آدمی پر انحصار کرے گا، اللہ سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جائے گا، چونکہ میرا صاحبزادہ ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس پر سختی کا عمل کیا جائے۔

خیر وہ بات ان تک پہنچا دی لیکن وہ اس سے کچھ راضی نہ ہوئے، لیکن کچھ ایسے بھی آتے تھے کہ اللہ ہے، اور وہ ان کے کاموں میں پورے کا پورا دخل دے رہا ہے، اور حاوی ہے، اور جس سے وہ فرماتا ہے، اور جس طرح سے وہ چاہتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مڑ کے گھوم کے چلا جاتا ہے۔ بڑے خوش نصیب لوگ تھے۔ مجھے یاد ہے وہاں ایک اشرف لاری آیا کرتا تھا، اشرف کو پتنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا۔ نوجوان خوب صورت چادر باندھتا تھا ریشمی، اور کندھے پر پرنا رکھتا تھا اور جب بسنت قریب آتی جاتی تھی اس کی مانگ بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم پتنگ سے اتنی محبت کیوں کرتے ہو۔ کہنے لگا، اگر آپ کبھی پتنگ

اڑا کے دیکھیں، اور آپ کو اس کا لپکا پڑے تو آپ اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کے اندر ایک ٹیلی کمیونیکیشن ہوتی ہے۔ تار ہوتی ہے۔ ادھر سے ضرور کوئی Message آتا ہے۔ جو بڑا پتنگ باز ہوتا ہے، ان کو پیغام آتے ہیں۔ تو میں نے کہا، تم یہاں بھی آتے ہو، ڈیرے پر بھی بیٹھتے ہو۔ بابا جی کی باتیں بھی سنتے ہو، اور خدمت بھی کرتے ہو لوگوں کی۔ اللہ رسول کو بھی مانتے ہو، اور ہم سے بہتر مانتے ہو، یہ کیسے؟ تو اس نے کہا، یہ سب کچھ جو مجھے ملتا ہے نا، یہ میری گڈی اڑانے سے ملتا ہے۔ میں نے کہا، یہ کیا راز ہے؟ کہنے لگا جب پتنگ بہت دور چلا جاتا ہے، اور "ٹکی" ہو جاتا ہے، وہ لفظ "ٹکی" استعمال کرتا تھا۔ یہ کہ ٹک جاتا ہے۔ ایک جگہ پر، اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہ صرف مجھے دکھائی نہیں دیتا ہے بلکہ کسی کو بھی دکھائی نہیں دیتا، اور میرے ہاتھ میں صرف اس کی ڈور ہوتی ہے۔ تو اس نہ نظر آنے والے کی جو کھینچ ہوتی ہے میرے ہاتھ میں، اس نے مجھے اللہ کے قریب کر دیا ہے، کیونکہ میرے دل پر اللہ کی بھی کھینچ ویسی پڑتی ہے جیسے اس پتنگ کی ڈور میرے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ اب دیکھیے کیا ہم جو بڑے کتابیں پڑھ کے بڑا علم سیکھ کے بڑے بڑے کیسیٹ سن کے، اور ولایت میں، جھگڑے، بحث و مباحثے کر کے آئے، ان کے پاس کچھ نہیں تھا، اور وہ جو ہمارا پتنگ باز سجناں تھا، وہ اسی کے زور پر ٹکی ہوئے پتنگ کو

اس کے دباؤ کو محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اشفاق صاحب آپ کو کبھی کھینچ نہیں پڑتی اللہ کی طرف سے۔ میں نے کہا، نہیں۔ ویسی تو نہیں جیسی تم کہہ رہے ہو۔ کہنے لگا، وہ انسان کے دل کو ایسے کرتا ہے۔ میں نے کہا، نہیں اشرف یہ تو ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔

ہمارے وہاں ایک صاحب تھے، ڈیرے پر، حاجی صاحب Blue Eye ۔ مجھے ان کا نام بھولتا ہے۔ بہت خوبصورت ان کی آنکھیں تھیں۔ وہ وہاں رہے، اور کچھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر ایک دن کہنے لگے، میں واپس چلا جانا چاہتا ہوں، اپنے رحیم یار خان۔ وہاں جا کر میں کچھ لوگوں کو تبلیغ کروں گا، اور جو جو کچھ میں نے یہاں سیکھا ہے، وہاں جا کر ان کو بتاؤں گا۔ مجھے اجازت دیں۔ آپ نے کہا، بالکل ٹھیک ہے۔ آپ جائیں، لیکن میری آرزو یہ تھی کہ آپ کچھ اور یہاں ٹھہرتے اور ہمیں خوشی ہوتی۔ آپ ہمارے جانی جان ہیں۔ ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حاجی صاحب کچھ دیر رہتے، لیکن وہ مصر تھے، اس بات پر میں جاؤں گا اور بابا جی کا اس پر اصرار ہوتا تھا کہ جب تک تمہارا رابطہ اللہ سے پورے کا پورا سالم کا سالم نہیں ہوگا تب تک آپ دیوار سے ڈھو لگا کر اس کے ساتھ کمیونی کیٹ، اس کے ساتھ گرین لائن پر کچھ بات نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت تک آپ عبادت یا آپ کا یہ سچ کا تجربہ ایسا ہی ہوگا شنیدہ، سنا ہوگا۔ تو حاجی

صاحب نے کہا، جی میں وہاں جا کر انشاء اللہ یہ جو آپ سب کچھ فرماتے ہیں، بیان کروں گا۔ اور انہوں نے کہا، ٹھیک ہے۔ جب وہ جانے لگے تو تھوڑے سے افسردہ تھے کہ حاجی صاحب جا رہے ہیں، انہوں نے بلایا۔ بابا جی کہنے لگے، تم جاؤ گے اپنے رحیم یار خان تو تمہارا گاؤں کتنی دور ہے۔ اس نے کہا، میرا چک وہاں سے کوئی پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ کہنے لگا، وہاں لوگ بھیڑ بکریاں بہت رکھتے ہیں۔ کہنے لگے، ہاں ہاں تو بھیڑوں کے گلے ہوں گے۔ کہا تو جب تم اپنے گاؤں میں داخل ہو گے تو تم بھیڑوں کے ریوڑ کو کراس کرو گے۔ کہیں نہ کہیں چر، چگ رہے ہوں گے۔ اس نے کہا، ہاں جی ضرور ہوں گے۔ کہنے لگے، جب تم بھیڑوں کے ریوڑ کے پاس پہنچو گے تو اس ریوڑ میں کتے بھی ہوتے ہیں پاسبانی کے لیے، حفاظت کے لیے رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا، ہاں جی ہوں گے۔ انہوں نے کہا، تم یہاں رہے ہو اتنی دیر تک، اب تک تو واقف نہیں ہو گے۔ آپ ان کتوں کو کس طرح سے عبور کریں گے، کیسے کراس کریں گے۔ اس نے کہا جی کہ اگر کسی کتے نے میرے اوپر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں پتھر اٹھالوں گا۔ تو بابا جی نے کہا، وہ تو چار کتے ہوں گے، اور آپ ایک کو پتھر مار لیں گے۔ ٹھیک وہ زخمی ہ سکتا ہے، تین آپ کو پکڑ لیں گے۔ حاجی صاحب کچھ پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے، میں جی کچھ ایسے کروں گا کہ وہاں سے ایک لکڑی توڑ لوں گا۔ وہاں سے

چاروں میرے پیچھے پڑیں تو زور سے گھماتا ہوا چلوں گا اور پھر میں اپنا آپ بچا کر کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ انہوں نے کہا، میں تو تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ تو ایک کتے کو لگ جائے گی، دو کو لگ جائے گی تو تم گزرو گے کیسے۔ یہ تو مشکل پڑ جائے گی تمہارے لیے۔ چاہے لکڑی گھماتے ہوئے گزرو۔ حاجی صاحب تو سوچ میں پڑ گئے۔ ہم بھی سوچ میں پڑ گئے کہ بھئی ان کو کراس کرنا بڑا مشکل کا ہے تو حاجی صاحب ہم سے زیادہ سمجھدار تھے، عمر میں بڑے تھے۔ تو کہنے لگے، حضور آپ فرمائیں کہ ایسی حالت میں ایسے موقع پر کیا ہونا چاہیے۔ تو بابا جی نے کہا کہ صاحب طریقہ یہ ہے کہ ان کو پریشان کیے بغیر، اور ان کو اپنا آپ دکھائے بغیر، سب سے پہلے آپ گڈریے کو آواز دیں۔ وہ آپ کی آواز سن کر جھگی سے نکلے گا۔ آپ اس سے کہیں گے، میں یہاں سے گزرنا چاہتا ہوں۔ وہ کتوں کو آواز دے گا، او کالو وُڈ بو وُ بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ جائیں گے۔ تو آپ گزر جائیں گے۔ جب بھی مشکل وقت ہو گڈریے کو آواز دیں۔ آپ کا پالن کرنے والے۔ اپنی Efforts کر کے راہ تجویز کر کے کبھی زندگی کے مشکل مقام سے گزرنے کی کوششیں نہ کرو۔ اس وقت اپنے چرواہے کو پکارو۔ تو حاجی صاحب کی سمجھ میں بات آ گئی۔ انہوں نے کہا، ابھی میں چرواہے کو پورے کا پورا آواز دینے کے قابل نہیں ہوا۔ میں ابھی رہوں گا آپ کے پاس، اور میں یہ سیکھوں گا کہ اس کو آواز کس طرح

دی جاتی ہے۔ تو وہاں خواتین و حضرات کچھ کچھ لوگ ایسے آتے تھے جن کو آپ صاحبِ حال کہہ کر پکارتے ہیں۔ جن کو ایک ذاتی تجربہ، اور ذاتی مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ اتنے خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں، اتنی آسانیوں میں سے گزرنے والے ہوتے ہیں کہ ہر کام کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کو Endorse کر دیتے ہیں۔ اس کے نام کر دیتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے لوگ جو تھے یا ہوتے ہیں۔ ہم اپنی تجویز ساتھ لے کر چلتے ہیں، اور جب بہت ہی مشکل آئے تو بہت ساری تجویزیں ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اپنی دنیا بھر کی سلطنتوں، اور حکومتوں کو دیکھیں کوششیں کرتی رہتی ہیں، اور ان کے سارے رخ ٹیڑھے، اور چبے ہوتے رہتے ہیں، اور بنی نوع انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے، ان میں کمی نہیں آتی۔ چند روز ہوئے میں اپنی بنیان استری کر رہا تھا۔ میری بنیان کھدر کی ہوتی ہے۔ سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ ہاتھ کی سلی ہوئی۔ بنی بنائی بنیان مجھے ملتی ہی نہیں، سلوانی پڑتی ہے۔ تو میں چاہ رہا تھا کہ اس کو استری کر کے پھر پہنوں تو خوش دلی کے ساتھ اس کو استری کر رہا تھا۔ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مجھے ٹیلی فون سننا پڑ گیا۔ اس پر کچھ دیر بات ہو رہی۔ میں استری ویسے ہی چھوڑ آیا، لوٹ کے گیا بات کرنے کے بعد تو پھر میں نے اٹھائی استری۔ اب میں پھر استری کرنے لگا، لیکن اس پر استری کا کوئی اثر نہیں ہوا میری بنیان پر۔ تو پریشانی

کے عالم میں میں نے دیکھا کہ یہ کیا ہوا۔ دیکھا تو میں نے اس کا پلگ تو آن ہی نہیں کیا تھا۔ جب تک پلگ کا کنٹیکٹ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میری استری پوری تھی، ولایت کی بنی ہوئی اور تھی بھی بالکل نئی۔

بس ایک خرابی تھی کہ وہ کنکشن نہیں لگا، پلگ نہیں لگا تھا۔ اس لیے وہ سلوٹیں تو ویسی کی ویسی رہ گئیں۔ اپنی زندگی میں بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا، جب کنکشن نہ لگے، تو زندگی کی سلوٹیں نکلتی نہیں ہیں، اور لگانے کے لیے بات اس کی ہوتی ہے کہ پلگ کسی نہ کسی طرح سے ڈائریکٹ لگ جائے۔ ویسے بھی لگائیں جیسے تاروں کو کنڈے لگا دیتے ہیں۔ وہ بھی ٹیڑھی بات ہے، لیکن صحیح طور پر اگر پلگ لگے تو اس کا لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فرانس کے ملاح، میں نے دیکھا ہے وہاں South کے خاص طور پر۔ وہ سمندر میں اترنے سے پہلے ایک دعا مانگا کرتے ہیں۔ بڑی مختصر سی، اور وہ دعا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تیرا سمندر بہت بڑا ہے، اور میری کشتی بہت چھوٹی ہے۔ بظاہر یہ معمولی سی دعا ہے، لیکن اس میں اتنا اعتراف ہوتا ہے، اور اتنی قربت ہوتی ہے خدا کے ساتھ ان کی، اور اتنا رابطہ ہوتا ہے کہ جب اترنے لگتے ہیں وہ South France کے لوگ کہ اس یقین کے ساتھ اترتے ہیں کہ یہ واقعی اس اللہ کا

سمندر رہے، اور وہ اس کا مالک ہے۔ میری کشتی جو ہے، وہ واقعی چھوٹی ہے، اور اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی جتنا کہ اسے کرنا چاہیے۔

ہمارے پاس جانکار لوگ بات سمجھنے والے بھی، اور احساس رکھنے والے بہت سے تھے، اور ہیں اب بھی۔ مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے، جانکار لوگوں میں سے ایک کا۔ میرے ایک دوست تھے۔ سلطان راہی ان کا نام تھا۔ آپ نے ان کی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ باوجود اس کے کہ میرا تعلق ریڈیو ٹیلیویژن سے تھا لیکن ہمارا رشتہ فلم سے وہ نہیں تھا۔ ایک، اور حوالے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور ہمارا رابطہ اپنے خفیہ انداز کا رہتا تھا۔ اسے اجاگر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ ایک روز میرے پاس T.V میں ان کا پیغام ملا کہ آپ آئیں، ایک چھوٹی سی محفل ہے۔ اس میں آپ کی شمولیت بڑی ضروری ہے، اور آپ اسے پسند کریں گے۔ میں نے کہا، بسم اللہ۔ ہمارے یہاں لاہور میں ایک علاقہ ہے نسبت روڈ جہاں پر دیال سنگھ کالج ہے۔ اس کے عقب میں چھوٹی گلیاں ہیں جہاں اچھے اچھے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں پر انہوں نے انتظام کیا تھا بڑی اچھی ایک بیٹھک تھی اور جالی والا دروازہ۔ اس کو صاف کر کے اگر بتیاں جلا کے سلطان راہی نے بندوبست کیا تھا۔ سلطان راہی کو شاید آپ جانتے ہیں یا نہیں اسے قرأت کا بڑا شوق تھا، اور اس کا ایک اپنا انداز تھا۔ اس کا اپنا ایک لہجہ تھا۔

کبھی کوئی فنکشن شروع ہوتا تھا تو لوگ اس نے کہتے تھے کہ آپ قرأت کریں وہ کر دیتا تھا۔ لیکن اس کا ایک، اور پہلو جو تھا قرأت کے ساتھ وابستگی کا، اسے کم لوگ ہی جانتے تھے۔ تو وہاں ہم بیٹھے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، گاؤں کا پینڈو آدمی۔ اس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ کندھے کے اوپر اس کے کھیس تھا۔ سادہ سا آدمی کچھ اتنا زیادہ Impressive (متاثر کن) بھی نہیں تھا جتنا اس کو ہونا چاہیے تھا۔ تو انہوں نے کہا، ان سے ملیں، یہ بھا رفیق ہے۔ بھا رفیق بھی اس محفل میں شامل تھا۔ ہم دس گیارہ پندرہ لوگ دیوار کے ساتھ ڈھو لگا کے بیٹھے گئے۔ سلطان راہی نے کہا، آپ کو اپنی کچھ قرأت سنانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔ انہوں نے کہا، میں سورہ مزمل پڑھوں گا۔ تو کہا، سبحان اللہ اور کیا چاہیے تھا۔ تو سلطان راہی نے اپنے انداز میں اپنے لہجے میں، اور اپنی آواز میں سورہ مزمل کی تلاوت شروع کی۔ بہت اعلیٰ درجے کی، اور لوگوں نے اسے بہت ہی پسند کیا۔ وہ پڑھتے رہے۔ ہم دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سنتے رہے، اور جب ختم ہو گئی تو سب کے دل میں تھی آرزو کہ کاش ایک مرتبہ پھر اسے پڑھ سکے، لیکن انہوں نے بند کر دیا۔ پھر انہوں نے بھا رفیق کی طرف دیکھا، اور ان سے کہا، جی آپ بھی فرمائیں ہمارا اندازہ نہیں تھا کہ ایسا سیدھا سا آدمی بولے گا۔ تو بھا رفیق نے کہا، جی میری آرزو بھی سورہ مزمل سنانے کی تھی لیکن انہوں نے سنا

دی۔ ہم نے کہا، نہیں نہیں آپ بھی ہم کو یہی سنائیں۔ اس میں کیا حرج ہے تو آپ اپنا شوق پورا کریں۔ ہم تو یہ آرزو کر رہے تھے کہ دوبارہ شروع ہوتی۔ اور کہنے لگا بسم اللہ۔ انہوں نے بیٹھ کر خواتین و حضرات اپنے اس انداز میں کھیس کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لیا۔ اس کے اوپر کہنیاں رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور سورہ مزمل سُنانی شروع کی۔

آپ نے بے شمار کیسیٹ سنے ہوں گے۔ بے شمار قاریوں کا سنا ہو گا۔ انہوں نے جو سنایا، اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ جوں جوں وہ سناتے چلے جا رہے تھے۔ ہم سارے آدمیوں نے جو بیٹھے تھے، یہ محسوس کیا کی اس بیٹھک میں تاریخ کا کوئی اور وقت آ گیا ہے۔ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اور ہم لوگوں کو ایسا لگا کہ ہم قرونِ اولیٰ کے مدینہ شریف کی زندگی میں ہوں، اور یہ وہی عہد ہے، اور یہ وہی زمانہ ہے، اور ہم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں کہ جو اس عہد کی آواز کو ویسے ہی کسی آدمی کے منہ سے سن رہے ہیں۔ یہ سب کا تجربہ تھا۔ عجیب و غریب تجربہ تھا۔ ہم نے یوں محسوس کیا جیسے اس کمرے میں، بیٹھک میں عجیب طرح کی روشنی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ہمارا خیال ہو، لیکن اس کی کیفیت ایسی تھی کہ اس نے سب کے اوپر ایک سحر کر دیا تھا۔ پھر وہ ختم ہو گئی۔ ہم نے زبان سے شکریہ نہیں ادا کیا، کیونکہ ہم سارے اتنے جذب ہو گئے تھے

کہ بولا نہیں جارہا تھا۔ البتہ ہماری نگاہوں میں جھکے ہوئے سروں میں، اور ہماری کیفیت سے یہ صاف طور پر واضح ہوتا تھا کہ یہ جو کیفیت تھی، جو گزری تھی، یہ کچھ اور ہے۔ تُوتو کوشش کر کے ہمت کر کے میں نے کہا، راہی صاحب ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ پہلے آپ نے سورہ مزمل سنا کر پھر آپ نے اپنے دوست کو لا کر تعارف کروایا اور قرآن سنوایا۔ یہ کیفیت ہمارے اوپر کبھی پہلے طاری نہیں ہوئی تھی۔ ہم سمجھ سکتے تھے۔ تو سلطان راہی نے کہا، بھاجی بات یہ ہے کہ سورہ مزمل جانتا ہوں، اور بہت اچھی جانتا ہوں، لیکن یہ شخص مزمل والے کو جانتا ہے تو اس لیے بڑا فرق پڑا۔ تو جب آپ والی کو جانتے ہیں، اور جاننے لگتے ہیں، زندگی میں خوش قسمتی سے یا اللہ سے ایسا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جیسا اس کا تھا، تو پھر وہ کیفیت، اور طرح کی ہوتی ہے، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جو کیفیت ہوتی ہے یہ مختلف ہوتی ہے، اور زندگی میں ساری عمر ساتھ چلنے والی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار جب بھی کیا تھا، اب بھی کرتا ہوں کہ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کی گڈی جو تھی، وہ ٹکی ہو جاتی تھی، جو بظاہر تو گڈی کی بات کرتا ہے لیکن اس کے پیغام کچھ اور ہوتا ہے، میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں۔

اینڈریو

میری دِلی آرزو کے مطابق ہمارے شہزاد احمد یہاں اس محفل میں تشریف لائے تو انہوں نے آتے ہی اس عہد کی یاد دلادی جس کا تعلق 60-61-62 کی دہائی کا ہے۔ مجھے صحیح طرح سے سن یاد نہیں رہا۔ اور اس بات کا تعلق ایک حد تک اس درس روحانیت سے ملتا ہے جس کے بارے میں علم حاصل کرنے کے لیے اور تعلیم پانے کے لیے بڑی بڑی جگہوں پر گھومتا رہا، لیکن یہ میرا ابتدائی دور تھا اور میرا اس روحانیت کے بکھیڑے میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ شام کے وقت بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی تو میں گیا، جا کے دروازہ کھولا تو وہاں ایک بڑا دبلا سا نوجوان، داڑھی، سنہرے بال، انگریزی مزاج، گھسی ہوئی جینز پہنے ہوئے اور آدھی آستین کی قمیض پہنے دیوار سے لگا کھڑا تھا چوکھٹ سے۔ تو اس نے مجھ سے کہا ?Are you Ashfaq Ahmed میں نے کہا، میں ہی ہوں تو وہ کچھ دیر چپ رہا، پھر میرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا، مجھے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں کہ آپ spiritualism (روحانیت) کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس

کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔ میں یہ کہ سکتا ہوں کہ میں اس علم کا ایک صحافی ہوں زیادہ سے زیادہ، لیکن میں اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ اس نے کہا، مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے تو کسی نے کوئٹہ میں بتایا تھا جہاں سے میں اپنا ٹریول چیک کیش کروا رہا تھا۔ اشفاق صاحب سے مل لینا، وہ آپ کو بہت ساری معلومات بتائیں گے ۔ میں نے کہا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن تم کہاں ٹھہرے ہو۔ اس نے کہا، میں ریلوے اسٹیشن لاہور، وہیں رہتا ہوں۔ مجھے آئے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے میں ہندوستان میں رہا۔ بنارس میں ایک سال رہا، اور وہاں سے پھر میں کھٹمنڈو چلا گیا۔ کھٹمنڈو میں میں نے تانترک ودیا کا علم حاصل کیا۔ وہاں دس گیارہ مہینے رہا۔ تانترا کا علم حاصل کرنے سے میری کوئی تشفی نہیں ہوئی، تو پھر میں یہاں آ گیا لاہور میں۔ کسی نے بتایا کہ لاہور بھی روحانیت کا گڑھ ہے۔ میں نے کہا، یہ مدینۃ الاولیا ہے تو سہی، لیکن میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہیں ہوں۔

سچی بات یہ کہ میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ وہ مایوس ہوا، چہرہ شہزادہ اس کا، بالکل، آپ کو آسانی ہو گی جاننے میں، ڈی ایچ لارنس سے ملتا جلتا تھا۔ اتنا ہی دبلا، ویسی ہی شکل، وہی آنکھیں، ویسی ناک، ویسے اس کا انداز کھڑے ہونے کا، گردن بھی ۔میں واپس اندر آیا تو میری بیوی نے پوچھا کون تھا؟ میں نے کہا، کوئی باہر کا آدمی

تھا۔ غیر ملکی، یہ پوچھتا تھا۔ اس نے کہا ہمارے پاس کیوں آگیا۔ میں نے کہا، مجھے بڑا تجسس ہے کہ ہمارے پاس کیوں آگیا۔ تو خیر شام کو جب میں لیٹا تو مجھے خیال آیا کہ پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہو گا، اور اس کو دقت ہوئی ہو گی، شریف سا آدمی تھا، اور وہ کچھ جاننا چاہتا تھا اور دقت میں میں بھی تھا، ہپی اس زمانے میں بہت آیا کرتے تھے اور اس کا انداز بھی ہپیانا تھا تو یوں میرے ذہن پر یہ ساری چرخی چلتی رہی۔ اگلے دن میں دس گیارہ بجے ریلوے اسٹیشن پر گیا تو وہ تھرڈ کلاس کے نلکے کے پاس اپنی کتاب کھولے دیوار سے ڈھو لگائے کچھ پڑھ رہا تھا، میں اس سے ملا۔ میں نے کہا میں معافی چاہتا ہوں۔ کل آپ سے ٹھیک سے بات نہ ہو سکی۔ آپ کا نام کیا ہے۔؟ اس نے کہا میرا نام اینڈریو ہے۔ میں نے کہا تم یہاں کہاں رہتے ہو۔؟۔ کہنے لگا میں یہیں رہتا ہوں۔ میں نے کہا تمہیں یہاں دقت ہو گی۔ اس نے کہا نہیں دقت کوئی نہیں، ہم عام آدمی ہیں۔ ایسی کوئی مشکل نہیں۔ یہ بہت اچھا ہے، پانی مجھے مل جاتا ہے پینے کو۔ کھانے کو ایک آدھ سموسہ کھا لیتا ہوں۔ میں نے کہا، تم ایسے کرو میرے ساتھ چلو گھر، اور وہاں تمہیں تھوڑی سی آسائش ہو گی۔ میری طبیعت پر بڑا بوجھ ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ میں حاضر ہوں۔ جب چلنے لگا تو اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے کہا اپنا تھیلا اٹھا لو کہنے لگا، کون سا تھیلا۔ میرے پاس تو کچھ نہیں۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ تو میری بیوی کہنے

لگی، یہ کیا چیز پکڑ لائے ہو، کیونکہ جب وہ گھر آیا تو اس کے بدن کی بڑی بو تھی۔ ہپیوں سے خاص قسم کی بو آیا کرتی ہے۔ دوسرے جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے مجھ سے کہا، کیا میں سگریٹ لے سکتا ہوں۔ تو میں نے کہا، پی لو۔ جب اس نے سگریٹ پیا۔ تو میری بیوی نے کہا، یہ کیسا سگریٹ ہے۔ اس میں تو اور قسم کی بدبو ہے۔ تو میں نے کہا، یہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ اجازت دے دیں۔ کوئی بات نہیں۔ اسے اجازت دے دیں۔ تو کہنے لگی آپ اسے کیا کریں گے۔ میں نے کہا ہمارا یہاں ایک کمرا ہے۔ بڑا اچھا سا، خالی پڑا ہے تو اس میں رہ لے گا۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تو اس نے بادل نخواستہ کہا، اچھا رہ لے۔ کتنے دن کے لئے۔ میں نے کہا مجھے پتا نہیں کتنے دن کے لئے۔ وہ صبح جب اٹھا تو اس نے کہا اشفاق صاحب I am ! not a poet; I am sort of a poet میں شاعر تو نہیں ہوں لیکن میں نے ایک نظم لکھی ہے رات کو۔ تو وہ مجھے سنانے لگا۔ میں شاعری سے بڑی رغبت رکھتا ہوں۔ لیکن اتنی گہرائی میں جانے کے لیے جب کہ کوئی مشکل نظم ہو تو میں رک جاتا ہوں کہ مجھے لکھی ہوئی ملے، دھیان سے دیکھ کر کچھ سمجھوں لیکن وہ سنانے لگا انگریزی میں تو میری بیوی آگے ہو کے بیٹھ گئی وہ چونکہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھی اس کو ذرا آسانی ہے تو اس نے کہا Andrew Please Say It Again اس نے پھر پڑھا تو وہ جناب بالکل اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی، اور

میں نے شکر کیا کہ میرے اوپر بوجھ نہیں رہا۔ تو اس نے کہا Do you
write’...have you written something else too.. اس نے کہا
ہاں میری ایک کاپی ہے۔ جو جیب میں تھی تو اس نے دو تین نظمیں اس میں سے
سنائیں تو میری بیوی کہنے لگی یہ تو بڑا کمال کا poet ہے۔ غضب کا ہے یہ تو، اور وہ
یہ ساری لمبی لمبی باتیں Detail سے بیان کرنے لگی۔ اس کو اچھی خوراک ملنے
لگی، ہمارے گھر سے کیونکہ وہ بہت اچھا شاعر تھا۔ اینڈریو صاحب وہاں رہنے لگے
۔ ہمارے گھر میں ایک کونہ تھا جہاں کوئی نہیں بیٹھتا تھا، کارنر میں تو وہ اس نے
اپنی جگہ بنالی۔ وہاں ایک ٹوٹا ہوا مصلیٰ بچھالیا۔ دن بھر وہ اسی کونے میں بیٹھا رہا۔
کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ کبھی ہم کو ڈسٹرب نہیں کیا۔ کبھی ہم سے کچھ پوچھا
نہیں۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ بس وہیں بیٹھا رہتا تھا اور لکھتا رہتا تھا۔
شام کو میری بیوی پوچھتی ?. Have you something new تو وہ کہتا تھا کہ
ایک بند stanza ہوا ہے یا دو یا پوری نظم تو وہ سناتا تھا۔ ایک ہی اس کی سامع تھی
اور ایک ہی تھا poet اور وہ اپنا مشاعرہ کر کے شام کو پھر اوپر چلا جاتا۔ ایک دن
میری بیوی بڑی پریشان تھی اور وہ بھاگی پھرتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے
کمرے میں۔ دوسرے سے تیسرے کمرے میں اور ملازم بھی پریشان۔ وہ بار بار
جاتی تھی برآمدے میں اور بار بار باہر آتی تھی تو اینڈریو جس نے کبھی دخل نہیں

دیا کام میں اور انگریز آدمی کبھی دخل دیتا بھی نہیں، پوچھتا بھی نہیں۔ اس نے جب آپا جی کی پریشانی کو ایسا دیکھا تو اٹھ کر اپنی جگہ سے آیا۔ کہنے لگا

If you do not mind ...ApaJi, You seem to be discomfort and you are uncomfortable, what is wrong ...?

مجھے آپ سے پوچھنا تو نہیں چاہیئے کیونکہ یہ Manners سے خلاف ہے، اور مجھے دخل نہیں دینا چاہیئے تھا، لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، آپ بہت گھبرائی پھرتی ہیں۔ تو اس نے کہا، Andrew do not talk to me یہ تمہارا کرنے کا کام نہیں ہے تم چھوڑو اس قصے کو میں ہوں بس گھبرائی ہوئی You do not disturb me وہ بے چارہ ڈر گیا، پتہ نہیں کہ مشرق کے لوگوں کا کیا انداز ہے لیکن جب اس کی پریشانی اور بڑھی، ایک آدمی آ گیا۔ ایک ہتھوڑی اور پلاس اٹھائے ہوئے۔ وہ اندر کچھ کھٹا کھٹ کرتا رہا۔ پھر چلا گیا واپس، تو اینڈریو نے کہا، آپ مجھے جو مرضی کہیں آپا جی، میں تو ضرور پوچھوں گا کہ کیا مسئلہ ہے۔ اس نے کہا بات یہ ہے میری جو کوٹھڑی ہے جہاں کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا ہے، اس کو لاک لگا ہوا ہے آٹومیٹک بند ہونے والا تو میں اپنی چابیاں اندر بھول گئی ہوں۔ غلطی سے ہاتھ لگ گیا دروازے کو تو وہ بند ہو گیا، اب وہ کھلتا نہیں، اب میں نے

پٹرول پمپ سے آدمی کو بلوا کے بھیجا۔ اس نے کہا 60 روپے لوں گا۔ اس نے بہت Try کیا۔ اس نے کہا ہے کہ تالا ایسا ہے جو دنیا کا کوئی بندہ نہیں کھول سکتا۔ ترکھان کو بلوائیں، وہ آری لے کر اتنا حصہ کاٹے گا۔ پھر لاک نکلے گا اس نے کہا کہ کیا میں آپ کا وہ تالا دیکھ سکتا ہوں۔ اس نے کہا تو دیکھ کے کیا کرے گا مسٹر poetاس نے کہا نہیں جی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو وہ کہنے لگی آجا۔ آجا دیکھ لے ۔ اس نے تالا جا کے دیکھا تو اس نے کہا آپا جی کوئی تار ہو گی تو اس نے کہا کہ، تار کوئی نہیں ہے تو اس نے خود گھوم پھر کے ایک ٹوٹی ہوئی چھتری پڑی تھی ہمارے گھر میں جو پرانی تھی اس نے اس کی تار نکالی اور اس کو مروڑ دیا اور اس کے اندر یوں ہلا کے کڑک سے دروازہ کھول دیا تو میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ تو اس نے کہا، یہ تم نے کیسے کھول دیا۔ کہنے لگا، بس یہ کھل گیا، بس یہ کھل جاتا ہے۔ کہنے لگاYes it was a very complicated Lock ۔ تو اس نے کہا کہ اینڈریو مجھے بتاؤ کہ تم نے کھولا کیسے ؟

اس نے کہا، آپا جی میں لندن کا ایک نامی گرامی چور ہوں، اور میں نے دو سال قید بھگتی ہے چوری کرنے پر۔ میرا کریکٹر اچھا تھا۔ مجھے چار مہینے کی معافی مل گئی تو ایک سال آٹھ مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد پھر میں جیل سے نکلا ہوں، تو میرے سامنے کوئی دروازہ کوئی لاک جو ہے، وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ میں شام کو

گھر آیا تو کہنے لگی یہ اینڈریو جو ہے، یہ چور ہے اور اس کو ہم نے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا، اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے کہا کہ اس نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ جب میں نے پوچھا تو کہنے لگا، یس سر میں تو بہت مشہور چور ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ اخبار کی نیوز کٹنگ دکھا سکتا ہوں جس میں میری فوٹو ہے۔

مجھے چار مہینے کی معافی مل گئی کیونکہ میرا کریکٹر بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد کہنے لگا، میں نے پرائمری سکول میں نوکری کر لی بطور پروفیسر آف فلالوجی He did M.A in English لٹریچر کا آدمی تھا۔ لسانیات کا آدمی تھا۔ لغت کا، بالکل لسانیات کا پروفیسر ہو گیا، تو پڑھتا پڑھاتا رہا۔ تو کہنے لگا لسانیات بڑا سخت subject ہے آپا جی، میں کبھی آپ کو بھی بتاؤں گا، کیونکہ آپ کو یہ ضرور آنا چاہیئے، اس کی بنیادی باتیں۔ تو پھر مجھے روحانیت کا شوق ہوا تو پھر میں انڈیا چلا گیا

۔

اب ہم گھر میں دونوں میاں بیوی بڑے خوف زدہ ہوئے کہ چور کو گھر میں رکھا ہوا ہے، یہ سزا یافتہ بھی ہے، اور ساتھ ساتھ شاعر بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی کا پروفیسر بھی ہے، اور پروفیسر بھی لسانیات جیسے مضمون کا، فلالوجی

وغیرہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ اب میں اس سے تھوڑا تھوڑا ڈرنے لگا اور
اس نے بھی بھانپ لیا اور وہ صبح اٹھ جاتا تھا۔ اور ایک لمبا راستہ طے کر کے دن
بھر غائب رہتا تھا۔ شام کے پانچ چھ بجے واپس آجاتا تھا، پھر ہم کھانا وغیرہ کھاتے
۔ دن کا کھانا وہ ہمارے پاس نہیں کھاتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا، تم
دن بھر کہاں جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ آپ تو میری مدد نہیں کر سکے، لاہور میں
بُڈھے راوی کے پاس، ایک بابا چھتری والا ہے۔ اس کے پاس جاتا ہوں تو آپ کو
بھی چلنا چاہیئے۔ وہ بہت عجیب و غریب ہے، اس کے پاس علم ہے، اور وہ بہت
ساری آپ کو ایسی چیزیں بتائے گا۔ تو میں نے کہا میں ایسی چیزوں پر اعتماد نہیں
نہیں رکھتا۔ میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس نے کہا نہیں آپ میرے
ساتھ ضرور چلیں۔ تو میں شوق اور تجسس کے مارے اس کے ساتھ گیا۔ وہاں
گئے تو وہ بابا چھتری والے جو تھے وہ کشمیری زبان بولتے تھے۔ ان کو کوئی اور
زبان نہیں آتی تھی، لیکن یہ دونوں صبح بیٹھ جاتے تھے گفتگو کرنے، اور شام تک
ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے تھے۔ اب یہ کیا کرتے ہوں گے، یہ
وہی جان سکتے ہیں۔ میرے لئے تو یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ یہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔
وہ کہتا تھا کہ یہ بابا جو بات کرتا ہے، ایسی ہوتی ہے جو میں نے اس سے پہلے نہ
کھٹمنڈو میں سنی، نہ بنارس میں سنی تھی اور بابا سے میں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ سرجو

آپ سے پوچھتا ہے کیسا آدمی ہے، لیکن اینڈریو کو ان ساری باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اب دیکھئے انسان تلاش کے لئے کسی طرف کو نکلتا ہے، رخ اس کا کسی اور طرف ہوتا ہے۔ چلا کہیں سے آ گیا ہمارے گھر۔ ہم جو بے یقینے لوگ تھے جن چیزوں پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اس کو وہاں رہنا پڑا۔

اب اس نے ایک دن بتایا کہ میری ایک منگیتر بھی ہے اس کا نام جوئی ہے، جوئی آنا چاہتی تھی۔ اس کو خط لکھتی تھی کہ I want to Join You تم کہاں ہو، اس وقت اینڈریو کا والد جو تھا، وہ برٹش ریلوے کا ریٹائرڈ آفیسر تھا۔ جوئی کا باپ کاؤنٹی میں ایک ڈرافٹر تھا۔ جی پی ڈرافٹر تو اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا میری بیوی کا شوق ہوا۔ اس نے کہا جوئی کو ضرور آنا چاہیئے۔ یہ الگ الگ کیوں رہتے ہیں۔ تو ہم نے کہا، ٹھیک ہے۔ اسے بلا لیتے ہیں، تو اسے خط لکھا گیا۔ اب جوئی جب آئی ہمارے گھر میں۔ بڑی خوبصورت تھی۔ بڑی گوری اونچے قد کی، لیکن طبیعت ذرا جسے کہتے ہیں نا، جلدی گھبرا جاتی تھی، وہ تحمل اور بردباری جو اینڈریو میں تھی، اس میں نہیں تھی، اور وہ بہت سی باتوں پہ اینڈریو پر چڑھ دوڑتی تھی تو جب میری لڑکیوں نے دیکھا، میری بھانجیوں، میری بھتیجیوں، میرے گھر والوں نے تو انہوں نے کہا، جوئی اور اینڈریو کی شادی کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے کہا پہلے ہم اس کی ڈھولکی رکھیں گے۔

پھر اس کی گھوڑیاں ہوں گی۔ آدھی لڑکیاں ادھر ہو گئیں۔ اس کی طرف اور آدھی جوئی کی طرف۔ ہمارے بر آمدے میں صاحب اتنی بڑی شادی پہلے کبھی ہوئی نہیں۔ بچیاں روز بیٹھ جاتی تھیں ڈھولکی لے کر، انہوں نے بجانا شروع کر دیا۔ جوئی بہت خوش۔ اتنی تو عزت نہیں ہوتی ولایت میں۔ وہ تو جاتی ہیں ایک سیکنڈ کے لیے۔ چرچ میں گئے اور ختم۔ ہو گئی شادی، جب شادی قریب آتی گئی۔ تو مجھے اینڈریو نے کہا، شادی تو میری ہو چکی ہے، لیکن میں اسے بلانا چاہتا ہوں، ملاں جی جو ہوتا ہے ناوہ بھی ہو۔ میں نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے تم کو ہم کیا درج کرائیں گے اس میں۔ اس نے کہا نہیں ویسے ہی آ جائے، تو میں نے محلے کے مولوی سے کہا، آج ہمارے شادی ہے۔ گورا اور گوری کی تو آپ آ جائیں تو کہنے لگا ٹھیک ہے۔ میں نے کہا، نکاح پڑھا دیں، کچھ پڑھ دیں آپ۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں نصاریٰ ہیں۔ میں نے کہاہاں نصاریٰ ہیں۔ اب جس دن اس کا شادی کا دن تھا تو وہ صبح چلا گیا، اپنے بابا سے ملنے، بابا چھتری والے سے اور اس سے دعا وغیرہ لینے۔ دن گزر گیا ہے لڑکیاں ڈھولکی بجا بجا کر تھک گئی تھیں۔ شام پڑ گئی۔ مولوی صاحب آ گئے۔ اینڈریو صاحب کا کوئی پتہ نہیں، اور ہم سارے پریشان بیٹھے ہیں۔ گھر میں اور جوئی جو ہے وہ Pins and needles لئے بھاگتی پھرتی ہے۔ رات پڑ گئی۔ رات کے آٹھ نو بج گئے۔ آدھی رات کو اینڈریو صاحب چلے

آرہے ہیں۔ ایک ستھن پہنی ہوئی گھٹنوں سے اونچی اور سر کے اوپر ایک ایسا صافہ اور قمیص تو میں نے ذرا شاؤٹ کیا اس کو۔ میں اس سے کہا Where have you been Andrew تو اس نے کہا I am very sorry I am lazy- Sorry sir forgive me یہ بار بار کہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن یہ ساری لڑکیاں بیٹھی ہیں تمہاری شادی کا سارا اہتمام ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ تو کہنے لگا کہ مجھے بڑا ضروری کام تھا۔ وقت مجھے مل نہیں رہا تھا۔ مجھے سرٹیفکیٹ لینا تھا تو وہ نہیں مل رہا تھا، دیر ہو گئی۔ تو میں نے کہا کون سا سرٹیفکیٹ کہنے لگا جی میں آج مسلمان ہو گیا ہوں اور مجھے اس کا سرٹیفکیٹ لینا تھا۔ میں نے کہا کہاں سے لیا سرٹیفکیٹ۔ اس نے کہا شاہی مسجد میں مولوی صاحب نے مجھے دیا۔ میں یہ لے آیا ہوں تو میں نے اپنا نام سلیمان رکھا ہے۔ میں نے کہا یار تجھے مسلمان ہونا ہی تھا تو مجھ سے کوئی اچھا سا نام پوچھتا۔ ہم نے ڈراموں میں اتنے اعلی نام رکھے ہیں۔ سلیمان کہنے لگا، یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ بس ہاں حضرت سلیمان کی نقل۔ (اس پر ایک کیفیت طاری تھی، عجیب و غریب آدمی تھا) اس نے کہا نام میں کیا رکھا ہے ۔ ادھر لڑکیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ انہوں نے شور مچا دیا کہ سلیمان بھائی زندہ باد۔ جوئی کہنے لگی what has happened اب میں تو چپ، میری بیوی بھی چپ۔ ایک لڑکی میری بھانجی ہے نیلو کہنے لگی۔ He has embraced

جوئیIslam, Now he is a Muslim, His name is Suleiman
نے یہ سن کر اپنے خوبصورت کپڑے جو پہنے ہوئے تھے، پھاڑ دیئے، سر کے بال
نوچے، چیخیں ماریں۔ زمین پر لیٹنے لگی۔ تھوکنے لگی، اور اتنی پریشان ہوئی کہ
ہمیں مشکل پڑ گئی، یا اللہ یہ کیا ہوا۔ اس نے کہا I will kill him, take it
away from my side سلیمان تو اس کی یوں سمجھانے کی کوشش کرے۔
Lookاس نے کہا Do not talk to me تم اتنے ظالم ہوتے ہو، دہشت
گرد ہوتے ہو۔ تم کچھ بھی ہو جاتے، مسلمان نہ ہوتے۔ تمہیں پتا نہیں یہ دنیا کی
خوفناک ظالم خونخوار قوم ہے۔ اس نے کہا Look I Know We Are
Not Such People۔ اچھا اس کو بتا رہا ہے کہ ہمارے دین میں یہ اکیلا دین
ہے جس میں ''لا اکراہ فی الدّین'' ہے دین پر کوئی جبر نہیں ہے۔ میں تم کو کبھی
نہیں کہوں گا کہ تم اپنا دین تبدیل کرو۔ مجھے اس بات کا حکم ہے۔ وہ اس کو اس
طرح سے کہہ رہا ہے جس طرح سے وہ اب ایک اور چیز ہو گیا ہے۔ جوئی کو ہم
نے سمجھایا، ملاں جی بیٹھے ہوئے ہیں ادھر آ کے، لڑکیوں کی ڈھولک بند ہو گئی۔
اس نے کہا I quit میں یہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ ہم نے کہا، اس کی اگر مرضی
نہ ہو۔ تو وہ کہنے لگی، آپا جی نو نو نو نو ایک ہی بات کرے، مسٹر سلیمان جو کہ پہلے
اینڈریو تھا، ایک ہی بات کہے، لکم دینکم ولی دین۔ یہ پتا نہیں کیا کچھ پڑھا ہوا تھا کہ

شادی زبردستی نہیں کرنا۔

میں نے بتایا تو ہے کہ پاجامہ سا پہنا ہوا تھا۔ بو بھی ویسی آ رہی تھی۔ خیر وہ اسے چھوڑ کر واپس چلی گئی، یہ رہ گیا۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ ہم زبردستی کرنے والے بندے نہیں ہیں، لیکن میں اس کو مناؤں گا ضرور۔ چاہے کوئی شامل ہو یا نہ ہو تو آپ میری ایک مدد کریں۔ میں نے کہا کیا۔ میں نے کبھی کوئی آپ سے چیز نہیں مانگی تو وہ میں نے دیکھی ہے۔ میں نے ایک دن سٹور کھولا تھا آپا جی کے ساتھ چاول نکالنے کے لیے۔ وہاں سٹور میں ایک ڈبہ تھا ٹین کا ۔ سر اس میں ایک بہت قیمتی چیز پڑی ہے کیا آپ وہ مجھے دے سکتے ہیں۔ میں ڈر گیا، پتا نہیں کیا مانگ رہا ہے۔ میں نے کہا کیا ہے تو اس نے کہا کہ Real crude sugar گڑ پڑا تھا ہمارا پانچ چھ سال کا گندہ بدبودار، وہ اس نے دیکھ لیا۔ تو اس نے کہا، یہ تم نے کہاں سے لیا ہے اور یہ اللہ کی نعمت! ہم تو سفید شوگر کھاتے ہیں۔ وہ تھا جو ہم بھینس وغیرہ کو دیتے ہیں۔ ہمیں اسے پھینکنے کے لیے کوئی مناسب سی جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ کہنے لگا تو میں نے پوچھا، تم اس کا کیا کرو گے؟، اس نے کہا You Don't Know Sir اس میں کیلشیم ہوتا ہے، اس میں آئرن ہوتا ہے، اس میں فاسفیٹ ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ یہ بڑی نعمت ہے۔ مجھے دیں میں اس کا کیک بناؤں گا۔ میں نے کہا جو ئی چلی گئی۔ شادی تمہاری ہوئی نہیں

۔کیک بنا کے کیا کرو گے۔؟ اس نے کہا نہیں۔ چنانچہ وہ گندہ گڑ واہیات اس نے گھول کے آٹا ڈال کے اتنا اعلیٰ درجے کا کیک بنایا، ہم تو نہ کھا سکے، لیکن وہ کاٹ کاٹ کر چھری سے کھا رہا تھا۔ ہمارے گھر والوں کو ایک ایک ٹکڑا دیا۔ تو میری بیوی نے کہا، اس کی شادی کا ہے۔ ہم کو لینا چاہیے تو ہم نے بھی لے کر جلدی جلدی تھوڑا تھوڑا کھایا۔ تو اس نے کہا میں اپنی ماں کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں نے کہا ضرور کرو۔ اس نے U.K برطانیہ ماں کو فون کیا کہ یہاں پر مقامی لوگوں نے میری شادی سیلی بریٹ کی۔ ماں اس کے بجائے اس سے یہ پوچھتی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کدھر ہیں؟ کہنے لگی how was the cake ? بس ایک ہی بات کرتا کہ ماما فائیو پاؤنڈ رادر ٹین پاؤنڈ، اور اس میں یہ تھا، اور اس نے اس کو گڑ کی کیفیت بتائی۔ اس میں کیلشیم، فلانا آئرن، فلانا فلانا کوئی اٹھارہ قسم کی خوبیاں گنوا دیں۔ پھر اس نے کہا، میں تمہیں کل ایک کٹنگ لے کر پارسل کر کے کیک کی بھیجوں گا۔ کیک شادی کا بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ پھر اچانک ایک دن وہ ہم کو چھوڑ کر چلا گیا۔

مجھے کوئی ایک مہینے بعد اس کا خط آیا کہ میں بدین میں رہتا ہوں۔ سوات میں ایک جگہ ہے، اور یہاں دریا بہ رہا ہے، اور اللہ میں نے اگر کوئی جنت زمین پر اتاری ہے تو وہ سوات ہے اور میں یہاں بہت ہی خوش ہوں۔ یہاں پر ہوں، اور مجھ پر

اللہ کا بڑا افضل ہے، میں نے جگہ خرید لی ہے۔ میرے پاس تیرہ کنال زمین ہے۔
میں نے کہا، وہ تم نے کیسے لی؟ اس نے کہا اس نے کہا یہاں جن لوگوں کی زمین
تھی، ایک باپ تین بیٹے ہیں۔ اس میں سبزی اگتی ہے کہ دنیا دیکھے اور میں
حسرت بھری نگاہوں سے اس ٹوٹے کو دیکھتا تھا پہاڑ میں۔ تو وہ مجھ سے پوچھتے تم
کیا دیکھتا ہے گورا۔ میں نے کہا یہ کتنی خوب صورت زمین ہے۔ انہوں نے کہا،
لعنت ہو، یہ کوئی زمین ہے۔ یہ کوئی جگہ ہے۔ یہ کوئی ملک ہے۔ دفع دور تو میرا
ان کا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے کہا تم زمین مجھے دے دو، انہوں نے کہا، تم زمین ہم
سے لے لو۔ چار ویزا ہم کو لندن کا منگوا دو۔ میں نے کہا منظور۔ میں نے اپنے باپ
کو خط لکھا، اس نے مجھ کو چار ویزا بھیج دیا۔ انہوں نے کچہری جا کر زمین میرے
نام کر دی۔ میں نے کہا، اگر جنت ہے تو وہ کہتے تھے اگر جنت ہے تو انگلستان ہے۔
ہمیں کیا اچھی چیز مل گئی۔ کہنے لگا اشفاق صاحب میں سمجھ نہیں سکا۔ یہ کیا ہے۔
وہ لوگ جنت کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ جو پٹھان تھے وہ کہتے تھے یہ بے وقوف کا
بچہ انگلستان کی جنت چھوڑ کر ادھر کیوں آ گیا ہے۔ تو یہ اینڈریو کی کہانی تھی، جو
وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے یوں بند کرنی پڑ رہی ہے۔ پھر کسی محفل میں آیا تو پھر
بیان کروں گا کہ یہ فیصلہ انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اسکی جنت
ارضی کہاں پر ہے۔

خواتین و حضرات !۔ آپ کا بہت شکریہ، اور بڑی مہربانی، اور اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

گوما ان ہالینڈ

یہ جو اب بات میں کرنے لگا ہوں، اس کا ہماری محفل ”زاویہ“ سے بلا واسطہ تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ایک چھوٹا سا تعلق ضرور ہے کہ محنت کرنے سے، اور لگن کے ساتھ پوری دھن کے ساتھ، جس طرح لوگ خدا کو تلاش کر لیتے ہیں، جس طرح دنیا کی تلاش میں ہم لگے رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر اوقات لوگ سڑک پر چلتے ہوئے جب سامنے سرخ بتی ہوتی ہے تو گاڑی روک کر شیشہ اتار کر کہتے ہیں کہ ”اشفاق صاحب بابا ہے کہیں۔“ میں کہتا ہوں ابھی تو نہیں اس وقت موٹر میں۔ میں پھر کبھی ملوں گا تو آپ سے ملاقات ہو گی۔ کہنے لگے بس ٹھیک ہے جی۔ بڑی مہربانی۔ ایسے بھی کہہ کر گزر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اکثر پوچھتے ہیں کہ کوئی بابا نہیں ملتا۔ میں نے کہا، سر وہ اب آپ کی آرزو نہیں ہے۔ کئی کو میں نے یہ بھی کہا، اس محفل میں بھی یہ بات کی کہ چودہ برس بے اے کرنے

میں لگائے، چودہ مہینے اس کی کوشش کر و روحانی دنیا میں جانے کی، کہنے لگا، نہیں چودہ مہینے تو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے کہا، چودہ ہفتے، کہنے لگے نہیں یہ بھی زیادہ ہے۔ اتنا ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی ہے "بابا" تو میں آپ کی خدمت میں پیش نہیں کروں گا۔ اس لیے اسے زچ کرنے کے لیے ذلیل و خوار کرنے کے لیے اس کا ایڈریس پوچھ رہے ہیں کیونکہ آخر میں آپ نے یہ کہنا ہے کہ ملے تھے وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے تو تو کوئی کبوتر نکال کر دکھایا ہی نہیں۔ اکثر یہی آرزو ہوتی ہے نا آدمی کی۔ ہم نے پاس کرنے کے لیے کہا تھا، وہ تو کیا نہیں، ڈبا پیر جو تھا۔ اکثر جو جعلی قسم کے پیر ہوتے ہیں، وہ اسی طرح بنتے ہیں کہ اپنی زندگی تو بے چارے شروع کرتے ہیں اللہ کی تلاش میں، لیکن ہم لوگ جو ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو جا کر مجبور کرتے ہیں آہستہ آہستہ کہ وہ ڈبہ پیر بنیں، اور ہماری خواہشات کو پورا کریں۔ ابھی تک کوئی بندہ ایسا نہیں گیا ان کے پاس جو کہے کہ مجھے کچھ روح کی تلاش ہے۔ اللہ کی آرزو ہے۔ میں دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتا۔ اس لیے میری آپ مدد کریں۔ چونکہ ایسا سوال نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بے چارے اپنا روپ بھی، اور طرح کا اختیار کر لیتے ہیں۔ تو میں تمہیداً عرض کر رہا ہوں کہ جو بات میں کرنے والا ہوں، اس کا تعلق Struggle سے ضرور

ہے۔ کوشش سے، اور جدوجہد سے، لیکن اس کا بلاواسطہ طور پر اس سے تعلق نہیں ہے، لیکن آپ سنیں گے تو چونکہ آپ ہمارے ذہین ناظرین ہیں، خود بخود اس کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں گے۔

سن 49ء کی بات ہے میں یہاں تھا تو ہمارے دوستوں کا ایک گروہ تھا جس میں سے اب سے نمایاں ہمارا دوست نصرت درانی تھا، جو ایک سپلائی کمپنی کا مالک تھا ملٹری کو سامان لے کر دیتا تھا۔ امیر آدمی تھا اس زمانے میں۔ اس کی بیوی بہت ماڈرن تھی۔ ہم اس کو پیار سے نینی کہتے تھے۔ نینی استانی قسم کی خاتون تھی، اور ہر بات میں ہم کو گائیڈ کرتی تھی۔ آرٹسٹ بہت اچھی تھی، اور وہ یہ جو لینڈ سکیپ پینٹنگ ہوتی ہے، واٹر کلر کی، بہت ماہر تھی، اور وہ اکیلی لڑکی تھی سارے لاہور میں جو دوپٹہ نہیں لیتی تھی۔ سارے اس کو حیرانی سے دیکھتے تھے کہ کمال کی بات ہے۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے جو اس زمانے میں نہیں ہوتے تھے، ہم جب اس کے دوستوں میں باہر نکلتے تھے تو سب اس نینی کو دیکھتے تھے۔ اس کا ایک بچہ تھا، بڑا شریر، بڑا ضدی، بڑا ظالم، بوٹ سے ٹھوکریں مارنے والا، بالکل نہ ماننے والا۔ تو ان کے ساتھ، اُس خاندان کے ساتھ ہمارے بڑے تعلقات رہے۔

ہمارا ایک دوست تھا۔ بہت اچھا آرٹسٹ، اب بھی ہے تو ان کے سٹوڈیو میں ہم اکٹھے ہوتے تھے۔ کئی دفعہ ہم اپنی دھماچوکڑی لارنس گارڈن جس کو اب باغِ جناح کہتے ہیں، میں مچاتے تھے۔ ہم چلتے رہے۔ بہت اچھی طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر، بڑے اچھے ایام ہمارے گزر رہے تھے کہ اچانک درانی اور نینی کا جھگڑا ہو گیا۔ میاں بیوی کا جھگڑا ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اتنی شدت اختیار کر گیا کہ انہوں نے علیحدگی کی بات کر لی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ بچے کا معاملہ تھا، ہم سب روئے پیٹے۔ درانی سخت آدمی تھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں رہنا۔ میں نے کہا، بچے کا کیا کرو گے؟ اس نے کہا بچے کی مرضی ہے، ماں کے پاس رہنا چاہے، ماں کے پاس رہے۔ میرے پاس رہنا چاہے تو میرے پاس رہے۔ تو نینی کو بھی ہم نے سمجھایا۔ وہ کہتی تھی کہ نہیں اگر یہ اتنا زیادہ سخت ہے تو میں اس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ میں اپنے فن میں طاق ہوں۔ لو جی دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں کے سامنے ہماری موجودگی میں کاغذ (طلاق) لکھے گئے، اور وہ تو کم روئے، اور ہم زیادہ روئے، اور بڑا دکھ ہوا۔ طلاق ہو گئی۔ بچہ ماں کے ساتھ چلا گیا۔ ویسا ہی ضدی، ویسا روتا، بسورتا، ٹھڈے مارتا ہوا۔ تو درانی سے میں ملا، وہ منتقل ہو گیا تھا GHQ راولپنڈی، وہیں اس کا دفتر تھا۔ اچھا خاصا بڑا دفتر۔ میں

نے اس سے کہا کہ اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ کہنے لگا نہیں دفع کرو۔ یہ تو پیشہ ہی ایسا نہیں ہے کہ شادی کرو۔ میں شادی کروں ہی گا نہیں ساری عمر۔ میں نے کہا نہیں نہیں تمہیں کرنی چاہیئے، تو نہیں مانا۔ سارے دوستوں نے بھی زور دیا۔ وہ کہتا تھا میں اکیلا بڑا خوش ہوں۔ یہ میری کوٹھی ہے، اور اتنی بڑی کوٹھی بارہ چودہ کنال کی، اور چھاؤنی کا علاقہ ہے، خوش و خرم ہم رہتے ہیں۔ مائی آتی ہے، اماں زین کپڑے دھونے کے لیے، اس کے ساتھ دو بیٹیاں تھیں۔ ایک دارو تھی۔ ایک کا گوما نام تھا۔ وہ کپڑے بھی دھو جاتیں، کھانا بھی پکا جاتیں، جھاڑو واڑو بھی کر جاتیں۔ پھر اس کا خانساماں تھا۔ پھر اس کا گھوڑا تھا۔ گولف کھیلتا تھا۔ امیر آدمی تھا۔ اچانک میں تھوڑا سا اس سے دور ہو گیا کہ میں لاہور میں مصروف ہو گیا۔ کچھ میری مصروفیات آزاد کشمیر ریڈیو میں تھیں۔ جیسا کہ آپ کو پتا ہے وہاں سے تراڑ کھل چلے گئے، تو لوٹ کے آیا تو اس نے کہا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے شادی کرنے کا۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے۔ کہنے لگا اب کی بار میں شادی کروں گا تو کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جو بالکل دیہاتی ہو، الہڑ مٹیار ہو، جس کو زمانے کا پتہ نہ ہو۔ نینی جیسی نہ ہو، نہ پینٹنگ جانتی ہو، نہ ڈانس جانتی ہو، نہ اس کو کچھ زندگی کا آگے کا پتا ہو، نہ پیچھے کا پتا ہو۔ ایک سادہ، پاکیزہ سی لڑکی۔ میں نے کہا، بھئی دیکھ لو تم بہت پڑھے لکھے ہو، اور تمہارا اندازِ زیست مختلف قسم کا ہے، تو

تم اس کے ساتھ نباہ کر لو گے؟ اس نے کہا میں کر لوں گا۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے۔

تو جناب یہ فیصلہ اس نے دل میں کر لیا ہوا تھا۔ میں نے دوستوں کو اطلاع بھی دی۔ بتا بھی دیا تو انہوں نے کہا، یہ بکواس کرتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا، یہ کس طرح سے کرے گا؟ یہ تو بہت ماڈرن قسم کا آدمی ہے۔ میں لوٹ کے آیا کراچی سے، ہمارا وہاں ایک سیمینار تھا، کوئی ایک مہینے کا، مجھے اس نے ڈھونڈا۔ گاڑی اس کے پاس تھی لینڈ روور تھی بغیر چھت کے بٹن دباتے تو چھت کھل جاتی تھی، وہ آیا اور کہنے لگا Meet your Bhabi تو وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی بے چاری لڑکی۔ نہ اس کا سر منہ نظر آئے۔ میں نے کہا، کون ہے یہ لڑکی؟ تو میں نے آگے ہو کے کہا، السّلام علیکم۔ کہنے لگی وعلیکم السّلام بھائی جان۔ تو دیہاتی سی لڑکی تھی تو میں نے آگے ہو کے دیکھا، وہ گوما تھی، جو ان کے کپڑے دھونے آتی تھی۔ اماں جان (کام کرنے والی) کی بیٹی، اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ گوما کے ساتھ۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے کہا، یہ گوما بیچاری جھاڑو دیتی ہے کچھ نہیں پتا اس کو۔ اس نے کہا، میں بڑا خوش ہوں اس کے ساتھ، اور بہت اچھی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مجھے وہ نخرے والی نہیں چاہیے۔ اچھا بھئی اب کیا کر سکتے تھے۔

خواتین و حضرات پورے ایک سال کے بعد 31 دسمبر کی رات تھی۔ اگلے دن صبح نیو ائیر (New year) تھا۔ چھاؤنی میں وہ تھا، چکلالہ میں۔ بہت لمبا چوڑا انتظام جیسے ہوتا ہے تو اس نے کہا، شام کو باغ میں چلیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے چلیں گے۔ کھانے کا مجھے جب سے شوق تھا، میرے جسم سے بھی ظاہر ہے۔ بڑی اچھی میس تھی، وہاں گئے۔ وہاں غیر ملکی لوگ بھی موجود تھے، اور سفارتخانے کے لوگ، ملٹری کے ایکسپرٹ جو باہر سے آئے تھے، وہ بھی تھے تو جب وہاں گئے تو مجھے اس نے کہا، تم آجانا میری سیٹیں بک ہیں۔ میں وہاں بیٹھ گیا تو یہ تھا نہیں۔ دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ بڑی خوبصورت لڑکی، اور چھوٹی سی اس کی کمر، پیلے رنگ کا اس نے سویٹر پہنا ہوا۔ اونچی ایڑی کی گرگابی، اس کے بال کٹے ہوئے تھے، وہ چلی آرہی تھی اس کے ساتھ۔ میں نے کہا، دیکھو میں نے اس کو منع کیا تھا، اب دیکھو کوئی اور لے آیا ہے۔ وہ قریب آئی تو گوما تھی۔ کہنے لگی بھاجی۔ میں نے اسے دیکھا اور اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ تو کہنے لگی آپ کیسے ہیں؟ آپ تو آئے ہی نہیں۔ یہ آپ کا بڑا ذکر کرتے ہیں جی۔ اب میں اس کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ جینز اس نے پہنی ہوئی تھی نیلے رنگ کی اور پیلا سویٹر۔ چائے کافی مجھے پینے کا شوق تھا۔ انہوں نے کہا ابھی پیو گے۔ میں نے کہا ابھی بھی پیوں گا۔ اور کھانے کے بعد بھی پیوں گا۔ کافی پی،

لیکن میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گوما کی طرف۔ میں نے پوچھا داراں کہاں ہے، تو اس نے کہا کہ انہوں نے اس کو مکان لیکر دیا ہے۔ وہ وہاں گاؤں میں ہیں۔ اماں بھی وہیں ہیں۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے جاتی ہوں۔ لیکن اس کے انداز میں، اس کی گفتگو میں ایک بڑی تبدیلی آگئی تھی، جو کہ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسی تبدیلی آسکتی ہے، اور اتنی جلدی۔ لوگ ہلا گلا کرنے لگے، میوزک بجنے لگا۔ اتنے میں ایک کرنل آیا بوڑھا سا آگے بڑھا، اور سلام کیا۔ اس نے گوما کی طرف انگلی اٹھائی وہ پکڑ کر چلی گئی۔ خواتین و حضرات وہ ناچی ہے کوئی۔ یعنی بینڈ کی دھن کے اوپر گوما۔ اپنی ایڑیاں زمین سے اٹھا کر بڑا مشکل ہے دھم دھما دھم، اور وہ کیسے بھمبیری کی طرح گھوم رہی تھی، اور کرنل بیچارہ اچھا بھلا تھا، وہ ہف گیا بوڑھا۔ اس سے چلا نہ جائے۔ تو وہ ایک دو تالیاں بجیں۔ آکے بیٹھ گیا۔ تو میری سمجھ میں نہ آئے کہ اس کو داد دوں یا بے داد، سمجھ میں نہ آئے۔ پھر ایک بندہ آگیا تو اس سے آکر کہنے لگا کہ ایکسکیوز می۔ گوما کہہ رہی ہے I am really tired' after five minutes I will be refresh. میں نے جب انگریزی سنی اس کی، تو میں نے کہا، یہ تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کہنے لگی گفتگو میں آجاتی ہے۔ تو میں نے کہا، تم نے پڑھائی شروع کی۔ کہنے لگی نہ بھا جی مجھے پڑھائی اچھی نہیں لگتی میں پڑھی لکھی تو نہیں۔ میں نے پڑھنا لکھنا بالکل

نہیں سیکھا۔ تو میں نے کہا، یہ جو تم بولی ہو۔ کہنے لگی، نہیں بول میں ساری ٹھیک ٹھاک لیتی ہوں۔ سمجھ بھی لیتی ہوں۔ میں نے کہا یہ راز کیا ہے؟ کہنے لگی جی زبان کے جاننے کا راز اس کے بولنے میں ہے۔ اچھا لکھنے والا جو ہے نا، اس کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ جتنا اچھا بولنے والے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ کانونٹ کے پڑھے بچے بچیاں ہیں جو ان کو انگریزی سکھائی جاتی ہے بولنے والی ہے۔ فیض صاحب جو تپڑ سکول کے پڑھے لکھے تھے، ایڈیٹوریل وہی لکھ سکتے تھے۔ وہ یہ راز پا گئی تھی۔ اس نے کہا، بولنے کا کمال ہونا چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ سیاستدان اکثر کہتے ہیں، یہ تو بولتا نہیں ہے، فلاں آدمی کمال کا بولتا ہے جی۔ اس کے کیا کہنے ہیں جی، تعریف ہوتی ہے اس کی۔ تو وہ چونکہ یہ راز پا گئی تھی، اس نے بولنے پر توجہ دی، اور کھٹا کھٹ بولنے لگی۔ تو اس کے ساتھ کہنے لگی، ہمارا اس کا جائنٹ اکاؤنٹ بھی ہے۔ درانی کا اور میرا، اور میرا اسنگل بھی ہے۔ تو میں نے کہا، تم اسے آپریٹ کیسے کرتی ہو۔ کہنے لگی، میں Goma (گوما) لکھتی ہوں۔ گوما لکھنا سیکھ لیا ہے۔ دستخط تو کر لیتی ہوں۔ اور میں نے ہندسے بھی سیکھ لیے ہیں۔ ایک سے سو تک۔ بڑے اچھے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ کوڑا صاف کرنے سے بہت آسان بات ہے۔ میں تھک جاتی تھی اور وہ کپڑے دھونے سے یہ پڑھنا لکھنا بڑی کمال کی چیز ہے۔ اس میں بندے کو بغیر کچھ کیے عزت مل جاتی

ہے۔ عجیب فلسفہ تھا اس کا۔ میں مبہوت رہ گیا۔

اتنے میں ایک اور آدمی آیا، اور اس کے ساتھ جا کر ناچنے لگا اور وہ ساری اس محفل کی جان تھی جو بھی لوگ آتے تھے، خاص طور پر فارنرز وہ اس کے ساتھ ناچنا پسند کرتے تھے، اور اللہ نے اس کو ایسا شعور دیا تھا کہ وہ تو پتا نہیں میں کس کی مثال دوں۔ آپ نے کبھی ایسا ناچ نہیں دیکھا ہو گا۔ پھر ہم نے کھانا کھایا، اور ہم آ گئے۔ درانی مجھے کہنے لگا، شام کو تم جاؤ گے نہیں کہیں۔ میں وہیں رہا، تو صبح جو اس نے ناشتہ ہم کو دیا وہ تو تھا ہی کمال کا، لیکن جس طرح سے اس نے ملازمہ کو کنڈکٹ کیا، یعنی اس کو حکم دیا کہ یہ چیز لیکر آؤ، بھائی جان کے لیے، یہ چیز واپس لے جاؤ، اور وہ جو میں نے فلاں فریج میں رکھی ہے، اس کو نکال کے لاؤ، وہ دیکھنے والا انداز تھا۔ اس نے کہا، دیکھو اس کو غلام محمد دیکھو، سائیس ہے؟ اس نے کہا جی بیگم صاحب۔ بلاؤ اس کو۔ تو وہ سائیس آ گیا۔ کچھ اور قسم کا آدمی۔ تو اس نے کہا، دیکھو ایک گھوڑا تو میرا ہے، ایک صاحب کا ہے۔ ایک بھائی جان کے لیے پیدا کرو۔ تو اس نے کہا بہت اچھا۔ میں نے کہا، مجھے کیا کرنا ہے گھوڑا۔ انہوں نے کہا۔ آپ کو بٹھانا ہے اس کے اوپر۔ آپ چلیں گے۔ میں نے کہا، خدا کے لیے میں گھوڑے پر کبھی نہیں بیٹھ سکتا۔ انہوں نے کہا، کچھ نہیں ہوتا، آپ چلیں ہمارے ساتھ۔ تو جی شام کو اس نے گھوڑے پر چکر لگوایا اور انہوں نے کہا، اگر

آپ چاہیں تو ہم انہی گھوڑوں پر مری چلتے ہیں۔ میں نے کہا، اللہ کے واسطے اتنا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہیں تک کافی ہے۔ اس کے بعد بڑی لمبی کہانی ہے، میں جلدی جلدی سے وائنڈ اپ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر جناب مجھے ولایت آنا پڑ گیا۔ اور کچھ عرصہ مجھے ان کی کوئی خبر معلوم نہ ہو سکی۔ دو سال کے بعد جب میں واپس گیا، بڑی آرزو تھی درانی سے ملنے کی، گوما سے ملنے کی۔ تو میں ملا درانی سے، اپنے دفتر میں تھا۔ بڑا اچھا خوشحال۔ تو میں نے کہا، سناؤ بھابھی کا کیا حال ہے۔ کہنے لگا دفعہ کرو، لعنت بھیجو اس پر۔ میں وہ گالی نہیں دے سکتا جو اس نے دی تھی، ساری کائنات کو، انسانوں کی انسانیت کو، جس کو بھی جس طرح گنا جا سکتا ہے، اور ساتھ گوما کو بھی۔ میں نے کہا وہ ہے کہاں۔ تم اس طرح کیوں کہہ رہے ہو۔ کہنے لگا، بس یار لعنت بھیجو۔ میں نے کہا، ہوا کیا۔ کہنے لگا وہ اس کا ایک بڑا محبوب دوست تھا ہالینڈ کا تھرڈ سیکرٹری ایمبیسی میں۔ اس نے مجھ سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لی اور وہ ہالینڈ چلی گئی۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے کہا، گوما ہالینڈ میں۔ کہنے لگا، ہاں۔ تو میں نے کہا، وہ وہاں کیا کر رہی ہے، کہنے لگا، وہ ہم سے تم سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اس کو زندگی گزارنے کا طریقہ بہت اچھی طرح سے آتا ہے، اور وہ اونچ نیچ کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہے، اور وہ اپنا آپ اپلائی کرتی ہے۔ اگر کہیں اس نے اپنا آپ روحانیت کی طرف اپلائی کیا ہوتا تو اس وقت پاکستان

کی کیا، پورے بر صغیر کی ایک بزرگ ترین ہستی ہوتی، لیکن اس کا رُخ دوسری طرف ہے۔ وہ کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو میں نے کہا، مجھے جانا ہے ولایت، تو پھر میں اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ اس نے کہا، جاؤ دفع ہو جاؤ تم بھی اس کے ساتھ۔ خیر مجھے وہاں ہالینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ پتا کیا اس کو ڈھونڈ نکالا۔ بڑی خوش و خرم تھی اور اس کا ولایتی خاوند وہ چھوڑ چکا تھا نوکری۔ اس نے کوئی خوشبویات کی Activity چلالی تھی، اس میں وہ اس کے کام کرتی تھی۔ میں نے کہا، تم نے ابھی تک لکھنا نہیں سیکھا۔ کہنے لگی، نہیں، لکھنا نہیں سیکھا۔ میں بولتی انگریزی ہوں۔ اب میں ڈچ زبان بھی بول لیتی ہوں، کیونکہ مجھے اس کا محاورہ ہے۔ اس نے کہا، ایک فرق میری زندگی میں پڑا ہے، کہ میں نے اپنے نام کے سپیلنگ بدل لیے ہیں۔ میں اس کو Gomant کرتی ہوں فرنچ میں T نہیں بولتے بھائی جان۔ تو گوما لکھتی تھی، یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میں دستخط کرتی ہوں پیسے چیک وغیرہ نکالنے ہوتے ہیں۔ تو میں بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگی، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ یہ علاقہ جو ڈہناک کا ہالینڈ ہے۔ میں اسے چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا تم کہیں اور کام کر لو۔ کہنے لگی نہیں، میں اس پر غور کر رہی ہوں۔ کہنے لگی، اماں کا بہن کا کبھی کوئی خط آتا ہے، ان کو پیسے وغیرہ بھیج دیتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہیں۔ میں نے کہا، تمہیں آرزو پیدا نہیں ہوئی، کبھی ان سے

ملنے کی، کہنے لگی، ہوتی ہے، لیکن یہاں کام وام اتنے ہیں، مصروفیات ایسی ہیں کہ میں اس میں لگی رہتی ہوں، اور میں اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتی، لیکن میں ان کی نگہداشت بہت اچھی طرح سے کر لیتی ہوں۔ مالی طور پر وہ بہت خوش ہیں۔ میں نے کہا، اچھا جی ٹھیک ہو گیا۔ اس سے مل کے، اس کے ہاں کھانا کھا کے پھر اپنے کام کر کے جو میرے ذمے تھے، ہماری یونیورسٹی کی طرف سے میں واپس آیا اور درانی سے ملا۔ بہت خوش و خرم، اور بہت اچھے موڈ میں۔ ہاں جسے کہتے ہیں ناچا گیاں مارتا ہوا۔ بالکل خوش ہوتے ہوئے کہنے لگا، لو دیکھو ہماری بھی مدد ہو گئی۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ کہنے لگا۔ وہ اس بدبخت کے پاس بھی نہیں رہی، ڈچ کے پاس، اس نے اس سے طلاق لے لی ہے۔ برسلز کے ایک بوڑھے کے ساتھ شادی کر لی ہے جو کہ وہاں کی ایلومینیم کی فیکٹری کا مالک ہے۔ اب وہ اس کی فیکٹری Run کرتی ہے کیونکہ بابے سے اتنا نہیں ہوتا کام اب، اس کے ہاں ڈیڑھ ہزار ملازم ہے، گھگھو بجتا ہے، اور وہ بیچ میں پتلون پہن کے گھومتی ہے۔ ہنٹر پکڑ کر جیسے سرکس نہیں ہوتی، رنگ ماسٹر، وہ سارا کنٹرول کرتی ہے۔ اور اتنا اچھا اس نے کنٹرول کیا ہے کہ اب وہ یورپ ایسوسی ایشن آف ایلومینیم فیکٹری کی اسسٹنٹ صدر ہو گئی ہے۔ یہ یاد رکھیئے پنڈی کے پاس گاؤں ہے دولتالہ اس کے پاس کی رہنے والی تھی، تو یہ اس کا ارادہ تھا، اور یہ اس کا تہیہ تھا۔ اس وقت

میں اسے نہیں جانتا، دس سال ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب بھی وہ انٹر نیشنل
ایلومینیم ایسوی ایشن کی صدر ہو گی کیونکہ اللہ نے اسے بڑی صلاحیت دی تھی۔
اور اس نے اپنی ساری صلاحیت ایک رخ کے اوپر چلا دی تھی۔ تو جب لوگ یہ
پوچھتے ہیں کہ صاحب ہمیں کوئی بتائیں کہ بابا کدھر ہوتا ہے، تو مجھے ہمیشہ وہ یاد آ
جاتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہوتا ہے۔ یہ فلاں چیز کہاں
ہوتی ہے۔ وہ اپنی دھن کی پکی اور راست رو خاتون تھی، اور جو بات تھی دل میں
رکھتی تھی، وہ بہت کم گو تھی، دھارنا دھاری تھی، اس کو پورا کر کے چھوڑا۔
خواتین و حضرات! اگر آپ تہیہ کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے نہ پوچھیں۔ اپنے آپ
سے پوچھیں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ جب تک آپ کی کنویکشن نہیں ہو گی۔ باہر
کی لائی ہوئی تبدیلی کسی طرح سے بھی آپ کے مدد نہیں کر سکتی۔ اب ہم
سارے مل کے اپنی گوما کو ڈھونڈیں گے۔ یعنی ہماری اپنی روح جو ہے، وہ ہمارے
لیے گوما کا درجہ رکھتی ہے نا۔ ہم چونکہ روح کے انسان ہیں۔ اللہ میاں نے انسان
کو ایک کیفیت دی جو دوسروں کو، کسی جاندار کو نہیں دی۔ انسان کا ایک وجود جو
ہے، وہ جسم ہی جسم نہیں ہے۔ اس کے اوپر ایک اور چوبارہ بھی ہے۔ جو
Intellect کا چوبارہ ہے۔ اسی وجود کے اوپر۔ وہ انٹلیکٹ کا چوبارہ جو آپ کو
مجبور کرتا ہے کہ آپ سردیوں کی یخ بستہ رات کو ٹوٹی ہوئی بائیسکل چلاتے ہوئے

نصرت فتح علی خان کا گانا سننے جائیں۔ وہ تقاضا ہے نا۔ بھینس کبھی بھی مشاعرہ سننے نہیں جاتی، اس کو صرف اپنا جسم چاہیے، روٹی، کپڑا، مکان، کوئی جانور ایسا نہیں کرتا۔ شیر نے آج تک کسی قوالی میں شرکت نہیں کی، بندہ کرتا ہے۔ اس کی آرزو ہے جو مرضی کریں۔ یہ جو انٹلیکٹ ہے، ذہن کا چوبارہ، اس کے اوپر ایک اور ہے، اور وہ روح کا چوبارہ ہے، وہ ہمارا بند پڑا ہے۔ گندی ٹوٹی پھوٹی پھوس اس میں پڑی ہے۔ پرانا ٹوٹا ہوا چرخہ ہے۔ پرانی منجیاں (چارپائیاں) بستر پھینکے ہوئے ہیں۔ شیشے اس کمرے کے ٹوٹے ہوئے ہیں؛ کنڈی اس کی Permanently بند ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی اوپر چڑھتا ہے، اور وہ آواز دے کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کا ہے چوبارہ۔ تو نیچے سے آواز دیتی ہے کہ اپنا ہے۔ تو کہتا ہے۔ اس کو کھولیں۔ وہ کہتی ہے، نہ پت دفعہ کر اس میں گند پھوس بھرا ہوا ہے۔ اس کو کھولنے کی کوئی چنداں ضرورت نہیں۔ تو یہ ارادہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے والے انسان کا ہوتا ہے کہ آیا میں اس کوٹھڑی کو کھولوں یا نہ کھولوں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

احکامِ الٰہی

جوانی کا زمانہ طاقت ور، منہ زور اور کڑا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم جوان تھے، اس وقت اس میں ضد بھی شامل تھی، اور سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ ہم کو دنیا بھر کے سوالوں کے جواب آتے تھے۔ کوئی مشکل سے مشکل بات ہو، ہم اس کو سمجھتے ہیں، یہ اس عمر میں ایک خاص طرہ امتیاز ہوتا ہے تو ہم نے ایک دن بابا سے یہ سوال کیا کہ سر آپ یہ بتائیں اور تو ساری باتیں سمجھ میں آگئی ہیں زندگی کی، یہ بتائیں یہ جو برے برے لوگ ہوتے ہیں، ناکارہ لوگ ہوتے ہیں جن کا سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جنہوں نے بہت سے ایسے مظالم ڈھائے ہوتے ہیں لوگوں پر کہ ان کو کوئی معافی نہیں ملنی چاہیے۔ وہ زندگی میں بڑے بڑے کامیاب ہوتے ہیں، اور بہت اونچے درجوں کے ہوتے ہیں، اور بہت اعلیٰ رتبے حاصل کرتے ہیں، اور جو لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، بڑے نیک ہوتے ہیں، بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں، وہ دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو قدرتی طور پر ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ مسکراتے رہے۔ اس بات کا کوئی جواب نہ دیا، اور ہم بڑے مایوس ہوئے، اور واپس اپنی کوٹھڑی میں آکر بیٹھ گئے، اور اپنے طور پر غور کرنے لگے کہ یہ عجیب ہے، یہاں بھی دو نمبر کام کرنے والے لوگ ہیں، ان کی

بڑی عزت افزائی ہے، اور جو اچھے والے ہیں، وہ بے چارے مارے مارے
پھرتے ہیں۔ کچھ معصوم لوگ ہوتے ہیں، ان کو کیوں سزا ملتی ہے زندگی میں۔
ایک تین سال کا بچہ ہے، اور وہ باہر نکلا سڑک پر اپنی گیند کو پکڑنے کے لیے، اور
تیزی سے ایک کار آتی ہے، اس کو کچل جاتی، اب اس کا کیا قصور تھا۔ اس طرح
کے بے شمار سوالات جو ذہن میں آتے تھے، جب بھی آتے تھے، اب بھی آتے
ہیں، اور ان کا جوانی، اور بڑھاپے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ بتدریج آتے چلے
جاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں جب تک انسان زندہ ہے۔ وہ ضرور ان سوالوں کو
Face کرتا ہے، اور ان کا جواب نہیں دے پاتا۔

ایک روز میں اور میرا ساتھی بہت بے چین ہوئے۔ اور ہمارے ساتھ ایک ایسا
واقعہ گزرا تھا، جو ہمارے ساتھ نہیں گزرنا چاہیے تھا، کیونکہ ہم اپنے "بھانویں"
بڑے اچھے آدمی تھے۔ لیکن ہم نے باباجی سے پوچھا کہ سر یہ راز کھول کر ہمیں
بتائیں، ایسا کیوں ہوتا ہے، تو انہوں نے کہا، دیکھو آپ لوگ جو ہیں، اللہ کے حکم
کے پابند ہیں، احکامِ الٰہی کے پابند ہیں۔ آپ لوگوں نے ایک عجیب صورتِ حال
اختیار کرلی ہے کہ آپ فعل اللہ کے اوپر تنقید کرنے لگ گئے ہیں۔ فعل اللہ کے
ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ اللہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ
ہے، جو چاہے اس کی مرضی کرے۔ لیکن آپ صرف اس کے احکام تک رہیں،

اور فعل اللہ کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے کہا، سر یہ تو پھر کمال کی بات ہے۔ ہم تو پڑھے لکھے لوگ ہیں، اور ہم کالجوں، یونیورسٹیوں میں یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ تنقید کریں۔ باقاعدہ Discuss کریں، ڈائیلاگ کریں۔ انہوں نے کہا، نہیں آپ کا، اور ان کا یہ رشتہ ہرگز ایسا نہیں ہے، تو آپ سے ہمیشہ یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ آپ احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر فعلِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک نئی بات تھی جو بڑی قابلِ غور اور قابلِ توجہ تھی۔

پھر جب تھوڑا سا وقت اور گزرا، اور ہم نے اپنے ارد گرد دیکھنا شروع کیا تو یہ محسوس کیا کہ واقعی ہماری توجہ فعل اللہ پر زیادہ رہتی ہے، اور ہم خوامخواہ اس میں دخل دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ کلفٹن گئے۔ ارادہ تھا کہ ساحل پر پکنک منائیں گے، بالکل پانی کے قریب جا کے ریت میں۔ وہاں جا کر دری بچھالی، سامان رکھ دیا اس کے اوپر، تو میں نے کہا تھا، کوئی لہر ایسی بھی آئے گی جو ہمارے اوپر چڑھ جائے گی۔ تو ہم نے کہا کوئی بات نہیں، پھر ہم بھاگ چلیں گے، دری کھینچ لیں گے۔ بڑا مزہ رہے گا۔ جب میری بیوی سارا سامان لگا رہی تھی، چائے وائے کا تو میں نے دیکھا کہ اس دری کے اوپر ایک چھوٹی سی چیونٹی جو ہے، وہ چلی آ رہی ہے۔ بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ سمندر کے پاس گھونگھا سپی، سنکو ہو سکتے ہیں۔ یہ چیونٹی کا یہاں کیا کام، یہ کدھر سے آ گئی۔ پھر میں غور کر

کے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سوچتا رہا کہ یہ لالو کھیت سے چلتی چلتی تیرہ دن کی مدت میں سفر طے کر کے آج ساحل پر پہنچی ہے۔ لیکن پھر میں سوچنے لگا، اس نے کیوں اتنی مصیبت اختیار کی۔ پھر میرے اندر سے آواز آئی کہ یہ بے چاری بہت بے چین تھی۔ گھر میں بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ میں جو یہاں پر رہتی ہوں تو میں جا کر سمندر کی حقیقت معلوم کروں گی۔ تو یہ سمندر کی گہرائی اور اس کی وسعت دیکھنے کے لیے یہاں تشریف لائی ہے، اور کہتی ہے کہ میں سمندر کو اچھی طرح سے سمجھنا چاہتی ہوں۔ تو یہی کیفیت انسان کی ہے کہ وہ اللہ کو اس کی ساری گہرائی، اور گہرائی کو ایک چیونٹی سے بھی کم تر ہونے کے باوصف جاننے کی آرزو رکھتا ہے۔ جاننے کا تجسس، اور شوق ہوتا ہے۔ تو ہم بیٹھے رہے۔ خیر ایک لہر آئی ہے، اور اس چیونٹی کو، ہمارے جائے نماز کو، اور ہماری سب چیزوں کو بھگو کر گزر گئی، تو پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی اللہ جو چاہے کرے جس طرح سے مناسب سمجھے لیکن اس کے باوصف دل کے اوپر ایک بوجھ ضرور رہتا ہے، اور آپ بھی اپنی روزمرہ زندگی میں یہ سوال کرتے رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں سے اپنے گھر والوں سے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ۔ تو ہمارے بابے یہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تم سچے ہو، اور تم جاننا چاہتے ہو، اور اس راز کو معلوم کرنے کی خواہش مند ہو، صرف یہ نہیں سری پائے کھاتے ہوئے یا نہاری کھاتے ہوئے یا بروسٹ

کھاتے ہوئے۔ اگر آپ سچ مچ جاننا چاہیں تو پھر اس کا ایک نسخہ ہے بڑا سیدھا اور پائیدار نسخہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ احکامِ الٰہی کے اندر پورے کے پورے داخل ہوں، جوں جوں آپ احکامِ الٰہی کے اندر داخل ہوتے جائیں گے، اور اس محیط کے اندر اپنے آپ کو سمیٹے جائیں گے آپ پر اسرارِ الٰہی ضرور واضح ہوں گے۔ جس طرح سے آپ ایٹم کا راز معلوم کرتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا ایٹم جو آنکھ کو بھی نظر نہیں آتا، خورد بین سے بھی نظر نہیں آتا، وہ کس طرح اتنا بڑا، اور طاقتور ہو سکتا ہے کہ سارے علاقے کو، ملک کو، جگہوں کو، شہروں کو پھاڑ کر رکھ دے، اور ملیامیٹ کر دے۔ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ سب سے پہلے آپ نیوکلیئر فزکس پڑھیں۔ پھر آپ لیبارٹری میں آئیں، اور لیبارٹری میں آ کر اس پر تجربہ کریں۔ پھر اس کے بعد کہوٹہ جائیں گے۔ پھر کہوٹہ میں جا کر ان کے ساتھ کام کریں۔ آپ شیشے کی طرح یہ واضح ہونے لگ جائے گا کہ یہ کیسے عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے افعال کو جاننے کے لیے اللہ کے احکامات کو ماننا ضروری ہے۔ یہ راستہ ہے۔ جب آپ احکامات کی لیبارٹری میں آ جائیں گے۔ پھر یہ ساری باتیں آپ پر آسانی کے ساتھ واضح ہوتی جائیں گی اور واضح یوں ہوتی ہیں کہ انسان جو ہے، وہ کتنی بھی کوششیں کیوں نہ کرے، ایک سنگل بینڈ کا ریڈیو سیٹ ہے۔ اس پر ایک ہی اسٹیشن بجتا ہے، اور اس جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں،

بے شمار اور لہریں بھی ہیں، اور ملک بھی بول رہے ہیں، لیکن میں تو ہوں ہی سنگل بینڈ کا ریڈیو، تو مجھ پر وہی ایک بجے گا۔ تو جوں جوں آپ احکامِ الٰہی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کا بینڈ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور وہ سگنلز جو آپ کو ویسے سنائی نہیں دیتے، ویسے محسوس نہیں ہوتے، ویسے ان کا احساس نہیں ہوتا وہ ارتعاش آپ کے اندر داخل ہونے لگے گا۔ وہ اسرار فٹافٹ آپ کے اوپر کھلتے چلے جائیں گے۔ لیکن اس وقت رک جائیں گے، جس وقت آپ احکامِ الٰہی سے ذرا سا بھی منہ پھیر کے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم جیسے آدمی، چھوٹے سے آدمی، بالکل بے حیثیت۔ ہم نے تو ایسے رازوں کو نہ جاننے کی کوشش کی، نہ یہ ہماری حیثیت ہے۔ نہ ہماری برات ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے میں نے دیکھے، اور بہت قریب سے دیکھے ہیں، جنہوں نے اس بات کو دل میں تہیہ کر کے اپنایا۔

پچھلے دنوں میرے بچے مجھ سے لیڈی ڈیانا کی بات کر رہے تھے، آپ جانتے ہیں وہ مر گئی بے چاری فوت ہو گئی۔ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی۔ اب جناب اس کا جو جنازہ چلا ہے کل دنیا نے دیکھا، ہر T.V اسٹیشن سے۔ اس وقت اگر آپ کے پاس ایسی صلاحیت ہوتی کہ جلدی جلدی دنیا کے اسٹیشن بدل کے دیکھ سکتے، جیسا کہ ہم نے یہاں اپنے پی ٹی وی پر لاہور میں دیکھے۔ ہم نے دیکھا سب جگہ پر ایک اسی کا جنازہ چل رہا تھا۔ ساری نیا میں یعنی راؤنڈ گلوب، سارے کرہ ارض پر۔ ہم

سب گھر میں بیٹھے حیران ہو رہے تھے، اور اس سے مرعوب بھی تھے۔ وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہے تھے کہ دیکھیں، چونکہ اس کا رویہ مخلوقِ خدا کے ساتھ بہت اچھا تھا، اور اس نے مریض بچوں کو اپنی گود میں بٹھایا تھا، جب یہاں آئی تھی، اور دنیا میں بڑے اس نے کام کیے تھے جو مائنز (بارودی سرنگیں) تھیں ان کو دور کرنے میں بھی مدد دی تھی۔ اسے جسے اللہ نے رتبہ دیا ہے کہ اس کا جنازہ اتنا بڑا ہے، اور رائلٹی، جو شہنشاہیت ہے، جو اپنی بگھی سے پیدل اتر کر چل رہی ہے۔ غالباً زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ رائلٹی ان کے پیچھے پیدل چلے آ رہے تھے، تو سب جب اتنی تعریف کر رہے تھے تو میں مرعوب تھا اس سے، اور تھوڑا سا متاثر بھی تھا کہ شاید ابھی اسے نہیں مرنا چاہیے تھا، اور میں اس بات کا عینی شاہد بھی تھا کہ اس کی طبیعت اور اس کا مزاج بہت اچھا تھا۔ ایک شام یہ لیڈی ڈیانا ہمارے گھر آئی تھی، تو ہم معمولی سے لوگ ہیں، وہاں ایک معمولی سے ڈرائنگ روم میں جب وہ آئی ہے تو بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہمارے ہاں لوڈ شیڈنگ تو ہوتی ہے، تو ہم سب بڑے پریشان تھے، میری بڑی آپا جو تھیں کہنے لگیں کہ ہائے ہائے شہزادی آئی ہے، اس پر بڑا ظلم ہو گیا، بتیاں بجھ گئیں۔ شرمندگی بھی ہوتی ہے، تو وہ کہنے لگی Never mind Apa, no, it is nothing, . candle will do.

کوئی بات نہیں موم بتی جلا لیں۔ کوئی بات نہیں۔ تو ہم نے کہا، بھاگ کے جا،
جلدی سے کینڈل لے کر آ صابری کی دکان سے، تو ملازم بے چارہ بھاگا بھاگا گیا تو
آ کر کہنے لگا۔ صابری کہتا ہے بتیاں پتہ نہیں کہاں پڑی ہیں، اندھیرا بہت چھایا ہوا
ہے۔ پتا نہیں موم بتی کہاں رکھی ہوئی ہیں۔ تو وہ بے چارہ واپس آ گیا۔ تو پھر اس
نے کہا، کوئی نہیں، اندھیرے میں ہم نے باتیں ہی کرنی ہیں نا، باتیں کرتے ہیں۔
تو ہم سب بہت متاثر ہوئے، کہ اتنی بڑی شخصیت ہے۔ ایسے ہی بات کرتی چلی
جاتی ہے۔ یہ ایک ذاتی مشاہدہ بھی تھا، لیکن یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، میں اپنے
ساتھی دیکھنے والوں سے، اپنے بچوں سے، اپنے بیٹے، پوتوں سے ایک ہی بات کہہ
رہا تھا کہ دیکھو یہ اللہ کی شان ہے، اور اللہ کی مرضی ہے، اور وہ جیسے چاہتا ہے
ویسے کرتا ہے۔ اس میں یہ خوبیاں جو آپ گنوا رہے ہیں ان کا ہونا یا نہ ہونا کوئی
معنی نہیں رکھتا۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ وہ جیسے چاہے کر سکتا ہے۔ اس کو یہ
پسند ہے۔ اس نے تم کو دکھایا ہے کہ دیکھو ہم ایسے بھی کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ڈیانا
کی دوسری زندگی سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ بہت اچھی طرح سے جانتے
تھے، لیکن یہ تو اللہ کا ایک فعل ہے، اور وہ کر رہا ہے۔ لیکن میرے لیے اللہ کا حکم
اور ہے یہ میری رول ماڈل نہیں ہے۔ میری رول ماڈل حضرت بی بی فاطمہ ہے۔
یہ نہیں ہو سکتی۔ میں دیکھوں گا۔ اس کا جنازہ چلا جا رہا ہے۔ بڑی شان ہے اس

کی، لیکن رول ماڈل نہیں ہے۔ میرے بچوں کے چہروں پر بڑی اداسی سی ہوئی کہ کتنی بری بات ہے۔ یہ کام کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ اللہ کا پسندیدہ ہونا ایک مختلف بات ہے۔ اچھا پھر میں تھوڑا سا پریشان ہوا، اور غم زدہ دل یوں ہوا کہ سارے بچوں نے میری بہت ٹھکائی کی کہ آپ بابا کمال کی بات کرتے ہیں۔ بہت سخت دل آدمی ہیں۔ تو میں نے کہا، یا اللہ تو کچھ ایسے کر کے میری عزت رہ جائے، تو اللہ نے میری بات مان لی۔ کچھ چھٹے ساتویں دن مدر ٹریسا فوت ہو گئی۔ اب مدر ٹریسا نے تو ۸۰ برس کی عمر تک، شروع سے لے کر لوگوں کی بے شمار خدمت کی تھی، اور ان کو ہر طرح سے مدد اور آسانی دی تھی اور مریض کوڑھی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر لاتی تھی، کلکتہ کی سڑکوں پر مرتے ہوئے، تڑپتے ہوئے، جب وہ فوت ہوئی ہے مدر ٹریسا، تو میں اس کا جنازہ دیکھنے کے لیے بھی رکا، اور میں نے ٹی وی آن کیا۔ بی بی سی لگایا، اور دو تین اسٹیشن مدر ٹریسا کا جنازہ، خواتین و حضرات! ایسا معمولی، ایسا چھوٹا تھا کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ یا اللہ اس کا جنازہ تو ایسا غیر معمولی ہونا چاہیے تھا۔ نوبل پرائز ملا ہے مدر ٹریسا کو امن کا، اس نے سب کچھ قربان کر دیا انسانیت پر، لیکن یہ تیری شان ہے تو جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

احکامِ الٰہی میں داخل ہونے سے وہ فریکونسی ضرور ملتی ہے۔ پھر میں اس نتیجے پر

پہنچا جس کے زور پر آدمی اپنے دل اور ذہن پر اٹھے ہوئے سوالوں کو جانچ سکتا ہے، آنک سکتا ہے۔ پرکھ سکتا ہے، اور اس کو اس کا جواب ملتا رہتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بات بڑی عجیب سی رہ جاتی ہے کہ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا شخص اور ایک بڑے مقام پر پہنچا ہوا آدمی، احکامِ الٰہی میں پورے کا پورا اترا ہوا انسان، کئی دفعہ کسی کوتاہی کی وجہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے، اپنی مرضی سے، اور اپنی مرضی کے خلاف بھی پھسل جاتا ہے، تو اس کے ساتھ جو ہوتی ہے وہ بھی اپنی طرز کی ایک نئی چیز ہے۔

ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ وہ اپنے بچوں کی، اور اپنے متعلقین کی، اور اپنے مریدین کی ٹریننگ کے لیے ڈیرے سے نکل کر باہر جنگل میں چلے گئے۔ ایک ایسے جنگل میں جس کے قریب سمندر تھا۔ لے جا کر ان کو جنگل کے مناظر بھی دکھانا چاہتے تھے، اور اللہ، اور جنگل کا، اور سمندر کا رشتہ بھی کچھ اپنے انداز میں سمجھانا چاہتے تھے۔ ان کو لے جانا اس لیبارٹری میں بہت ضروری تھا۔ مریدین کی ایک لمبی جماعت تھی۔ وہ بابا جی جو تھے، وہ ایک درخت کے ٹنڈ پر بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اچانک ایک شام ایسا ہوا کہ ایک اور بزرگ وہاں آ گئے اور انہوں نے آ کر اس صوفی کو السّلام علیکم کہا۔ یہ صوفی صاحب جو مریدین کی فوج لے کر گئے تھے، اٹھ کھڑے ہو گئے اور دست بدست ان کے سامنے

جھکے اور ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ تو یہ جوان مرید تھے، وہ تو بے چارے پریشان ہوئے کہ یہ کون صاحب ہیں جن کے آگے ہمارا پیر جو ہے، ہمارا گرو جو ہے، ہمارا monitor جو ہے، اس طرح سے جھکتا ہے تو وہ ان کے ساتھ محبت، اور ادب سے باتیں کرتے ہیں۔ ایک مرید جو تھا میرے جیسا، اس کے دل میں کھد بد ہو رہی ہے، اور بدستور ہو رہی ہے۔ اس نے کہا، اس کی کچھ خدمت ہونی چاہیے۔ یہ وقت کے بہت بڑے ولی قطب ہوں گے۔ مرید اپنے پیر صاحب کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا، حضور یہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ولیوں کے ولی ہیں، اور ہم خوش ہیں کہ ان سے ہماری ملاقات ہو گئی، اور یہ امیر البحر ہیں۔ یہ سمندروں کے قطب ہیں، سمندروں کی ڈیوٹی ان کو سونپی گئی ہے۔ ہم اتفاق سے سمندر کے کنارے آکر بیٹھے ہیں تو یہ ہم سے ملنے کے لیے آگئے ہیں۔ اس نے کہا، جی یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ اس سے تو ہماری ترقی ہو گی، اور ان سے کچھ پوچھیں گے۔ وہ بولے ایک بات ہے برخوردار کہ تمہاری ترقی نہیں یہ کر سکتے کیونکہ بڑے دکھ کی بات ہے، اور میرا دل اندر سے خون کے آنسو روتا ہے کہ ان کے پپ جو ہیں، کندھوں پر جو سٹار لگے ہوتے ہیں، وہ اتر چکے ہیں، اور ان کو اس کا علم نہیں، اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو امیر البحر سمجھتے ہیں۔ جب یہ بات سنی اس مرید نے تو رونے لگا کہ اتنا بڑا درجہ میرا پیر

ان کو دے رہا ہے، اور ان بے چاروں کو پتا نہیں۔ وہ اتنی زور سے رویا کہ انہوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ تو خاموش رہ، ورنہ ان کو علم ہو گیا تو بڑی تکلیف ہو گی۔ خیر وہ ملے بیٹھے، ان کے ساتھ باتیں کیں۔ پھر انہوں نے کہا، ہم کو اجازت دیجیے۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے سمندروں میں۔ تو مرید نے کہا کہ میں ان کو چھوڑ آؤں۔ انہوں نے کہا، ضرور یہ تو ہمارا فرض ہے۔

وہ پیچھے پیچھے ان کے دست بدست چلا۔ اور جو امیر البحر تھے وہ آگے آگے چلے تو جنگل میں جاتے جاتے جب گھنا جنگل آیا۔ تو اس نے کہا، آگے آجاؤ میاں ہمارے ساتھ۔ تو اس نے کہا، نہیں حضور ایسے ہی ٹھیک ہے۔ جب بات کی تو اس نے زور سے چیخ ماری، اور رونے لگ گیا۔ انہوں نے کہا، کیا بات ہے۔ تم رونے کیوں لگ گئے ہو۔ اس نے کہا، حضور میرا دل بھر آیا ہے، اور میرے اوپر ایسی افتاد پڑی ہے کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا، بے فکر رہو۔ ہم سے بات کرو، ہم تمہارے پیر سے بات کریں گے۔ کوئی الجھن ہے؟ اس نے کہا، ہاں حضور الجھن ہے۔ انہوں نے کہا، کیا الجھن ہے؟ اس نے کہا، حضور الجھن یہ ہے کہ آپ امیر البحر ہیں، اور آپ کا تصرف ہے سمندروں پر، یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر، لیکن حضور آپ کے پپ اتر چکے ہیں۔ آپ کے سٹارز کوئی نہیں ہے۔ اب آپ اس ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ تھوڑے دنوں

میں آپ کو پتا چل جائے گا۔ انہوں نے کہا، تم کیا بکتے ہو۔ اس نے کہا، مجھے یہ فرمایا گیا ہے جو عرض کیا۔ اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ انہوں نے بھی جب ادھر ادھر دیکھا، دونوں کندھوں پر واقعی ان کے سٹارز نہیں تھے وہاں۔ انہوں نے خاک زمین سے اٹھا کر سر میں ڈالنا شروع کی، اور وہ واویلا کیا کہ جنگل میں پرند چرند سب پریشان ہو کر شاخوں سے اڑ گئے۔ انہوں نے کہا، اے پیارے! اے نوجوان! تم نے مجھ پر اتنی بڑی مہربانی کی ہے۔ اب میرے پر ایک مہربانی اور کر کہ میرے پاؤں میں رسی باندھو، اور مجھ کو گھسیٹو زمین پر، اس جنگل میں، اس کڑی سرزمین پر، جہاں کیکر کے کانٹے اور کیا کچھ نہیں ہے۔ آ میں بھی واویلا کرتا ہوں تو بھی کر کہ اللہ کے احکام نہ ماننے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے، جو مجھ سے بے خیالی میں ہو گیا۔ اس نے کہا، حضور میں تو یہ بے ادبی کر نہیں سکتا۔ آپ مجھے قتل کر دیں یہ میں نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا، میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ میں کبھی تجھے اس کا بدلہ دوں گا، تو بے چارہ مجبور ہو گیا۔ اس نے کوئی سخت بیل توڑی، اس کو بل دیا، حکم کے مطابق ان کے ٹخنوں پر باندھا کندھے پر بیل کر رکھا اور چیخیں مارتا ہوا خود بھی اس کو بت کی طرح گھسیٹتا ہوا چل پڑا جنگل میں، اور وہ روتے جاتے تھے، اور آہ و بکا کرتے جاتے تھے، اور فریاد کرتے جاتے تھے کہ ہماری کوتاہی، جو گناہ ہے، معاف کیا جائے۔ جب وہ

چلتے ہوئے آرہے تھے، تو بتانے والے بتاتے ہیں جتنے پرندے درختوں میں بیٹھے تھے، انہوں نے بھی چیخ و پکار شروع کر دی، اور رونا شروع کر دیا، اور جنگل کی ہرنیاں اور ہرن اور شیر اور چرند پرند کھڑے ہو گئے اور منہ اوپر اٹھا کر کہنے لگے، یا باری تعالیٰ ان کو معافی عطا فرما۔ ہم تیری مخلوق ہیں۔ بیکار سی مخلوق ہیں۔ ہم تو جانور ہیں لیکن تیرے حضور یہ تو درخواست کر سکتے ہیں کہ اس کو معافی عطا کی جائے۔ ان کا رونا، اور چیخنا، اور پرندوں اور جانوروں کا اللہ کو پسند آیا، تو پھر انہوں نے کہا، جا اس کو معاف کیا۔ چنانچہ اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ تو وہ آ گئے اپنے عہدے پر واپس۔ تو اس مرید نے کہا، حضور میں تو خوشی سے بے چین ہوا جا رہا ہوں۔ الحمد للہ۔ جب وہ جانے لگے سمندر کا کنارہ نزدیک آ گیا۔ کیونکہ اب انہوں نے اپنی ڈیوٹی پر حاضری دینی تھی۔ مرید نے کہا، حضور میری حیثیت تو نہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آپ سے کیا کوتاہی ہوئی ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے۔ کہنے لگا چند روز کی بات ہے کہ میں سمندروں میں اپنی ڈیوٹی دینے جا رہا تھا، کشتی میں بیٹھا تھا، اور حکمِ خداوندی سے چل پھر رہا تھا۔ بڑی تیز بارش ہونے لگی سمندر میں۔ تو میں نے کہا، یا باری تعالیٰ اس بارش کو یہاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ بھرے سمندر پر یہ بارش۔ اگر سوکھے میدانوں میں ہو تو کچھ فائدہ ہو۔ لوگوں کو اناج ملے، فصلیں اگیں۔ بس اتنی بات، میں نے رائے دی تھی۔ فعلِ

اللہ کے اوپر میں نے تنقید کی تھی، تو خواتین و حضرات پھر یہ بات ہو گی۔ فعلِ اللہ اور ہیں، احکامِ اللہ اور ہیں، اور ہم سب احکامِ الٰہی کے پابند ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

ایک معصوم بیٹی کی کہانی

اتنی ساری بیٹیوں کی موجودگی میں آدمی کا دل بہت خوش ہوتا ہے اور اس کو ہمیشہ بڑی تقویت ملتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ بیٹا مطلوب ہوتا ہے، اور بیٹی لاڈلی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ وہ نہیں لے سکتی اور اس کی جگہ وہ نہیں لے سکتا، لیکن اگر حساب لگا کر دیکھو اعداد و شمار کے مطابق تو بیٹی کا نمبر ہمیشہ اوپر ہی رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ طے شدہ بات ہے کہ عورت کا احترام بہت ہے۔ جب آپ باہر نکل کر دیکھیں تو ہر ایک شے کے اوپر آپ کو ماں کی دعا لکھا ہوا ملے گا۔ بیوی کی دعا کہیں بھی نہیں۔ ایک بھی رکشہ پر نہیں لکھا ہوتا۔ عورت ماں کے روپ میں ہو، بیٹی کے روپ میں، بہن کے روپ میں ہو، عورت کی بڑی عزت دلوں میں ہوتی ہے۔ جھگڑے وگڑے ہو جاتے ہیں، لیکن بابا کو اپنی بیٹی اور بیٹیاں ہمیشہ بہت پیاری اور بہت لاڈلی ہوتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ یورپ کے کچھ ملک یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے یہاں پر عورت کی عزت نہیں ہے اور اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا ہے، اور کچھ ادارے انہوں نے اس طرح کے بنا دیئے ہیں کہ چیک کرنے کے لیے کہ کیا واقعی بُرا برتاؤ ہوتا ہے۔

کافی دیر کی بات ہے کہ میرے دفتر میں آیا ایسے ہی ایک ادارے کا آدمی، وہ بڑا بھلا سا نیک سا نوجوان تھا، جرمنی کا۔ اور جرمنی کے لوگ تحقیق کے معاملے میں اتنے ضدی، اتنے کڑوے اور اتنے کسیلے نہیں ہوتے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ کے اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ بیچارہ آیا تھا بہت سارے تصورات لے کر اپنے ذہن میں کہ میں پاکستان جا رہا ہوں اور اس کے بارے میں یہ یہ کہانیاں موجود ہیں۔ تو اس نے میرے دفتر میں مجھ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ سر You don't mind if I ask you direct question کہ آپ اپنی بیوی کو صبح کے وقت مارتے ہیں یا شام کو مارتے ہیں؟ تو میں نے کہا، شام کے وقت۔ میں دفتر سے تھکا ہارا جاتا ہوں تو ٹھیک طرح سے مار نہیں سکتا اس لیے میں صبح جب میں فریش ہوتا ہوں تو بانو قدسیہ کو "کھڑکا" جاتا ہوں۔

بے چارے کو بڑی کوفت ہوئی۔ کہنے لگا، آپ تو بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں۔ ویسے ہماری جو محبت آپس کی ہے وہ چلی آ رہی ہے۔ چاہے آپ کتنا بھی ہمارے خلاف پروپیگنڈا کریں، اس کا اثر مجھ پر یا میری بچیوں پر یا میرے بچوں پر نہیں ہو گا۔

ایسے ہی بارہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ یہ بچے بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں،

اور بڑے اڑیل ہوتے ہیں، بڑے ضدی ہوتے ہیں، اور بہت زمین پر پاؤں مار کر اپنی بات منوانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ میں چونکہ اس عمر میں ہوں، اور میں نے بہت سے زمین پر پاؤں بجتے سنے ہیں، اور میں نے اس کے آگے سر جھکایا ہے، تو میرے دفتر میں پانچ چار نوجوان طالب علم آ گئے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے تھے، اور وہ پولیٹیکل سائنس کے 6th year میں تھے۔ اسے آپ کیا کہتے ہیں، Second Part کے اسٹوڈنٹ تھے۔ ان میں ایک تھی، اس کا نام کلثوم تھا۔ ایک کا یاسمین، ایک کا مجھے یاد نہیں، اسے ببلی ببلی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ کچھ زیادہ بولی نہیں، اور دو لڑکے تھے، نوجوان بڑے اچھے تھے پیارے خوش شکل۔

کلثوم ان کی لیڈر تھی، اور اس کے چہرے کے اوپر کچھ نشان تھے۔ لڑائی جھگڑے کے دھبے۔ جب یہ لوگ میرے دفتر میں آئے تو کلثوم آتے ہی دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی، انکل ہم نے دیکھا ہے، آپ کا معاشرہ، اور ہم نے دیکھا ہے آپ کا مذہب، اور سب لوگ جو ہیں بڑے چالاک اور بے ایمان، اور سخت ہوتے ہیں۔ ہم لڑائی کر کے آئے ہیں۔ میں نے کہا، کیا ہو گیا۔ اس نے کہا، میرا نام یہ ہے، اور یہ میرے ساتھ میری کلاس فیلو، ان کا نام یہ ہے، اور ان کی نام یہ ہے۔ تو تعارف کرانے کے بعد اس نے کہا، آپ بڑے مامے بنتے ہیں

اخلاقیات کے اور دین کے۔ میں نے کہا، ہو کیا گیا؟ کہنے لگی، ہم سپہنوں (خواتین پولیس اہلکار) سے لڑ کے آئے ہیں۔ انہوں نے جلوس وغیرہ نکالا ہو گا۔ آگے سپہنیں ہوتی ہیں۔ بے چاری اچھی ہوتی ہیں۔ ان کو حکم جو ہوتا ہے، ان کو روکو تو ان کی مُڈ بھیڑ ہو گئی۔ ہمارے لاہور میں ایک جگہ ہے جہاں یہ T.V وغیرہ بہت بکتے ہیں، ہال روڈ۔ اس کے اوپر جھگڑا تھا۔ میں نے کہا، جھگڑا کس بات پر ہو گیا؟ تو اس نے کہا، جی یہ کیا قانون بنایا ہے آپ نے، لوگوں سے خوامخواہ کہا کہ ہمارے حقوق آدھے ہیں، مردوں کے پورے۔ کہنے لگی یہ کیا بات ہوئی کہ عورت قتل ہو جائے تو آدھی دیت اور مرد قتل ہو جائے تو زیادہ۔ میں نے کہا، تم نے اس پر جلوس کیوں نکالا، یہ تو مجھے جلوس نکالنا چاہیے تھا۔ میں نکالوں گا کل سے جلوس، یہ تو کمال کی بات ہے۔ وہ غصے میں تھی، کہنے لگی۔ آپ کیوں جلوس نکالیں گے۔ میں نے کہا، میں اس لیے جلوس نکالوں گا کہ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ میں مر جاؤں گا تو بانو قدسیہ کو ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا۔ وہ مرے تو مجھے پچاس ہزار ملیں گے۔ یہ تو الٹا ہو گیا کام۔ کہنے لگی، ہاں ہم تو پھر جلوس نکال کے آئے ہیں۔ میں نے تو یہ الٹا جلوس نکال دیا تمہارا۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ اگر میری بیوی خدانخواستہ قتل ہو جائے تو مجھے چار پانچ لاکھ ملیں۔ میں مارا جاؤں تو میری بیوی کو 25-26 روپے مل جائیں۔ تاکہ اس کو کوئی سزا

ملے۔ اس کی ساتھی کہنے لگی، دیکھو یاسمین میں نے تم سے کہا تھا کہ انکل کے پاس نہیں جانا۔ یہ ہمیشہ ایسی الٹ بات کرتے ہیں۔ میں تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو کہنے لگی، یہ ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ آپ کا یہ سب فلسفہ، میں آپ کی پرواہ نہیں کرتی۔ میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ ہم سارے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پرانے دقیانوسی دھات، پتھر کے زمانے کی چیزیں، اس زمانے کی آپ نے اخلاقیات میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب میں نے کنڈم کر دی ہیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ کنڈم کرتی ہیں تو کریں، تمہیں پورا حق پہنچتا ہے۔ وہ کہنے لگی، میں آپ کو بتاؤں ایک بات، اور آپ کان کھول کے سن لیں کہ میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ میں نے بالکل نہیں جانا بہشت وغیرہ میں، مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ غصے میں تھی بیچاری۔ بڑی پیاری سی تھی، اور اچھی طاقت تھی اس میں، بہت خوبصورت بازو چڑھائے ہوئے تھے۔ اس کے ارادے مضبوط تھے۔ ہنسنے والی لڑکی تھی۔ میں نے تو دوزخ میں جانا ہے۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں آپ کی۔۔۔۔ میں نے کہا، نہیں نہیں، تو نے دوزخ میں جا کر کیا کرنا ہے۔ دفع کرو۔ کہنے لگی نہیں میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ میں نے کوئی قانون نہیں ماننے۔ میں نے نہ دین کے، نہ اسلام کے۔ میں نے اپنی مرضی سے رہنا ہے۔ میں نے کہا، بیٹی دوزخ میں جانا بڑا مشکل کام

ہے۔ تو کیسے جائے گی۔ دوزخ میں جانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس نے کہا، جی کیسی محنت کیا؟ وہ جی میرا، اور اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بڑا زبردست۔ میں نے کہا، تو نہیں جا سکتی۔ کہنے لگی میں جا کے دکھاؤں گی۔ اتنا جھگڑا ہو گیا کہ میں نے کہا کہ تو دوزخ میں تو۔۔۔۔؟ ”توکیہہ تیرا پیئو نہیں جا سکدا“۔ میں نے کہا بڑا لمبا کام ہوتا ہے۔ اس میں کئی مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پھر جا کے کہیں بندہ ہوتا ہے دوزخی۔ پہلے جا کے تو شرک کر۔ پھر اللہ کی زمین پر فساد پھیلا، پھر جائے گی۔ کسی کی چیز چرا لے گی، پنسل کالج سے لے آئے گی، یا کسی کا دوپٹہ کھسکا لے گی تو اس سے تو نہیں جائے گی دوزخ میں۔ کہنے لگی نہیں بس میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے۔ میں نے کہا، نہ نہ بچے، غصہ تھوک دے، کوئی بات نہیں۔ ہم ایسے کریں گے کہ تجھ پر بوجھ نہیں پڑنے دیں گے، تو تم کو آسانی سے چلنے دیں گے۔ مجھے یہ بتاؤ جس زمانے میں ہم ایم اے میں پڑھتے تھے، اس وقت پرچے میں پانچ سوال ہوتے تھے، بیس بیس نمبر کے، اور وہ پانچ کرنے ہوتے تھے، کہا جاتا تھا کہ آؤٹ آف Eight کوئی پانچ سوال کریں۔ اب سمسٹر سسٹم چل گیا ہے، جس کی مجھے کچھ سمجھ نہیں ہے۔ کہنے لگی، سنیں، سمسٹر سسٹم چلا تھا، وہ پھر کینسل ہو گیا۔ اب پھر پیپر ہی ہوتا ہے۔ اور پانچ سوال ہی کرنے ہوتے ہیں، اور پانچوں سوال بیس بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، اور تیرا بھلا ہو جائے اسلام میں بھی پانچ ہی

سوال ہوتے ہیں۔ وہ بھی بیس بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔ کہنے لگی ہیں، یہ کیا؟ میں نے کہا۔ دیکھ اب تو ایسے کریں گے۔ تو ہے غصے والی بیٹی، تو تیرا انتظام ایک اور طرح سے کرنا چاہیے کہ ہم ایسے کریں گے کہ تم کو لڑکیوں کو بہت شوق ہوتا ہے ڈائٹنگ کرنے کا، اور اپنی Figure ٹھیک رکھنے کا، ٹھیک ہے نا، ہم ایسے کریں گے تجھے سال میں ایک مہینہ ڈائٹنگ کرائیں گے ٹھیک ہے نا۔ صبح کھلا دی روٹی سارا دن پانی بھی میں نے پینے نہیں دینا اور کھانا بھی نہیں کھانے دینا۔ کہنے لگی

Oh you are talking of Ramzan۔

میں نے کہا، اب تم جو مرضی نام دے لو اس کا۔ کہنے لگی، انکل وہ تو جو رمضان ہے نا وہ تو روزے میں رکھتی ہوں سارے۔ کہنے لگی گھر میں تو کوئی بھی نہیں رکھتا لیکن میں رکھتی ہوں سحری کھا کے۔ مالی بابا اور اس کی فیملی جاگی ہوئی ہوتی ہے، میں ان کے کوارٹر میں چلی جاتی ہوں۔ بڑے مزے کی روٹیاں پکائی ہوتی ہیں ماسی نے تو میں سحری کھا کے آ جاتی ہوں، تو میرا روزہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تیرے بیس میں سے بیس نمبر آ گئے، ٹھیک ہے نا۔ پھر میں نے کہا تم جیسی لڑکیوں کو بڑا شوق ہوتا ہے سیر و تفریح ک، بہت مرتی ہیں، ایسے تصویریں دیکھتی ہیں، کیلنڈر دیکھتی ہیں۔ کہتی ہیں ہائے ہائے ملیشیا جائیں گے۔ یہ امریکا کا ساحل ہے، یہ دیکھو یہ ڈزنی لینڈ ہے، اس جگہ جانا چاہیے، شوق ہوتا ہے۔ میں ایسا

بندوبست کروں گا۔ میں ہوں تو غریب آدمی لیکن میں تمہیں پاسپورٹ بنوا کے دوں گا اور میں تمہیں ملک سے باہر بھیجوں گا، اور تمہیں بڑا شاندار نظارہ ملے گا، جو تمہیں دنیا میں کہیں اور نہیں نظر آئے گا۔ کہنے لگی، کیسی جگہ۔ میں نے کہا، ایک ایسی جگہ جہاں آدمیوں کا بڑا ہجوم ہو گا۔ اتنا بڑا ہجوم دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگی، آپ حج کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ کہنے لگی، انکل وہ تو مجھے شوق ہے دیکھنے کا، کیونکہ دینا میں سب سے بڑا ہجوم۔ وہ کہنے لگی، آپ مجھے نہ دیں پاسپورٹ، اور نہ دیں ٹکٹ۔ وہ تو میں انشاء اللہ خود جاؤں گی۔ وہ میرا پکا تہیہ ہے وہ تو میں نے طے کیا ہوا ہے۔ لیکن میں آپ کے اسلام وغیرہ کو نہیں مانتی۔ غصے میں تھی نا۔ تو بار بار ایسے کہتی تھی۔ میں نے کہا چلو بیس نمبر تیرے یہ ہو گئے، چالیس ہو گئے۔ تو میں نے کہا کہ تم نیو کیمپس میں کیسے آتی ہو۔ کہنے لگی نیو کیمپس میں ابو کار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کئی دفعہ نہیں آتے تو میں خود کار لے کر آجاتی ہوں۔ اگر دونوں میں سے کوئی صورتِ حال نہ ہو تو ڈیڈی مجھے دس روپے دیتے ہیں۔ میں 1984-83 کی بات کر رہا ہوں۔ تو اس زمانے میں ڈیڑھ روپیہ آنے جانے میں لگتا تھا۔ ہماری بس ہوتی ہے۔ میں نے کہا اگر میں تجھے کہوں یہ جو تجھے دس روپے ملتے ہیں، ان میں سے تھوڑے سے پیسے اٹھنی اس سے بھی کم یہ ایک طرف رکھ کے Put by کر کے ایک

طرف رکھ دے تو دے دیا کر کسی غریب کو۔ تو کہنے لگی۔ آپ مجھے پھنسا رہے ہیں۔ میں نے کہا، میں آپ کو کہاں پھنسا رہا ہوں، تو میرے پاس آئی ہے، اتنی محبت کے ساتھ، تیرا ابا اتنی محبت سے تم سے بات کرتا ہے، تو پھنسانے کی بات کرتی ہے۔ کہنے لگی، آپ مجھے زکوٰۃ میں پھنسانا چاہ رہے ہیں۔ جسے انکل آپ ڈھائی فیصد کہتے ہو۔ یہ تو غلط ہے، یہ تو فلاں نے بنائی ہے ڈھائی فیصد۔ اللہ کا حکم اور ہے۔ میں نے کہا، بھئی وہ کیا ہے۔ کہنے لگی اللہ تو کہتا ہے جو کچھ تمہارے خرچ سے باقی بچے وہ سارے کا سارا دے دو۔ یہ تو میں نے پہلی بار سنا۔ میں نے کہا، اوہ تیرا بھلا ہو جائے تو نے تو مجھے ڈرا دیا۔ ڈھائی فیصد پر میں یقین نہیں رکھتی۔ یہ کیلکولیشن غلط ہے۔ کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا، یہ تو تیری اور کمال کی بات ہو گئی۔ تیرے تو ساٹھ نمبر ہو گئے۔ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ تو اسی طرح میں نے کہا، اب اگلا کام آتا ہے جہاد کا۔ وہ مرد بھی جاتے ہیں عورتیں بھی جاتی ہیں، لیکن ذات کے خلاف لڑنا بھی ایک جہاد ہے۔ خرابی کے خلاف۔ تو وہ تو سامنے ہے۔ کہنے لگی، دیکھو میں کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تو میں نے کہا 80 نمبر ہو گئے۔ میں نے کہا بے وقوف لڑکی کلثوم بی بی تم نے آج تک اسّی نمبر لیے ہیں کسی پرچے میں۔ کہنے لگی اسّی تو انکل بہت ہوتے ہیں۔ میں تو یہی رو رہا تھا کہ تو دوزخ میں کیسے جائے گی۔ تو تو مصیبت یہ ڈالے بیٹھی ہے۔ تیرا ارادہ دوزخ میں جانے کا

ہے۔ کہنے لگی، وہ میں غصے میں کہہ رہی تھی۔ اس کا جھگڑا دین کے ساتھ تو نہیں تھا بے چاری کا۔ آدمی دکھی ہوتا ہے۔ اپنی ماما جی سے اپنی اماں سے اپنے ابو سے لڑتا ہے تو پھر اس کو غصہ آتا ہے۔ پھر جن باتوں کی وہ تلقین کرتے ہیں، جس کے اوپر قائم رہنے کے لیے۔۔۔؟ اس کو وہ ہٹ کرتا ہے۔ میں نے کہا، کلثوم بچے اب ایسے کریں گے کہ پھر تمہیں ایک لفظ سکھائیں گے۔ وہ ہے تو مشکل عربی کا لیکن تو ذہین لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے تو سیکھ جائے گی اگر مشق کرے تو۔ کہنے لگی وہ کیا ہے۔ میں نے کہا، وہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ کہنے لگی، لو کیا بات کی۔ یہ تو میں صبح منہ دھوتے وقت، صبح سویرے جب پانی ڈالتی ہوں تو یہی پڑھتی ہوں۔ تو میں نے کہا، اب بتاؤ بچے تم نے تو پھنسا دیا، ہم دوزخ کیسے جائیں گے۔ یہ تو تم نے میرے بھی راہ بند کر دی۔ اب میں بھی کلثوم بی بی کا بابا دادا بن کے بیٹھ گیا۔ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ مجھے بھی فائدہ ہو جائے گا۔ باقی رہ گئی نماز کی بات۔ تو میں نے کہا، عید کو لڑکیاں بڑے شوق سے گھر میں مصلیٰ ڈالے سروں کے اوپر دوپٹے لپیٹ کر کھڑی ہو جاتی ہیں نا تو تین نمبر تو اس میں بھی آ جائیں گے۔ 83-84 نمبر ہو جائیں گے۔ بیس تیرے کلمے کے ہوئے پڑے ہیں۔ کہنے لگی نہیں نہیں خیر نمازیں میں رمضان شریف میں تو ساری پڑھتی ہوں پوری، اور اس کے علاوہ بھی جب بھی موقع لگ جائے، لیکن ریگولر نہیں

ہوں۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، تیرے نمبر تو 94-95 سے زیادہ بن رہے
ہیں، تو اب تیرا کیا کریں۔ تو اس کی سہیلی یاسمین کہنے لگی، تم اٹھو، میں نے تم سے
کہا تھا ناکہ انکل اشفاق کے پاس نہیں جانا یہ بہت چالاک ہیں۔ یہ ہمیں دھوکے
سے پھنسا رہے ہیں۔ تو ان کے جو ساتھی لڑکے تھے وہ بڑے غور سے یہ باتیں
سنتے رہے اور حیران ہوتے رہے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ تھوڑی سے
باتیں کیں کہ سر ہم بھی کچھ تھوڑے سے ایسے ہی تھے۔ گستاخ کچھ الٹے سیدھے
الفاظ ہمارے منہ میں بھی، اور ذہن میں بھی آجاتے ہیں۔ میں نے کہا، کوئی بات
نہیں۔ ذہن میں آجاتے ہیں تو بے اختیاری کی بات ہے۔ ذہن کے اوپر کنٹرول
نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں، چلتے رہیں، لیکن کہنے لگے، رخ ہمارا البتہ ادھر کا ہو گیا
ہے جس طرف کی بات آپ کر رہے ہیں۔ تو کلثوم بی بی اپنی آستین چڑھائے
ہوئے غصے میں لٹیں کھلی ہوئی، لیکن وہ ذرا تھوڑی سی ٹھنڈی ہوئی، لیکن اس کا
غصہ پورے کا پورا کم نہیں ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا، پولیس نے انہیں تنگ کیا
تھا۔ بات بھی اس کی سن لیں۔ جب آپ بات کسی کی سنیں۔ سننے کے لیے کوئی
بھی ہو۔ آپ کے گھر میں جھاڑو دینے والی ہے۔ ماسی کھانا پکانے والی ہے۔ اس کی
بات ہے۔ کہنے سننے کے لیے آپ کے پاس بھی وقت ہونا چاہیے۔ کلثوم کی اور
یاسمین کی بات، اور ان کے ساتھیوں کی بات نہیں سنی گئی تھی؟ اس لیے ان کو

غصہ تھا۔ اور غصہ سارا وہ ڈائریکٹ گیا تھا اس دین کی طرف اور اتھارٹی کی طرف، اور بڑوں کی طرف۔ اب اس میں ساری جہالت جو ہے وہ بڑوں کی ہوتی ہے۔ بڑوں کو سنبھالنا نہیں آتا۔ وہ اپنی اتھارٹی میں لگ جاتے ہیں، اور ہمارے ملک میں اتھارٹی کا رواج ذرا ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہاں اکیلے بڑوں کی اتھارٹی نہیں۔ آپ بھی جب سوچیں گی، اور آپ جب گھر جا کے غور کریں گی تو آپ دیکھیں گی، آپ اپنی اتھارٹی کو ان معصوموں پر، ان لوگوں پر ضرور استعمال کر جاتی ہیں، جو کہ آپ سے نیچے ہیں۔ لیکن الحمدللہ آپ نے اس بات کو تسلیم کیا۔ لڑکے تو مانتے نہیں، لیکن ہم کیا کرتے ہیں ہمارے ہاں لوگ جو ہیں وہ بھی اپنی اتھارٹی کو بڑی شدت سے، اور بڑی بری طرح سے استعمال کرتے ہیں۔

میں شاید پیچھے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس بات کا بڑا غصہ تھا۔ یہاں ایک جگہ ہے اچھرہ، اس میں خواتین بہت جاتی ہیں۔ کچھ کپڑے وپڑے لینے کے لیے۔ میں بھی جاتا ہوں، بیگ پکڑ کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ انہوں نے کچھ لینا ہوتا ہے، کچھ سلی سلائی چیزیں۔ تو وہاں پر ایک خاتون کسی سکول کی ٹیچر تھی، اچھی پیاری معزز، سیاہ برقع اس نے اوڑھا ہوا، ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا۔ ہم جس دکان سے کچھ سودا لے رہے تھے تو اس نے کچھ پوچھا، سرخ رنگ کا کوئی کپڑا، پتا نہیں کیا کہا، لیکن دکاندار نے سنا ہی نہیں۔ پھر اس نے ذرا وضاحت سے کہا تو اس نے ہاتھ

کے اشارے سے کہا، تیرے کام کی یہاں چیز نہیں ہے اس دکان پر آگے جا کے پتا کر۔ تو میں غصے میں بھی آیا اور مجھے رونا بھی آ گیا۔ میں نے کہا یہ تو آپ کو حق نہیں پہنچتا۔ اس نے کہا، اشفاق صاحب یہ ایسے ہی ہے کوئی کم پیسوں والی۔ تو یہ اتھارٹی دیکھیں نا، حالانکہ وہ کوئی افسر نہیں ہے۔ کسی بڑی جگہ پر نہیں ہے، لیکن وہ اپنی اتھارٹی بے جا طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اور اگر آپ اپنے ارد گرد دیکھیں گی تو بڑا ظلم چل رہا ہے۔ بہت زیادہ تکبر شامل ہو گیا ہے۔ ہر بندے کے ذہن میں۔ اور تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے وہ بہت ساری چیزیں اکٹھی کرتا رہتا ہے، تاکہ دوسروں کو ڈرانے کے لیے تکبر نمایاں کرے۔ یہ بات، خوشی کا اظہار اس لیے کر رہا ہوں کہ تھوڑے دن ہوئے میں اپنے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڑی خوبصورت سی، پیاری، لمبی عورت ایک خوبصورت سے بچہ ٹوپ اس نے پہنا ہوا، اون کے موزے جرابیں، وہ آ گئی۔ آ کے وہ عورت میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہنسنے لگی اور کہنے لگی آپ نے مجھے پہچانا؟ میں نے کہا، نہیں۔ کہنے لگی انکل میں کلثوم ہوں۔ میں نے کہا، اور تیرا بھلا ہو جائے بیٹھ۔ میں نے کہا، تو اتنی دیر کہاں رہی۔ کہنے لگی میں سیدھی شکاگو سے آ رہی ہوں، اور میں نے آپ کا پتا ڈھونڈ کے سب سے پہلے آپ کے ہاں حاضری دی، میرا خاوند وہاں ڈاکٹر ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ میں آپ سے اپنی پرانی محبت، اپنی برخورداری، اپنی

بیٹی ہونے کا ایک چھوٹا سا حق مانگنے آئی ہوں۔ سیدھی آپ کے پاس۔ میں ڈر گیا۔ میں نے کہا، فرمائیں۔ میں تجھ سے بڑا ڈرتا ہوں، اور اتنے سال میرے ڈر میں ہی گزرے ہیں۔ کہنے لگی، یہ میرا بیٹا ہے۔ بہت پیارا ہے، اور بہت صحت مند ہے، اور ہم اس کو صحت اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر پال رہے ہیں۔ یہ روتا بہت ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ کسی طرح اس کا رونا کم ہو، کئی دوائیاں دی ہیں۔ میرے خاوند ڈاکٹر ہیں، لیکن اس کا رونا کم نہیں ہوا تو میں اس کو آپ کے پاس لائی ہوں کہ اس کو دم کر دیں۔ میں نے کہا، اوہ تیرا بھلا ہو جائے۔ میں کوئی نیک آدمی نہیں ہوں۔ میں کیسے دم کروں۔ مجھے دم کرنا نہیں آتا۔ کہنے لگی آپ ''شو'' کر دیں۔ میں نے کہا، نہیں بچے یہ تو۔۔۔۔۔؟ اب میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھے واقعی نہیں آتا دم کرنا کہ کیا پڑھتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں۔ کہنے لگی آپ میرے ساتھ ہمیشہ۔۔۔۔۔؟ اب پھر وہی غصہ پرانا اس کا کہ میں کتنی دور سے چل کر آئی ہوں، اور کتنی آرزو لے کر آئی ہوں۔ کہنے لگی۔ اب آپ پھر تکبر کے میز کے اوپر چڑھ گئے ہیں۔ آپ کریں اس کو دم۔ میں نے کہا، پیارے بچے! اگر مجھے کچھ آتا تو میں ضرور کرتا۔ اس نے کہا، آپ جھوٹے ہی کر دیں۔ ''شو شو'' کر دیں۔ اب میں نے کہا، جھوٹی پھوک کیسے ماروں گا۔ پھر میں نے کہا، چل ہمارے مولوی صاحب ہیں۔ مسجد میں، بہت نیک آدمی ہیں۔ میں

جمعہ پڑھنے جاتا ہوں وہاں۔ ان سے دم کرواتے ہیں۔ تو کہنے لگی، نہیں آپ سے کرواؤں گی۔ آپ ہی کریں۔ دیکھیں انسانی کوتاہی کیا ہوتی ہے۔ میں بھلا اس کا دل رکھنے کو کر دیتا۔ ایسے ہی "شو"، لیکن میں رکا رہا۔ میں نے کہا، مجھے نہیں آتا۔ یہ اللہ نے میرے اندر صلاحیت نہیں رکھی ہے۔ میری صلاحیت ہے کہ میں کچھ لکھ لیتا ہوں ڈرامے، لیکن یہ کام نہیں جانتا تو اٹھ کے کھڑی ہو گئی، جس طرح سے میرے دفتر میں اپنا پاؤں مار کے گئی تھی، زور سے، اتنے ہی زور سے اس نے ویسے ہی پاؤں مارا۔ کہنے لگی نانا۔ (بچے کے حوالے سے مجھے نانا کہی رہی تھا) "بابا یو آر ہولی مین" یہ اس کا آخری فقرہ تھا۔ اور غصے میں کار میں بیٹھ کے چلی گئی۔ اب بتاؤ میں تم کو کس کھاتے میں ڈالوں۔ تم جو آ گئی ہو ساریاں (ہال میں بیٹھی خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے) مجھے ڈر ہے کہ تم بھی اندر سے لڑائی کرو گی۔ کسی نہ کسی دن میرے ساتھ، اور پیاری تم بہت ہوتی ہو۔ یہ آپ اپنے بڑوں سے اپنے بھائیوں سے اپنے ابو سے پوچھیں۔ باوجود اس کے کہ اختلاف ہوتے ہیں۔ اب ہمارے درمیان کوشش ہو رہی ہے کہ ہمارے درمیان ہماری محبت کے درمیان کچھ ایسی دیواریں کھڑی کر دی جائیں، تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ تو پیارے بچو، میں اب تمہارے سامنے شکایت کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ووٹ دینا پڑے، آپ میرے حق میں دینا۔ کلثوم کے حق میں نہ

دینا۔ وہ مجھے بہت جھڑکیاں دے کر گئی ہے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

موت کی حقیقت

جب آدمی کے وجود پر بہت سال کی بڑی دھول جم جاتی ہے تو پھر وہ اپنے ارد گرد اپنے ماحول میں سے ایسی چیزیں تلاش کرنے لگ جاتا ہے جو بڑی گرد آلود ہو چکی ہوتی ہیں، اور اس کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ یہ چیزیں صاف ستھری ہو کے پھر سے ترتیب سے رکھی جائیں۔ لیکن میرا وجود اتنا صاف ستھرا ہو کے ویسی ترتیب سے نہیں رہ سکتا۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ پرسوں ہوا۔ میں اپنی پرانی کتابوں کی الماری کو صاف کر رہا تھا، تو اس میں سے ایک کتاب بڑے پیارے محبوب دوست، اور اس سے بڑے شاعر کی نکل آئی اور میں اسے دیکھنے لگا، اور ماضی کے کافی دور پہنچ کر ان حالات میں بھی پہنچا جو ماضی سے بعید تر تھے۔ اس میں ایک چھوٹی سی پرچی پر ایک چھوٹی سی نظم میں نے لکھ کر رکھی تھی۔ یہ نظم ہمیں اپنے زمانے میں بہت ہی پیاری، اور بہت ہی اچھی لگا کرتی تھی، اور ہم اس کو لہک لہک کر، اور چہک چہک کر پڑھا کرتے تھے لیکن اب بالکل ہمارے ذہن سے یہ چیز نکل چکی تھی۔ اس پر وقت کی دھول جم چکی تھی۔

خواتین و حضرات! جب کوئی رخصت ہو جاتا ہے آپ کے درمیان میں سے، اور

موت اس کے ساتھ رشتہ گانٹھ لیتی ہے تو پھر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ یہ موت کا جو وجود ہے، اس کا تعلق عدم کے ساتھ ہے یا موجود کے ساتھ۔ آدمی تو گزر گیا، چلا گیا، لیکن اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں اتنا کچھ نہیں تھا چلے جانے کے بعد جتنا کچھ ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ موت بھی زندگی کا، ایک روپے کا دوسرا رخ ہی تو ہے، لیکن یہ بڑی اہم بات ہے، اور بڑی دلچسپ ہے، اور اس کے ساتھ ایک گہرا رشتہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تو مجھے یاد آیا، کتابوں کی الماری صاف کر چکنے کے بعد اور اس دوست کا ذکر کتاب میں پڑھنے کے بعد اس کی شاعری دیکھنے کے بعد، جو کہ اب ہم میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں پر، ہمارے مشرق میں، موت کے بارے میں بہت عجیب و غریب روایات اور بہت ہی عجیب و غریب قصے، اور بہت عجیب و غریب رویئے ہیں۔ میرے چچا جہلم میں تھے ٹمبر مرچنٹ۔ ان کے دوست کا ایک جواں سال بیٹا کسی وجہ سے فوت ہو گیا۔ اکیلا ہی اس کا بیٹا تھا، اور وہ بڑا صوفی آدمی تھا۔ میرے چچا کے دوست اپنے زمانے میں نائب تحصیل دار رہے تھے لیکن بے حد ایماندار، اور بہت Honest اور راست گو انسان تھے۔ کسی وجہ سے میرے چچا نے یہ عرض کیا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہوں نے اپنے نمائندے کے طور پر مجھے بھیجا اور کہنا کہ میں جو نہی ٹھیک ہوا اور میری صحت بحال ہوئی، میں خود حاضری دوں

گا۔ جب میں وہاں گیا تو بہت سے لوگ جمع تھے اور وہ چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے
۔ میں جب ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے پہچانا۔ اور مجھے کہنے لگے اشفاق میاں
دیکھو ہم جیت گئے اور سب دنیا ہار گئی، ہم کامیاب ہو گئے اور باقی کے سب لوگ
بڑے بڑے ڈاکٹر، بڑے حکیم اور بڑے بڑے نامی گرامی طبیب ہار گئے۔ میں
پریشان کھڑا تھا ان کے سامنے کہ یہ کیا بات کہ رہے ہیں۔ کہنے لگے، دیکھئے ہمارا
یار جیت گیا، اور سارے ڈاکٹر فیل ہو گئے۔ ہم ایک طرف تھے اور یہ لوگ
سارے ایک طرف تھے وہی ہوا جو ہمارے یار نے چاہا، اور جو اس نے چاہا تھا وہی
ہم نے چاہا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک اکلوتا
اس کا بیٹا، جواں سال، اور بار بار یہی بات کہ رہا ہے۔ کچھ وقت ایسی کیفیت درد
کی، اور کرب، اور الم کی بھی بن سکتی ہے۔ لیکن یہ انداز بتا تا تھا کہ وہ یہ بات اندر
سے کہ رہے ہیں اور اس کے اوپر ان کا پورا ایمان ہے، اور وہ ہل نہیں رہے ہیں
اس مقام سے۔ اور کہتے تھے جو اللہ نے کیا ہے وہی درست۔ اور وہی ٹھیک ہو گا
جو اللہ کرے گا۔ اور چونکہ ہم اللہ کی سائیڈ کے ہیں اس لیے جب اللہ کامیاب
ہوتا ہے اور وہ ہر بار کامیاب ہی ہوتا ہے، تو ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ میرے
لیے ایک عجیب بات تھی۔ میں اس وقت ایف اے کر چکا تھا لیکن نہ میرے

پاس الفاظ تھے، نہ میں بڑے سلیقے سے ان کے ساتھ افسوس کر سکتا تھا جس کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا۔ افسوس کے لیے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ انہوں نے چائے پلائی، کھانا وہاں کھانا کھلانے کا رواج تھا۔ اگلے دن واپس آئے۔ میں نے آ کر ساری بات چچا سے کہی۔ انہوں نے کہا کہ وہ بہت مضبوط اور اللہ کو ماننے والے شخص ہیں۔

اس کے بعد پھر کچھ عرصے بعد جب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور میں نے ابھی کوئی ملازمت نہیں کی تھی تو مجھے سالٹ رینج میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ جو ہے نا کوہستان نمک تو یہاں پر ایک مقام تھا پہاڑوں کے اندر۔ اب تو ماشاء اللہ راستہ بہت آسان ہو گیا ہے نا، موٹروے کی وجہ سے، اس وقت بہت مشکل سے یہاں پہنچتے تھے۔ جب ہم تلہ گنگ پہنچے تو ایک بزرگ تھے ملک صاحب، ان کا بھی اسی طرح بیٹا فوت ہوا تھا، اور ان کے پاس لوگ افسوس کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ بیٹھے تھے آرام سے ایک مقام پر، اور لوگ گھوڑوں پر، پیدل، ایک دو اونٹ پر بھی وہاں آ رہے تھے۔ بہت رئیس تھے اس علاقے کے۔ جو آدمی بھی، جہاں پر ملک صاحب بیٹھے تھے اس دائرے کے قریب پہنچتا تھا وہ اپنے گھوڑے کی باگ یا شتر کی مہار چھوڑ کر پیدل چلتا ہوا رکتا تھا، اور ہاتھ اونچے کر کے ایک آواز لگاتا تھا۔ "ملک صاحب حق ہویا" یعنی جو کچھ بھی ہوا، یہ حق ہوا،

میں اس سے آگے بول نہیں سکا۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ یہ بھی پرسا دینے کا ایک انداز تھا، لیکن وہ کہتے اونچی آواز میں۔ اب بھی یہ رسم ہے کہ جب کوئی فوتیدگی ہوتی ہے تو وہ آنے والے پرسا دینے والے لوگ بہت اونچی آواز میں کہتے ہیں کہ ملک صاحب حق ہویا اور وہ جواب میں یہ کہتا ہے کہ بالکل ٹھیک ہے جو کچھ ہوا حق ہوا۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔ اس کو اندر سے نکال کر کہنا۔ وہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑا جمع غفیر تھا، اور عورتوں کے دل بڑے نازک ہوتے ہیں، روتی ہوئی آتی تھیں۔ لیکن وہ بھی ساری ہاتھ کی انگلیاں ہلا کر کہتی تھیں بی بی حق ہوا، اور وہ ماں جو تھی اس بیٹے کی وہ بھی کہتی تھی، ہاں ہوا، میں اس کو تسلیم کرتی ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا حق ہوا، تو موت کو زندگی کے ساتھ اس طرح سے وابستہ کرنا، اور اس کو زندگی کی ایک بُنت میں عجیب طریقے سے لانا، یہ کچھ ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی ذات پر پورا کا پورا اعتماد رکھتے ہیں، اور ان کا ایمان جو ہے وہ بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ تو میں اکثر سوچتا تھا اور میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ زندگی کو protect کرنے کے لیے اس کی حفاظت کرنے کے لیے موت جو ہے، یہ بڑی اہم اور بڑی ضروری چیز ہے، اور اس کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ وہ جو ایک Red Indian تھے شامان جسے کہتے ہیں۔ سیانا آدمی۔ تو اس کے پاس کیلیفورنیا کا ایک طالب علم آ گیا۔ اینتھروپالوجی کا پوچھنے کے لیے۔

اس نے کئی باتیں اس سے پوچھیں۔ جڑی بوٹیوں کے بارے میں۔ تو اس نے کہا کہ ڈان جو آن، (سیانے کا نام ڈان جو آن تھا)۔ اس کی اصلی رپورٹ میں نام شاید کچھ اور ہو۔ تو اس نے کہا، ڈان جو آن بات یہ ہے کہ زندگی میں بہت سارے مشکل سوالات سامنے آ جاتے ہیں، ان کو کیسے حل کیا جائے۔ اس نے کہا کہ مشکل سوال تو آنے ہی نہیں چاہئیں۔ سوال تو تم خود بنا کر اس میں خود کو پھنسا لیتے ہو۔ سوال کوئی چیز نہیں ہے، لیکن یہ زور دینے لگا کہ صاحب ہم شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتہ ہے۔ خیر ان کا کچھ جھگڑا شروع ہو گیا۔ وہ کہنے لگا، دیکھیں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ میری ایک منگیتر ہے۔ میری اس سے کئی سالوں سے منگنی چل رہی ہے۔ اب ایک اور لڑکی ہمارے درمیان میں آ گئی ہے۔ مجھے اپنی منگیتر بھی اچھی لگتی ہے، وہ بھی اچھی لگتی ہے۔ میں اس کا حل کیا کروں؟ میرے پاس اس کا کوئی حل نکلتا نہیں ہے، اور میں بڑا اچھا آدمی ہوں۔ میری منگیتر بہت اچھی خاتون ہے، اور وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ ڈان جو آن نے کہا، بھئی اگر اتنی مشکل پیش آ جائے تو پھر آپ اپنی موت سے پوچھ لیا کریں۔ ہر آدمی کے ساتھ بائیں ہاتھ پر پانچ فٹ کے فاصلے پر اسکی موت چلتی ہے۔ ہر وقت ساتھ رہتی ہے تو اس کو کہو، اے موت تو اب بتا اب کیا کریں؟ تو اس نے کہا، کیا وہ جواب دیتی ہے۔ اس نے کہا ہاں پہلے تو آپ کو احساس کے ذریعے سے پتا چلے

گا۔ پھر جوں جوں آپ کے ساتھ رابطہ گہرا ہو جائے گا، تو وہ بات بھی کرے گی آپ کے ساتھ، آواز بھی آئے گی۔ تو وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کیسے موت اس کے ساتھ بات کرتی ہے۔ خدانخواستہ کسی کی موت پیچھے رہ جائے۔ کہیں اچھرے میں، انارکلی میں اور آدمی آگے نکل جائے اور ایکسیڈنٹ ہو جائے تو وہ چیخیں مارے گا کہ میرا کوئی بندوبست کرو۔ بہت اچھی بات ہے۔ Logical وہ کہتا ہے کہ پھر ان کی بات آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگی تو زندگی کے بارے میں نہ عرض کر رہا تھا کہ اس بُنت اس طرح سے آتی ہے۔

میری ایک بھانجی تھی بڑی دیر کی بات ہے۔ اس کو اپنے دادا سے بڑا پیار تھا۔ ہوتا ہے پوتیوں کو اپنے دادا سے پیار تو، دادا اس کے سیر کرنے جاتے تھے۔ اچانک فوت ہو گئے، تو اس کو بڑا صدمہ ہوا۔ اکیلی بیٹھی رہتی تھی۔ ذرا زیادہ ہی پریشان رہتی تھی، تو ایک دن اس کے گھر کی ملازمہ نے کہا "منی تیرا دادا کہاں گیا"۔ اس نے کہا میرے دادا روز صبح سیر کو جاتے تھے تو میرے دادا اور اللہ میاں اکٹھے سیر کیا کرتے تھے۔ بہت لمبا چکر لگایا تو میرے دادا تھک گئے، تو اللہ میاں نے کہا، اب تم واپس کدھر جاؤ گے۔ تم میرے گھر میں ہی رہ لو۔ ریسٹ کر لو تو میرے دادا وہاں ریسٹ کر رہے ہیں۔ تو اللہ ان کے بڑے دوست ہیں۔ اتنی گہری بات اس نے کہی، بڑی عجیب و غریب بات کر دی، تو یہ مشرق کے لوگ بات کرتے

ہوئے مانتے ہیں کہ موت زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔

میں ۱۹۴۸ء میں پڑھتا تھا گورنمنٹ کالج میں۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا، اور قائداعظم ابھی زندہ تھے تو کالج میں ممتاز مفتی آیا۔ سائیکل ہاتھ میں پکڑے ہوئے تو مجھے کلاس سے باہر بلا کر کہنے لگا، تم فارغ ہو؟ میں نے کہا، کالج سے فارغ ہونا کوئی ایسی بات نہیں۔ اس نے کہا ذرا چلتے ہیں۔ میں آیا ہوں پنڈی سے کہ مجھے خبر لینی ہے ایک بزرگ کی۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا چلو ہم اکٹھے چلتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے ہم کرشن نگر میں گئے۔ وہاں ایک جگہ تھی "لولی لاج"۔ پرانی وضع کے گھر تھے تو اس کے اندر گئے۔ ایک ذرا سے تاریک کمرے میں ایک بزرگ ایک پرانی وضع کے پلنگ کے اوپر لیٹے ہوئے تھے جس میں شیشہ وغیرہ لگا ہوتا تھا۔ وہ بزرگ کافی تکلیف میں نظر آتے تھے۔ ان کی چارپائی یا پلنگ کے گرد ان نے دوست بیٹھے ہوئے تھے، جو مسجد میں دوست بن جاتے ہیں۔ زندگی میں ایک تو آپ کے دوست وہ ہوتے ہیں، جو آج کل ہیں۔ ایک وہ جب آپ ریٹائرڈ ہوں گے تو پھر آپ دور ہو جائیں گے ان قریبی دوستوں سے تو اس وقت ہمارے سیانے یہ رائے دیتے ہیں کہ جب آپ ریٹائرڈ ہو جائیں تو کم از کم اس وقت مسجد میں جانا شروع کر دیں اور وہ ایسا قیمتی مقام ہوتا ہے کہ آپ کی نئی Friendship ڈویلپ ہوتی ہے جو اس سے پہلے

کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے نائ دوستی پیدا کریں اور نئ دوستی کا پیدا ہونا بڑی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ خیر وہ دوست تھے۔ سامنے ان کی بہو اور بیٹا کھڑے تھے۔ بہو بڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ تو ممتاز مفتی نے جا کر کہا میں ممتاز ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہاں میں نے پہچانا ہے۔ ممتاز مفتی کہنے لگے، آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ کہنے لگے، میرے گردوں نے کام بند کر دیا ہے۔ یہ مکمل طور پر فیل ہو گئے ہیں، اور میر الیور جو تھا، اس کا ایک چوتھائی حصہ کام کرتا تھا، اب وہ بھی کام نہیں کرتا اور سانس جو ہے میری وہ ٹھیک ہے۔ ہاں دل بھی ٹھیک ہے۔ لنگز کے اندر جو ریشہ ہے وہ منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ از روئے شریعت (مجھے لفظ ان کے یاد ہیں) یہ حکم ہے کہ جو کوئی تم سے احوال پوچھے تو جزئیات کے ساتھ بیان کر دو۔ یہ میں نے جزئیات کے ساتھ آپ کو بیان کر دیا۔ ویسے میری کیفیت اللہ کے فضل سے بہت اچھی ہے۔ واقعی میں ٹھیک ہوں، جو کچھ گزر رہا ہے، میں اس پر راضی ہوں، لیکن چونکہ حکم ہے بتا دو تو میں نے بیان کر دیا۔ تو وہ بہو جو کھڑی تھی۔ بے چاری نرم دل لڑکی وہ رونے لگی۔ وہ کہنے لگے تم گھبرایا مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔۔

میں ینگ تھا اس وقت Sixth Year میں پڑھتا تھا۔ مجھے بہت گھبراہٹ طاری ہوئی۔ ایک آدمی کو اس طرح سے لیٹے ہوئے دیکھ کر اور اس کو جاتے ہوئے

دیکھ کر۔۔۔ باقی لوگ جو تھے حوصلہ مند لوگ تھے۔ وہ کہنے لگے نہیں شیخ صاحب! انشاء اللہ تعالیٰ آپ ٹھیک ہوں گے۔ کہنے لگے ہاں کیوں نہیں میں ٹھیک ہوں۔ پھر انہوں نے ذرا سا اونچے ہو کر وہ جو ڈھو ہوتی ہے اس کا سہارا لے کر کارنس کے اوپر رکھی ہوئی اپنی پگڑی، کلاہ کو ہاتھ سے اٹھالیا، اور اٹھا کر اس پگڑ کو سر پر رکھ لیا، بڑی اچھی وہ پگڑی باندھی ہوئی تھی سر پر رکھ کر بیٹھ گئے، اور سب کو ایسے دیکھنے لگے تو میں بھی کھڑا تھا۔ ممتاز مفتی کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہنے لگے، اچھا جی السّلام علیکم، السّلام علیکم۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ دوستوں سے میں بھی شامل تھا ان میں۔ تو کہا، اچھا جی صاحبزادے السّلام علیکم، اور پھر ڈھو لگائی، اور پگڑی بندھی ہوئی، ویسے کے ویسے آنکھیں بند کر لیں اور خوشی کے ساتھ برضائے ذات چلے گئے۔ بالکل کوئی جھگڑا نہیں، کوئی کچھ نہیں۔ تو چونکہ میں متجسس Curious تھا، نوجوان تھا۔ میں نے کہا یہ پگڑی ان کی ایسے پھنسی ہوئی ہے۔ اتار دیں تو ان کے جو دوست تھے کہنے لگے، نہیں نہیں۔ میں نے کہا، جی یہ پگڑی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ کہنے لگے، یہ موت کی تقدیس کے طور پر اس کی عزت افزائی کے لیے، ننگے سر برا لگتا ہے۔ اب وہ آ رہی ہے تو اچھا نہیں لگتا، اس لیے مشکل سے اٹھا کر انہوں نے سر پر لے لی ہے۔ یہ ساری باتیں ہو چکیں، تو اب جہاں سے بات چلی، وہ میں آپ سے عرض کروں کہ وہ معروف نظم آپ بھی

جانتے ہیں ہم بھی جانتے ہیں، یہ جو ہم اور آپ سب پڑھا کرتے تھے کہ :

"تاج تیرے لیے ایک مظہر الفت میں سہی، تجھ کو اس وادی رنگین سے عقیدت ہے۔ میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو۔۔۔ یہ تو تاج محل میں ہمیں مل لیتی ہے۔ یہ تو نہیں ہے وہ مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا۔ یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا یہ محل، یہ منعکس درودیوار، یہ محراب یہ طاق" (جب تک تو ہمیں زبانی یاد آئی، آج بھول گئی) اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق، میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو۔ تو صفائی کرتے ہوئے یہ نظم پڑھتے ہوئے، جو میں نے آج سے ۴۰-۴۵ سال پہلے پڑھی۔ ہم سب نے پڑھی تھی کہ یہ خیال آیا کہ وہ شہنشاہ جو یہاں سے چلا گیا، اور جس نے اپنی محبت کا Symbol ایک خوبصورت سفید پتھر میں محفوظ کر دیا۔ اپنے طور پر، وہ بھی ایک انسان تھا۔ شاعر بھی انسان ہوتا ہے۔ دانش ور بھی انسان ہوتا ہے۔ شاعر نے اس کو اپنے ایک اور اینگل (زاویہ) سے دیکھا اور بادشاہ نے لاشعوری طور پر ایک اور روپ سے دیکھا، اور پرسوں مجھے خیال آیا الماری صاف کرتے ہوئے کہ شاعر جن غریبوں سے محبت کرتا ہے اور جن کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انہیں سوائے اس نظم کے کچھ نہیں دے سکا، اور شہنشاہ جو فوت ہو گیا ہے، اور جو بادشاہ ہے، اور جو Symbol اچھا نہیں

کہلاتا ہے ، وہ اس وقت ہندوستان کو پونے دو ارب ڈالر سالانہ دیتا ہے اور آگرے کے ساڑھے تیرہ ہزار گھرانے تاج محل کی وجہ سے اپنی اعلیٰ درجے کی روٹی کھاتے ہیں۔ جن میں فوٹو گرافر بھی ہیں۔ سنگ تراش بھی ہیں، نقاش بھی ہیں۔ پیتل کے وہ برتن جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں، وہ بھی بناتے ہیں، تو آج ایک اور اینگل سے مجھے یہ بات یاد آئی کہ ہم شاعر، دانش ور اپنی جذباتی کیفیت میں ہر ایک بات کرتے چلے جاتے ہیں، اور ہندوستان کو بڑا ناز ہے اپنی فلم انڈسٹری پر، یہ اس کے لیے فارن ایکسچینج مہیا کرتا ہے، ہر سال آپ نظم لکھ سکتے ہیں کہ جذباتی بہت اچھی ہوتی ہے۔ میں وہ نہیں کہتا۔ میں اپنے ایک نئے زاویے، نئے رُخ کی بات عرض کر رہا ہوں۔ غریبوں کو اتنا پیسہ مل رہا ہے، وہاں پر، اور آگرے اور اس کے گرد و نواح کے لوگ اتنے مزے سے ایک تاج محل کی وجہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سینکڑوں سالوں وہ ایک صدقۂ جاریہ ہے جو اس بندے نے سچ مچ محبت کرنے والے نے، سچ مچ ایک شخص سے محبت کرنے والے۔ وہ اس کی بیوی ہو، کچھ ہو، اس کے جواز سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا کی۔ جس سے کئی غریبوں کی کفالت ہو رہی ہے۔

آپ کے لیے بھی سوچنے والی بات ہے۔ چلا میں کہاں سے تھا اور پہنچ کہاں گیا۔ یہ بڑی عجیب و غریب چیزیں ہوتی ہیں۔ بڑی مہربانی آپ تشریف لائے۔ میں تو

اپنی الماری صاف کرتا ہوا، ایک یاد لے کر آ گیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں
اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا
فرمائے۔ اللہ حافظ۔

شیئرنگ

میرے اس پروگرام پر جہاں اور بہت سے اعتراض ہوتے ہیں، خاص طور پر ایک بات جو بار بار کہی جاتی ہے اور پوچھی جاتی ہے کہ آپ کے جو مہمان ہوتے ہیں وہ خود سے کوئی بات نہیں کرتے یا آپ انہیں کہنے نہیں دیتے۔ تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ میں کہنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ میں اپنی داستان گوئی ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ٹاک شو نہیں ہے، ڈسکشن شو نہیں ہے۔ اسے ایک اور انداز میں ہم نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسی انداز میں چلے تو بہتر ہے۔ اگر آپ اس میں تھوڑی سی آرزو بھی رکھتے ہیں کہ آپ کو شامل کیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں ایسے کیا تھا۔ آج میری آرزو ہے۔ ردِّ عمل کے طور پر یہ چاہوں گا کہ کچھ سوال آپ سے پوچھوں، میں ہی بات نہ کرتا رہوں۔ ہمارے یہاں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس سے نکلتے ہوئے اگر آپ، ایک علاقہ ہے ماڈل ٹاؤن، اس کی طرف جائیں تو راستے میں ایک مقام پر جہاں بڑی تیز رفتار گاڑیاں جا رہی ہوتی ہیں، کچھ جھگیاں ہیں، ان میں جو لوگ وہاں رہتے ہیں، میں کبھی کبھی ان سے کچھ بات کرتا ہوں کیونکہ بہت ساری کہانیاں مفت ہی معلوم ہو جاتی ہیں۔ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہاں پر

ایک ماسی عمری ہے، جو بڑی دانشور، دیدہ ور قسم کی خاتون ہے۔ وہ بڑی اچھی باتیں کیا کرتی ہے۔ تو ان سے میں تھوڑے دن ہوئے ملا تھوڑی دیر کے لیے۔ تو ان سے ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہوئی، جس پر میں غور کرتا رہا، لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا، جیسی کہ میری آرزو تھی کہ پہنچ جانا چاہیے۔ فی الحال یہ بات عرض کرنی چاہ رہا تھا کہ جو عطا ہے Giving، ڈونیٹ کرنا کسی کو، الحمدللہ ہمارے پاکستان میں اس کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، اور لوگ بڑے مخیر ہیں، وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر بھی اس میں حصہ لیتے ہیں، اور وہ دیتے ہیں لوگوں کو، ضرورت مندوں کو، محتاجوں کو۔ لیکن ایک چیز ہوتی ہے سانجھ یعنی Sharing۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ شیئرنگ کی طرف آدمی راغب نہیں ہوتا۔ میری بیوی کہتی ہے، آج مجھے ایک خوفناک خواب آیا ہے، تم یہ پیسے لے جاؤ، صدقے کا بکرا وہاں سے لو، اور ذبح کراؤ اور دے آؤ۔ اور اگر کوئی شخص آ کر شیئرنگ کی بات کرے کہ میرا یہ دکھ ہے اور اے اخبار والو میرا دکھ سنو، اس کو چھاپو مت، کچھ مت کرو، لیکن میرا بوجھ ہلکا تو ہو، وہ کہتے ہیں شیئرنگ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم آپ کو کچھ دے دلا سکتے ہیں لیکن شیئرنگ کا کام نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اس کائنات میں جتنے بھی جاندار ہیں، وہ اللہ نے شیئرنگ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں یہ شیر، چیتا، پرندے، درخت، پودے یہ سب اسی

کائنات میں اسی کرۂ ارض پر رہ کر ہمارے ساتھ شیئرنگ کرنے، سانجھ بٹانے کے آرزومند ہیں۔ اس میں ایک بڑی حیرانی کی بات یہ ہوئی منظور صاحب (ہال میں ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) کہ جو جانور تھے، جو درندے تھے، جو چوپائے تھے۔ انہوں نے تو شیئرنگ میں پورا ساتھ دیا ہمارا۔ آپ غور کریں، لیکن انسان نے ان کے ساتھ شیئرنگ میں سانجھ میں وہ سلوک نہیں کیا جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیے تھا۔ یعنی ایک معمولی سے ہاتھی دانت کی خاطر، اتنے بڑے ہاتھی کو مار دیتے ہیں، اور بے دریغ مارتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ڈسپوزل کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ اب روتے چیختے پھرتے ہیں کہ شیر جو ہے، Tiger جو ہے، اور لائن جو ہے، یہ کم ہو رہا ہے اس کو بچایا جائے۔ لیکن ایک وقت تھا کہ بے دریغ گورے نے خاص طور پر اسے قتل کیا، اور ختم کیا۔ پانڈا ایک جانور بڑا پیارا قلابازیاں لگانے والا بدھو سا، اس کو بالکل ختم کر دیا۔ تو انسان نے شیئرنگ کا فن نہیں سیکھا، اور اب لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے میں بھی وہ شیئرنگ کی طرف نہیں آتا، نہیں آنا چاہتا۔ یہ ایک بڑے المیے کی بات ہے، جنگل تھے بہت گھنے۔ خوبصورت اعلیٰ درجے کے جو آپ کے حسن میں، اور آپ کے کرہ ارض کی تقویت کا باعث تھے، اسے کاٹ کاٹ کر صاف کر دیا۔

میں پہلی مرتبہ جب امریکہ گیا ۱۹۶۳ء میں، تو صبح اٹھ کے میں نے اخبار لیا نیویارک ٹائم۔ وہ میں لے کے چلا تو مجھے ایک لڑکی کہنے لگی۔ hay, you will take rest of it تم تو بیچ میں سے اتنا اٹھا کر لے چلے ہو تو میں نے کہا باقی کچھ اور بھی ہے۔ اس نے کہا تم تو سارا اخبار چھوڑے جا رہے ہو۔ کوئی تقریباً ۲۷۰ صفحے کا اخبار Sunday Edition چھپتا ہے وہاں۔ تو میں تو اسے اٹھا بھی نہ سکا، چونکہ میں پہلی منزل پر تھا اس لیے میں کندھے پر رکھ کر چلا، اور وہاں پہنچ گیا۔ پھر میں نے اسے پھیلا کے دیکھا۔ یا اللہ میں یہ کہاں سے پڑھنا شروع کروں؟ تو سیانے آدمی سے پوچھا کہ بھئی اس اخبار کو کیسے پڑھیں۔ اس نے کہا، یہ سارا نہیں پڑھا جاتا جو خواتین ہوتی ہیں وہ نکال لیتی ہیں کھانے پکانے والا حصہ۔ جو کپڑے سینے والے ہوتے ہیں وہ اپنا حصہ، وہ اپنے ایتھلیٹ جو ہوتے ہیں، وہ اپنے سپورٹس کا سیکشن نکال لیتے ہیں۔ بہت کچھ ہے پڑھنے کو تو وغیرہ وغیرہ۔ میں بڑا حیران ہوا لیکن میں نے سوچا، میں ان کو فون کر کے پوچھوں۔ میں آپ کا دفتر دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا چلے آیئے۔ جب میں گیا تو میں نے ان سے پوچھا، یہ جو آپ اخبار کا Sunday Edition چھاپتے ہیں۔ اس پر کتنا کاغذ خرچ آتا ہے، تو انہوں نے کہا، ہمارے سنڈے ایڈیشن پر تقریباً ۱۰ ایکڑ درخت کٹتا ہے۔ تو پھر اس کا پلپ بنتا ہے، اور پھر اس پر چھپتا ہے۔ ایک انفارمیشن دینے

کی خاطر جو میں سمجھتا ہوں، اتنی اعلیٰ پائے کی انفارمیشن بھی نہیں ہے، جو انسان کو وہ کچھ عطا نہیں کرتی جو انسانیت کا شرف ہے۔ اتنا سارا کاغذ پلپ کی صورت میں بنا کر درختوں کو کاٹتے چلے جاتے ہیں۔ تو پھر میرے تجسس اور تحقیق کا دائرہ بڑھا، تو ٹائم نیوز والوں کا کاغذ بڑا تھِن Thin ہوتا ہے، اور خاص قسم کا۔ انہوں نے کہا، ہم اپنا کاغذ خود بناتے ہیں۔ اب چونکہ جنگل ختم ہوتے جا رہے ہیں اس لیے ہم نے ایسے Ship بنا لیے ہیں جن کے اوپر پلپ بنا کر کاغذ تیار کرنے کے کارخانے ہیں، اور دنیا کے ہم ایسے علاقوں میں شِپ لے کر گھومتے رہتے ہیں جہاں جنگل قریب ہوں، وہاں سے کاٹ لیں۔ پھر یہی اخبار والے رونے لگ گیے ہیں کہ خدا کے واسطے اس کرۂ ارض کو بچایا جائے۔ اس میں بڑی پولیوشن pollutionہورہی ہے۔ اس کی لیئر Layer جو ہے وہ پھٹ گئی ہے۔ یہ سب کچھ انسان ہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ دردناک قصہ بڑی دردمندی سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ ہم عطا کرنے میں تو شیر ہیں لیکن شیئرنگ کرنے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ قدرت کے بڑے مظاہر ہیں، جو بڑی طاقتیں کہ لیں۔ ان کو ہم سب شیئر کرنے پر مجبور ہیں۔ چاند ہے، سورج ہے، ستارے ہیں، ہوا ہے، آسمان ہے یہ سارے ہم شیئر کرتے ہیں، کیونکہ اللہ کی مہربانی ہے۔ اگر خدا نخواستہ ان پر ہمارے قبضے ہونے شروع ہو جائیں، جیسا کہ ہو رہے ہیں۔ بڑے

فخر سے کئی دفعہ ہم نے لکھا ہوتا ہے کہ کائنات کے اوپر ہم کمندیں ڈال کے اس
کو اب تسخیر کرنا ہے، کائنات نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ اسے تسخیر کریں
گے۔ کیا کریں گے تسخیر کر کے۔ یہ کہا جائے ہم اس کے ساتھ ایک دوستی کرنا
چاہتے ہیں۔ اک محبت کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے ساتھ انسانوں کے
ساتھ بھی آدمی محبت کرے۔ اور انسان اگر غور سے دیکھے تو سب سے بڑی چیز
جو وہ سانجھ میں رکھتا ہے، وہ اس کا تنفّس ہے، سانس ہے۔ میں جو سانس اس
وقت لے رہا ہوں، یہ غالباً چلتا چلتا کسی جنگل میں پہنچتا ہے۔ کسی ہاتھی، کسی مگرمچھ
کا حصہ بنتا ہے۔ اس کا تنفّس آیا ہوا یہاں پہنچتا ہے۔ ایک تعلق ایک
Relatedness کی بات ہوتی ہے، انسان ایک انسان سے ٹوٹ کر، بکھر کر
پریشان و حیران ہو رہا ہے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ سب کچھ کیا ہو رہا
ہے۔ اور باوجود اس کے وہ بڑی گہرائی کے ساتھ، اور گہرائی سے ساتھ اپنے
مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک مسئلے کا جو ہمارے بزرگانِ دین صوفی
کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑے صاحبِ حال بزرگ تھے۔ مثلاً وہ حال ان پر وارد تھا۔
وہ اس مشکل میں مبتلا ہوئے، اور اس مشکل کو سمجھ کر پھر اس کا حل نکالا کرتے
تھے۔ میں، آپ یا اور پڑھے لکھے آدمی اس مشکل کے اندر داخل نہیں ہوتے۔
میں نے آپ کو پہلے بھی شاید ایک دفعہ بتایا تھا کہ ہمارے بابا جی کے پاس ایک

لڑکی آئی۔ اس کے بازو کے اوپر پھنسیاں تھیں۔ بڑی موٹی موٹی خوفناک قسم کی دوودھیا۔ پیپ سے بھری، تو انہوں نے دیکھا تو کہا، اس کا کرتے ہیں کچھ۔ ایک دن گزر گیا۔ شام کو مغرب کے وقت میں نے دیکھا تو وہ، اور اس کا باپ بیٹھے ہوئے۔ میں نے کہا بابا جی، اس پر کوئی دوائی لگانے والی لگا دیتے۔ تو کہنے لگے، دوائی ابھی ذہن میں نہیں آ رہی۔ میں نے کہا جی کیوں ذہن میں نہیں آ رہی۔ کہنے لگے جب یہ میرا حال ہو گا تو مجھے سمجھ میں آئے گی نا، یہ کیا چیز ہے۔ اب تو یہ میرا حال نہیں۔ میں نے کیا، حال کیا ہوتا ہے۔ کہنے لگے مجھے نہیں پتہ چل رہا بیماری کا۔ تو دوسرے دن ان کے بدن پر ویسی ہی پھنسیاں نکل آئیں، اور ان کی آرزو پوری ہو گئی۔ پھر انہیں پتہ لگا۔ یہ مرچیں کیسی لگتی ہیں۔ دیکھیں نا، آپ کا کوئی دوست کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے، تو آپ کو محض کتابی سا اندازہ ہوتا ہے کہ سر درد ہے لیکن وہ جس کیفیت سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کیسا ہے۔ جب تک آدمی اس سانچھ میں داخل نہیں ہو گا تب تک وہ صاحبِ حال نہیں بنے گا۔ مجھ پر ہنستے ہیں۔ میرے بچے یہ سارے پڑھے لکھے ہیں، گھر میں بھی اور باہر بھی۔ یہ آپ کیا بات کرتے ہیں صاحبِ حال کی۔ زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ سائنس کہیں پہنچ گئی ہے۔ کلوننگ ہو گئی۔ بھیڑ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس نے دو بچے بھی دے دیئے ہیں، اور آپ ابھی تک وہیں پھنسے بیٹھے

ہیں بابوں کی بات کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں، کلوننگ بھلے ہوتی رہے۔ سائنس آپ کی آگے بڑھتی رہے، لیکن انسان کا رشتہ قدرت کے ساتھ، اور روح کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آئے گی نہیں۔

اللہ نے جو قوانین طے کر دیئے ہیں جو اللہ کی سنت ہے اس کے مطابق کام چلتا رہے گا۔ بڑے بڑے معاشروں کی زندگی میں دن آتے ہیں جو وہ مناتے ہیں، وہ دن اس وقت تک نہیں منایا جا سکتا جب تک سب کی شیئرنگ نہ ہو۔ یہ نہیں کی ایک آدمی کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہو کر کہے، جناب ہم نے یہ کام کر دیا ہے، یا توپ چلا دی ہے۔ عید آتی ہے نا، اگر صرف آپ کا ہی گھرانا عید منائے۔ بہت اچھے کپڑے پہنے، اور باقی کے لوگ اس میں شامل نہ ہوں، تو پھر وہ عید نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے اسی طرح سے کوئی اور دن آ جائے بڑا خوبصورت، ۱۴ اگست کا آپ مناتے ہیں۔ بازار میں نکلتے ہیں وہاں Display ہوتی ہے۔ تو جبھی ہوتی ہے جب اس کو سارے مل کر کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایسے دنوں کو آپ عطا کے حوالے کر دیں کہ جاؤ تم میری طرف سے دیکھ کر آؤ کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہاں آپ کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ اب مثلاً دیکھیے اب ہمارا یہ ۲۸ مئی کا دن ہے (اس دن پاکستان نے ایٹمی دھماکے کئے تھے)۔ کتنا بڑا دن ہے، لیکن یہ سارے کا سارا سائنس دانوں یا ٹیکنالوجیز کا دن نہیں ہے۔ پوری قوم اس میں

شامل ہے۔ آپ کا، سب کا ہے۔ ان لوگوں کا بھی ہے، جنہوں نے اتنی گہری سرنگ کھودی۔ ان لوگوں کا بھی جو بڑھئی اور ترکھان، ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ وہ ویلڈر جن کو ہم نہیں جانتے جن کو ضرورت ہوتی ہو گی، وہ بھی اس میں ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ چلیے وہ تو وہ ہو گئے، ہم ان کو سلام کرتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے آپ کو بھی سلام کرتے ہیں کہ ہم چودہ کروڑ آدمی اس آرزو میں، اور اس دعا میں برابر کے شریک تھے، اور یہ کارنامہ ہمارا کارنامہ ہے، اور ہم اس میں چلے آ رہے ہیں۔ اچھا یہ تو ہوا ایک بہت بڑا کارنامہ، ایک بہت طاقتور کارنامہ ہے، اور جس نے پوری دنیا کو دہلا کے رکھ دیا، اور ہمارا سر فخر سے اونچا کیا۔ اس کی دھمک چاغی میں سے ہوتی ہوئی واشنگٹن ڈی سی کی اس جگہ گئی، اس مشین کے اوپر جس نے واضع طور پر بتایا کہ اس کی طاقت اتنی ہے، اور اس کا حجم ایسا ہے، اور اس کی ماہیت ایسی ہے۔ تو یہ بات طے پا گئی۔ اس میں ہم سب شریک ہیں۔ بہت بڑی طاقتور چیز جو ہو، وہی آپ کو Unite کر دے۔ بہت ہی کمزور چیز، اور بہت ہی دھیمی چیز شوال کا چاند ہوتا ہے، کبھی نظر آتا ہے کبھی نظر نہیں آتا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے، اور سب دیواروں پر چڑھے، کوٹھوں پر چڑھے اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں نا۔ تو وہ کھڑے ہو کے دیکھتے ہیں، اور وہ بڑا دھیما سا ہوتا ہے، وہ بھی ہمیں تقویت عطا کرتا ہے۔ یہ شیئرنگ کی برکت ہے۔

اگر یہ سانجھ نہ ہو تو یہ کوڑی کے کام کی نہیں ہے، اور نہ رہ جاتی ہے۔ صرف عطا کرنا اور دینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ پانچ ہزار روپے ہیں، دے آؤ۔ یہ اتنا ہے، سکول کو دے دو۔ یہ اس کو چندہ دے دو۔ ٹھیک ہے لیکن چندے کے ساتھ رہنے والے اور لوگ بھی ہیں، جو یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ آئیں، اور ان کو دیں، ہم کو یہ تقویت حاصل ہو، اور ہم کو یہ عزت ملے کہ ہم سب مل کر یہ کام کریں۔

تو میں جو یہ عرض کر رہا تھا کہ وہ سڑک جس سے میں کبھی کبھی گزرا کرتا ہوں، وہاں جو ماسی عمری ہے، وہ مجھے بتا رہی تھی۔ چار پانچ دن ہو گئے ہیں۔ تم لوگ بڑے خوش ہو، اور تمہاری جھگیوں میں یہ بڑے بڑے ڈبے پڑے ہیں۔ تو اس نے کہا، یہ شیخ صاحب نے بھیجے ہیں۔ تو کہنے لگی، جی ان میں سوغاتیں ہوتی ہیں۔ تحفے ہوتے ہیں اور بھی خواتین آکر اکٹھی ہو گئیں۔ کہنے لگی، اللہ بھلا کرے شیخ صاحب کا، بڑے اچھے آدمی ہیں۔ پھر کہنے لگی، بابا جی ہم نے کبھی شیخ صاحب کی شکل نہیں دیکھی۔ کبھی آج تک نہیں دیکھا، کون ہیں جب انشاء اللہ ہم فوت ہوں گے، اور شیخ صاحب بھی فوت ہوں گے، تو پھر وہاں جا کے ان سے ملیں گے۔ فوت ہوئے بغیر شیخ صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم یہ آرزو لیے بیٹھے ہیں مرنے کی۔

تو یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہم نہ صرف شیئر نہیں کرتے، کھانے نہیں کرتے، ہم نفسا نفسی میں کیوں مبتلا ہیں؟ آج میں آپ سے یہی پوچھنے آیا تھا، اب میں آپ سے ضرور پوچھوں گا، اس لیے کہ آپ مجھ پر الزام دیتے ہیں کہ آپ ہی بات کیے جاتے ہیں۔ ہم زیادہ بہتر بات کر سکتے ہیں۔ یقیناً آپ زیادہ بہتر بات کر سکتے ہیں۔ یہ بتائے کہ کیا ہم لوگ عام لوگ، ساری دنیا کے لوگ، ساری دنیا کے لوگ سوچنے میں سمجھنے میں غور کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے۔

بالکل رکھتے ہیں لیکن ہم چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ چیز میں مکان بھی ہے، پیسا بھی ہے، ٹی وی بھی ہے، موٹر کار بھی ہے، صرف موٹر کار نہیں، اچھی موٹر کار ہے، اس بہتر موٹر کار، ہم چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تو پھر جو جاندار کے ساتھ شیئر کرنا ہے، اس کا تصور ختم ہو گیا ہے۔

بھاگنا ہی پیدا ہو گیا، یعنی یہی تو مسئلہ ہے۔

آپ کا جو ٹیلیویژن پروگرام ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہی بھگا رہا ہے چیزوں کے پیچھے۔ کیونکہ اس کے پروگرام جو ہیں ان پروگراموں میں جو ٹائم ہے، اس ٹائم میں سے آدھا ٹائم یہی ہوتا ہے کہ آپ فلاں چیز خریدیں۔ فلانی چیز بڑی گلیمرس، اور فلانی چیز میں آپ بڑے حسین لگیں گے۔ ان میں ٹی وی

کمرشل کا بڑا ہاتھ ہے۔ دیکھیے! کیسا اچھا ٹاک شو ہو گیا ہے۔ آپ ان چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، جو آپ کی من چاہی چیزیں ہوتی ہیں، بالکل تمنا کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ نہیں پسند کرتے یا جو آپ کے تفاخر میں اضافی نہیں کرتی ہیں۔ ان چیزوں کو آپ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے کہ جتنی آسانی کے ساتھ ہم نے کہا۔

مذہب سے جو دوری ہو گئی ہے روحانیت سے، بس یہ جو ہم نے چیزوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا ہے۔ میرے اندر جو روح ہے نا اس کا گلا دبا دیا ہے۔

میرے ابا جی تھے، اور میرے دادا تھے۔ ان کی روح کا گلا تو نہیں دبا تھا، اب یہ کیوں دب گیا ہے۔

اس وقت ترغیب کے چانسز، اور مواقع کم تھے، میڈیا کا پھیلاؤ کم تھا۔ اس وقت تعلیم پانا ضروری تھا۔ میں جا کے ٹی وی دیکھتا ہوں، اور ٹی وی پر کسی اچھی چیز کے پراڈکٹ کا اشتہار دیکھتا ہوں، اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے، میں اس کو خریدوں۔

تو کیا لوگ سوچنے سمجھنے، غور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور کیا وہ سوچنے سمجھنے، اور غور کرنے پر اپنے آپ کو مامور کرتے ہیں؟ یہ آج کا سوال ہے۔

لوگ سوچ رہے ہیں دو طرح سے، ایک دائرے کے لوگ ہیں جو لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق سوچنے پر مائل کر رہے ہیں۔ ایک وہ دائرہ ہے، جو ان کے طابع ہو چکا ہے، اور ان کا اسیر ہے، اور جس طرف وہ پہنچانا چاہتے ہیں، اس طرح سے لوگ سوچتے چلے آ رہے ہیں۔ اب اس میں مجھے ایسا لگتا ہے جیسا کمرشلائزیشن، جیسا منظور صاحب بات کر رہے تھے کہ چیزوں کی فیسی نیشن اس قدر ہو چکی ہے۔ ان کے اندر کشش اس قدر ہے کہ وہ مقناطیس کی طرح ہمیں کھینچ لیتی ہے، اور اس معاشرے میں جس میں ہم آج موجود ہیں، اور زندہ ہیں، اس میں مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری کوتاہیوں کے باعث بہت ساری Negative چیزیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ اب ہم لوٹ نہیں سکتے۔

میں لوٹ کر پھر اس طرف آؤں گا، اور بار بار ایک سکول ٹیچر کی طرح رہوں گا کہ کیا ہم سوچنے سمجھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں یا نہیں آپ تو یہ Indicate کر رہے ہیں کہ بالکل ہم سوچتے سمجھتے نہیں ہیں جیسی بنی بنائی چیزیں ہمیں دی جاتی ہیں، ان کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

میں نے عرض کیا اس میں دو طرح کے لوگ ہیں

بات بالکل آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ ایک بندہ تو آپ کو بھگاتا ہے، اب آپ،

اور باقی نوے ننانوے فیصد لوگ اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، تو وہ نہیں سوچتے ہیں، تو پھر وہ ایک فیصد والا بھی نہیں سوچتا ہے۔ کیونکہ وہ تو غرض مند آدمی ہے۔ وہ سوچ والا آدمی نہیں ہے۔ اس کو ایک چاہت ہے۔ غرض کا بندہ ہے۔ ڈاکٹر عاصم کا میں ذکر کر رہا تھا، سائیکالوجسٹ کا۔ وہ کہتا ہے کہ کچھ لوگ سوچنے سمجھنے کی آرزو نہیں رکھتے۔ بیشتر وقت شطرنج کھیلنے میں، تاش کھیلنے میں گزارنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گاڑی لے کر گھومنا شروع کرتے ہیں، اسّی نوّے میل بلا مقصد گھوم جاتے ہیں، اسی بلا مقصدیت کے اندر انسان جو ہے، وہ اپنے آپ کو گم کرتا چلا جا رہا ہے، میں آپ کو یہ ایک لمحہ فکریہ دے کر جا رہا ہوں کہ اب آپ نے کل کیا کرنا ہے۔ کیا اپنی سوچ کو لے کر چلنا ہے، یا بنی بنائی سوچ کے انتظار میں صبح آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کے دروازے پر سے سوچ کو اٹھانا ہے، جیسی کہ آپ کو فیڈ کر دی گئی ہے، اور اس کو حرزِ جان بنا لینا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور اللہ آپ کو بہت آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسان کو شرمندہ نہ کیا جائے

آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

کئی دفعہ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی قصوروار نہیں ہوتا لیکن وہ مجرم، قصوروار گردانا جاتا ہے، پکڑا جاتا ہے۔ زندگی میں ایسی باتوں سے اگر ہم زیادہ شدید نہ ہوں، سنجیدہ نہ ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ اس میں میرا کوئی عمل دخل ہی نہیں تھا تو میں کیسے پکڑا گیا۔

ہم ڈیرے پر حاضر تھے تو پانچ پڑھے لکھے، اچھے، شریف، ذہین، دانش مند لوگ جو وہاں موجود تھے، وہ پکڑے گئے۔ بابا جی نے ہماری پیشی کروادی حالانکہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا، اور ہم نے کوئی ایسی خرابی نہیں کی تھی۔ لو جی ہماری سرزنش شروع ہو گئی۔

اصل میں بابا جی کسی بڑے جلسے آئے ہوئے تھے، اور زندگی بھر وہ کسی بڑے جلسے میں نہیں گئے تھے، لیکن ان کا کوئی مرید ہمارے الحمرا ہال میں جو اس زمانے میں بڑا ہال متصور ہوتا تھا، لے گیا۔ وہاں پر ان کو ایک ایسے لیکچرار کا لیکچر سننا پڑا جو بڑی اچھی دردمندی کی باتیں کر رہا تھا، اور پاکستان کو دل و جان سے چاہتا تھا۔

، اور باباجی اس کی باتیں سن رہے تھے۔ لیکن جب سب لوگ سر دھن رہے
تھے، تو اکیلے شاید وہی تھے جو اس کے اوپر ویسی توجہ نہیں دے رہے تھے جیسی
کہ وہ جانی چاہیے تھی۔ اس شخص نے کہا۔ دیکھو! میرے پیارے ہم وطنو پاکستان
بن گیا۔ اللہ کی ہم پر بڑی مہربانی ہوئی ہے۔ یہ خاص عطیۂ خداوندی ہے اور ہم
جتنا بھی اس کا شکریہ ادا کریں، کم ہے۔ اگر یہ پاکستان نہ بنتا تو میں جو اس وقت
آپ کے سامنے کھڑا ہوا، اس وقت ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں، میں یا تو
ایک چپڑاسی ہوتا یا معمولی ایک کلرک ہوتا، اور یہ پاکستان ہی کی وجہ سے ہے کہ
ایسے اونچے مقام پر کھڑا ہوں۔ آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔ بڑی اچھی بات تھی۔
ہم اکثر یہی کہتے ہیں، آپ نے اکثر سنا ہو گا، اب ہم کو انہوں نے بلا لیا، اور قطار
میں کھڑا کر کے کہا، دیکھو پیارے بچو! ایسی بات نہیں کرتے۔ ہم نے کہا اگر اللہ
ہمیں موقع دے، ہم بھی ضرور ایسی ہی بات کریں گے۔ کچھ بہت اچھے اچھے
رتبے پر ہیں، اور جا رہے ہیں تو ہمیں یہی کہنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ خبردار
جس شخص نے یہاں رہ کر ذرا سی بھی تربیت حاصل کی ہے، میں اس کو یہ بات
کہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ سر یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو
بہت اچھی بات ہے، اور اس کا اعلان عام ہونا چاہیے، اور ہم پاکستان کی سارے
شعبوں کی بات سن رہے تھے، وہ شرمندہ ہو رہے تھے کہ یہ اس مقام پر پہنچ گیا

پاکستان بننے کے بعد، جبکہ ہم ویسے ہی چھوٹے مقام پر ہیں۔ ان کے دل پر کیا بیتی؟ باباجی کو دل کا بہت خیال تھا، اور آدمی کا بہت خیال تھا، ترقی کا، سائنس کا، یا رتبے کا بالکل نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات کہنا، اور اپنے ہم وطنوں کو اپنے قریبی عزیزوں کو شرمندہ کرنا جو ہے، بڑا ہی قبیح فعل ہے، اور پھر وہاں پر رہنے کے بعد ایک اور بات کا اس میں اضافہ ہوا۔ ایک اور بات کا، وہ یہ کہ ہم بڑی سختی سے منع کیا گیا کہ چونکہ آپ ایک ایسے مقام پر رہتے ہیں جہاں روحانیت کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو اگر تم میں سے کسی کو خوش نصیبی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زیارت ہو خواب میں، وہ ہرگز ہرگز کسی دوسرے سے ذکر نہ کرے، یعنی اتنا بڑا رتبہ اتنی بڑی سعادت اور یہ حکم دیا جارہا ہے کہ ہرگز یہ بات نہ کریں۔ چونکہ ہم بولتے نہیں تھے۔ تو ہم نے کہا، بہت بہتر لیکن یہ بات ہمارے دل میں رہی، اور تجسس پیدا ہوا۔ ایک دن گزر گیا دو دن گزر گئے۔ میں جو بہت بے چین تھا کہ اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے اور تھوڑا سا میں منہ چڑھا بھی تھا۔ میں ان سے ڈرتے ڈرتے بہت سی عجیب و غریب باتیں بھی پوچھ لیتا تھا۔ میں نے کہا، حضور یہ بتائیے کہ اس دن یہ بات کی تھی کوئی ایک ہفتہ ہوا کہ اگر کسی خوش نصیب کو زیارت نصیب ہو حضور پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تو اس کا ذکر نہ کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ جو سننے والے ہوں گے۔ وہ بہت خفت محسوس کریں گے کہ

دیکھو یہ آدمی بڑا خوش نصیب ہے۔ اس کو تو زیارت ہو گئی، ہم بڑے کم نصیب لوگ ہیں۔ ہم میں کوئی نہ کوئی خرابی موجود ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں اتنا بڑا یہ اعزاز اور شرف حاصل نہیں ہوا۔ خبر دار کسی کو شرمندہ کرنا تمہارا شعار نہیں ہے۔ اگر تم آدمی کو شرمندہ کرو گے، تو تمہارا یہاں آنا محدود ہو جائے گا، اور آپ کے Rights ریزرو ہو جائیں گے۔ خواتین و حضرات! ہم تو اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے اپنی ذات کا چوگا دیتے رہتے ہیں، اپنا میک اپ کرتے رہتے تھے۔ اور حکم ہے کہ خبر دار دوسرے بھی لوگ تمہارے ساتھ رہتے ہیں، باقی کے بارہ کروڑ جتنے بھی آدمی ہیں، ان کو شرمندہ کرنا آپ کا منصب نہیں۔ آپ اس دنیا میں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ آپ لوگوں کو خفیف کریں، ان کو شرمندہ کریں۔ یا باعث بنیں ان کی نکبت کا، ان کی خجالت کا۔ تو اس ٹریننگ میں سے گزرتے ہوئے بڑے سال لگے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ ٹریننگ پوری نہ ہو سکی۔ چونکہ ڈیرے کے باہر جو عمل چل رہا تھا۔ وہ استکبار کا عمل تھا، تکبّر کا عمل تھا، اور ہماری ساری کی ساری قوم تکبّر کی راہ پر گامزن تھی۔ اور تکبر سے ہر وہ شخص اپنی ذات کا ہو کر رہ گیا تھا، اور مجھے رہ رہ کر ایک ہی خیال آتا تھا کہ کسی زمانے میں ایک رنگین کارٹون دیکھا تھا سینما میں۔ کہ ایک کشتی ہے۔ وہ سمندر کی لہروں پر چلی جا رہی ہے، اور اس میں آٹھ آدمی سوار ہیں۔ چار ادھر بیٹھے ہیں،

اور چار اس کے آگے نوک کے اوپر، تاکہ کشتی کا وزن، اور توازن برابر رہے۔ اچانک جو آگے کا حصہ ہے، اس میں سوراخ ہو جاتا ہے اور تیزی سے پانی اس کے اندر داخل ہونے لگتا ہے اور کشتی بھرنے لگتی ہے۔ تو جو پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی تھے، ان میں ایک اٹھتا ہے ایک ڈبا لے کر، اور وہ چاہتا ہے کہ پانی نکال دے تو دوسرا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے خبردار! سوراخ ان کی طرف ہوا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے اس کام میں، وہ جانیں یا ان کا کام جانے۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔ وہ واقعی آرام سے بیٹھ جاتا ہے، تو کبھی کبھی اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے، وہ کارٹون یاد آجاتا ہے۔ اس پروگرام میں میں تو صورتِ حال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ہماری زندگی میں یہ داخل نہیں ہوا تھا کہ دوسرے آدمی کو شرمندہ کرسکیں۔ آپ کے ملک میں دیکھیے، اتنی اتنی بڑی خبریں چھپتی ہیں کہ ہمارا ملک اس وجہ سے ترقی نہیں کرتا کہ اس میں پچاس فیصد لوگ جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ میں ان سے بڑی درخواست کرتا ہوں۔ میں نے دفتروں میں بھی حاضر ہو کے کہا تھا، طریقے سے یہ خبر بتایا کریں۔ چونکہ جو آدمی کسی وجہ سے پڑھا نہیں ہے، اس کو کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ میرے ساتھ اس طرح کا ایک واقعہ بھی گزر چکا ہے۔ ڈھاباں سنگھ ایک منڈی ہے۔ دانہ منڈی میں وہاں پر ٹریکٹر سے بوریاں اتار کے مزدور لوگ، وہ منڈی میں پھینک رہے تھے۔ اور

دانہ منڈی کے ایک آڑھتی کا منشی یہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ ہمارے ملک کی بری حالت ہے۔ اس میں ۸۵٪ لوگ ان پڑھ ہیں جو کچھ نہیں کر سکتے، نہ ملک کا بنا سکتے ہیں، نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ جب تک ملک تعلیم یافتہ نہیں ہو گا، اس وقت تک اس کی حالت نہیں بدلے گی۔ وہ اب اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ میری آرزو تھی کہ اگر یہ خبر اونچی نہ پڑھے تو کوئی حرج نہیں، اور وہ جو بے چارے مزدور، کسان بڑے خوب صورت، صحت مند بوریاں اٹھا اٹھا کر نیچے لا رہے تھے، اور وہ گندم آ رہی تھی پور میں، اور وہ گندم میرے گھر میں پہنچ رہی تھی، جس سے مجھے، اور میرے بچوں کو پلنا تھا، جو ہماری زندگی کا سہارا تھی۔ جو انہوں نے بڑی محنت سے، بڑی محبت سے اگائی تھی اور جسے بڑی محنت، اور محبت سے مجھ تک پہنچا رہے تھے۔ ان کو یہ سنایا جا رہا تھا کہ دیکھو تم تو جاہل لوگ ہوتے ہو، اور جاہل جب تک رہیں گے، ہم ترقی نہیں کر سکیں گے۔ میں ضرور چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں علم کی شمع روشن ہو، اور اس کی روشنی دور دور تک پہنچے، لیکن جب تک یہ لوگ شرمندہ کرتے رہیں گے تو آپ کا ملک کمزور ہوتا رہے گا۔

ہر آدمی جاہل تو نہیں ہوتا نا، جاہل ہونا کچھ اور بات ہے۔ یہ ابھی تک معلوم ہی نہیں کہ پڑھے لکھے آدمی کی Definition کیا ہے، کس base پر رکھا جا رہا ہے یا پھر اس کو جو اخبار پڑھ رہا ہے، اس کو پڑھا لکھا کہا گیا ہے، اور پھر یہ بات ہے

کہ ہم ابھی تک یہ کلیئر ہی نہیں کر سکے کہ پڑھنے لکھے آدمی کی Definition کیا ہے۔

یو این او نے ساری دنیا کے لیے پڑھے لکھے کی Definition مقرر کر دی ہے جو شخص حرف شناس ہو۔ اب پ ت کو پہچان سکتا ہو، اور اپنا نام لکھ سکتا ہو۔ اس کو یو این او والے پڑھا لکھا آدمی تصوّر کرتے ہیں۔

پاکستان میں بھی یہی ہے کیا۔

وہ تو ہم U.N.O کے ساتھ چل رہے ہیں نا۔ دنیا کا وہ ادارہ ہے۔

ہر مردم شماری میں یہ بدل جاتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں پیراگراف پڑھ سکتا ہو تو اس کو ہم پڑھا لکھا کہیں گے۔ کبھی کچھ اور ہوتا ہے، کوئی کرائیٹیریا نہیں ہے، ہمارے ہاں۔

دیکھیے ہمارا فورم ڈسکشن کا نہیں ہے، لیکن پڑھے لکھے کی تعریف انٹرنیشنل سطح پر مقرر ہو چکی ہے۔ میرے نزدیک کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بی اے ہے۔ آرمی کے نزدیک پڑھا لکھا آدمی کم سے کم ایم اے ہے۔ ڈاکٹر کے نزدیک کم سے کم پڑھا لکھا .Ph.D ہے، اس طرح یہ تو کام آگے چلتا ہے۔

مشکل یہ پڑ رہی ہے کہ جو پڑھا لکھا آدمی ہوتا ہے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اللہ نے

اس کو بڑی صلاحیت دی ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچتا نہیں ہے۔ ایک سٹیج پر کھڑا ہو کے کہے گا دیکھو پاکستان بن جانے سے میرا رتبہ کتنا بڑھا ہے۔ میں اپنے رتبے کی بات کر تا رہوں گا۔ میرے ذہن میں لاشُعور میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے سننے والے جو کسی بھی رتبے تک نہیں پہنچ سکے، لیکن وہ کنٹریبیوٹ کر رہے ہیں کسی نہ کسی طرح سے ملک کی اکانومی ہیں۔

فرض کریں وہ کنٹریبیوٹ نہیں کر رہے، لیکن وہ انسان ہیں، اور ان کا استحقاق ہے زندہ رہنے کا۔ میری پیاری بی بی اس کائنات میں جب دوسرا شخص پیدا ہوا تھا۔ پہلے کے حقوق آدھے رہ گئے تو دوسرا شخص کون تھا، کیسا تھا۔ کنٹریبیوٹ کر تا تھا یا نہیں کر تا تھا لیکن یہ رہ گیا۔ میں جو اس ملک میں رہتا ہوں۔ میرے حقوق 14\1 کروڑ ہیں، میں یہ کہوں کہ میں چونکہ یہاں بیٹھا ہوا بات کر رہا ہوں اور آپ میری شکل دیکھ رہے ہیں، میں تعلیم یافتہ ہوں۔ حقوق کے معاملے میں ہم برابر ہیں۔ یہ مساوات ہم کو خاص طور پر دی گئی ہے۔ آپ لوگ اکثر پوچھتے ہیں اور اس بات پر غم کا اظہار کرتے ہیں، اور یہ جائز طور پر آپ کے دل کا غم بنا ہوا ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق کیوں نہیں ہے؟ بہت سوچتے ہیں ہم۔ ہمارے ہاں ہی نہیں ساری ملتِ اسلامیہ میں، ساری امت میں، عالمِ اسلام میں اتفاق کیوں نہیں ہے۔ یہ واقعی دکھ ہے۔

ہمارا، اور بڑی درد مندی کے ساتھ دل سوزی کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن موٹی سی بات یہ ہے کہ اس وقت تک نااتفاقی قائم رہے گی جب تک دوسروں کے حقوق کسی جگہ تلف ہو رہے ہوں گے۔ جونہی آپ نااتفاقی کو محسوس کریں آپ فوراً اندازہ لگا لیں۔ آپ کے پاس ایک تھرمامیٹر ہے کہ دوسرے آدمیوں کے حقوق جو ہیں، وہ تلف کیے جا رہے ہیں، ضائع کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے نااتفاقی ہے، اور جو معاشرے، جو علاقے، اور جو ملک بڑے اتفاق سے رہتے ہیں، اور انصاف پسندی سے رہتے ہیں، ان کے اندر حقوق انسانی تلف نہیں ہوتے ہیں۔ آدمی پڑھا لکھا ہو، موٹا ہو، باریک ہو، کالا ہو، پیلا ہو، اس کا حق ہے۔ ملک کے رشتے سے اس کو حق پورے کا پورا ملتا ہے، تو ہم سے یہ کوتاہی ہوتی ہے۔ ہمارے سارے بابے یہ بات کہتے ہیں، اور وہ تکلیف وہ بات ہے۔ اس پر چلنا ہم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بڑی مشکل بات ہے۔ وہ یہ ہے کسی محفل میں، کسی مجلس میں، کسی گفتگو میں اگر آپ کے پاس بات کرتے ہوئے بہت اعلیٰ درجے کی دلیل آ جائے۔ ذہن میں بہت اچھی Argument آ جائے، تو وہ دوسرے بندے کو جو آپ کا مدِّ مخالف ہے، وہ گھائل کر دے جو آپ دلیل دیں یا زائل کر دے یا اس کو ملیا میٹ کر دے تو ہمارے بابے کہتے ہیں، ایسی دلیل روک لو، بندہ بچا لو۔

سامعین! بات تو بندے کی ہے، اور آپ ہمیشہ سے یہی بات کرتے رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں توہینِ آدمیت ختم ہونی چاہیے، اور ہر آدمی کی عزت نفس جو ہے، وہ بحال کی جائے۔

آپ نے کبھی محسوس کیا کہ یہاں سے بھاگنے والے لوگ یا کسی، اور ملک میں سٹیل ہونے والے لوگ اس ملک کو پسند کرتے ہیں، جس ملک کے رہنے والے سارے کے سارے توانا ہوں۔ ایسے ملک میں کبھی Migrate نہیں کرنا چاہتے، جہاں دو تین چار حکمران ہوں۔ باقی کے سارے بیچارے مینڈک ہوں کمزور اور ناتواں۔ ہمارے ملک میں بھی یہ کوششیں کی جارہی ہیں۔ کچھ لوگ توانا طاقت والے ہوں، اور باقی کے چودہ کروڑ بے چارے "ڈڈو" ہوں۔ "ڈڈو" سمجھتے ہیں آپ؟ مینڈک۔ جس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ تو اتنے مینڈکوں کے درمیان رہنا آپ کو تقویت عطا نہیں کر سکتا۔ خواہ ذاتی طور پر آپ کتنے ہی قومی کیوں نہ ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں اٹلی میں تھا، تو مجھے ٹینس کا کھیل دیکھنے کا بہت چسکا پڑ گیا تھا، اور مجھے ٹینس کا کھیل بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں کبھی اتنی شدومد سے نہیں کھیلا جاتا تھا، ہمارے ملک میں۔ وہاں جتنے بھی میچ ہوتے تھے، میں بڑے شوق سے دیکھتا تھا تو ایک بڑی اعلیٰ درجے کی ٹینس پلیئر تھی، اس کی ورلڈ چمپئین تو نہ ہو سکی، لیکن اٹلی کی تھی، اور اس کا نام تھا۔ نینالو ہیتی، اس کی Opponent تھی

سنٹینا Santina ۔ سنٹینا ذرا بڑی عمر کی تھی، اور Nena نوجوان تھی، چھوٹی تھی، لیکن Nena کا جسم مضبوط تھا، ایک دن ان کا میچ ہوا۔ سب کو سو فیصد یہ یقین تھا کہ Nena جیتے گی، کیونکہ ایک تو اس میں صلاحیت بڑی تھی دوسرے وہ نوجوان تھی اور ایک جسمانی ساخت بڑی مضبوط تھی۔ تو میچ کھیلتے رہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ Santina جیت گئی۔ اس نے خوشی سے زور کا نعرہ لگایا، کیونکہ ہمیں بھی توقع نہ تھی، اور جب وہ Net کے پاس جاتے ہیں، اور جا کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، تو جب ہاتھ ملانے لگی تو جو Nena تھی، وہ شدت جذبات کے ساتھ رونے لگی۔ شکست بڑی ظالم چیز ہوتی ہے اور Santina نے بجائے اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کے اپنا ریکٹ زور سے پھینکا، اور وہ Net جو بڑا Tight لگا ہوتا ہے، چھلانگ لگا کر اس کے اوپر سے گزر گئی، اور جا کے ہاری ہوئی نینا کو گلے لگا لیا، اور اس کا سر منہ چومنے لگی۔ جتنی تیزی سے وہ رو رہی تھی، اس سے زیادہ شدت سے جیتنے والی رو رہی تھی۔ اور سنٹینا نے اپنی جسمانی کامیابی کو ایک روحانی کامیابی میں تبدیل کر دیا، اور پھر اس نے اعلان کیا، میں کبھی بھی پھر ایسے مقابلے میں نہیں اتروں گی جہاں کسی دوسرے کو رونا پڑ جائے گا۔ پھر وہ بڑی سہیلیاں بن گئیں، اور اخباروں میں تصویریں چھپتی رہیں، جیسے ایکٹرسوں کی چھپتی ہیں۔

سامعین! یہ جذبہ تو ان لوگوں میں بھی ہے، خواہ وہ اٹلی کے بھی ہوں، کہ وہ کسی کو روتے ہوئے دیکھ سکتے۔، جہاں شکست خوردگی کے عالم میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارا پروپیگنڈا ہے۔ کہ یورپ والے تو بالکل جذبوں سے خالی ہیں۔

لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں، سارے کا سارا ہمارا ملک، ہمارا علاقہ، یا لوگ ایسے نہیں ہیں۔ میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں۔ جب میں تھر پار کر گیا صحرا میں۔ ایک ضرورت تھی، ایک ایسی تلاش تھی۔ میرے ساتھ میرے دوست ممتاز مفتی بھی تھے تو ہم گاؤں ہے چھوٹا جدو وہاں رہے۔ وہاں لوگوں نے ہماری بڑی خاطر مدارت کی، اللہ ان کو خوش رکھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں ہماری مائی بھاگی رہتی تھی، بہت اعلیٰ درجے کی گانے والی۔ نئ نئ اس نے بھینس خریدی تھی، اور اس کو نہلاتی تھی۔ ہم کو بڑا دودھ پلایا۔ یہ ہمارے بھائی آئے ہیں پنجاب سے۔ تو ہم ان کے مہمان تھے۔ گرمی بڑھ رہی تھی، اور جس چیز کی ہمیں تلاش تھی، وہ ابھی ہم سے دور تھی۔ ایک چورا لے کر ہم کو دے دیا۔ چورا جھونپڑی کو کہتے ہیں۔ اس میں ہم رہتے تھے تو وہاں پر ایک لڑکا تھا کول نسل کا۔ آپ سمجھتے ہیں "کول دراوڑ" کول قوم ہے، جو تھر میں بہت رہتی ہے۔ کولین گوٹھ میں رہتے ہیں۔ گوٹھ گاؤں کو کہتے ہیں۔ آپ کے ملک میں رہے ہیں۔ کبھی باہر نکلیں،

اپنے ملک کو دیکھیں۔ کمال کمال کی چیزیں ہیں۔ تو وہ ایک لڑکا آیا کرتا تھا۔ گاچو اس کا نام تھا۔ ایک اس کی بہن تھی چھوٹی سی۔ اور وہ گاچو جو تھا، سر کے اوپر ٹوکرا رکھ کے چھائیں بیچتا تھا۔ جنگل چھائیں۔ چھائیں تربوز کو کہتے ہیں۔ صبح بیچارہ لے کر آتا تھا۔ دونوں یتیم تھے۔ جب دھوپ بڑھتی تھی، جب دس بجے کے قریب، تو سر کے اوپر ٹوکرا لے کر آتا تھا۔ میں اس سے چھائیں، جنگل چھائیں ایک دو چھلکے تربوز خرید لیتا تھا۔ تو وہ بچہ جب چل کے آتا تھا دھوپ میں تو اس کا جو سایہ پڑتا تھا پیچھے تو وہ بھولی سی بہن وہ پیچھے پیچھے چلتی تھی اور وہ آگے ہوتا تھا۔ میں کہتا تھا گاچو تو اپنی بہن کو آگے کیوں نہیں چلاتا۔ تو کہنے لگا، سائیں ہم یتیم ہیں، ہم جھونپڑے میں رہتے ہیں تو گرمی بہت ہو جاتی ہے۔ میں چھوٹا بچہ ہوں۔ میرا سایہ بڑا لمبا ہے۔ میں چاہتا ہوں میری بہن کو گرمی نہ لگے۔ وہ میرے سائے سائے میں چلتی ہے۔ یہ پاکستان کے ورثے کی بات ہے تو وہ گرمی اس کو نہیں لگنے دینا چاہتا تھا، تو یہ گاچو تھا۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں آپ کے ملک میں جو تکبر سے دور ہیں، اور دوسروں کے لیے بھی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مہربانی۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

اندر اور باہر کی شخصیت کی میچنگ

اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

آج میں پھر آپ کو تھوڑی دیر کے لیے اٹلی لے جانا چاہتا ہوں۔ ابھی بیٹھے بیٹھے یاد آیا ہے یہ واقعہ۔ سبھی پوچھ رہے تھے کہ آج کون سے موضوع پر بات کریں گے۔ کون سا موضوع ساتھ لے کر آئے ہیں، تو خواتین و حضرات کوئی خاص موضوع میرے سوچنے میں، میرے اسٹاک میں ہوتا نہیں ہے۔ باتوں میں اگر کوئی چیز نکل آئی تو پھر اس پر آہستہ آہستہ عمارت کی تعمیر ہوتی رہتی ہے۔

میں روم میں اپنی یونیورسٹی سے واپس آ رہا تھا گھر کی طرف۔ تو جب سینٹ پیٹر کے بڑے میدان سے گزرا تو وہاں پر ایک سکھ سردار نسواری رنگ کی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ وہ بڑے غور کے ساتھ سینٹ کی بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا، اور جو بڑے بڑے ستون تھے ان کو گن رہا تھا۔ میں نے کہا، سردار جی ست سری اکال۔ واگرو کی خالصہ، واگرو کی فتح وہ بے چارہ کانپ گیا گھبرا گیا۔ ایک دم کہنے لگا، جی مینوں جانتے ہو؟ میں نے کہا، میں پاکستانی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا، لو جی میری بڑی مشکل حل ہو گئی۔ میں دو دن سے یہاں گھوم رہا ہوں میری

بولی کوئی نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا، نہیں یہاں انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ تو میں نے کہا آیئے آپ کو چائے پلائیں۔ میں اسے ایک قریبی ریستوران میں لے گیا، تو جب میں چائے کا آرڈر دینے لگا تو اس سے پوچھا، کافی پئیو گے یا چائے۔ کہنے لگا، نہیں جی دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔ کچھ گرمی سی لگ رہی ہے۔ آئس کریم ہونی چاہیے۔ میں دو دن سے آئس کریم کی تلاش میں ہوں، لیکن مجھے پتا ہی نہیں آئس کریم کو کیا کہتے ہیں۔ میں انگلی ضرور لگاتا تھا کہ یہ دو، مجھے اور کچھ ہی چیز نکال کے دے دیتے تھے تو مجھے ایک لفظ وہ بتادیں کہ آئس کریم کو کہتے کیا ہیں؟ میں نے کہا آئس کریم کو جلاتو کہتے ہیں۔ کہنے لگا، لو جی پٹھا ناں رکھ دتا ہے۔ ایہہ جلان والی چیز ہے یا ٹھنڈ پان والی چیز اے۔ میں نے کہا، بس رکھا تو یہی ہے۔ اس کا نام ہی یہ ہے۔ تو ہم بیٹھ کے باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا، سردار صاحب بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو دیکھ کر مجھے ایک طرح کی بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنا جو وجود ہے جو آپ کو احکام دیئے گئے ہیں، اس کو آپ پورا مین ٹین کرتے ہیں۔ کیس رکھتے ہیں۔ ڈاڑھی آپ کی ہے، کڑا آپ کا ہے، پگڑی اتنی خوب صورت پہنتے ہیں۔ تو اس نے کہا، ہاں جی یہ ہونا چاہیے۔ یہ انسان کو شناخت کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ کچھ تشخص کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا، لیکن پورا حاوی نہیں تھا اس کے اوپر۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔

تو میں نے کہا، سردار صاحب جی آدمی کا دل صاف پاک ہونا چاہیے۔ نیت ٹھیک ہونی چاہیے۔ کہنے لگا، نہیں جی، دل پاک صاف نیت اچھی ہو، اس کا پتا نہیں چلتا۔ جب تک اس کا ظاہر جو ہے وہ اس بات کی شہادت نہ دے۔ آپ کے دل میں کیا ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے کہا، باہر کا وجود جو ہے اس کے بارے میں جو آپ نے فلسفہ سازی کی، اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ۔ اس نے کہا، دونوں کا تال میل ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی عجیب بات کی جو بڑے سالوں کے بعد مجھے یاد آئی۔ اس نے کہا، آدمی جو ہے، وہ اپنی وردی سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر شخص کی ایک وردی ہوتی ہے، اور وہ وردی طے کرتی ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ تھانیدار کو دیکھ کر اسے بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ طلباء کو معلوم نہیں کرنا پڑتا۔ تھانیدار کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ تھانیدار ہے۔ میجر کی وردی کو پہچان لیتا ہے، اور یہ باتیں کرتے رہے۔ وہ تو چلا گیا لیکن میرے لیے سوچ کا ایک سامان چھوڑ گیا۔ ایک شخص کا جو Indicator، باہر کا اشارہ ہے، وہ آدمی کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے۔ تو میں یہ سوچنے لگا کہ اگر ایک لڑکی ہو، بڑی شوخ و شنگ۔ اس نے جینز پہنی ہوئی ہو، اور بہت اونچی ایڑی کی گرگابی پہنے ہوئے ہو، کانوں کو اس نے لگایا ہو، کیسیٹ پلیئر کا ہیڈ فون، اور شر شر کر کے چل رہی ہو، اور سرجن کو وہ اوزار بھی دے رہی ہو

لیکن وردی اس نے نہ پہنی ہو اور وہ کہے میں نرس ہوں، کام بھی وہی کر رہی، تو اس کو سرجن صاحب کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔ اگر وردی نہیں اس کے بغیر تو ہم نہیں مانتے کہ یہ کام ہو رہا ہے، ہم اس کا تشخص چاہتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں، ہم شناخت کریں، فوراً پتا چل جائے یہ کون ہے؟ مثلاً دیکھیے ایک بہت خوب صورت اعلیٰ درجے کا نوجوان ہے، اور پڑھا لکھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اس نے ایک سلک کی بنیان پہنی ہے، اور چھوٹی سی چڈی پہنی ہوئی ہے۔ اور پاؤں میں قینچی چپل پہنی ہوئی ہے اور وہ جمبو جٹ چلانے کے لیے کاک پٹ میں آنے کی کوششیں کرتا ہے۔ آپ اسے روکیں گے۔ وہ کہے گا میں پائلٹ ہوں، قینچی چپل والا، تو کہے گا جی میرا لائسنس دیکھیں، اور لائسنس سچ مچ ہو۔ اور وہ کہے، میں ہزار گھنٹے فلائنگ کر چکا ہوں اور اس وقت دنیا کی وزنی ترین مشین کو ہوا میں لے جا رہا ہوں۔ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں، اور اپنے کاغذات پورے دکھائے تو اس کو ہوائی جہاز میں بیٹھنے نہیں دیا جائے گا اور کاک پٹ میں آپریٹ کرنے کی اجازت نہیں ہو گی، کیونکہ اس کی وردی نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی میں عجیب سی بات ہے جو انسان کے عمل کے اندر حائل ہوتی ہے۔ نیت اس کی اچھی ہے۔ نیت نیک ہے، وہ جانتا بھی ہے، لیکن چونکہ طے شدہ پیٹرن کے اندر، چوکھٹے کے اندر نہیں ہے، اس لیے ہم اسے قبول نہیں کرتے۔

مثلاً ابھی میرے ذہن میں آرہا ہے۔ چوک ہے، چوراہے ہیں، لاہور، کراچی کے بہت پیچیدہ، اور کثیف ٹریفک والے اور مشکل چوراہے پر ایک نوجوان مونچھوں والا کھڑا ہو۔ اس نے بدن کو تیل ملا ہوا ہو، اور لنگوٹا باندھا ہوا ہو، اور ہاتھ میں اس کے ایک بانس پکڑا ہوا ہو، اور ٹھکا ٹھک مار کے ٹریفک کنٹرول کر رہا ہو، کبھی کسی کے سر پر کبھی گاڑی پر مار دیا، اور کبھی سکوٹر پر، اور کنٹرول کر رہا ہو تو سارجنٹ آ کر، پریشان ہو کے پوچھے گا تو کون ہے؟ وہ کہے گا جناب میں محمد صدیق ٹریفک کانسٹیبل۔ ۳۲۷۲۱۲۶۲ اپنا نمبر بھی بتائے گا، تو وہ کہے گا تو کیا کر رہا ہے۔ وہ کہے گا، سر میں ٹریفک کنٹرول کر رہا ہوں تو وہ کہے گا تیری وردی کہاں ہے۔ وردی کی کیا ضرورت سر، دیکھیے میں کتنے اعلیٰ درجے کا ٹریفک کنٹرولر ہوں۔ ہاتھ میں بانس ہے، تیل ملا ہوا ہے، اور ساروں کے سر پر مار رہا ہوں۔ لنگوٹی میں نے پہنی ہوئی ہے لیکن ٹریفک کنٹرول کر رہا ہوں۔ وردی کی کیا ضرورت ہے۔ تو کام سے پکڑ کر نہ صرف لائن حاضر کر دیا جائے گا، بلکہ میرا خیال ہے معطل بھی ہو جائے گا۔ تو خالی یہ کہہ کر گزر جانا کہ میرا دل بڑا نیک ہے، میری نیت بہت اچھی ہے۔ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ اس سے بھی اجتماعی زندگی میں شکوک و شبہات پیدا ہونا لازمی ہیں۔ جس طرح کہ باہر کی شکل و صورت دیکھ کر آدمی کو یقین نہیں آتا کہ یہ آدمی

اندر سے ایسا ہو گا۔ لیکن جب آپ نے اجتماعی طور پر ایک وردی طے کر دی ہے تو پھر وردی والے کو بھی اس بات کی حیا ہوتی ہے کہ جو اس کے لیے طے کیا گیا ہے، اس پر قائم رہے، اور جو مجھ سے توقع کی جاتی ہے، وہ توقع پوری کروں تو جب یہ بات مجھے وہاں معلوم ہوئی تو میں غور کرتا رہا، اور پھر آج تک سوچتا ہوں، مجھے بعد میں نفسیات دانوں نے یہ بتایا بھی کہ انسان کا باہر کا تشخص اس کی اندر کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس فلسفے کے تحت ہم نے انسان کی اندر کی بیماری دور کرنے کے لیے بہت سی ایسی چیزیں اختراع کی ہیں، جو باہر سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ ریڈی ایشن کر کے اندر کی بیماری جو ہے، دور کی جاتی ہے۔ تو اندر کا باہر کا بڑا قریبی رابطہ، اور ایک رشتہ ہے، اور اس رشتے کو آپ جبھی اپنا سکتے ہیں جب کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوں، اور اس پٹڑی پر دونوں اسی استقامت کے ساتھ قائم ہوں جس طرح ان کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی سلطنت کا کوئی بادشاہ بہت اچھا، نیک بادشاہ، صلح کل لیکن طبیعت میں بڑا اڈسپلنڈ تھا، اور اس کو اپنے ملک کی صحت وصفائی کا بڑا خیال تھا۔ مجھے صفائی کی بات کرتے ہوئے یاد آیا کہ اپنی رعایا کی صحت بر قرار رکھنے کے لیے، چونکہ وہ صفائی کا بڑا دیوانہ تھا، اس لیے اپنی مملکت میں بھی اس نے خاصا صفائی کا انتظام کر رکھا تھا، اور ظاہر ہے گھر کا بھی، محل کے اندر بھی صفائی کا انتظام بطورِ خاص دیکھا جاتا تھا۔

قریب ہی اس کے ایک چھوٹی سی کالونی تھی۔ بہت اچھے لوگوں پر مشتمل۔ صفائی کا وہ بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ تو ایک اماں بوڑھی جو کہ صفائی کے معاملے میں بادشاہ کی، ملکہ کی، اور شہزادی کی بڑی قابلِ اعتبار بھنگن تھی، اس کا بڑا مقام تھا۔ وہ آ کے محل کے اندر زنان خانے میں صفائی کرتی تھی اور ان کی مرضی کے مطابق کام کرتی تھی، اور اس کا احترام تھا۔ بڑے آدمی کا احترام ہوتا ہے۔ اچھا کام کرنے والے کا احترام ہوتا ہے۔ کام چاہے کوئی بھی ہو۔

تو کہانی بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اماں بڑی بیمار پڑ گئی، اور شاہی خاندان کا کام کیا جانا ضروری تھا، تو اس نے اپنے نوجوان بیٹے سے جو بڑا لحیم شیم بڑا خوب صورت اچھا نوجوان تھا، اس سے کہا، بیٹا میں نہیں جا سکتی محل میں تو جا کر میری جگہ پر کام کر۔ چنانچہ وہ اپنا جھاڑو لے کر، ٹاکی لے کر جس طرح کا سامان اسے چاہیے تھا، وہاں چلا گیا۔ اس نے جا کر برآمدے میں جھاڑو ٹاکی لگائی، پھر دوسرے کمرے میں لگائی۔ وہ جب تیسرے کمرے میں جھاڑو لگا کر باہر نکل رہا تھا تو شہزادی غسل خانے سے نہا کر کھلے بال آ رہی تھی اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ شہزادی کو دیکھا تھا۔ وہ شہزادی جس کا ذکر کہانیوں میں ہوتا ہے اور بے چارہ کھڑے کا کھڑا ابت بنا رہ گیا، اور شہزادی اپنا منہ لپیٹ کے وہاں سے بھاگی۔ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ گھر آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا،

پیاری ماں یہ کیا مخلوق ہے تو اس نے کہا، بیٹے کیا ہوا؟ اس نے کہا، ماں وہاں تو ایک لڑکی نکلی، لیکن جیسے آسمانوں سے اتری ہوئی لگتی تھی۔ کبھی ہم نے بازار میں، شہر میں تو ایسی مخلوق دیکھی نہیں۔ اس نے کہا، اوہ تیرا بھلا ہو جائے تو نے شہزادی کو دیکھ لیا۔ کہنے لگا، ماں میں اسے دیکھ تو آیا ہوں، لیکن میری آرزو ہے، میں اسے ایک بار پھر دیکھوں، اور قریب سے دیکھوں۔ اس نے کہا بیٹا اس بات کی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ ابھی جلا دبُلا کر ہم ماں بیٹے کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس نے کہا، ماں میری زندگی کی آرزو ہے کہ اس حسنِ مجسم کو قریب سے دیکھوں۔ میں بالکل بھونچکا ہو گیا تھا۔ بوکھلا گیا تھا۔ میرے ذہن پر اس کے نقوش ٹھیک طرح سے نہیں آئے۔ اس نے کہا، بھئی ایسا نہ کر یہ نہیں ہو سکتا۔ تو وہ بیمار پڑ گیا، جان کے لالے پڑ گئے۔ اب ماں ماں ہی ہوتی ہے تو اس نے حوصلہ کیا، سیدھی شہزادی کے پاس گئی۔ چونکہ شہزادی اس کا احترام کرتی تھی، سارے گھر والے کرتے تھے۔ اس نے کہا، بیٹی یہ بات ہو گئی ہے، اگرچہ بڑی ناقابل بیان تھی، میں نے بیان کر دی۔ ناقابلِ برداشت تھی، وہ تو برداشت کر لی۔ مہربانی ہے، مشکل آ پڑی تو اس کا حل نکال۔ اس نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اماں آمنا سامنا ہو گیا غلطی سے۔ اس نے کہا، مشکل یہ آ پڑی ہے کہ وہ تجھے دوبارہ دیکھنا چاہتا ہے۔ تو نہ نعوذ باللہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں ہوتا ہی

نہیں۔ لیکن میرا اکلوتا بیٹا ہے، مر جائے گا۔ شہزادی نے کہا، میں کیا کر سکتی
ہوں۔ مرتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اللہ کی یہی رضا ہے۔ وہ بڑھیا رونے لگی، چلی گئی۔
گھر بیٹھی بیمار بیٹے کو دیکھا۔ جان بہ لب بیٹے کو۔ ماں تھی صبر نہ ہوا پھر لوٹ کر آئی
اور منتیں کرنے لگی۔ شہزادی نے ترس کھا کر کہا، اماں تو ایسا کر اس کو ایک جھوٹا
پیر بنا دے۔ کوئی بزرگ بنا دے۔ اس کو کہو، اللہ کی عبادت کیا کرے حق ہو کا
نعرہ مارا کرے اور جنگل بیابانوں کی سیر کرے۔ میرے والد جو ہیں وہ پیروں،
فقیروں کو بڑا مانتے ہیں۔ بزرگوں پر بادشاہ سلامت کا اعتقاد تھا، تو میں سمجھتی
ہوں کہ ایک وقت ایسا ضرور آسکتا ہے کہ اگر اس کا نام بہت دور دور تک پہنچ گیا
کہ بڑا کمال کا فقیر ہے تو شاید میرے والد اس سے متاثر ہوں، اور متاثر ہونے کے
بعد مجھ کو بھی کہیں، بیٹی جا ان کی زیارت کر آ۔ اس نے کہا، اللہ تیرا بھلا کرے۔
وہ گھر آ گئی۔ اس نے کہا، بیٹا اٹھ یہ لمبا پینڈا ہے، لیکن طے کرنا ہے اس مسافت
کو۔ تو نہا دھو پگڑی باندھ کے نیک بن جا۔ اللہ کا پیارا۔ اس نے کہا، اللہ کا پیارا کیسے
بنا جاتا ہے۔ اس نے کہا یہ تو مجھے بھی نہیں پتا، تجھے بھی نہیں پتا۔ اب جنگل میں جا
کے بیٹھ کے اللہ سے کہہ، میں تیرا پیارا ہوں، اور وہ تجھ کو قبول کر لے گا۔ وہ چلا
گیا جنگل میں جا کے بیٹھ گیا مزے سے، اور وہاں پر جا کر وقت گزارنے لگا، اور
اللہ کی تسبیح جیسی بھی اس کو آتی تھی، اور آرزو دل میں رکھنے لگا کہ کبھی شاید اللہ

کی زیارت ہو، اور میں کبھی اس راہ پر چل سکوں۔ اس راہ پر چل کر اس آرا کو بھی دیکھ سکوں جس کی آرزو لے کر میں نے یہ ساراڈرامار چایاہے۔ کچھ عرصہ وہاں پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے اسے دیکھا، ایک نوجوان ہے، شکل صورت بھی اچھی ہے۔ بات کسی سے نہیں کرتا۔ آنکھیں بند کر کے، لو لگا کے بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے جب اس کو دن رات وہاں اسے بیٹھے دیکھا۔ سردی میں، گرمی میں، دھوپ میں، بارش میں تو انہوں نے جھونپڑی ایک بنوادی اور وہ اس جھونپڑی میں رہنے لگا۔ وقت گزرتا رہا تو آہستہ آہستہ اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا کہ ایک بہت کرنی والا بزرگ ہے، اور پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اور لوگ اس کی زیارت کو آنے لگے۔ ایک سلسلہ چل پڑا۔ کسی نے آ کے بادشاہ سے بھی ذکر کیا کہ آپ کی راجدھانی کے فلاں علاقے میں، فلاں پرگنے میں بڑا بزرگ آیا ہوا ہے۔ لمبی داڑھی ہے۔ لمبے بال ہیں، اور بڑا حسین آدمی ہے، اور بات نہیں کرتا کسی سے۔ تو بادشاہ کو اشتیاق ہوا۔ انہوں نے سواری نکالی، پنج ہزاری دس ہزاری امیر، وزیر اس کے ساتھ چلے کہ، زیارت کرنے چلتے ہیں۔ جنگل میں پہنچے، کٹیا کے پاس کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ نے دیکھا، اس کو سلام کیا۔ آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا، اس کو کیا پروا تھی۔ اس نے کہا، میں وقت کا بادشاہ ہوں۔ تجھے سلام کرنے آیا ہوں۔ اس نے کہا بابا تیری مہربانی، ہم نے تیرا سلام قبول کیا، اب چلا

جا۔ اس نے کہا، نہیں میں یہاں بیٹھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کہنے لگا، کھلی جگہ پڑی ہے بیٹھ جا۔ بادشاہ نے کہا، ساتھ میرا سارا لاؤ لشکر بھی ہے۔ اس نے کہا، وہ بھی بیٹھ جائے، فقیروں کا ٹھکانا ہے۔ چنانچہ وہاں پر بادشاہ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اس نے اندر سے محسوس کیا اس کا Vibration جو ہے، ارتعاش اس کا روحانی، بہت طاقتور ہے، جس نے بادشاہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ خواتین و حضرات! وہ بادشاہ وہاں پر آنے جانے لگا۔ ملنے ملانے لگا۔ اس کی رعایا کے لوگ بھی ظاہر ہے، وہ بھی آنے لگے۔ اس کی ڈاڑھی بڑھ چکی تھی۔ بال لمبے تھے۔ کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ بادشاہ نے ایک دن اپنی بیٹی سے کہا کہ پیاری بیٹی ایک بہت بڑے بزرگ ہماری سلطنت میں آئے ہیں، اور ہماری خوش قسمتی ہے، ہمارے قلمرو میں اتنا بڑا بزرگ آیا ہے، تو کسی دن جا اس کی زیارت کرنے۔ تو اس نے کہا، بالکل ٹھیک ہے ابا جی میں جاتی ہوں۔ اس کو تو پتا تھا کہ یہ کون ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر پہنچی اور جا کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی، دیکھ تیرے دل کی آرزو پوری ہو گئی میں نے جو بات بتائی تھی، اس کے مطابق اتنے سالوں بعد تیرے سامنے آ گئی ہوں، تو اب آنکھیں کھول اور جس طرح سے چاہتا ہے میری زیارت کر، دید کر، میں تیرے سامنے کھڑی ہوں۔ وہ کہنے لگا، اچھا اچھا مہربانی، مہربانی، تین دفعہ کہا۔ ویسے ہی

بیٹھا رہا آنکھیں بند کر کے۔ اس نے کہا، بد بخت میں اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں اور تو آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہے۔ تو اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو لکھنے والے کہتے ہیں کہ شہزادی نے کھینچ کے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا تڑاخ سے۔ کہنے لگی، آنکھیں کھول۔ جس کے لیے اتنا بڑا اڈرامار چایا تھا، وہ گوہر مقصود تیرے سامنے موجود ہے۔ تو اس نے کہا۔ بی بی اب آنکھیں بند ہی رہنے دو۔ وہ سچا ہے جس کو لوگ تلاش کرتے ہیں۔ وہ مل جائے گا کبھی نہ کبھی آنکھیں بند کرنے سے۔ اب تجھ میں کیا رکھا ہے۔ اس نے کہا، سن بی بی، سچا تو کوئی ایسے ہی ہوتا ہے، لیکن اگر جھوٹ کی دھارنا دھار کر بھی آدمی چلے، اور اس کے سامنے اس کا سفر موجود ہو، اور اس کا رخ جو ہے ٹھیک ہو، تو وہ سچائی کی طرف جانے لگتا ہے، لیکن اگر بد قسمتی سے شروع ہی سے اس کے سفر میں ٹیڑھ پڑ جائے، جیسے ہمارے معاشرے میں بڑی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہونے لگی ہے تو پھر وہ کبھی اس منزل تک نہیں پہنچتا جس کی آرزو اس نے جھوٹے انداز میں کی ہے۔ چنانچہ وہ آنکھیں بند کیے ہی بیٹھا رہ گیا۔ اور گوہرِ مقصود تھا، وہاں سے واپس آ گیا۔ تو باپ نے پوچھا بھئی کیسے بزرگ ہیں۔ کہنے لگی، ابا جی ابھی کچا ہے۔ یہ اس کا اپنا انداز تھا، لیکن ایک وقت آئے گا، یہ بہت بڑا بزرگ بنے گا۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض اوقات باہر کی وردی اختیار کرنے سے بھی اندر

کے وجود پر، اندر کی ذات کے اوپر اس کے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں، جس طرح سے باہر سے کیموتھروپی کر کے آپ اندر کے کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ روحانیت میں بھی ایسا عمل ہوتا ہے۔ آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ، مہربانی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ خواتین و حضرات! اللہ آپ کو بھی آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

مٹکی

ہم سب کی طرف سے سب کو سلام پہنچے۔

یہ آج ہی کے دن تھے، اور تقریباً ایسا ہی موسم تھا، اور ایسے ہی ماہ و سال تھے، لیکن وقت اس سے بہت پہلے کا تھا، اور ہم اس آرزو کو لے کر چل رہے تھے کہ ایک ایسا ملک بنے گا۔۔۔ایک ایسا سنہرا دیس۔۔۔ جس کے اندر لوگوں کو آسانیاں ملیں گی، اور وہ ذہنی طور پر، روحانی طور پر اور نفسیاتی طور پر آسانیوں کے اندر زندگی بسر کریں گے، کیونکہ ہم اس دعویٰ کو لے کر چلنے والے تھے کہ یہ ایک ایسا ملک ہو گا جو ایک مثالی دیس کی صورت میں ہو گا۔۔۔اور ہم لوگوں کو، دوسرے ملکوں کو یہ بتا سکیں گے کہ دیکھو پیارو! حکمرانی، جہاں بانی اس طرح سے کی جاتی ہے۔۔۔، اور جس طرح سے آپ لوگ اپنے اپنے ملکوں میں کرتے ہیں۔ وہ کوئی زندگی گزارنے کا، زندگی بسر کرنے کا، کوئی ایسا کمال کا فن نہیں ہے جس کا کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ یہ ایک ایسا دور تھا، اور ایسا عہد تھا، اور ہم اپنے انداز میں تھے ہماری سرشت میں، اور ہماری سوچ میں، اور ہماری سائیکی میں، اور ہمارے دل میں ایک عجیب بات تھی۔۔۔۔ جیسا کہ میں

نے پہلے ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ ہم دینے میں سے دینے کے عمل پر، اور دینے میں سے دینے کے فن پر عمل پیرا تھے، اور ہم جانتے تھے، اور ہمیں اس بات کا بہت پکا شعور تھا کہ زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے یا زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے جب تک ہاتھ سے، اور پلے سے کچھ نہیں دیا نہیں جائے گا، اس وقت تک کسی بھی قسم کی فلاح، اور ترقی نہیں ہو سکے گی۔

کسان اپنے گھر کے اندر جا کر اپنی بھڑولی کھول کر اس میں سے اناج نکال کر، یا بوری کی تناویں کاٹ کر اس میں سے دانے نکال کے، جھولی بھر کے کھلے میدان میں جاتا تھا، اور وہ اچھے بھلے دانے۔۔۔اچھا بھلا اناج جس سے اس کے گھرانے کی زندگی کا سامان بڑی آسانی سے کیا جا سکتا تھا، باہر لے جا کر یا تو پورے کے ذریعے یا بیج در بیج۔۔۔۔یا چھٹے کے ذریعے ایک عجیب و غریب زمین پر پھینک کر اس امید پر، اور اس سوچ پر چلا آتا تھا کہ اس کے اندر سے اب ایسے ہی بے شمار دانے، ستر، ستر اور سات سات سو، اور سات سات ہزار ہو کر نکلیں گے۔ یہ پہلے دینا ہوتا ہے، پھر اس کے بعد لینا ہوتا ہے۔ یہ تصور ہمارے ساتھ تھا کہ دیں گے، تو ہم دے چکنے کے بعد کیاریوں دروازوں میں سے چھوٹے چھوٹے پودے جھانک کر دیکھتے تھے کہ گھر والے کھیت میں آئے ہوئے ہیں کہ نہیں، یا ہم اکیلے ہی نشوونما پا رہے ہیں۔ تو کبھی کبھی بونے والے وہاں موجود تھے، اور

کبھی نہیں بھی ہوتے تھے، لیکن وہ پودے نشو و نما پاتے چلے جاتے تھے، اور جب وہ بڑے ہوتے تھے، تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

تو دوستو! ہمارے پاس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ ہم اپنی دولت، شہرت، عزت، شفقت، محبت، مروت، یہ سب کچھ لے کر اپنے وطن کی بنیادوں میں ڈالنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے پاس سوائے ہمارے بدنوں کے، ہمارے وجود کے، اور سوائے ہمارے اپنے خون کے کچھ بھی نہ تھا۔ ہم نے اپنے وجود کو، اپنے جسم کو، اپنے خون کو اس وطن کی بنیادوں کو پیش کیا۔ جو الحمدللہ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور یوں اس ملک کی بنیاد پڑی۔ یہ تصور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اور آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی دھندلانے لگا کہ دینا اتنا ضروری نہیں ہے، اور ان کھیتوں میں ان مرغزاروں میں، ان باغوں میں ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے کاشت میں کوئی مدد نہ کی۔ البتہ اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کی طرف پل پڑے، اور یہ ہمارے ذہنوں سے نکلتا گیا کہ ہمیں دینا بھی ہے، کیونکہ دیے بغیر کام آگے نہیں چل سکتا، اور جوں ہی دینے سے ہاتھ روکتے ہیں، تو کہیں نہ کہیں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور ویرانی، اور بربادی کے سامان ضرور شروع ہو جاتے ہیں۔

چند دنوں کی بات ہے۔ آپ کے اسی ملک میں، میں ایک پروگرام دیکھ رہا تھا، اور میں پوری توجہ اس پر نہیں دے سکا، چونکہ کان میرے تیز ہیں، اور نگاہ اب کمزور ہونے لگی ہے، لیکن وہ بات جو بھی، وہ میں نے ساری کی ساری عمر سن لی تھی۔ کوئی ڈاکٹر شاہ۔ کمپیئر نے سوچا تھا کہ یا شاید حقیقت بھی تھی کہ شاہ اتنے عمر رسید ڈاکٹر نہیں ہیں۔ اتنے بوڑھے، Old Surgeon نہیں ہیں، لیکن اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے بہت سارے آپریشن کیے۔ اتنے ہزاروں آپریشن کیے کہ گنیز بک میں اس کا نام آتا ہے، یا آنے والا ہے، یا آئے گا۔ تو میری توجہ ان کی طرف ہوئی۔ وہ اچھے سے سمارٹ سے، پیارے سے، اچھی گفتگو کرنے والے ایک ڈاکٹر تھے، اور وہ یہ بتاتے رہے کہ میں نے کتنی تیزی سے، کتنے سارے آپریشن کیے، اور اتنی تیزی سے کیوں کیے۔ میں مال بھی بنانا چاہتا تھا، اور ایک یہ بھی کہتے تھے کہ میری انگلیوں میں بھی کچھ اس قسم کی ایک لگن آباد تھی، ایک Creativity تھی، ایک تخلیق تھی کہ میں جلدی سے جلدی زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا خواہشمند ہوں۔ تو کمپیئر نے پوچھا کہ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی زندگی کا کوئی بہت مشکل آپریشن تھا؟ تو انہوں نے کہا، یوں تو بہت سارے آپریشن مشکل ہوتے ہیں، لیکن ایک آپریشن بہت مشکل تھا جس نے بہت زیادہ وقت کیا، اور میری بہت زیادہ توجہ لی، اور میں بہت سٹپٹایا، لیکن میں

بڑی کوشش کے ساتھ، اور تحمل کے ساتھ اس پر لگا رہا۔

آپ لوگوں سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے خواجہ دل محمد کا ایک شعر یاد آیا ہے۔ خواجہ دل محمد ہمارے بہت کمال کے شاعر تھے، اور مجھے بہت افسوس ہے کہ لوگ اب انہیں نہیں جانتے۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو ان سے بالکل واقف نہیں ہے، لیکن وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک جگہ پر سرجن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرجن کیا ہوتا ہے۔۔۔یعنی آپریشن کرنے والا کیا ہوتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ "سرجن کی صفت اور خوبی یہ ہے کہ نظر باز کی، سر افلاطون کا، جگر شیر کا، اور ہاتھ خاتون کا۔۔۔"یعنی سرجن وہ ہوتا ہے جس کی نظر باز کی ہوتی ہے۔ Plato کی طرح اس کا سر غور کرتا ہو۔ اس کی نظر باز کی ہو، اور ہاتھ خاتون کا۔۔۔ تو ان سرجن کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ اس انداز کے ڈاکٹر ہیں۔ کہنے لگے کہ میں اپنے سرجری ہاسپٹل میں تھا کہ اچانک وہاں پر ایک اپاہج آدمی کو جو ابھی اپاہج ہوا تھا۔ کوئی ایک آدھا گھنٹہ قبل، اسے چارپائی پر ڈال کر لائے۔ وہ ایک نوجوان تھا جس کی دونوں ٹانگیں، ایک تیز دھار آلے سے کٹ گئی تھیں، اور اس کے ساتھیوں نے اس کی رانوں پر بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے رومال یا کوئی رسیاں باندھی تھیں۔ تاکہ جریانِ خون نہ ہو اور وہ جب میری پاس پہنچا تو میں حیران تھا کہ میں اس کا کیا کروں۔ اس کے فوراً بعد ہی

دو آدمی، بھاگے بھاگے آئے، اور انہوں نے کہا کہ جی اس کی دونوں ٹانگیں ہل رہی ہیں جس تیز دھار آلے سے کٹی تھیں، مشین میں کام کرتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں ران سے نیچے کٹ کر دور جا گری تھیں، تو یہ واقعہ اور یہ سانحہ گزرا تھا، پاکستان سٹیل ملز میں۔ ایک کوئی بڑا تیز چکر گھوم رہا تھا۔ کٹاؤ دار جس میں وہ کام کرتے ہوئے قریب آیا تھا کسی کام کی غرض سے۔ وہ مزدور بڑا ذہین، بڑا قابل اور بہت سمجھدار تھا، لیکن وہ اس کی لپیٹ میں آگیا، اور لپیٹ میں آتے ہی اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں، اور بہت جا گریں، اور اس کے ساتھیوں نے تلاش کر لیں، اور وہ اس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر آگئے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ میرے لیے بڑے امتحان کا وقت تھا۔ میں، اور میرے ساتھی، اور میرے اسسٹنٹ میرے ساتھ لگے۔ ہم کوئی مسلسل ۱۸ گھنٹے اس پر کام کرتے رہے، اور اللہ کا فضل یہ ہوا کہ ہم ان کی دونوں ٹانگیں جوڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب خطرہ، اندیشہ، شائبہ یہ تھا کہ بہت ممکن ہے کہ Nerves اس کے ساتھ ٹھیک طرح سے نہ جڑی ہوں، جو شریانیں، اور وریدیں ہیں، وہ اپنی جگہ پر نہ لگی ہوں، کیونکہ یہ آپریشن ہی بہت بڑا تھا، لیکن ہم خدا سے دعا مانگ کے اس کام پر لگے ہوئے تھے، اور جب آپریشن ختم ہوا تو ہم ڈاکٹر بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تو وہ جو اس کے دوسرے ساتھی مزدور تھے انہوں نے بتایا کہ جب

ہم اس کو چارپائی پر لے کر چلے ہیں تو وہ صاحب جو تھے، جن کا نام شکور تھا، وہ تھوڑے سے ہوش میں تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر کہا کہ مشین بند نہ کرنا، کیونکہ اگر یہ مشین ایک دفعہ بند ہو گئی تو اس کے چلانے میں ۱۰ لاکھ کا خرچہ اٹھتا ہے۔ تو اس مشین کو بالکل بند مت کرنا۔ میں نے چاہتا کہ میرے ملک کو یا میرے اس کارخانے کو کوئی نقصان پہنچے۔ تو اس کے بعد وہ نیم بے ہوشی میں چلا گیا۔ اب میرا مقصد اس سارے واقعہ کو سنانے کا یہ ہے کہ وہ کون آدمی ہے، اور وہ کس طرح سے اس ملک کے ساتھ وابستہ ہے، اور ہم کیا کریں، اور کدھر جائیں کہ ہم اس کو سلام کر کے آئیں، اور جب تک وہ زندہ رہے، اور ہم زندہ رہیں، ہمارے اور اس کے درمیان سلام کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اس قسم کے جو لوگ ہیں، انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ اس کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ اس کو لے کر چلے اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دردناک بات جو میں آپ کی خدمت میں ضرور عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ اس کارخانے میں، اس سٹیل مل میں، اسی قسم کے پاکستانیوں نے جو اس سے بہتر تعلیم یافتہ تھے، وہاں سے اتنا کچھ کھسوٹا، اور جس شدت کے ساتھ لوٹا، اس کی خبریں آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوں گی، اور خاتون جنہوں نے بڑا اعتراض کیا تھا کہ کیوں میری فوٹو کھینچی گئی ہے۔ کیا ہو گیا اگر میں نے ۱۰۔۱۵ کروڑ نکال لیا ہے تو؟

تو یہ دردناک کہانی بھی ساتھ لے کر چلنی پڑتی ہے۔ایک بات البتہ ۱۴اگست کے رشتے کے حوالے سے ہے۔کافی دیر کی بات ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے ایسی باتیں سرزد ہو گئی ہیں، اور اب بھی ہوتی ہیں۔وہ یہ کہ میری بڑی آرزو تھی کہ کبھی کوئی ۱۴اگست ایسا منایا جائے۔ جس میں ان شیر بہادروں، اور ان Creative Person کو جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، اس کی تعمیر کی ان کو بھی آگے لایا جائے، اور آگے بڑھایا جائے۔ یہ ایک میری بڑی آرزو تھی۔جب بھی تھی، اور اب بھی ہے۔ یہ آرزو، اور یہ تمنا، اور یہ خواہش لے کر میں وقت کے President کی خدمت میں حاضر ہوا۔مجھے خوشی، اور فخر ہے کہ انہوں نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ بڑی مہربانی فرمائی یہ ہمارے جنرل ضیا الحق صاحب تھے میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔میں نے کہا کہ سر اس مرتبہ جب ہم ۱۴اگست منائیں تو کچھ اس طرح سے ہو کہ جہاں آپ جھنڈا چڑھاتے ہیں، اور عمائدینِ ملک، اور غیر ملکوں کے سفیر، اور وزراء، اور نمائندے اکٹھے ہوتے ہیں، وہاں پر ایک Sitting Arrangement کچھ اس طرح کا بھی ہو کہ کرسیوں کے اس Lay Out میں اب کی بار اول قطار جو کرسیوں کی ہو،وہ ان متّقی لوگوں کی ہو جو مال و دولت کے اعتبار سے یا نام و نمود کے اعتبار سے جانے، اور پہچانے نہیں جاتے، لیکن ان متّقی لوگوں کو دین، اور قرآن کی پرواہے۔

دین، اور قرآن کہتا ہے کہ "تم میں کوئی بڑا نہیں، تم میں کوئی Superior نہیں، ماسوائے اس کے کہ تقویٰ رکھتا ہو۔" تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ۲۲ کرسیاں آگے لگائیں، اور ۲۲ تقویٰ والے لوگ ہوں۔ سفید دودھیا چادروں والے۔ چھوٹی چھوٹی ان کی پگڑیاں ہوتی ہیں، وہ باندھ کر وہ تشریف فرما ہوں، اور ان کے بعد غیر ملکی سفیر، اور باہر کے نمائندوں کی ہوں۔ اس کے بعد پھر کوئی، اور تاجر وغیرہ، اور ہم جو آرٹسٹ لوگ خوامخواہ زبانی باتیں کرنے والے ہیں، ہم سب سے آخر میں ہوں، اور ہم سے بھی آخر میں بیوروکریٹس ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ تو وہ کہنے لگے کہ اشفاق صاحب میری بھی یہی آرزو ہے۔ آپ بہت اچھی Suggestion لے کر آئے ہیں۔ لیکن تقویٰ والے لوگ ہم کہاں سے لیں۔ تو میں نے کہا کہ سر تقویٰ والے لوگ تو ہمارے ارد گرد بہت سے ہیں۔ آپ کے اس محل میں بہت سارے مالی ایسے ہیں۔ بہت سارے بابے ایسے ہیں۔ بہت کمال کے پیارے لوگ ایسے ہیں جن کی وجہ سے میرے پیارے ملک کی بنیادیں استوار بھی ہیں، اور پائیدار بھی ہیں۔ وہ سب دعا دینے والے لوگ ہیں۔

آج سے کوئی پانچ چھ دن پہلے میں لاہور کے میو ہاسپٹل میں گیا۔ مجھے کوئی ضرورت تھی۔ وہاں مجھے رکنا پڑا تو اس کے کینسر کے وارڈ میں ایک گاؤں کی اچھی سی، جسے انگریزی میں Well Meaning کہتے ہیں، اچھے سبھاؤ والی،

پیاری سی شکل کی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں آئی ہو یہاں بی بی؟ وہ کہنے لگی، مجھے کینسر کی شکایت ہے، اور مجھے یہاں تھیراپی کے لیے آنا پڑتا ہے۔ کہنے لگی کہ بھاجی یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ جس سے میں گزر رہی ہوں، لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں، اور جب میں سویرے سب سے پہلے اٹھتی ہوں، تو میں نماز پڑھنے کے بعد دعا میں سب سے پہلے اس دنیا کے بندوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔ کہ یا اللہ کل عالم کی خیر ہو۔

ہماری نانیاں، دادیاں اکثر یہی دعا مانگا کرتی تھیں کہ کل عالم کی خیر ہو۔ اللہ ان سب کا بھلا کرے۔ اور پھر یہ کہتی ہوں کہ یا اللہ، میرے پاکستان کی خیر ہو، اور اس کے بعد میں کہتی ہوں کہ یا اللہ حکمرانوں کی خیر ہو۔ تو میں نے ایک اچھے جرنلسٹ کی طرح کہا، حکمرانوں کی خیر کیوں ہو؟ وہ تو بڑے خراب ہوتے ہیں۔ کہنے لگی، بھاجی اگر حکمران ہوں گے۔ جیسے تیسے بھی ہوں، تبھی گاڑی آگے چلے گی نا۔ اللہ ان کی بھی خیر کرے، اور جہاں جہاں ان کی کمیاں ہیں، ان کو بھی اللہ پورا کرے۔ میں ان کے لیے ضرور دعائیں مانگتی ہوں، تو ایسے ایسے بندے بھی موجود ہیں۔ ہاں اگر وہاں کرسیاں رکھی جائیں تو میں ان بی بی کو بھی ضرور تشریف لانے کے لیے کہتا، تو یہ آرزو تھی کہ یہ کرسیاں ہوتیں تقویٰ کی بھی۔ تو اللہ نے ہی تعریف کی ہے، اور اللہ نے ہی اس کو پسند فرمایا ہے۔ تو جنرل ضیا الحق

نے کہا کہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ان لوگوں کو آگے لانا چاہیے لیکن اشفاق صاحب یہ Tradition نہیں رہی۔ یہ رسم نہیں رہی۔ ہم کیا کریں، اور کیسے کریں۔ آپ مل کر ہمارے ساتھ کام کریں۔ میں نے کہا کہ جی میں ہر طرف سے حاضر ہوں۔ تو ہم نے یعنی میں نے، اور مرحوم نے بھی (اللہ ان کے درجات بلند کرے) اپنے طور پر زور لگایا۔ یہ سوال پیش کیا، لیکن وہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں نا، انہوں نے کہا کہ سر آپ کیا فضول بات کرتے ہیں۔ یہ تو طے شدہ ہے، پلان سارا تیار ہو گیا ہے، اس کے چارٹ بن گئے ہیں۔

یہ لوگ جو آپ کے ارد گرد موجود ہیں، اور جن سے آپ لوگ استفادہ کر رہے ہیں، لیکن آپ کو علم نہیں ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی ذات سے، اپنے علم سے، اپنی تعلیم سے، اپنی خوبصورتی سے، اپنی پاور سے اس ملک کو فائدہ پہنچا رہے ہیں نہیں۔ وہ لوگ جو خاموش رہ کر کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو آپ کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دعائیں دیتے ہیں، اور دعائیں سمیٹتے ہوئے آپ کے ارد گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں وہ لوگ، تقویٰ والے ہیں جن متّقی لوگوں سے ہم واقف نہیں ہیں اور جن سے ہم واقفیت حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ تو میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک گھر سے دانا دانا لا کر بکھیرا نہیں جائے گا، واپس نہیں ملے گا۔

پیارے لوگو! ہم سندھ کے مشہور Desert تھرپارکر میں تھے، اور کافی دور نکل گئے تھے۔ صحرا کو تو آپ جانتے ہیں کہ جب وہاں کوئی آدمی پھنس جائے تو بڑی پیاس لگتی ہے۔ ننگرپارکر ایک جگہ ہے۔ اس کے بعد انڈیا کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے رن کچھ ہے، دلدلی قسم کی جگہ ہے، تو ہم راستہ بھول گئے۔ میں، اور ممتاز مفتی۔ ہم کافی عمر کے تھے، مگر جو ہمارا گروپ تھا، وہ Younger تھا۔ اب پیاس بڑی شدت کی لگی، اور خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ شاید Desert کے اس کارنر میں کوئی پانی بھی ایسا نہ ملے گا جو کہ پینے کے قابل ہو۔ دلدلی علاقہ تھا۔ چل تو ہم رہے تھے، اور مشکل بھی ہمارے ساتھ تھی، اور علاقہ بھی ایسا تھا جو کہ نہایت نامانوس تھا۔ وہاں ایک بڑا سا درخت تھا۔ ایک بڑی عجیب قسم کا درخت، جو شاید صحرا کے اس دلدلی علاقے میں ہی ہو سکتا تھا، اور اس علاقے کی سرحد کے قریب ہی سرخ رنگ کے پہاڑ تھے۔ وہ پہاڑ جن سے ہماری بادشاہی مسجد بنی ہوئی ہے۔ عجیب جگہ تھی۔ ہم خوفزدہ بھی تھے۔ تو جب ہم نیچے پہنچے تو آپ سن کر حیران ہوں گے کہ وہاں ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا تو میں نے کہا کہ ممتاز یہ تو پانی ہے۔ یہ اللہ نے ہی ایسا لگایا ہے۔ اس نے کہا کہ کہیں یہ پانی زہریلا نہ ہو۔ خیر وہیں پر ایک پرانی وضع کی مٹکی سی بھی تھی مٹی کی، اور اس پر بہت ساری کائی جمی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں دھاگا ڈال کر ایک کارڈ سا بھی

لٹک رہا تھا، جس پر سند ھی، اور اردو میں ایک عبارت تحریر تھی کہ خبر دار! اس مٹکی کا پانی نہ پینا۔ سب سے پہلے آپ اس مٹکی کو اٹھا کر اس کے پانی کو نلکے میں ڈالیں اور جب وہ پورا بھر جائے تو پھر آپ ہینڈل چلائیں، اور پانی پی لیں۔ چنانچہ ہم نے مٹکی اٹھائی۔ پانی اس میں ڈالا، ہینڈل چلایا، اور پانی فٹافٹ چلنے لگا۔ اور ہم سب نے پیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آخری Instruction تھی۔ یاد رکھیے! جاتے وقت اس مٹکی کو پانی سے بھر کر رکھ کر جائیں۔ اگر آپ نے پانی لیا ہے تو آپ کو پانی دینا بھی پڑے گا، اور رکھنا بھی پڑے گا، ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوکھ جائے گا، اور وہ لوگ جو اس علاقے میں آئیں گے، وہ ٹھنڈے پانی سے محروم ہو جائیں گے۔۔۔۔ الحمد للہ۔۔۔۔ اس مٹکی کے حوالے سے ایک بات مجھے معلوم ہوئی جو آج مجھے بڑی دیر کے بعد یاد آئی۔ آپ کے سامنے عرض کر دی۔ اللہ آپ کو بہت ہی آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف بھی عطا کرے، اور وہ مٹکی آپ کے ساتھ جائے۔ ہر وقت، اور ہر گھڑی جس میں سے ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ اللہ حافظ۔

انا کی لٹھ

ہم سب کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

ایک بڑی مشکل آپ لوگوں کے ساتھ گفتگو کے شروع سے اب تک رہی ہے، اور وہ بدستور اس کے ساتھ چلی آ رہی ہے، اور اس کا مداوا مجھ سے کوئی ٹھیک طرح سے نہیں ہو پاتا، تو میں بڑی ایمانداری سے اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ ان خامیوں، اور کمیوں کو کس طرح سے دور کیا جائے، تاکہ اس میں آپ کو بھی تسلی ہو، اور میری بھی تسلی ہو۔ وہ یہ ہے کہ میں "بابوں" کا بہت ذکر کرتا ہوں، اور آئندہ بھی موقع ملا تو میں ان کا ذکر ضرور کروں گا۔

بابوں کی میں نے اپنے طور پر تعریف بھی آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، اور اس کی Definition بھی بتائی تھی کہ ضروری نہیں کہ وہ بابا ایک لمبا سا چوغہ پہنے ہو، گلے میں ایک ہار ڈالا ہوا ہو اس نے منکوں کا، ریٹھوں کا، اور چھوہاروں کا، اور لال ڈاڑھی بھی ہو، اور آنکھوں میں سرخ سرمہ بھی ڈالا ہو، اور سر پر چوگوشیا ٹوپی بھی ہو، صرف وہی ہوتا ہے بابا، یہ ضروری نہیں۔ ایک بابا میں نے بتایا تھا کہ بہت ماڈرن، اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے سرخ رنگ کی

چوڑی پھن دار ٹائی لگائے ہوئے۔ اس کے اندر گولڈ کا بروچ ٹانکے ہوئے۔ اعلیٰ درجے کا کیمرا ہاتھ اٹھائے ہوئے، اور جتنی بھی اس موجودہ دور کی ساری Equipment ہیں، وہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ وہ بھی بابا ہو سکتا ہے۔

بابا کی ایک Basic Qualification یہ ہے کہ وہ اس فریم ورک کے اندر رہتا ہے، جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعے انسان کے لیے طے کر دیا۔

ہم گھوڑی کے اوپر اپنا بٹھا کر مری کی پہاڑیوں کے اوپر دوڑا دیتے ہیں۔ گھوڑے کو پتا ہے کہ اس پتھر پر پاؤں رکھنا ہے، اور اس پتھر پہ پاؤں نہیں رکھنا۔ ایک کتا ہے، وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کو پتا ہے کہ مجھے یوں بولینی ہے ایک چیز کی، اور یوں اگر کوئی غیر بندہ گھر میں آئے تو اس پر حملہ آور ہونا ہے۔

اسی طرح سے جو سارے جانور ہیں، وہ پختہ پیدا ہوئے ہیں، اور ان کا فریم ورک ان کا چوکھٹا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک بے چارہ انسان ہی ایسا ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ تعلیم حاصل کر کر کے، پوچھ پوچھ کے، توجہ دے دے کے، استفسار کر کر کے اپنی زندگی کا ڈھانچہ بناتا ہے، اور ایک ڈگر تیار کرتا ہے جس پر کہ وہ چلتا ہے۔ پھسلتا ہے، پھر چلتا ہے، پھر پھسلتا ہے۔ مثلاً کتا ہو، اور گھر میں چور آجائیں تو آپ اس کی سنگلی کھول دیں، اور

اس کو کہیں کہ ہش۔۔۔۔، اور وہ کہے کہ جی میں نے تو ابھی F.A ہی نہیں کیا تو میں کیسے حملہ کر دوں۔ کوئی Education تو دینی چاہیے نا اس کو۔ تو کتا آرام سے بیٹھ جائے کہ جی میں B.A کروں گا تو حملہ کروں گا، ورنہ مجھے تو نہیں آتا، یا میں نے ٹائپ نہیں سیکھی، یا میں نے کمپیوٹر نہیں سیکھا۔ تو اللہ میاں سے پوچھا گیا کہ جی میں کیا کروں تو اللہ نے فرمایا کہ دیکھو! میں نے تمہارے لیے انبیا کے ذریعے تمہارا ایک فریم ورک پہلے ہی پہنچا دیا ہے۔ جیسا وہ فرمائیں، اسی کے مطابق کرنا ہے، اور مزے سے سیٹی بجاتے ہوئے، زندگی کے سارے مزے لیتے ہوئے اپنی آکسیجن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، سینری سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے، چٹانوں سے زندگی کے سفر طے کرنا ہے۔

تو ہم اس مقام پر آ کر پھنس جاتے ہیں، اور ہمارے درمیان وہ جو چوکھٹا یا فریم ورک دیا ہوتا ہے، اس میں، اس کا طے شدہ پروگرام ہے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق چلا جا رہا ہے۔ کبھی اس کے اندر اس قسم کا ٹیڑھا پن نہیں آتا، جیسا کہ انسان کے اندر آتا ہے۔

تو یہ جو بابے ہوتے ہیں نا، جنھوں نے مجھے بہت Attract کیا، جو ایک سیدھے راستے پر، سیدھی لائن پر، صراطِ مستقیم پر چلے جا رہے ہیں، وہ پکار کر کہتے ہیں

اھدنا الصراط المستقیم، اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہے، اور وہ کہتے ہیں بسم اللہ، ہم اس پر چلیں گے، اور وہ انعمت َعلیھم والے لوگ ہیں ان پر انعام نازل ہوتا ہے، وہ بن جاتے ہیں اور میں اس کی آرزو میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا ہوں، اور بھاگتا رہوں گا کہ میں انعمت علیھم والے کسی بندے کو پکڑ لوں جس کے اوپر انعام نازل ہو، اور جب انعام کسی بندے کو ملا ہے، اور جس راستے پر وہ جا رہا ہو گا، اس کا راستہ صراطِ مستقیم ہی ہو گا۔ ٹھیک ہے نا۔ اب میرے اندر ایک چالاکی ہے، میں اس کے ذریعے ایک خود کلامی، یعنی ایک Self Dialogue کرتا رہتا ہوں۔ مجھے کس طرح وہ راہ ہاتھ آئے، جو آسان ہو۔ ہم لوگ جو ہیں وہ کم کوش لوگ ہیں، آرام طلب لوگ ہیں، اور بھی کئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ میں تصور کے زور پر ایک Fiction Writer ہونے کی حیثیت سے، یہ سوچتا ہوں کہ میں، مثلاً کبھی منڈی جاؤں، سبزی منڈی۔ اب میری صحت ٹھیک ہے، میں جا سکتا ہوں۔ تو وہاں پر مجھے کوئی انعام یافتہ بندہ مل جائے جس نے کچھ گاجریں، کچھ مُولیاں، کچھ گوبھی خریدی ہوئی ہے، اور میں اس کو پہچانوں کہ یہ اصل بابا ہے۔ تو میں اس سے کہوں کہ سر میں آپ کا سامان اٹھالوں۔ تو وہ کہتا ہے، کتنے پیسے۔ میں نے کہا، جو آپ دیں گے میں لے لوں گا۔ اب وہ انعمت علیھم والا بندہ ہے۔ وہ کہے گا کہ اچھا۔ تو جب وہ چلے، اور میں اس کا سامان لے کر سر پر اٹھا کر چلوں تو جس رستے

پر وہ جارہاہے، میری آرزو یہ ہے کہ میں عین اس کے Foot steps کے اوپر چلتا جاؤں، کیونکہ اھدنا الصراط المستقیم جو ہے نا، وہ دکھانا انہوں نے، اور وہ صراط المستقیم پر چلا جارہاہے۔ اللہ نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ لوگ جن پر میں نے انعام کیا، وہ میرے بندے ہیں۔ خیر، تو میں اس تلاش میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ وہ بابے جو، جو سیدھے راستے پر چلتے ہیں، جو کبھی کسی منڈی میں نظر آجائیں، سڑک پر مل جائیں تو میں ان کو Follow کروں، اور جب تک میری سانس نہیں ٹوٹتی، میں ان کا پیچھا کروں، کیونکہ یہی میری زندگی کی آرزو ہے، کیونکہ میں اور جانداروں، جانوروں کے مقابلے میں ایک Human being ہوں، میں Animal of Soul ہوں۔ میرے اندر روح بھی ہے۔ بکرے، کتے، اور دوسرے جانوروں کے اندر جان ہوتی ہے۔ Spirit کہہ لیں ہوتی ہے، Soul نہیں ہوتی۔ میرے اندر اللہ نے Soul بھی رکھ دی ہے، اور پھونک اپنی ماردہ ہے، تو میں اس کی تلاش میں رہا اور یہی بات میں نے آپ سے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ کی ہے۔

تو آج میں آپ کو ایک آسانی بتانے لگا ہوں، اور اس کی مثال جو ہے اس علاقے سے۔ اس ٹیلیویژن سے ہے، جہاں پر میں نے ۱۹۶۴ء سے لے کر اب تک کا وقت کسی نہ کسی صورت میں گزارا ہے۔

میرے اوپر سب سے زیادہ گرفت اس کی بات ہوتی ہے کہ جناب ہم کو بھی بتائیں کہ بابا کہاں ہوتا ہے؟ ہم کو تو کبھی ملا نہیں۔ سچی بات ہے وہ صحیح کہتے ہیں کہ ہم کو تو ملا نہیں۔ کئی دفعہ تو یہ ہوتا ہے کہ میں گاڑی میں جارہا ہوں، تو ریڈ بتی آ جاتی ہے آگے۔ تو کوئی بندہ شیشہ نیچے کر کے کہتا ہے کہ اشفاق صاحب! وہ بابا ہم کو بھی بتائیں، اور پھر شیشے چڑھا لیتا ہے۔ تو وہ اس طرح سے کہتا ہے کہ جیسے میری دکان ہو گی تو میں بتا دوں گا کہ یہ اپنا فلاں سٹور ہے وہاں سے جا کر لے لیں۔ بابا کو تو تلاش بھی اور طرح سے کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی میں ابھی آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ وہ بابا جو ہوتا ہے، اچھے، خوش نصیب انداز کا بابا، جس کے پاس راستہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کی نگاہیں راستے کے اوپر رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی طریقے سے۔ اور وہ لکی ہوتا ہے، اور وہ آپ کے قریب، آپ کے ارد گرد۔ آپ کے لوگوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک ہوتا ہے، اور میری، اور آپ کی انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ایک ایسے آدمی کو بابا سمجھ لوں، جو میرا چپڑاسی ہے۔ یہاں پھنستی ہے بات۔ کیوں نہیں ملتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں جی کیا آج کل بھی بابا ہوتا ہے۔

اکثر لوگ کہتے ہیں۔ تو اس معاملے میں ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ جس ماضی

کا حال شاہد نہ ہو، وہ ماضی جھوٹا ہے۔

اس عہد کو شہادت دینی پڑے گی کہ پہلے کے جو لوگ گزرے ہیں، وہ ٹھیک تھے تو ایک آدمی ویسا یہاں ضرور ہے، پھر ہی کہے گا نا۔ ورنہ تو یہ کہانی ہی ہے نا۔ قصہ ہی ہے نا۔ تو وہ شاہد موجود ہوتا ہے۔ ان وہ مجھے، میرے جیسے اندھے آدمی کو، جس کے دیدے ہیں، اس کو کیوں نظر نہیں آتا، کیونکہ میرے اوپر انا کی، تکبر کی، استکبار کی ایک گہری تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں برانڈرتھ روڈ میں ایک دکان کرتا ہوں۔ وہاں کا جو بابا ہے، جس کے اوپر میں سامان صندوقڑی (صندوقچی) چکوا کر بھیجتا ہوں کہ جا فلانی دکان پر جا کے دے آ۔ یہ کس طرح سے بابا ہو سکتا ہے کہ میں اس کو کہوں، سلام۔ بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ نگاہیں میری نگاہیں، اس آدمی کو تلاش نہیں کر سکتیں، اور کبھی بھی تلاش نہیں کر سکیں گی۔ کیونکہ آپ کے، اور اس کے درمیان ایک گہرا پردہ لٹک رہا ہے۔

جب میں ۱۹۶۴ء میں ٹیلیویژن کے ساتھ متعلق ہوا۔ یہ ٹیلیویژن ۶۴ء میں آیا تھا تو میں ریڈیو میں کام کرتا تھا تو یہاں اسلم اظہر تھے۔ اس کے پہلے مدار المہام۔ تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا کہ اشفاق صاحب آئیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہم

ٹیلیویژن کھول رہے ہیں، اور انشاءاللہ یہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔ چونکہ آپ کا ریڈیو کا کافی تجربہ ہے، اس لیے آئیں دیکھیں کہ ڈرامہ کیسے کریں گے تو میں ڈر گیا کہ یا اللہ ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ میں تو کہیں باہر سے پڑھ کر بھی نہیں آیا۔ ہمیں پتا ہی نہیں کہ یہ سب کیسے ہو گا۔ تو اگلے دن میں کرسی پر بیٹھا تھا، اور اسلم صاحب اندر کچھ کام کر رہے تھے، اور مجھے ان سے ملنا تھا لیکن خوف دل میں بدستور قائم تھا، ڈرامے کے بارے میں یہ ڈرامہ کیسے لکھا جائے گا۔ یہ کیسے ہو گا، ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ تو جہاں میں کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے قریب ہی ایک اور بنچ تھا۔ اس کے اوپر اور نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو بھی ملنا ہے، تو اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو میں نے کہا کہ اچھا بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھر میں اندر چلا گیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ ڈسکس کرتے رہے، اور میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان بھی اندر چلا گیا ہو گا۔ اس نے بھی کچھ باتیں کی ہوں گی، اور وہ جس نوکری کے لیے آیا تھا، اسے اس نوکری پر رکھ لیا گیا۔ وہ صاحب کا ڈرائیور تھا۔ اس شخص کا نام میں آپ کو آج بتاتا ہوں، وہ گل حیدر تھا۔ وہ اس اسٹیشن میں اس چار دیواری کے اندر صاحب کی بڑی گاڑی چلانے پر مامور ہو گیا لیکن جب میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کے انداز سے، اس کے چہرے سے، اس کے ساتھ ایک دو

باتیں کرنے کے انداز سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا کہ یہ آدمی کچھ مختلف سا ہے۔ بہر کیف اس کی نوکری لگ گئی۔ چلتا رہا یہ سب۔ پھر ہم یہاں آتے رہے، اور وہ ملتا رہا۔ سلام کرتا رہا بڑے ادب کے ساتھ، اور ہماری اور اس کی گفتگو ہوتی رہی، لیکن میرے سارے ساتھی جو ۲۰۰۰ بندے یہاں کام کرتے تھے، ان کے مقابلے میں میری نگاہ مختلف تھی کہ یہ ڈرائیور جو ہے گل حیدر، یہ کچھ اور طرح کا ہے۔ لوگ اپنی تنخواہیں بڑھانے کے لیے نعرے مارتے تھے، جیسے چھوٹے ملازمین وغیرہ جو ہیں کرتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک کونے میں پرے کھڑا ہوتا تھا۔ تو میں کہتا تھا کہ گل حیدر تم بھی نعرے لگاؤ۔ وہ کہتا تھا نہیں صاحب! وہ سب کھڑے ہیں نا، وہ Community اپنی۔ لیکن اس کے اندر ایک احتجاجی رنگ نہیں اختیار کر سکا۔ پتا نہیں کونسی بات تھی یا کونسی بات نہ تھی کہ میں یوں کر کے کہہ دوں کہ یہی بات تھی، لیکن میں اس سے متاثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کے متعلق بات نہ کر کر کے اس سے اتنا خوفزدہ سا ہو گیا تھا کہ میرے اندر ادب کی وہ لہر جو ایک اچھے آدمی کے لیے دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ زیادہ دبیز ہو گئی، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے زیادہ Face کروں یا وہ میرے سامنے آئے۔ ایسے بھی ہوا کہ میں یہاں سے کوئی ایک دو پروگرام کر کے نکلا ہوں تو اسلم صاحب نے کہا کہ چلیں گل حیدر آپ کو چھوڑ دے گا۔

ڈرائیور تھانا۔ تو میں نے کہا کہ جی میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اور مجھے اسلم صاحب کہتے کہ کیوں جی کیا ہو گیا۔ یہ تو بڑا اچھا ہے۔ یہ ہمارے سارے لوگوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ بڑا Safe ہے اور بہت دھیمے مزاج کا آدمی ہے، تو میں کہتا کہ نہیں سر مجھے کسی اور کے ساتھ بھیج دیں، کیونکہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ خیر ان کو سمجھ نہ آئی میری بات۔ آج میں ایک بڑا عجیب سا راز آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں، جو شاید اگر آج یہ بات چیت نا ہو رہی ہوتی تو میں کبھی بیان نہ کرتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے میری انا، اور میرا تکبر اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس کے زیادہ قریب نہ ہوں جتنا کہ آدمی آ جایا کرتا ہے۔

میں ایک بڑا پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بڑا Well Placed ہوں، اور میرا رتبہ بہت ہے، اور لوگ مجھے بہت زیادہ سلام کرتے ہیں، لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ جتنی دیر وہ یہاں رہا، اور جتنی دیر میں وہاں رہا، اس کے سامنے اپنے آپ کو ایک معمولی انسان ہی سمجھتا رہا، اور مجھے یقین ہے، اور میرا ایمان ہے کہ میں ٹھیک تھا، اور میں سچائی پر تھا۔۔۔ اور میں حق پر تھا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ ہم یہاں پر کسی ڈرامے کی شوٹنگ کرنے کے لیے باہر گئے۔

کسی پانی کنارے، کسی دریا پر، راوی کے اوپر، تو وہاں پر گل حیدر کا جو بیٹا تھا۔ اس کو بھی انہوں نے Cable boy یعنی جو تار اٹھاتے ہیں مقرر کر دیا تھا۔ تو out door شوٹنگ تھی۔ گل حیدر کا بیٹا بڑا اچھا، بڑا پیارا سا، خوب صورت سا جیسے پٹھانوں کے بچے ہوتے ہیں، وہ تھا۔ بچہ کچھ شرارتی سا تھا۔ اس نے، جیسے بچے Rowdyism کرتے ہیں، پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب وہ ایسی خوفناک جگہ تھی کہ جہاں پر اس بچے کے ڈوبنے کا لوگوں کو ۱۰۰ فیصد خدشہ ہو گیا تھا، اور کسی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اسے نکالا جائے۔ جو تیرنا جانتے تھے، ان کی بھی نہیں تو اس Cable boy نے کیبل چھوڑ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی، اور جا کر اس کو پکڑ لیا۔ ڈوبنے سے اس کو بچا لیا۔ لیکن خود ڈوب گیا، اور سب لوگ جو شوٹنگ کے لیے وہاں موجود تھے، ان کے دلوں پر اس کا بڑا بوجھ تھا۔ اور ہم اس کے جسدِ خاکی کو لے کر گئے۔ ایک جیتا جاگتا اچھا بھلا آدمی لے کر گئے تھے لاش لے کر آ گئے۔ واپس لے کر آئے۔ اب میرے لیے اس کو Face کرنا مشکل ہو گیا، وہ ایک باپ تھا، اور اس نے بڑی امنگوں، آرزوؤں کے ساتھ اس کو پالا تھا، تو میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ میں ضرور جاؤں۔ تو آخر میں اس کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ گل حیدر یہ حادثہ ہو گیا ہے، اور مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ کہنے لگا، نہیں سر افسوس تو تب ہوتا جب یہ حادثہ ہوتا۔ یہ تو بس

اللہ کا حکم ہی ایسا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ صاحب اللہ کی کتاب ہوتی ہے نا۔ بس اس میں ایسے لکھا تھا۔ اب میں Faith کی بات کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ صاحب اس کا حکم تھا، اب ہم اس کے حکم کے آگے سر نہیں اٹھا سکتے۔ میں نے کہا، افسوس ہے۔ کہنے لگا، ہاں جی افسوس ہے۔ میں نے کہا کہ غم ہے، کہنے لگا، جی غم ہے۔ میں نے کہا شکایت ہے، کہنے لگا، شکایت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی شکوہ ہے۔ کہنے لگا، کوئی شکوہ نہیں۔ بس جی جب میں گھر جاتا ہوں تو میں بیٹھتا ہوں، مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں غم میں ڈوب سکتا ہوں، کرب میں مبتلا ہو سکتا ہوں، اپنے آپ کو پامال کر سکتا ہوں۔ لیکن شکایت نہیں کروں گا۔

میں نے بہت سا وقت اس کے قریب مختلف زاویوں سے گزارا کہ دیکھیے! ایک بڑی آدمی کو Face کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اور جب آپ کا اندر ماننے لگے، تو پھر تو اور بھی مشکل ہے۔ دیکھیے نا پولیس آفیسر آتے ہیں۔ ان سے لوگ ڈرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب آپ کا اپنا اندر ماننے لگے تو بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر کیف اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لمبا وقت گزر گیا۔ ٹائم کتنا سارا چلا گیا اور گل حیدر اس ٹیلیویژن کے دفتر سے، اس اسٹیشن سے ریٹائر ہو گیا، اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میں اب ریٹائر ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں کچھ موقع نہیں ملا۔ کچھ ٹائم نہیں ملا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دن وہ مجھے مل گیا، اور

وہ بہت خوش تھا۔ میں نے کسی ریٹائر آدمی کو اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے کہا کہ ریٹائر ہو گئے ہو۔ کہنے لگا، جی صاحب جی۔ میں نے کہا، آپ خوش ہیں۔ کہنے لگا کہ جی اللہ کا بڑا فضل ہے۔ میں نے کہا کہ اب تم کیا کرو گے۔ کہنے لگا، کہ سب سے پہلا کام میں یہ کروں گا کہ میں اپنا ڈرائیونگ لائسنس پھاڑ کے پھینک دوں گا کہ دوبارہ آرزو پیدا نہ ہو نوکری کرنے کی، ڈرائیوری کرنے کی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں خضاب نہیں لگاؤں گا۔ وہ لگاتا تھا روزانہ اپنے آپ کو سیٹ رکھنے کے لیے، اور تیسری بات یہ اس نے کہی کہ اشفاق صاحب میری بڑی آرزو ہے کہ اب میں دبا کر عبادت کروں۔ میں اکیلا بیٹھوں گا، اور اپنے اللہ سے کچھ باتیں کروں گا۔ یہ میری بڑی آرزو ہے۔ بڑا جی چاہتا ہے۔ بس وہ یہ تین خواہشیں تھیں اس کی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میرا دل سے اس کو سلام پہنچتا رہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری انا، آپ کا تکبر، آپ کی سوچ، ہمارا اپنے آپ کے اندر پھنسے رہنا۔ ہمارے قریب سے یقیناً اس قسم کے بڑے آدمی گزرتے رہتے ہیں، اور ہم پوچھتے رہتے ہیں کہ جناب ہم کو تو کوئی نہیں ملا۔ ہم نے اتنی بڑی انا کی لٹھ مونڈھے (کندھے) پر رکھی ہوئی ہے کہ کوئی قریب تو آئے ہم اس کا بوتھا (منہ) سینک دیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہم ایک دن تحریر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ کوئی ہم سے پوچھ رہا تھا کہ جو تحریر ہے، اس کو آپ کس طرح سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں کہ ایک تحریر صحافت کی ہوتی ہے، اور ایک تحریر ادب کی ہوتی ہے، اور ان میں کیا فرق ہے؟ تو میں ان سے یہی عرض کر رہا تھا کہ صحافت کی تحریر ایک وقائع نگار کی تحریر ہوتی ہے۔ وہ جو جو واقعات دیکھتا ہے، انہیں کے ساتھ کو دیکھ پرکھ کر ایک فریم ورک میں موجود کر کے لکھتا ہے، اور وہ سچ کے پیچھے، اور تحقیق کے پیچھے جانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اور سعی کرتا ہے، اور ان واقعات کو جو گزرے، وہ واقعات جو آنے والے ہیں، اور جس کے بارے میں وہ ان حال کے واقعات سے اندازہ لگاتا ہے، وہ صحافت کی تحریر کہلاتی ہے۔

اور جو ادیب ہوتا ہے، وہ اس حقیقت سے ایک رمز تلاش کرتا ہے۔ ایک مختلف حقیقت کی طرف جاتا ہے، جسے آپ Separate reality کہتے ہیں۔ ایک Reality تو وہ ہے جو آپ زندگی میں ہر روز ملاحظہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک

Reality، ایک حقیقت وہ ہے جس کو ایک صاحبِ نظر یا صاحبِ بصیرت آدمی اس کی تہہ تک پہنچ کر تلاش کرتا ہے۔ مثلاً درختوں کے پھل جب پکتے ہیں، اور پکنے کے بعد آخری مرحلے کو پہنچتے ہیں تو شاخوں سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور یہ ایک دنیا بھر کے سارے ملکوں میں، سارے علاقوں میں، ساری جگہوں پر ایک طے شدہ معاملہ ہے کہ اشجار پھلوں کو جب وہ پک جاتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن جب نیوٹن ایک بنچ کے اوپر بیٹھ کر اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر کے اس پھل کو جو پک چکا ہے، گرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ ایک Separate Reality بیان کرتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ Gravity ہے۔ ادیب بھی اس رمز کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو بین حقیقت میں موجود نہیں ہوتی۔ آپ سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے ایک بہت دیر کا پڑھا ہوا واقعہ یاد آیا، جو شاید ہم سب کو یہ بات سمجھنے میں مدد دے۔ ہمارے یہاں گولڑہ شریف میں مہر علی شاہ تھے۔ ان کا نام سے آپ سب واقف ہیں۔ ان کے صاحبزادے تھے غلام محیّ الدّین صاحب، جن کو عرف عام میں لوگ "بابو جی" کہتے تھے۔ وہ بابو جی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کو کوئی اپنی طبع علمی کے اظہار کا اتنا چاؤ نہیں تھا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضری دینے کی بڑی آرزو تھی، ایک دفعہ بڑی کوشش کر کے میں گولڑہ شریف پہنچا، دوپہر کا

وقت تھا۔ میں نے کہا کہ میں بابو جی سے ملنا چاہتا ہوں، تو انہوں نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں، لیکن چونکہ آپ لاہور سے آئے ہیں، اس لیے ان کو جگا دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، ایسی گستاخی نہیں ہونی چاہیے۔ میرا ملنا نہ ملنا کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھنا۔ ان کا سونا، وہ بہت ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں ان سے مل نہیں سکا، اور یہ حسرت میرے دل میں ہی رہی۔

باؤ جی جب بہت چھوٹے تھے، بالکل بچے تھے۔ آپ نے اگر گولڑہ شریف دیکھا ہو، اور اس کے قریب سے گزرے ہوں جو اسلام آباد والے ہیں، وہ تو روز ہی گزرتے ہیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ بستی کے عین ساتھ ساتھ ایک ریلوے لائن ہے۔ گاڑی بستی کے قریب سے گزرتی ہے، یعنی گولڑہ شریف کا، اور ٹرین کا ایک بڑا گہرا رشتہ ہے۔ گاڑی جب گزرتی تھی تو بابو جی اس گاڑی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ بہت چھوٹے تھے نا تو وہ گاڑی کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ ایسی گہری محبت میں مبتلا ہوئے کہ دُنیا مافیہا کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ وہ گاڑی کے عشق میں ہی مبتلا ہو گئے تھے، اور اسے دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس کو ایک انگریز چلا رہا ہے۔ پیچھے جو جھنڈی ہلانے والا ہے، وہ بھی انگریز ہے، اور جب وہ جھنڈی ہلاتا ہے تو گاڑی Whistle دیتی ہے، اور پنڈی کی طرف روانہ ہوئی ہے بابو جی۔ پہلے تو کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے تھے، اور گاڑی گزرتی تھی۔

جب اس چھوٹے بچے کا، اس معصوم کا ہاتھ ہلانا، اور ہر روز اس گاڑی میں استغراق دیکھا، تو جو ڈرائیور تھا وہ بھی جواب میں ہاتھ ہلانے لگا۔ انگریز میں یہ خوبی بڑی تھی، اور آج بھی ہے۔ پھر انہوں نے کیا کیا کہ ایک چھوٹا سا ڈنڈا لیا، اور اس کے اوپر گرین کپڑا باندھ کے اس کی جھنڈی بنائی، اور جیسے ریلوے اسٹیشن پر جھنڈی لہرا کر گاڑی کے نکاس کی اجازت دیتے ہیں نا، یہ بچہ بھی وہاں کھڑا ہو کے گرین جھنڈی ہلاتا تھا، اور وہ گاڑی جاتی تھی۔ کچھ دنوں تو یہ کھیل رہا، پھر اس کے بعد جب وہ گرین جھنڈی ہلاتے تھے تو ڈرائیور Whistle دیتا تھا کہ Yes Sir آپ کا Order بھی ہم نے تسلیم کیا، اور ہم گزر رہے ہیں۔ وہ جھنڈی ہلاتے رہے۔ گرین جھنڈی کے ساتھ گاڑی وہاں سے گزرتی رہی۔ پھر ان کو ریلوے اسٹیشن پر جانے کے بعد پتا چلا کہ ایک چیز سگنل بھی ہوتی ہے، اور جب سگنل ڈاؤن ہوتا ہے تو گاڑی گزرتی ہے، اور جب Up ہوتا ہے۔ تو گاڑی نہیں گزرتی۔ چنانچہ انہوں نے لکڑیاں وکڑیاں جوڑ کے اپنے مریدوں سے کہہ کہلوا کے رسیاں ٹاکیاں لے کے ایک لکڑی کا بڑا سا سگنل بنایا، اور اس کو گھر کے کوٹھے کے اوپر لگا دیا، اور انہوں نے تناؤ باندھ لی۔ اب جب گاڑی آنے کا وقت ہوتا تو وہ رسی ڈھیلی کر دیتے تھے۔ سگنل ڈاؤن ہو جاتا تھا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی، اور Whistle دیتی ہوئی وہاں سے گزر جاتی تھی۔ اس چیز نے ان کو بڑا

مشکل میں ڈال دیا، اور ٹائم کا پابند بنا دیا۔۔۔ کیونکہ بھئی ظاہر ہے کہ گاڑی تو وقت پر گزرتی ہے، اور ان کو رات کو جاگنے پر بھی مامور کر دیا، کیونکہ رات کو بھی جاگنا پڑتا تھا، تو پھر گاڑی ان کا سگنل Receive کر کے گزرتی تھی۔

تو ایک دفعہ شام کے وقت جب وہ کھیل رہے تھے تو وہ بھول گئے، اور سگنل up رہ گیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کھیلتے رہے تو وہ جب انگریز نے سگنل up دیکھا تو گاڑی اس نے روک دی کہ سگنل up ہے۔ تو میں کیسے گزر سکتا ہوں، اور اس نے بڑی Whistles دیں، اور جب اس نے وسلیں دیں تو یہ اپنا کھیل چھوڑ کر بھاگے، اور جا کر سگنل کو ڈاؤن کیا، اور گاڑی۔۔۔ چھکا چھک۔۔۔ چھکا چھک۔۔۔ دوڑنے لگی۔ جب تک یہ سگنل ڈاؤن نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کی محبت میں مبتلا صاحب جو تھا، وہ ان کو ویسے ہی جواب دیتا تھا جیسا کہ ایک ڈرائیور کو اپنے سگنل مین کا جواب دینا چاہیے، اور وہ اس کے عشق میں مسلسل مبتلا چلے جاتے رہے جو مرید حضرات پیر مہر علی شاہ صاحب کے پاس آتے تھے، اور صاحبزادہ کو دیکھتے تھے ان میں گوالیار کے کوئی صاحب تھے۔ نام تو مجھے ان کا یاد نہیں کیونکہ بڑی دیر کی بات ہے، تو انہوں نے کہا کہ صاحبزادے آپ اس کالے کلوٹے (انجن) کے عشق میں کیوں مبتلا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آگ کھاتا ہے۔ انگارے ہضم کرتا ہے۔ اپنی جان پر دکھ سہتا ہے،

اور یہ دکھ سہ کر جس منزل کا تہیہ کر تا ہے، اس کی طرف جاتا ہے۔ دوسرے یہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ جس منزل کا ارادہ کرتا ہے، اس پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اب اگر اس نے یہ تہیہ کیا ہے کہ میں سمہ سٹہ جاؤں گا تو کوئی طاقت اس کو نہیں روک سکتی، اور تیسی صفت یہ ہے، اور سب سے پیاری بھی کہ جس نے مجھے اس عشق میں مبتلا کیا کہ یہ First class کے ڈبے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے، اور Third class کے ڈبے کو بھی، اور گندی بوگی کو بھی لے کر چلتا ہے۔ یہ یہ نہیں کہتا کہ تو یہاں رہ، میں تو First class کے ڈبے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ یہ صراطِ مستقیم کا مال ہے۔ نہ ایک انچ ادھر جاتا ہے، نہ ایک انچ ادھر۔ جو راستہ اس نے طے کر لیا ہے، اس کے اوپر چلتا ہے۔ اب انجن تو ہم سب نے دیکھا ہے، لیکن جو Separate reality اس نوجوان لڑکے نے اس کی بیان کی ہے، وہ ایک اور Reality ہے۔ تو یہ Reality ہے جو ہم لکھنے والے، چھوٹے بڑے درجے کے اس کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ایک حقیقت تو یہ ہے جو ہمارے سامنے چلی آرہی ہے، اور یہ ایک حقیقت وہ ہے جو کہیں، اور پوشیدہ ہے۔

سائنس کے اسٹوڈنٹس یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ جیسے معلوم کی دنیا ہے ایسے ہی نامعلوم کی دنیا بھی ہے۔ اور جو اس کو تسلیم نہیں کرتا، اس کی سوچ

بڑی محدود ہو جاتی ہے، کیونکہ لا معلوم کی دنیا پھیل جاتی ہے اور جب کہ اللہ نے فرمایا کہ "ہم نے آپ کو علم دیا ہے۔ الا قلیلا۔۔۔۔یعنی تھوڑا سا دیا ہے تو باوجود اس کے کہ اس کا Separate Reality سے جس کا کہ میں ذکر کر رہا ہوں، کوئی ایسا قریب کا تعلق نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی میں آپ کو تسلیم و رضا کی خو ڈال کے، کچھ ایسے خفیہ راز بھی بتا دیتا ہوں جو میری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں ایک لکھنے والا ہوں۔ جیسا کیسا بھی ہوں، میں بھی جانتا ہوں، اور آپ بھی جانتے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی فخر کی بات نہیں ہے، لیکن انسان کے اندر ایک چیز ہوتی ہے، اور وہ اسے محسوس کرتا ہے کہ شاید مجھ سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔ مجھے ایک دن خیال آیا اور میں نے سوچا کہ میں لکھنے والے کی حیثیت سے , Broadcaster کے انداز سے کچھ تھوڑا سا معروف آدمی ہو گیا ہوں، اور لوگ مجھے جانتے ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنا معروف ہو گیا ہوں، اور لوگ مجھے کتنا جانتے ہیں، تو میں نے اس کا ایک ٹیسٹ نکالا۔ میں نے ایک کارڈ لیا خالی اور میں نے اس کے اوپر لکھا کہ۔

محترمی جناب اشفاق صاحب!

آپ سے ملنے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ اللہ کرے، آپ سے ملنے کا کبھی کوئی موقع ملے

وغیرہ وغیرہ۔۔۔!!

جیسے اپنے Fans وغیرہ کو خط لکھے جاتے ہیں نا۔ ویسے ہی میں نے بھی لکھا، تو اب جو میں نے ایڈریس لکھا تو وہ یہ تھا کہ "اشفاق صاحب مشہور ڈرامہ نویس۔ لاہور" باقی Details نہیں دیں کہ میں کس محلے میں رہتا ہوں۔ لکھ کر میں نے اس کو سپردِ ڈاک کر دیا، تو وہ تقریباً تین دن کے بعد مختلف مہریں لگا ہوا مجھے مل گیا۔ اس میں بہاولپور کی مہر بھی تھی۔ رحیم یار خان کی بھی تھی، اور مختلف جگہوں کی تھیں، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یا اللہ یہ بڑے کمال کی بات ہے، اور میں ماشاءاللہ کافی معروف آدمی ہوں۔ تین دن کے بعد ملا، لیکن ملا تو سہی۔ اب اتفاق دیکھیے، اور قدرت کی ایک Reality کو اجاگر کرنے کا ایک انداز ملاحظہ فرمایئے۔ تقریباً ایک مہینے بعد یا ۱۵۔۲۰ دنوں کے بعد مجھے ایک لفافہ ملا۔ بڑا اچھا سا۔ خوب صورت سا، اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ "اشفاق احمد۔ بکواسی Broad Caster کو ملے"۔۔۔۔اس پر نہ لاہور لکھا تھا، اور نہ میرے گلی محلے کا نام۔۔۔اس کے اوپر صبح ۹:۳۰ کی راولپنڈی کی مہر تھی، اور شام ۴:۳۰ کی اس کی Delivery کی مہر تھی۔ یعنی اسی دن وہ مجھے مل گیا، یعنی بظاہر اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن میں کبھی کبھی رمز کے انداز میں سوچتا ہوں کہ جب رمزیں واضح ہونے لگتی ہیں۔ تو کئی کئی طریقوں سے۔۔۔ عجیب عجیب انداز

سے کھلتی ہیں تو لکھنے والوں کے لیے، اور غور کرنے والوں، اور محسوس کرنے والوں کے لیے اس Separate Reality کی طرف نگاہ کرنا، اور نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ وہ اس Reality ، کو اس مختلف حقیقت کو جان کر پھر اپنے لوگوں کے قریب آسکتے ہیں۔ جو لوگ صرف ایک ہی حقیقت کے مارے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پھر ایک ہی لائن پر چل سکتے ہیں۔ ان کو کبھی ان لوگوں کی تکالیف کا اندازہ نہیں ہو سکتا جن کی تکالیف ان سے مختلف ہوتی ہیں، بلکہ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے جیسی تکالیف ہوں تو ان کا بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے۔

چونکہ ابھی تحریر کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، لیکن ہمارے زاویہ میں ہر طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، اور ہم اس پر ہر ایک زاویہ سے، ایک اور Angle سے غور کرتے رہیں گے۔ یہ تو تھی میری بات، جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی، اور آپ کے سامنے پیش کر دی، لیکن اب میرا ابھی ایک مسئلہ ہے جو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا، اور اسے حل کریں گے۔ کوئی ایسا پیچیدہ تو نہیں ہے، لیکن اکثر مختلف مقامات پر، مختلف اوقات میں وہ مجھے، آپ کو، ہم سب کو گھیرے میں لیے ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر نوجوان لڑکے، لڑکیاں خاص طور پر

اس بات کا اعادہ کرتی ہیں۔ کہ اس دنیا میں مجھے کوئی سمجھ نہیں سکا اور افسوس کہ کسی نے میری حقیقت کو نہیں جانا۔ آپ کی اردو شاعری بھی اس سے بھری پڑی ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

لوگوں کو یہ شکایت عام ہے کہ میرے دل کو کوئی نہیں سمجھتا۔ تو یہ فرمایئے کہ یہ بات کس حد تک درست ہے؟ کیا واقعی آدمی دوسرے آدمی کو نہیں سمجھتا؟ کیا واقعی نا سمجھے جانے والے انسان کے پاس اتنا کچھ ہوتا ہے کہ جس سے دوسرا آدمی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہوتا؟ کیا واقعی نا سمجھے جانے والے انسان کا وجود اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر ہر وقت روتا پھرتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہے؟

حاضرین میں سے: اشفاق صاحب! بات یہ ہے کہ اگر آپ نے شاعروں کا حوالہ نہ ہوتا تو میں بڑی سخت بات کرتا لیکن آپ نے شاعری کا حوالہ دیا ہے تو مجھے نسبتاً نرم رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی گمراہ ہو تو دوسروں کو بھی جہالت میں مبتلا کر دیتا ہے، اور ان کو اپنی ہی نظروں میں چڑھا دیتا ہے، اور

وہ اپنی نظروں میں چڑھتے چلے جاتے ہیں، اور دنیا کی نگاہوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جو لوگ اپنی نگاہ میں خود ہی چڑھتے چلے جاتے ہیں، وہ عموماً سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں مگر دنیا ہمیں نہیں سمجھ پائی، یہ ان کی ایک بہت عجیب سی صورتِ حال ہے۔

اشفاق احمد: آپ اختر عباس! کیا سمجھتے ہیں کہ یہ رویہ درست ہے؟

اختر عباس: سر بات یہ ہے کہ توجہ طلبی کا سارا مسئلہ ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے دنیا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہمارا مشاہدہ زیادہ تیز ہے، اور اسے شیئر کرنے والے زیادہ ہونے چاہئیں کیونکہ لوگ ان سے شیئر نہیں کرتے۔ ان سے پوچھتے نہیں ہیں تو پھر وہ شکوے سے بھرے ہوئے بولتے ہیں۔

اشفاق احمد: ویسے یہ گلہ بڑا عام ہے اختر عباس صاحب!

اختر عباس: لیکن سر یہ گلہ بے جا ہے۔ میری اپنی Feeling یہ ہے کہ یہ بے جا ہے۔ اس پر اس طرح سے اصرار کرنا نہیں چاہیے۔

اشفاق احمد: آپ خالد صاحب کیا سمجھتے ہیں؟

خالد صاحب: سر میرا خیال ہے کہ جب ایک فرد اپنے مفادات کے مطابق Society میں عمل کرنا چاہتا ہے اور سامنے والے افراد اپنے مفادات کے

مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں اور جب دونوں کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو جو ہارتا ہے یا جس کے مفادات ضرورت کے مطابق پورے نہیں ہو پاتے، تو وہ شکوہ کناں ہو جاتے ہیں۔ لیکن۔۔۔۔میرے خیال میں ایسے آدمی کی اپنی Personality میں کمی ہوتی ہے۔ وہ صحیح طور پر سمجھا نہیں پاتے یا اس کی Personality واضح نہیں ہو پاتی، تو وہ اس کا گلہ عوام النّاس سے کرتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں سمجھتا ہے۔

اشفاق احمد: آپ لوگوں نے کبھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسا اعلان کیا؟

ایک سامع: اشفاق صاحب! ہوتا ہے اکثر۔۔۔۔اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ ہر بندے کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے۔۔۔۔ایسا موڑ آتا ہے کہ جب وہ Emotional ہو جاتا ہے تو وہ سمجھا نہیں پاتا، لیکن جب وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے تو وہ خود ہی Realise کرتا ہے کہ اس میں میری ہی خامی تھی۔ تب وہ بندہ خود ہی مصنف ہوتا ہے، لیکن Emotional ہونے کی صورت میں وہ دوسروں کو Blame دیتا ہے۔ کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ اس میں ضروری نہیں کہ ان میں پڑھے لکھے لوگ ہی شامل ہوں۔ وہ خواتین جو بہت تعلیم یافتہ نہیں ہوتیں، وہ بھی یہ شکایت کرتی ہیں۔ اپنی

پڑوسیوں سے کہ مجھے کوئی سمجھنے والا ملا ہی نہیں ہے۔

تو وہ جذباتی ہوتی ہیں نا اس لیے ایسا سوچتی ہیں۔

لیکن (اشفاق صاحب) ہم سب کا جو Angle ہے، وہ شاید بڑا محدود ہو۔ آپ کی نظر مختلف حوالوں سے مختلف چیزوں پر، لوگوں پہ زیادہ پڑی ہے اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑا اپنے حوالے سے، اپنے مشاہدے کے حوالے سے بتائیں کہ آپ کو اس کی کیا وجہ لگتی ہے، اور اس کو کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے، تا کہ اس کا عملاً بھی کوئی فائدہ ہو۔

اشفاق صاحب: اختر عباس صاحب! میرے ایک استاد تھے، جب میں روم میں تھا۔ اس کا نام تھا او نگاریتی۔۔۔۔ پروفیسر او نگاریتی۔۔۔۔ میں ان کی باتیں بیان کرتا رہوں گا۔ ان کو ہم پروفیسر کہتے تھے، لیکن یہ پروفیسر سے اوپر کا درجہ تھا۔

جب وہ تشریف لاتے تھے تو ہم سارے کے سارے، کسی کے پاؤں میں بوٹ ہے، کوئی ننگے پاؤں ہے۔ کوئی پنکھے کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے تھے، اور سب ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ آ گئے ہیں اٹھو سب، پروفیسر او نگاریتی، اور وہ تھے Pop Lorlate اٹلی کے۔۔۔ اب ان کے دو کتابیں آئی ہیں ترجمہ ہو کے۔ جب کوئی مشکل ہمیں پڑتی تھی تو ہم ان سے اس قسم کے

سوال کرتے تھے جیسا کہ آپ نے پوچھا ہے کہ آپ کا بہت وسیع مشاہدہ ہے۔

ایک دفعہ ایک پروفیسر کا اس بیوی سے بڑا شدید جھگڑا ہو گیا، اور اس میں بہت حد تک وہ خاتون ٹھیک بھی تھیں۔۔۔۔تو جب جھگڑا زیادہ ہو گیا، اور یہ معاملہ سٹاف روم میں پروفیسر اونگاریتی کے پاس پہنچا، تو انہوں نے کہا کہ دیکھو جھگڑا اپنی جگہ، لیکن تم قوت کے سارے اعضاء جو ہیں، ان کو استعمال کیا کرو۔۔۔۔اور خاتون سے کہنے لگے کہ بی بی تم صرف آنکھیں استعمال کرتی ہو، پپوٹے استعمال نہیں کرتیں، تو جب تک یہ نہیں ہو گا ساتھ، اس وقت تک کام نہیں ہو گا۔

تو ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ آدمی کہتا ہے کہ زندگی میں مجھے کوئی سمجھا ہی نہیں ہے، اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ اس شخص کو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی کمینگیاں، اور حماقتیں، اور نالائقیاں لوگوں کے سامنے نہیں آئی ہیں۔ اسے اللہ کا شکر ادا کر کے سونا چاہیے، اور یہ شکوہ بھی نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ مجھے سمجھتے نہیں۔

آپ کا بہت بہت شکریہ اور جو میرے ساتھی ہیں، وہ بھی شکریے کی اس ادائیگی میں میرے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم

کرنے کا شرف عطا کرے۔

تائی کریم بی بی اور الیگزینڈر فلیمنگ

میرا بیٹا سائیکالوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے امریکہ گیا ہوا ہے تو اس کی ڈاکٹریٹ میں ذرا دیر لگی میرے حساب سے۔۔۔۔۔ تو میں ایک احساس والے باپ کی طرح ناراض ہوا کہ بھئی اتنی دیر کیوں لگائی ہے۔۔۔۔۔ آپ لوگ بھی کبھی کبھی گھر میں ناراض ہوتے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس سے جا کے پوچھوں کہ کیا بات ہے۔ پچھلے سے پچھلے سال میں وہاں گیا، تو اس کے Head of the Department سے ملا، تو انہوں نے کہا کہ نہیں، یہ تو بڑا Perfect ہے۔ کوئی شکایت نہیں، بلکہ ہم تو یہ چاہیں گے کہ یہ اور کچھ دیر ہمارے پاس رہے، اور ہم اس سے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ یوں میرے تسلی ہوگئی۔

یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے میں اس کی کار میں بیٹھا تھا، اور وہ کار چلا رہا تھا۔ ہماری گاڑی سے آگے ایک اور شخص گاڑی لے جا رہا تھا، اور وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا، اور ہچکولے بھی کھا رہا تھا، تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ہارن بجاؤ، اور اس کو ایک طرف کرو۔ تو اس نے کہا کہ ابو میں ابھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ بھئی آپ اس کو ہارن دیں۔ تو وہ کہنے لگا کہ ابو یہاں ہارن دینے کا

رواج نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو Silence Zone ہوتا ہے، یہ تو ویرانہ ہے۔ تو اس نے کہا کہ بس ہارن نہیں دیتے ہیں نا۔ میں نے کہا کہ کیوں نہیں دیتے، کہنے لگا، کہ میں اس لیے نہیں دیتا ہوں کہ یہ آگے جانے والا مجھ سے عمر میں ذرا بڑا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے نئی گاڑی چلانی سیکھی ہو، اور میں اگر ہارن دوں گا تو وہ گھبرا جائے گا، اور اس کا نقصان ہو گا، تو میں یہ نہیں چاہتا۔ میں نے کہا کہ دفع کرو، اس کا نقصان ہوتا ہے تو ہو، تمہیں اس سے کیا۔ بجا ہارن، اور اس کو ہٹا۔ کہنے لگا، کہ نہیں۔۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں ابو۔ یہ ذرا مشکل ہے۔ میں یہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ یہ میرا Colleague ہے۔ اور میں نے کہا، اچھا۔ کیا یہ یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ پڑھتا ہے یا پڑھاتا ہے۔ ان نے کہا کہ نہیں، پڑھتا پڑھاتا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تمہارا Class Fellow ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں، ابو یہ میرا Class Fellow نہیں ہے، بلکہ یہ میرا Road Fellow ہے۔ ہم ایک ہی سڑک پر جا رہے ہیں۔ اس رشتے سے ہم ایک دوسرے کے Fellow ہیں، ہم اسے تنگ نہیں کر سکتے۔ تو میں نے کہا کہ بیوقوف! تجھے یہ علم حاصل کرنے کے لیے یہاں بھیجا تھا نالائق آدمی۔ تم کو کہا تھا کہ Ph.D. کر کے آؤ۔ یہ تو تم بالکل ہی میاؤں میاؤں سے ہو گئے ہو۔ یہ کتنی بری بات ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو واپس اپنے گھر لاہور چلو، اور

بے صبری کی زندگی بسر کرو، اور وہاں کا ٹریفک دیکھو۔ یہاں آکر تو تم بالکل نالائق ہو گئے ہو۔ اس آدمی کو اپنا Road Fellow بتا رہے ہو، اور اس کی عزت افزائی کے لیے، اور اس کو نقصان نہ پہنچانے کے لیے یہ سب کر رہے ہو۔ ہم تو وہاں ذرا کوئی قریب آجائے تو ایسے دھکا دے کر گزرتے ہیں کہ اس کی جان نکال دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ صبر کی بات تم نے کہاں سے سیکھی۔ اس نے کہا کہ صبر ہمارے ہاں عام ہے۔ بلکہ ہمارے مسلمانوں میں تو صبر کی بہت تلقین ہے۔ اور ہم اسے پڑھتے تھے، لیکن اس کو گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہاں آکر مجھے عملی زندگی کا پتا چلا کہ صبر کے کیا معنی ہیں، اور اس کے کیا فوائد ہیں، اور یہ انسانی زندگی کو کس قدر استحکام عطا کرتا ہے۔ یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ اللہ جو ہے، آپ اس پر پورا پورا بھروسہ رکھیں اور اللہ جو ہے، وہ آپ کے ہر مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ کے خالق کے طور پر موجود ہے، اور "لا تقنطو من رحمت اللہ۔" اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا چاہیے، جب تک آپ کے ہاتھ میں صبر کی ڈوری نہیں ہو گی۔ اس وقت تک آپ لا تقنطو کے معنی نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں نے کہا کہ بھائی یہ تُو کچھ عجیب سی بات کر رہا ہے، میں دین کے بارے میں اتنا گہرا مطالعہ نہیں رکھتا۔ جتنا کہ تو مجھ سے بات کر رہا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ عمل ہو، تیزی

ہو۔ آگے بڑھنے کے لیے کچھ کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ ایک آئرن ہوتی ہے۔ آئرن جسے کہ Anvil کہتے ہیں۔ جس کے اوپر لوہار لوہار کھ کر کوٹتے ہیں تو وہ بے بس کر دینے کا سب سے بڑا Symbol ہے نا۔ اس نے کہا کہ جب لوہار آئرن کے اوپر چیزیں کوٹتا ہے تو کئی ہتھوڑے ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن آئرن اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

جب صبر کی اس نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں اپنا بچپن آ گیا کہ میرے گاؤں میں ایک ہماری تائی تھی۔ تائی میری اصلی تو نہ تھی، لیکن گاؤں کی تائی سب کی تائی ہوتی ہے۔ جب میں آٹھویں میں ہوا تو میں اپنی تائی سے اچھے طریقے سے ملا۔ اس کا خاوند تیلی تھا، وہ فوت ہو چکا تھا۔ میری پیدائش سے پہلے فوت ہو چکا تھا، جس وقت تایا فوت ہوئے، اس وقت تائی کی عمر کوئی 19 برس تھی۔ تائی کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ میں اپنی زندگی خود بناؤں گی، اور ان دو بچوں کا بوجھ اللہ کے فضل سے ساتھ لے کر چلوں گی، لیکن کام تو مشکل تھا۔ بیل کی نگہداشت کرنا، کولہو چلانا، تیل پیلنا اور پھر اس کے بعد شام کے وقت کندھا لگا کے اس کو نکالنا۔ بہت مشکل کام تھا، یہ کام ایک بہت تگڑا اور تنومند مرد کر سکتا تھا۔ تو میں جب اس سے ملا تو وہ میرے لیے ایک ایسا کردار تھی جیسا کہ آپ نے ریڈرز ڈائجسٹ میں عام طور پر

The most unforgettable character I ever met پڑھا ہو گا۔

میں نے دیکھا کی تائی کے پاس ایک چھوٹی سی رنگین سی پیڑھی تھی۔ وہ ہر وقت اس کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ بیل کے پیچھے چل رہی ہے تو پیڑھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ کھانا پکا رہی ہے تو پیڑھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ رنگین سی، بڑی خوبصورت سی تھی۔ کوئی بھی کام کر رہی ہے تو پیڑھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کو ہر وقت اپنے قریب ترین رکھتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں اس سے پوچھا نہیں، لیکن میں اس سے متاثر ضرور تھا کہ یہ ایک نئی طرز کی چیز ہے جو اس نے بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔

ایک دن جب اس نے مجھے ساگ اور روٹی دی، اور میں قریب رکھی پیڑھی پر بیٹھنے لگا، تو اس نے کہا کہ نہیں پت (بیٹا) اس کے اوپر نہ بیٹھنا۔ دوسری دو پڑی ہیں، ایک چھوٹا سا موڑھا بھی پڑا ہوا ہے۔ تو میں نے کہا کہ تائی اس کے اوپر کیوں نہ بیٹھوں۔ تو اس نے کہا کہ یہ بڑی ادب والی پیڑھی ہے۔ کہنے لگیں جب تیرا تایا فوت ہوا تھا، اور میں 19 برس کی بیوہ تھی، ایک لڑکی سی تھی نا تو میرے اوپر مشکلات کا ایک پہاڑ ٹوٹا تو ہمارے گاؤں کے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ کریم بی بی فکر نہ کرنا۔ اللہ جو ہوتا ہے وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان اللہ مع الصابرین اگر تو صبر کرے گی تو اللہ تیرے ساتھ ہو گا، اور اللہ سے

بڑی Company کس کی ہو سکتی ہے۔ کہنے لگی کہ میں بڑی خوش ہوئی، اور میں نے تہیہ کیا، اور میں نے دو رکعت نماز نفل پڑھے، اور میں نے کہا "اے اللہ مجھے تقویت عطا فرما کہ میں صابروں میں سے ہو جاؤں، اور صابرانہ زندگی بسر کروں۔" چنانچہ اسی تہیہ کے ساتھ میں نے زندگی بسر کرنا شروع کر دی، اور میں کرتی رہی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیا واقعی اللہ ہر وقت میرے ساتھ موجود ہے۔ یہ خیال آنے کے ساتھ ساتھ میرے اوپر ایک ذمہ داری عائد ہو گئی کہ اللہ جب موجود ہے، تو ہے، آتا بھی ہے تو میں اس کو بٹھاؤں گی کہاں؟ اللہ کے لیے تو ایک اچھی سی کرسی ہونی چاہیے نا۔ وہ میرے ساتھ جو ہے تو میں نے ایک پیڑھی لی۔ بڑی اچھی سے، رنگین سی، اور اس کے اوپر یہ نوار لگائی، اور میں اس کو ہر وقت ساتھ رکھتی ہوں۔ چونکہ "ان اللہ مع الصابرین" اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہے۔ اس لیے ہم میں سے کوئی بھی اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ صبر کی ایک کہانی میرے سامنے ہے، میری زندگی کے درمیان سے ہو کر گزری ہے، تو پھر مجھے خیال آیا کہ یہ جو میرا بیٹا ہے، یہ ٹھیک ہی کہتا ہے، اور اس کی یہ بات وزن رکھتی ہے، لیکن میری زندگی کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ دبادب "چھیتی"، زیادہ جلدی، ترقی کرنے کی

خواہش کرنا، زیادہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنا، اور سہ استحکام، اور وہ خوبی نہیں ملتی تھی جو انسان کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے، لیکن ذہن میں یہ خیال آ چکنے کے بعد بھی میرا جو دل ہے وہ اس پر ٹکا نہیں۔

پھر میں جب امریکہ سے یہاں آ گیا، تو میں یہاں آ کر سوچا کہ مجھے کسی مولوی سے یا کسی دین کے معاملات کو گہرائی سے سمجھنے والے سے یہ پوچھنا چاہیئے کہ صبر کیا ہوتا ہے۔ اور کیا کرنا چاہیے اس کے لیے۔ تو میرے ایک دوست تھے مولوی موسیٰ۔ وہ بہت چھریرے بدن کے آدمی، بہت پیارے مولوی، بڑے Enlighted بڑے عجیب طرز کے آدمی تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میری ان کے ساتھ وابستگی کیسے ہوئی۔ جس زمانے میں میں سمن آباد رہتا تھا، یہ لاہور کا ایک علاقہ ہے۔ وہاں جمعہ کی نماز میں جس مسجد میں پڑھنے جاتا تھا وہاں مولوی موسیٰ جو تھے، وہ نماز پڑھاتے تھے، اور خطبہ دیتے تھے۔ وہاں ایک دفعہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے، اور منبر پر کھڑے تھے، اور لوگ بالکل چوکس ان کی باتیں سن رہے تھے، اور وہ خطبہ یہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ نے کہا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا میں ان سے بکرے کے گلے کی رسی تک لے کر رہوں گا، کیونکہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔ سب انکاری ہو گئے تھے نا کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیتے۔ پیسوں کے معاملے

میں انسان کمزور ہوتا ہے۔ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ نے یہ بات غصے سے کہی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ نے کہا، اے امیر المومنین! ذرا آپ رکیں، اور اس کے اوپر غور فرمالیں، تو انہوں نے غصے سے کہا" اے عمر رضی اللہ ! یہ تیرے منہ سے میں کیا سن رہا ہوں۔" جب مولوی صاحب نے یہ بات کی، تو پیچھے ایک مڈل سکول میں کچھ بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ زور سے کسی نے کک جو ماری تو وہ فٹ بال ہوا میں تیرتا ہوا، اچھلتا ہوا مسجد کے صحن میں آ گرا۔ جہاں ہم سب نمازی بیٹھے تھے۔ تو مولوی صاحب منبر پر کھڑے تھے۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کے Rowdyism کے، وہ ہم کو چھوڑ کے باہر نکل گئے۔ وہاں فٹ بال پڑا تھا۔ تین قدم پیچھے ہٹ کر انہوں نے اتنی زور سے کک لگائی کہ وہ دو بلڈنگ طے کرتا ہوا واپس سکول میں جا گرا جہاں سے بچوں نے کک مار کر اس کو مسجد میں گرا دیا تھا، اور پھر وہ آ کر منبر پر کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ " اے عمر رضی اللہ !تُو یہ کیا کہہ رہا ہے اور میں حیران ہر رہا ہوں کہ جاریہ کے زمانے میں تو تُو اتنا مضبوط تھا، اور جب کہ یہ معاملہ درپیش آیا ہے تو اتنا نحیف ہو رہا ہے۔ مجھے قسم ہے اللہ کی کہ جو حکم مجھے دیا گیا، میں اس پر پورا عمل کروں گا۔"

میں نے کک مارتے ہوئے ایک مولوی کو دیکھا تو عجیب سا لگتا ہے نا۔ جب خطبہ

ختم ہو گیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب یہ سب ۔۔۔۔۔۔! تو کہنے
لگے کہ وہ بچے کھیل رہے تھے، اور بچوں کا شوق ہوتا ہے تو ان کا فٹ بال آ گرا
تھا، تو وہ بچے خوفزدہ تھے کہ مسجد میں کیسے جائیں۔ بڑے بزرگ لوگ جھڑکیاں
دیتے ہیں نا۔ تو یہاں بھی بہت سے ایسے لوگ ہوں گے۔ میرے دل میں خیال
آیا کہ ان کا فٹ بال تو ان کو واپس ملنا چاہیئے نا۔ تو میں نے وہاں جا کر کک لگا دی۔
اور اس کو واپس پھینک دیا۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب میں آپ کی تلاش میں
ہوں۔ مجھے یہ بتائیے کہ صبر کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اشفاق صاحب! آپ
وہاں سے سٹارٹ لے سکتے ہیں کہ جب بہت ٹریفک ہو، اور جب گاڑیوں میں
گاڑیاں پھنسی ہوئی ہوں، آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو، اور آپ اپنی کار چلا رہے
ہوں تو آپ پیں پیں نہ کریں۔ ہارن نہ بجائیں بلکہ Steering پر اپنی انگلیاں
بھی بے چینی کے عالم میں نہ بجائیں اس کو صبر کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر ہم کیا
کریں۔ کہنے لگے کہ بجائے اس پر انگلیاں مارنے کے یا کسی کو جھڑکنے کے آپ
اس وقت ورد شروع کر دیں۔ اللہ کا ذکر کیونکہ یہ آپ کو آسانی دے گا۔ آپ
اس وقت آرام سے ''یا لطیف، یا ودود'' پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ ٹریفک میں
پھنسے ہوئے ہوں تو بے چینی کا مظاہرہ نہ کریں، کیونکہ ایک مسلمان کو یہ زیب
نہیں دیتا کہ وہ بے چین ہو، کیونکہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اس کا دین اس کے

ساتھ ہے، اور اس کو جو روشنی ملتی ہے، وہ اپنے پرانوں سے، بزرگوں سے، اپنے پرکھوں سے، ساتھیوں سے ملتی ہے، اس کو بھگانے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ آپ اس وقت ورد کریں "یالطیف، یاودود" تو آرام سے بیٹھے رہیں۔ جب ٹریفک کھلے گا، مشکل دور ہو گی، تو پھر آپ نکل پڑیں۔ بجائے اس کے کہ آپ بے چینی کا شکار ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں چھوٹا تھا۔ چھوٹے سے مراد، جب میں میٹرک میں تھا تو میرے ایک خالو تھے۔ ان کے پاس ایک بڑے اعلیٰ درجے کی موٹر سائیکل تھی، بڑے سائز کی۔ انڈین موٹر سائیکل۔ میرے خالو پمپ شوز پہنتے تھے، نہ جانے اس کو پمپ شوز کیوں کہا جاتا تھا۔ بس یہ ایک خاص لفظ تھا ان کے لیے۔ وہ پمپ شوز جس کے اوپر کالی ٹائی لگی ہوتی تھی، پہن کر بڑی شان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لاہور کی سڑکوں پر دوڑاتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور میں 30-25 کاریں ہوں گی، اور وہ ایک ہی موٹر سائیکل تھا۔ جو پتہ نہیں اکیلا ہی 1200 cc کا ہو گا۔ اتنی اونچی آواز، اور اتنی اونچی شان، اور اس کے اوپر نہایت خوبصورت آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اور جب وہ لاہور کا چکر لگاتے تھے تو ساری دنیا ان کو منہ میں انگلیاں ڈال کر دیکھتی تھی۔ اونچی گھڑی باندھتے تھے، یعنی تھوڑی اوپر کو، اور عجیب طرح کی خوشبوئیں لگاتے تھے۔ میں ان کو دیکھتا تھا جو ہماری خالہ تھیں،

خالہ رابعہ۔ جب یہ موٹر سائیکل پر نکلنے لگے، اور خوب چکر لگانے لگے، تو میں نے اپنی خالہ کو کافی پریشان دیکھا، کیونکہ میرے خالو کی زندگی میں کچھ اور ہی طرح کا ٹیڑھا پن پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ کچھ اور طرح سے، اور کچھ اور لوگوں میں Popular ہو رہے تھے۔ اور جب خاوند میں ذرا سی بھی ٹیڑھ پیدا ہو جائے تو بیوی کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری خالہ پوچھتی تھی کہ کس طرح سے ہو کہ اکرام خان صاحب (میرے خالو) جو ہیں، وہ راستے پر آ جائیں، اور میری محبت میں مبتلا رہیں، اور ہمارا گھر آباد رہے۔ تو اس وقت مجھے یاد ہے، کسی نے انکو بتایا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی یہ ذکر بڑا کارآمد ہو گا، خاص طور پر خواتین کے لیے کہ جب گھر میں اس طرح کی الجھنیں ہوں تو کیا کیا جانا چاہیے۔ تو انہیں کسی نے یہ بتایا تھا کہ آپ ایک ہزار مرتبہ "یا ودود" کا ورد کر کے اپنے خاوند کو کھانے پر دم کر کے کھلائیں۔ اس سے محبت اور یگانگت بڑھتی ہے۔ یہ وہی ذکر ہے نا، جو مولوی موسیٰ نے بتایا تھا کہ اسٹیئرنگ پر انگلیاں نہ بجائیں، بلکہ "یا لطیف، یا ودود" کا ورد کریں۔ اس سے آپ کا بھی فائدہ ہو گا۔ اللہ کا ذکر بھی ہو گا، بے چینی بھی کم ہو گی جو ہمارے ہاں Build Up ہو رہی ہے، میں اپنی خالہ کو دیکھتا تھا کہ وہ بہت پریشان تھیں، لیکن اللہ کے فضل سے، اور اس رُخ پر استقامت اختیار کرنے سے، ان کی یہ الجھن دور ہو گئی، اور میرے خالو جو تھے،

وہ پہلے والے خالو بن گئے۔

پھر مجھے یاد ہے کہ وہ Piles کی ظالم بیماری سے فوت ہو گئے۔ ان کا جنازہ رکھا تھا گھر میں۔ میری والدہ، اور چچی تھیں، لیکن رونے والی عورتوں میں کچھ عورتیں ایسی بھی شامل تھیں، جو بہت زور سے رو رہی تھیں، جن کو ہم نہیں جانتے تھے۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ کتنا صبر کیا جانا چاہیے۔ مولوی موسیٰ نے کہا بے چین ہونے سے، گھبراہٹ سے، چیں چیں کرنے سے، گھر والوں سے لڑنے سے، وہ حسن جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر عطا کیا ہے، وہ نصیب نہیں ہوتا۔ باہر کا حسن تو آدمی میک اپ کر کے کر لیتا ہے، لیکن وہ زیادہ دیر تک ساتھ تو نہیں دیتا نا۔ ایک اندر کا حسن بھی ہوتا ہے۔

میں بڑی دیر تک روم جو کہ اٹلی کا دارالحکومت ہے، وہاں رہا ہوں۔ وہاں میں پڑھتا تھا اور پڑھاتا بھی تھا۔

خیر۔۔۔۔ وہاں 53ء میں ایک صاحب ہماری یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئے جو کہ بہت نامی گرامی انسان تھے۔ ان کا نام تھا۔۔۔۔ سر الیگزینڈر فلیمنگ۔۔۔۔ یہ وہ صاحب تھے، جنہوں نےPenicillin کو Discover کیا تھا۔ نوبل انعام یافتہ، سر کا ان کو خطاب ملا تھا۔۔۔۔ تو سر فلیمنگ سے بہت سی باتیں ہوئیں۔

لیکن ایک موٹی بات جو انہوں نے کی تھی، کہ دنیا میں سب سے زیادہ صبر کرنے والا شخص جو ہوتا ہے، وہ Scientist ہوتا ہے۔ تو یہ میرے لیے نئ بات تھی، اور اچنبھے کی بات تھی۔ مجھے مشرقی نوجوان ہونے کی حیثیت سے شاید حق پہنچتا تھا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے پوچھوں کہ سر اس کی تفصیل کیا ہے۔۔۔؟ تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔ ہوٹل میں ٹائم طے کیا۔ بڑی مہربانی تھی آنجہانی کی کہ انہوں نے ٹائم دیا۔ بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا۔۔۔ بڑے سوالات کیے۔۔۔ میں آج اس کا ایک چھوٹا سا قصہ آپ کو عرض کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ سر یہ جا آپ ایجادات کرتے ہیں، اور جو آپ اتنے رتبے کے Scientist ہوتے ہیں، یہ آپ کو کیسے آجاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارا کوئی اتنا بڑا کمال نہیں ہوتا۔ ہم تو بس لیبارٹری جاتے ہیں، اور لیبارٹری میں حاضر رہتے ہیں، اور چوکس رہتے ہیں، اور ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ بس ہم لیبارٹری میں ڈانس کرتے ہیں۔ ....as a dervesh's dance کہنے لگے کہ درویش کا مطلب جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ سر وہ تو ہے ہی ہمارا۔ یہ آپ نے Borrow کیا ہے ہم سے۔ کہنے لگے، جیسے ایک درویش ناچ کرتا ہے، اسی طرح سے ایک Scientist اپنی لیبارٹری میں ہر وقت۔۔۔۔۔ ہمہ تن اس ناچ میں لگا رہتا ہے۔

The dance of intelligence... dance of life... The dance of something to have

اچھا یہ میرے لیے نئ بات تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اور انہوں نے کہا کہ علم جو ہے، وہ عالم مطلق کے پاس ہے۔ اللہ کے پاس ہے۔ انسان کے پاس نہیں ہوتا۔ پھر وہ ذرا سے ڈرے کیونکہ میں بالکل Young تھا۔ کہنے لگے Do you ? believe in god میں نے کہا سر Believe کیا کرنا ہے، وہ تو ہے ہی ہمارا۔۔۔ تو کہنے لگے اچھا۔۔۔۔ Thanks God that you believe in God میں آپ کو بتاتا ہوں کہ علم جتنا بھی ہے، وہ اللہ کے پاس ہے، اور وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتا ہے، انسانوں کو عطا کرتا رہتا ہے۔۔۔ نہ پہلے نہ بعد میں۔۔۔ انسان اپنی کوشش، اور جدوجہد سے اور اپنی ہمت سے علم حاصل نہیں کر سکتا۔۔۔ میں نے کہا کہ جی یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ ہم تو کوشش، جدوجہد اور Struggle کے بندے ہیں۔۔۔ اس کے بغیر تو ملتا ہی کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، اس کے لیے آپ کو ایک Constant ایک مسلسل حاضری اور ڈانس کرنے کی ضرورت ہے۔ جھولی پھیلا کر، کشکول اپنا لے کر موجود رہو کہ کب علم عطا ہو۔ وہ جب چاہتا ہے، دیتا ہے، تو وہ کہنے لگے کہ کئی ہزار برس سے درختوں کے اوپر سے سیب زمین پر گر رہے تھے کسی نے نوٹس نہ

لیا۔ سیب تو گرتا ہی رہتا ہے نا۔ پھر اللہ نے جب علم عطا کرنا مقصود جانا تو پھر اس نے ایک فرشتے سے کہا کہ جا یہ جو ایک بابا کوٹ پہن کر سیب کے درخت کے پاس بیٹھا ہوا ہے، اس کے کان میں جا کر کہہ دے کہ یہ Gravity ہے۔ تو فرشتے نے غالباً کہا ہو گا کہ Gravity ....Gravity ۔ پھر اس نے سوچا ہو گا کہ یہ کیسے گرا، اور اس کے اوپر اس نے کام کرنا شروع کر دیا، اور اس طرح سے، علم صرف عالم مطلق اپنی مرضی سے عطا فرماتا رہتا ہے۔

پھر انہوں نے مجھے بتایا دیکھو! عمل اور کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک بیماری بڑی خوفناک ہے، اور اس کا علاج نہیں ہے، اور بڑے لوگ اس سے مر رہے ہیں۔ اس کی ریسرچ پر ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں، اور ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں پاؤنڈ ڈالر خرچ ہو رہے ہیں، لیکن اس کا کوئی سر پیر معلوم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ میں ڈر گیا، میں نے کہا کہ یہ ایسی کون سے بیماری ہے۔ کہنے لگے، اس کی کینسر کہتے ہیں۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ کینسر کیا ہوتا ہے۔ میں کہا کہ اچھا جی۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔ ہاں ایک بیماری ٹی بی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ ٹی بی سے بھی خطرناک ہے۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ ہم ڈھونڈتے رہیں گے۔۔۔۔ ہم تلاش کرتے رہیں گے۔۔۔۔ لیکن اس کا علم صرف اسی سے عطا ہو گا، اور وہی اس کی Date مقرر کرے گا۔۔۔۔ کوشش ہماری جاری رہے

گی۔ کیونکہ یہ اس کا علم ہے۔ میں نے کہا سر! آپ کے خیال میں اس کا علاج کب مل جائے گا؟ تو کہنے لگے کہ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، میرا اندازہ ہے کہ شاید 1960ء یا 1962ء میں اس کا علم ہو جائے۔

تو پیارے لوگو! 1960ء، 1962ء گزر گیا۔۔۔۔ 90ء گزر گیا۔۔۔۔ 92 گزر گیا۔۔۔۔ اب 98ء ہے۔۔۔۔ وہ جب چاہے گا، عطا کرے گا۔ ہمیں اپنی جھولی پھیلا کر اس کے حضور مسلسل رقص کرتے رہنا چاہیے، تاکہ وہ دے۔ اور صبر اختیار کرنا چاہیے، جو وہ Scientist اپنی ریسرچ میں، اور اپنی تحقیق میں کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں دے، اور آسانیوں کو تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔
(آمین)

حضرت صالح کی اونٹنی اور پاکستان

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کبھی اونٹ کی سواری کی ہے یا نہیں۔ پھر بھی ایک اندازے کے مطابق یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اونٹ دیکھا ضرور ہے۔ ہم نے اپنے بچپن میں اونٹ کی بہت سواری کی۔ اس لیے کہ ہمارے گھر کے قریب جس گاؤں میں میں رہتا تھا، وہاں بلوچوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ بلوچ اور اونٹ لازم وملزوم چیزیں ہیں، اور بلوچ لوگ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ میری زندگی پر ان کا بڑا خوشگوار اثر ہے۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے جھڑکا اور شائد ایک تھپڑ بھی مارا۔ میں منہ بسورتا ہوا اماں بلوچن کے گھر چلا گیا۔ تو اس نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا، ابا جی نے مارا ہے۔ وہ چادر لے کر غصے سے ہمارے گھر آگئی۔ اور کہنے لگی، ڈاک دار تو نے بچے کو کیوں مارا؟ کہنے لگے، میں نے اس کو مارا نہیں بلکہ جھڑکا۔ کہنے لگی جھڑکا بھی کیوں۔ وہ سمجھتی تھی کہ جھڑکا بھی اس قسم کی چیز ہے۔

اونٹ پر ہم بہت سواری کرتے رہے۔ پھر اس کے درمیان ایک بڑا لمبا وقفہ آ

گیا۔ 1946ء میں جب پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی تو ہمیں دریائے ستلج کے کنارے ایک لمبے سفر پر تبلیغ کے لیے جانا تھا تاکہ پاکستان کی طرف لوگوں کا جھکاؤ پیدا کیا جاسکے۔ وہاں تقریباً کچھ ایسے لوگ تھے جن کا جھکاؤ پاکستان کی طرف بہت کم تھا اور وہ مسلم لیگ سے ناواقف تھے۔ ہمیں وہاں اونٹ پر جانا تھا۔ ہمارے پاس دو اونٹ تھے۔ دو نوجوان علی گڑھ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یہ ایک لمبا سفر تھا، ہم نے ایک دن میں ساٹھ میل کی مسافت اونٹ پر طے کی، پھر ہمارے خوش قسمتی سے وہاں راستے میں دو ڈاکو مل گئے۔ ایک کا نام گامن تھا، ایک کا نام سجاول تھا۔ رنگ دار بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں روک لیا، تم کدھر جارہے ہو۔ ہم نے بتایا ہم ایک مشن پر جارہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم ڈاکو ہیں، ہمیں ایک کراڑ (ایک ہندو قوم) کو لوٹنے جانا ہے، ہمیں اونٹ دے دیں۔ ہم نے کہا، اونٹ ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ تم کراڑ کو بعد میں لوٹ لینا ہمارا کام زیادہ ضروری ہے۔ انہوں نے کہا، نہیں ہماری کام تم سے زیادہ ضروری ہے۔ خیر وہ ایک لمبی کہانی ہے، وہ پھر کبھی سناؤں گا۔ پھر دونوں ڈاکو ہمارے دوست بن گئے۔ اور اونٹ پر بیٹھنے کا طریقہ بتایا کہ اگر کاٹھی نہ بھی ہو تو پھر اونٹ کی کوہان پر لانگڑی مار کر بیٹھا جاتا ہے، ہر ایک کام کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا تھا آپ سے کہ چند دن پہلے کراچی جانے

کا اتفاق ہوا، میں تقریباً آدھی صدی کے بعد سن پینتالیس کے بعد پاکستان کے سرحد کے اندر اونٹ پر بیٹھا۔ کلفٹن میں آپ نے دیکھا ہو گا، اور ہم نے بھی اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کیا، اونٹ پر بیٹھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اونٹ اٹھنے کے انداز میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کرتا ہے۔ دنیا کے دوسرے سارے جانور اگلی ٹانگیں پہلے کھڑی کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے اس کے اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے سجدہ کرتا ہے۔ یہ اللہ نے اس کا ایک کام رکھا ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے سجدہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ ہم نے کافی وقت ان اونٹوں کے ساتھ گزارا، لیکن میرے ساتھ عجیب و غریب واقعات گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ اس اونٹ کے رشتے سے، اور اس کے حوالے سے بھی میں یوں ایک الجھن بھی گرفتار ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اونٹ کے بارے میں بھی قرآن پاک میں کہتا ہے۔ کیا تم نے اونٹ کو دیکھا کہ کس طرح کا جانور بنایا۔ یعنی اس کے عجائب و غرائب ابھی تک پوشیدہ ہیں، اور سارے کے سارے اس کے خصائص لوگوں کے سامنے نہیں آئے، اتنا ہم جانتے ہیں یہ میلوں اور دنوں تک سفر کر سکتا ہے پانی کے بغیر۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں، لیکن یہ اپنے انداز

کا بڑا ہی خوبصورت جانور ہے۔ بے حد خوبصورت۔ اگر آپ نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا، اب آپ کو موقع ملے تو اسے ضرور دیکھیئے گا۔ اللہ کرے آپ جائیں یا آپ گئے ہوں گے، جدے سے مدینے جاتے ہوئے بڑی خوبصورت سڑکیں ہیں، کبھی کبھی ریگستان کے لق و دق ٹوٹے اور کچے علاقے آ جانے پر آپ کو چلتے پھرتے اونٹوں کی کچھ قطاریں نظر آئیں گی۔ ان کے مالکوں نے کھلے چھوڑے ہوتے ہیں۔ چاندنی جیسی ریت پر جیسے چاندی سے بدن لیکر دھوپ کے اندر ایک عجیب گل کھلاتے ہوئے چلتے ہیں، وہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم بس پر سفر کر رہے تھے اور بس سے سر نکال نکال کر بڑی دیر تک ان کو دیکھتے تھے۔ اللہ میاں نے کیسی خوبصورت مخلوق پیدا کی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اسی سلسلے میں مجھے کچھ یاد آیا۔ پاکستان میں جب امریکہ کا صدر آیا، ابھی تک شائد ایک ہی آیا ہے، جس کا نام Lindon B. Johnson تھا۔ وہ کراچی اترا، تو جس چیز نے لنڈن بی جانسن کو متاثر کیا، وہ عجیب چیز اونٹ تھا۔ ہماری بہت گاڑیاں تھیں جو سامان، اسبابِ نقل و حرکت میں کام آتی تھیں، بہت سارا سامان ڈھوتی تھیں۔ اونٹ گاڑیاں تھیں، یہ 1952، 1953 کی بات ہے، وہ اونٹ سے اتنا متاثر ہوا تو اس نے کہا میں تو اونٹ امریکا لے کر جاؤں گا، اور اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونٹ کو تو نہیں لے جا سکا اس

اونٹ کا ساربان جو کہ شتربان تھا بشیر، اس کو ساتھ لے گیا، اور بشیر بے چارے کو بڑی مصیبت پڑی، اور وہ روتا تھا کہ اونٹ کی وجہ سے مجھے امریکہ جانا پڑ رہا ہے۔ وہ امریکہ جانے سے گھبراتا تھا کہ مجھے وہاں کی بولی نہیں آتی۔ اخبار میں بیان دیا، میں وہاں جا کر کیا بات کروں گا، امریکہ جا کر مجھے کیا لینا ہے۔ مجھے اونٹ گاڑی چلانی ہے، الغرض اس کو جانا پڑا۔ اس نے نئی رومی ٹوپی خریدی۔ اگر آپ نے تصویریں دیکھی ہوں تو بے چارے نے یہ کچھ کیا، وہ آزاد آدمی تھا۔

میں آپ سے اونٹ کی باتیں کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اس اونٹنی کا خیال بار بار آتا ہے، جو اونٹنی حضرت صالح کی اونٹنی تھی، اور جو ایک معجزے کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ قوم ثمود کی طرف صالح کو اللہ نے بھیجا تھا، اور وہ بہت اونچے درجے کے نبی تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ جا کر اس بے ہودہ قوم کو راہ راست پر لاؤ۔ وہ بڑی بگڑی قوم تھی۔ بیشتر میں خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس دولت بہت زیادہ تھی۔ علاقہ بہت سرسبز تھا، اُردن کے علاقے سے لے کر عرب تک، اور مدینے شریف سے لے کر تبوک کے درمیانی علاقے میں۔ وہاں جا کر ثمود کی جغرافیائی حد ختم ہوتی ہے۔ لمبا چوڑا علاقہ تھا، اور ثمود کے لوگ اپنے تئیں تکبر کے مارے ہوئے اور اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتے ہوئے اونچے پہاڑوں کو تراش کر چھینی ہتھوڑی سے اسے چھیل چھیل کر ان پہاڑوں کے اندر نہایت خوبصورت محل

بناتے تھے۔ یہ انکا بڑا کمال تھا، یعنی انہوں نے کوئی لینٹر نہیں ڈالا، کوئی اینٹ و پتھر جمع نہیں کیے، پہاڑ کا چھیلنا، کھرچنا شروع کر دیا، اور اس کے اندر ایسے اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے، ستون محرابیں ہیں کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اگر آپ چاہیں تو اُردن کے علاقے میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ سائیڈیں بھی ملتی ہیں۔ اگر آپ کو جغرافیے کا شوق ہے تو جیوگرافک میگزین میں گاہے بگاہے ان محلات کی وہ تصویریں فوٹوگراف کی صورت میں اور ڈرائنگ کی صورت میں آتی رہتی ہیں۔

تو وہ لوگ بڑے معتبر لوگ تھے، اور وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے، تب اللہ نے ایک پاکیزہ نبی حضرت صالح کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر ان کو اللہ کا پیغام دیں تو ان لوگوں کو نبیوں کے اوپر جو اعتراض رہا تھا، جتنے بھی نبی انکے پاس بھیجے گئے ہیں، ایک ہی اعتراض رہا ہے کہ آپ کیسے نبی ہو سکتے ہو؟ آپ ہمارے جیسے انسان ہو۔ اور کہتے تھے کہ تُو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور پھر تیسری بات کہ تُو غریب آدمی ہے، اور غریب آدمی کیسے نبی ہو سکتا ہے؟ نبی تو بہت امیر آدمی کو ہونا چاہیے۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ تم کیسے نبی ہو سکتے ہو۔ تیرے بازوؤں میں سونے کے کنگن بھی نہیں۔ اور بھی جتنے پیغمبر تھے، اس کے ساتھ بھی یہی تھا۔ نوح علیہ السّلام کے ساتھ بھی۔ وہ یہی بات بار بار دہراتے کہ اگر تُو سربلند

ہوتا اور تیرے بھی اتنے اونچے محل ہوتے جتنے لوگوں کے پاس ہیں، تم نے بھی ایسی عمارتیں بیائی ہوتیں، اے صالح تو ہم تم کو پیغمبر مان لیتے، لیکن اب تو تُو ایک عام آدمی ہے۔ ٹھیک ہے بھلے آدمی ہو لیکن تمہاری اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیں ہم بھی بار بار Acknowledged Condition کی بات کرتے ہیں، جب بھی کبھی مصیبت پڑتی ہے، بوجھ پڑتا ہے، تو آپ بجائے اس بوجھ کو بلا واسطہ طور پر Directly برداشت کرنے کے لیے ہمیشہ پلٹ کر اکنامکس کی طرف جاتے ہیں۔ ہماری اکنامکس کمزور ہے، اس لیے کام نہیں کرتے۔ ہم نیک اس لیے نہیں ہوسکتے، کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ ہم بہادر اس لیے نہیں ہوسکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ اچھے انسان اس لیے نہیں بن سکتے کہ مالی طور پر کمزور ہیں۔ تو وہ بھی یہ کہتے تھے کہ تم مالی طور پر بہت کمزور ہو۔ تمہارے پاس اتنے بڑے محل ہوتے، جتنے ہمارے پاس ہیں، پھر ہم نبی مانتے۔ لیکن وہ کہتے، مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں تم کو بھلائی کے راستے کی طرف بلاتا ہوں۔ تمہارا اسی میں فائدہ ہے۔ میں تم سے اس کے عوض کوئی ٹیوشن فیس نہیں مانگتا، جو کچھ ہے مفت میں دیتا ہوں، اور میرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تو انہوں نے کہا ہم تجھ کو پیغمبر نہیں مانتے، اگر ہم طبیعت پر بوجھ ڈال کر آپ کو پیغمبر مان بھی لیں، تو اس کے لیے ایک شرط ہے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھا دو، ثمود قوم نے کہا۔

حضرت صالح نے فرمایا، آؤ تم کون سا معجزہ چاہتے ہو۔ لیکن انہوں نے Warn کیا کہ معجزہ رونما ہو چکنے کے بعد بھر اگر تم نے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو نہ مانا تو پھر تم پر عذاب آ جائے گا۔ خوش نصیب ہیں وہ قومیں، جنہوں نے معجزہ طلب نہیں کیا، لڑائی جھگڑا کرتے رہے ہیں، لیکن معجزہ نہیں مانگا، وہ بچ گئے، لیکن اگر معجزہ مانگ لیا جائے، اور معجزہ طلب کر لیا جائے اور وہ رونما ہو جائے، پھر بھی نہ مانا جائے تو پھر عذاب طے شدہ بات ہے۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں، ہم برداشت کر لیں گے لیکن اگر تُو معجزہ رونما کرے گا تو۔ دیکھیے ان ظالموں نے معجزہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا، ہم یہ چاہتے ہیں سامنے چٹیل پہاڑ ہے، اور بہت چکنا اور مضبوط ہے، کروڑوں سال سے اپنی جگہ قائم ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں تیرا اللہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی پیدا کرے۔ اب پہاڑ کا اور اونٹ کا کوئی تعلق نہیں، اور وہ اونٹنی آئے ہمارے ساتھ ہماری بستی میں رہے، تو پھر ہم مانیں گے تم پیغمبر ہو۔

چنانچہ انہوں نے دعا کی، اور اللہ سے معجزے کو طلب کیا کہ اگر یہ لوگ اس طرح سے ہی مان جائیں تو انکا فائدہ ہے۔ ان چٹیل پہاڑوں کے درمیان میں سے اللہ کے حکم سے اونٹنی نمودار ہوئی، اور ان کے آگے چلتی آ رہی ہے۔ پہاڑوں کا قد بت بھی بہت بلند تھا۔ وہ اونٹنی بھی چاندی کا ایک مرقّع نظر آتی تھی، چلتی

ہوئی آگئی اور بستی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اور ظاہر ہے ادھر ادھر دیکھنے لگی ہو
گی، وہاں آ کے۔ ان لوگوں نے اسے دیکھا اور ششدر بھی ہوئے کہ اونٹنی تو
پیدا ہو گئی ہے لیکن اب ہم اس کو کیا کریں۔ تو حضرت صالح نے فرمایا تمہاری
خواہش کے مطابق، تمہاری آرزو کے مطابق یہ اونٹنی انہی پہاڑوں کے درمیان
میں سے پیدا ہو کر آپ کے درمیان آگئی ہے، اور اب یہ آپ کی مہمان ہے۔
اب اللہ نے ایک شرط عائد کی ہے کہ بستی کے ایک کنویں یہ پانی پیئے گی، اور اس
کا ایک دن مقرر ہو گا، اس دن وہاں سے کوئی دوسرا آدمی پانی نہیں لے سکے گا۔
نہ مویشی نہ چرند پرند نہ انسان۔ اونٹنی ہماری معزز ترین مہمان ہے، اسکی دیکھ
بھال کرنا ہمارا فرض ہے، انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔ کچھ دن
تو انہوں نے اونٹنی کو برداشت کیا، اور باری کے مطابق جو دن مقرر تھا، اسے پانی
دیتے رہے، لیکن پھر انسان انسان ہے، ان میں سے ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جس
نے مزید آٹھ آدمیوں کو ورغلایا اور وہ نو ہو گئے۔ انہوں نے کہا، یہ کیا شرط ہم
نے اپنے آپ پر عائد کر لی ہے، اور اس اونٹنی کی کیا حیثیت ہے، ہم اس کا کسی نہ
کسی طرح سے قلع قمع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے رات کے وقت اس اونٹنی کی
کونچیں کاٹ دیں، جو کہ ٹخنوں کے اوپر کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اونٹنی ظاہر ہے وہاں
پر اپاہج ہو کر بیٹھ گئی۔ صبح کو جب سب لوگ بیدار ہوئے، اور اونٹنی کے پانی پینے

کی باری تھی، لیکن وہ تشریف نہ لائی، کیونکہ وہ وہاں نہ تھی۔ جب حضرت صالح کو علم ہوا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ تو پھر انھوں نے اپنی قوم سے کہا، یہ بہت بُرا ہوا، نہ صرف تم نے اس معجزے کو جھٹلایا بلکہ اس مہمان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب تین دن کے اندر اندر تمہارا قلع قمع ہو جائے گا۔ اور تم نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ پھر آنے والی تاریخ میں لوگ انگلیاں اٹھا کر بتایا کریں گے کہ یہ ثمود کے رہنے کی جگہ تھی، اور یہ ان کے محل تھے جو ویران پڑے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح ویران رہیں گے۔ چنانچہ جیسا فرمایا گیا تھا، بالکل ویسے ہی ہوا، پہلے دن، جیسے کہ بتاتے ہیں کہ ان کے منہ پیلے ہوئے، اگلے دن بے حد سرخ ہو گئے پھر کالے۔ پھر ایک ایسی چنگھاڑ، جیسے آج کل بم بنے ہیں، چنگھاڑ آئی، وہ سارے کے سارے اوندھے منہ گر گئے اور نیست و نابود ہو گئے۔

ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہو تو اسلام آباد پہنچ کر مجھے ایک پیغام ملا کہ ایک بابا ہیں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں، میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں۔ آپ کو علم ہے۔ پچھلے ہفتے آپ سے بابا کی بات کر رہا تھا، جو ہمارے ساتھ اسی ٹی وی اسٹیشن کا رہنے والا تھا۔ لیکن بابوں کے زائچے بابوں کی شکل و صورت، اور ان کے ڈھانچے، ان کے حلیے ان کے مزاج بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھ سے یہ آ کر نہ پوچھیں، ہر بابا میٹھا نہیں ہوتا، میرے سائیں فضل

شاہ صاحب جیسا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ دھوپ تھی، پہاڑی علاقہ تھا۔ میرے گلے میں چھوٹا سا صافہ (لمبا کپڑا) تھا۔ آپ کو پتا ہے پہاڑوں کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ جب میں انکے پاس گیا، تو کہنے لگے، تم بڑی مٹھار مٹھار کے باتیں بناتے ہو، اور باتیں سناتے ہو، میں تم کو Warn کرتا ہوں۔ یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا۔ Warn کرنے کے لیے بلایا ہے یہاں پر۔ تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو، اور تم لوگوں نے توجہ دینی چھوڑ دی ہے اور تم ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ دیکھو! کہنے لگے، میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ملک ایک معجزہ ہے، یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو، ہم نے یہ کیا، پھر یہ کیا، پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا، پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے، ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو، پاکستان کا وجود میں آنا ایک معجزہ تھا، اتنا بڑا معجزہ ہے جتنا بڑا قومِ ثمود کے لیے اونٹنی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالح کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے، نہ تم رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ میرے گلے میں موجود صافے کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری کیا کیفیت ہو گی۔ انہوں نے کہا تم نے صالح کی اس اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ باون برس گزر گئے تم نے اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہوا ہے جو ثمود نے

کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں، اور باہر کے رہنے والوں دونوں کوWarn کرتا ہوں، تم سنبھل جاؤ، ورنہ وقت بہت کم ہے، اس اونٹنی سے جو تم نے چھینا ہے، اور جو کچھ لوٹا ہے، اندر کے رہنے والو اس کو لوٹاؤ، اور اس کو دو، اور باہر کے رہنے والو ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں، اس کو کوئی عام چھوٹا سا" معمولی ساجغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالح کی اونٹنی ہے، ہم سب پر اس کا ادب، اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا، اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو، اور اس کو Recompensate کرو۔

میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا، اور خوف زدہ ہو کے کھڑا رہا، اور پھر ان کو سلام کر کے، سر جھکا کے واپس چلا آیا۔ میری دعا ہے، اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

We don't live in present

but in future and past

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

آج کا دن میرے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ اہم ترین دن ہے، جتنے بھی زاویے گزرے، ان میں سے ایک اہم دن۔ اور شاید یہ میرے اور آپ کے درمیان ایک جدائی کا باعث بھی ہو، کیونکہ جس طرح محبت، اور یگانگت، اتفاق، قربت، اور بھائی چارہ بہت اہم چیز ہے، اس طرح جدائی بھی بہت اہم ہے۔ وصال تو اہم ہے ہی۔ فراق اس سے اہم تر ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کہتے ہیں، جب تک فراق کی لذت نہ چکھی جائے، اور اس میں داخل نہ ہوا جائے، اور آدمی اس کا صاحبِ حال نہ ہو، اس وقت تک وہ منازل طے نہیں ہوتیں، جن منازل کو سامنے رکھ کر سالک نے پہلا قدم اٹھایا ہوتا ہے، اور یوں بھی حال جو ہے، یہ بہت اہم چیز ہے۔

آج کا دن ہر شخص کے لیے بہتر دن ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آدمی کبھی بھی

حال کے اندر موجود نہیں رہتا۔ آپ نے یہ ٹرم سنی ہو گی کہ وہ بڑے صاحبِ حال بزرگ تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بزرگ نہ ماضی کی یاد میں مبتلا تھے، نہ مستقبل سے خوف زدہ تھے، جو ان کو مل رہا تھا، اس پر شکرِ نعمت بجالا رہے تھے۔ ہماری سب کی بد قسمتی یہ ہے، خاص طور پر سیانے پڑھے لکھے آدمی کی کہ وہ حال کے اوپر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ یا تو لوگ ماضی میں رہتے ہیں یا مستقبل کی تلاش میں سر گرداں رہتے ہیں۔ جو لذتیں اللہ نے حال پر عطا کی ہوتی ہیں، ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آپ نے اپنی زندگیوں میں اکثر دیکھا ہو گا، ہم کہتے ہیں ایک وہ وقت تھا جب میرا دوست یہاں کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے کہا، بس یہ عرضی لکھ کے لے آ، میں تجھے کارنر پلاٹ دیتا ہوں، پلازا بنا سکتا تھا، آج جناب کہیں کے کہیں پہنچے ہوتے۔ تو ساری بات ماضی کی کرتے ہیں، یا یہ کچھ کر لو، کل کا کچھ پتہ نہیں ہے، مارے جائیں گے۔ زمانہ خراب آ رہا ہے مشکلات بڑھ جائیں گی۔ ابھی سے بندوبست کر لو۔ کبھی کبھی ہمارے گھر میں پانی ٹینکی میں ختم ہو جاتا ہے، رات کو میری بیوی ٹونٹی کھولتی ہے تو سوں سوں کی آواز آتی ہے۔ وہ کہتی ہے میں نے پہلے ہی کہا تھا، اس کا کچھ بندوبست کر لو۔

میں کہتا ہوں جگ میں پانی پڑا ہے کچھ لوٹے میں بھی ہے، ہم تو رات کو سو جائیں گے، خدانخواستہ آگ تو نہیں لگ رہی۔ کہتی ہے آپ کیسی فضول باتیں کرتے

ہیں۔ صبح اٹھ کر وہ اتنی پریشان ہوتی ہے۔ میں نے مستقبل کے بارے میں اتنی خوفزدگی کا اظہار کیا تھا، وہ مستقبل ابھی تو آیا ہی نہیں، لیکن ہم سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے آگے رکھے ہوئے اعلیٰ درجے کے پھل سے ہم لطف اندوز نہیں ہو سکتے، ماضی کی ان بیریوں کو یاد کرتے رہتے ہیں، کانٹے دار جھاڑیوں کے اوپر چڑھ کے، جو ہم بیر کھایا کرتے تھے۔ اکثر ہم ذکر کرتے تھے کہ وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ مستقبل کے باغوں کو دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے ٹوکرے اتر اتر کر پھل آئیں گے۔ ہمارے ملازم کھڑے ہوں گے، رسیاں باندھ کر ان کے اوپر ترپال ڈال کے، ٹانکے لگا کے، دوستوں کو تحفے بھیجے جا رہے ہوں گے۔ منڈیوں میں ہمارا پھل جا رہا ہو گا، لیکن یہ جو ہمارے سامنے موجود ہے، آپ کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑا ہی آسان اور بڑا ہی مشکل کام ہے۔ ہمارے سمیت دنیا بھر کی ٹریننگ ایسی ہی ہوتی ہے۔ صاحبِ حال بڑا چالاک ہوتا ہے کیونکہ اس کو جتنا مل رہا، جو مل رہا، اٹھا کے جیب میں ڈال رہا ہے۔ مزے سے کھا رہا ہے۔ گاجر مل گئی تو گاجر کھا رہا ہے میں اور آپ اس کے انتظار میں ہیں کہ انناس ملے گا تو لے لوں گا۔ ہم کبھی بھی حال سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ حال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ زندگی کی سب سے ضروری حقیقت یہ ہے کہ حال سے فائدہ اٹھاتا رہے، اور اس کے گن گاتا رہے۔ اس سے لطف اندوز ہوتا رہے کہ

اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔ بری غور طلب بات ہے، اور جو حال میں جتنا مشکل میں مبتلا ہو گا، عذاب کی زندگی بسر کر رہا ہو گا، مستقبل میں بھی اتنا ہی ہو گا۔ آپ اپنا حال خراب کر کے دیکھ لیں، آپ کا مستقبل لا محالہ ایسا ہی چلتا رہے گا۔ اس میں سیدھ آئے گی ہی نہیں۔ آپ ایک تجربہ کر کے دیکھ لیں، ہم نے اس ٹیڑھے چمٹے کو جو حال کا ہے سیدھا کر لیا، مستقبل خود بخود خوبصورت سے خوبصورت تر ہوتا چلا جائے گا۔ میری زندگی میں صوفیائے اکرام کے علاوہ ایک ایسا شخص بھی آیا جو بغیر جانے ہوئے حال کی اہمیت کیا ہے، اس پر حاوی تھا۔

سراج دین نامی ایک مزدور تھا، آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے میں اپنا دفتر بنوا رہا تھا، جب مزدور کی دیہاڑی تیس روپے روزانہ ہوتی تھی۔ سراج چپس کھسانے کا کام جانتا تھا، بہت ذہین اور خوبصورت آدمی تھا، اچھی بات کرتا اور بہت کم گو تھا۔ خوبصورت بات کرتا تھا اور لوگ اس کو ۳۰ روپے دیہاڑی کی بجائے ۵۰ روپے دیتے تھے، کیونکہ وہ اپنے فن کا ماہر تھا۔ وہ اپنے فن پر پوری استقامت کے ساتھ حاوی تھا۔

ایک بہت اچھا دن تھا ۲۶، ۲۵ دسمبر کی بات ہے، دھوپ بہت اچھی نکلی ہوئی تھی، عام طور پر اگر آپ نے غور کیا ہو، یا کریں گے کہ ۲۵ دسمبر کے بعد یا اس

دن آسمان ابر آلود ہوتا ہے، لیکن وہ ۲۵ دسمبر کا دن ایسا خوبصورت اور شفاف تھا۔ سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ میں جب دفتر آیا تو سب لوگ کام کر رہے تھے۔ کام بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا میں نے ٹھیکے دار سے پوچھا سراج نہیں آیا؟ اس نے کہا نہیں آیا۔ میں نے کہا کیوں نہیں آیا؟ کہنے لگا کوئی پتہ نہیں۔ میں نے کہا، اس نے کوئی اطلاع بھیجی؟ کہا کہ نہیں بھیجی۔ میں نے کہاں ٹھیکیدار صاحب کو تو اس کا نوٹس لینا چاہیے تھا، پتہ ہونا چاہیے، آج تو اس کی بہت سخت ضرورت ہے، اتنا اچھا دن ہے، رگڑائی ہونی ہے اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں آؤں گا۔ پھر میری طبیعت میں اللہ جانے کہاں سے طیش آ گیا، ایسے ہی۔ حالانکہ میں تو کبھی بھی افسر نہیں بنا، لیکن اس دن میں ایک مشکل سا افسر بن گیا۔ کہا، اس کو حاضر کیا جائے، ورنہ اس کو کام سے نکال دیا جائے گا۔ کہنے لگا، نہیں صاحب آج نہیں آیا تو کل آ جائے گا۔ میں نے کہا نہیں وہ کہاں رہتا ہے۔ ٹھیکیدار نے بتایا اچھرہ کے پیچھے ایک کچی آبادی ہے وہاں رہتا ہے۔ میں پتہ کرنے جاتا ہوں۔ میں نے کہا، جائیں۔ جب وہ سکوٹر پر جانے لگا تو میں نے کہا ٹھیکیدار صاحب! رکیے رہنے دیں۔ میں جاتا ہوں۔ ڈرائیور نے گاڑی نکالی، ہم چلے گئے، وہاں گئے تو ایک آدمی کو ساتھ لیا۔ اس نے کہاں گاڑی یہاں روکنی پڑے گی، کیونکہ پیچیدہ گلیاں ہیں اور کچی آبادی ہے۔ میں نے کہا، چلو میں شدید

غصے میں تھا۔ وہ لمبی چوڑی پیچیدہ گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک گھر میں جس کے باہر ایک بھٹا سا پردہ لٹک رہا ہے۔ وہ جو چوکیدار میرے ساتھ گیا تھا، اس نے آواز دی سراج! اُس نے کہا، کون ؟۔ میں محمد علی۔ اس نے کہا۔ آ محمد علی بسم اللہ ! اس نے کہا، باہر آ صاحب آیا ہے۔ اس نے کہا، صاحب کون؟ کہا، اشفاق صاحب آئے ہیں۔ اس نے کہا، یہاں! وہ بے چارہ حیران ہو کر چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ کہنے لگا بسم اللہ۔ میں نے کہا، کوئی بسم اللہ نہیں اور میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو۔ میں سخت طیش میں ہوں، تمہاری مرمت کروں گا، چلو تم چلو۔ کہنے لگا صاحب! میں کل آ جاؤں گا۔ میں نے کہا نہیں تم میرے غصے سے واقف نہیں ہو، افسر لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں، چاہے وہ بعض اوقات کتنا ہی مسکراتے رہیں، تمہیں ابھی چلنا پڑے گا۔ کہنے لگا، میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں، آپ اندر آئیں، آپ اندر تشریف لائیں مجھے فخر ہو، مجھے خوشی ہو، میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ میں نے کہا بالکل جھوٹی محبت ہے، غلط کہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو تم ضرور آتے۔ اس نے کہا، مجھے آپ اجازت دیں کہ میں کل آ جاؤں۔ اس نے کہا، آپ آئیں تو سہی۔ میری بیوی سے تو ملیں۔ میں نے کہا، میں کسی سے نہیں ملتا، میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کہا، جناب آپ اندر آ جائیں چائے کی ایک پیالی پئیں۔ میں نے

کہا، توبہ کرو، میں پانی بھی نہیں پیوں گا، تم چائے کی بات کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو، اور میرے ساتھ چلو، تو پھر اس کی بیوی آ گئیں پردے کے اس طرف۔ چاچاجی آپ آ جائیں۔ مجھ کو اب تھوڑی خفت ہونے لگی کہ بیچاری کہ رہی ہے۔ اچھا بی بی میں ایک سیکنڈ کھڑا ہوں گا، تیرے کہنے پر اندر داخل ہوں گا۔ ورنہ یہ بہت جاہل آدمی ہے۔ اندر گیا، اس نے کہا بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا نہیں۔ تو مجھے بتا تو آیا کیوں نہیں۔ اس نے کہا، کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ میں نے کہا، کیوں نہیں آیا، تمہیں ساری وضاحت دینا پڑے گی۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ یہ جو کنستر ہے ناجی مٹی ڈال کر نرگس کا ایک پودا لگایا تھا کل شام جب میں گھر آیا تو اس میں ایک پھول کھلا ہوا تھا تو مجھے بڑا اچھا لگا۔ دیکھیں ہمارے گھر میں آج ایک نرگس کا پھول ہے۔ یہ میں آپ کو دیتا ہوں، اس کی خوشبو دیکھیں کتنی اچھی ہے۔ میں تمہارے اس پھول کو بالکل قبول نہیں کرتا۔ میں تمہارے اس کنستر کو باہر پھنکوا دوں گا۔ تم کیا فضول بات کے لیے یہاں رہ گئے۔ تم کو آنا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی کہنے لگا۔ سر جی جب میں گھر آیا ہوں تو میری بیوی نے مجھے کہا کاکا چلنے لگا ہے، پہلے رڑھتا، گھٹنوں چلتا تھا۔ آج پہلا دن ہے کہ وہ ڈگ مگ ڈولے چلا ہے۔ میں نے کہا، وہ تو سو گیا ہے۔ کہنے لگی ہاں۔ میں نے کہا اس کو جگاؤ میں اس کو چلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کمال کرتے ہو کاکا تو سویا ہوا ہے۔

میں اس کو کیسے جگاؤں۔ کہنے لگا، صبح اٹھتے ہی پہلا کام میں نے یہ کیا ادھر وہ چولہے کے پاس بیٹھ گئی، اور میں ادھر بیٹھ گیا تو بیچ میں اپنا بیٹا چھوڑ دیا وہ کبھی ادھر جاتا تھا اور کبھی ادھر جاتا تھا۔ صاحب زندگی روشن ہو گئی۔ کنستر میں پھول کھلا تھا، چھوٹا بچہ تھپ تھپ کرتا اِدھر اُدھر جاتا تھا، سر جی! ہمیشہ آج کا دن دھندلا ہوتا ہے، لیکن آج بڑا خوبصورت دھوپ والا دن تھا۔ اتنا خوبصورت دن پچاس روپے میں تو نہیں بیچا جا سکتا۔ سر میں کل آ جاؤں گا، رات بھی لگا دوں گا آپ کہیں گے تو، اور آدھی چھٹی بھی نہیں کروں گا۔ لیکن اس خوبصورت دن کو آپ رہنے دیں۔ اتنا سستا نہیں بیچا جا سکتا۔ میں نے کہا، پانچ سو روپے کا بیچتے ہو۔ کہنے لگا، نہیں۔ وہ تو حال پر راضی تھا۔ وہ اکیلا آدمی میں نے دیکھا جس کا تعلق روحانیت سے ہرگز نہیں تھا، لیکن وہ صاحبِ حال آدمی تھا، وہ اس خوشی میں مبتلا تھا کہ میں ایک اچھا دن گزار رہا ہوں۔ اگلے دن دیہاڑی پر لگ جاؤں گا، اگلے دن یہی کام تو کرنا ہے، لیکن اس کو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔

پرسوں میں اسلام آباد میں تھا تو مجھے سراج یاد آ گیا۔ کتنے بڑے بڑے آدمیوں سے میں زندگی میں ملا ہوں لیکن سراج ان میں بہت بڑا آدمی تھا۔ میں اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر آج تک یاد کرتا ہوں۔ پھر وہ دبئی چلا گیا تھا۔ پتا نہیں آج کل کہاں ہو گا۔ پرسوں میں اسلام آباد میں تھا۔ سیر کر رہا تھا، اچانک مجھے سراج یاد آ

گیا۔ کسی کو آئن سٹائن یاد آ جاتا ہے، کسی کو نصرت فتح علی خان۔ بڑے لفظوں میں کسی کو ہمارے اجمل صاحب یاد آتے ہیں۔ وہ فلسفے کے استاد تھے۔ قدرت اللہ شہاب یاد آ جاتے ہیں میں چلتا جا رہا تھا۔ سراج یاد آ گیا۔ اس وقت میں شکر پڑیاں میں تھا۔ بہت اچھا موسم تھا، شام کا۔ میں نے سوچا اور تو میں کچھ نہیں کر سکتا، پڑھا لکھا ہوں، تشکیک کا مارا ہوا، گھبراہٹ میرے اندر شروع سے جنم لے چکی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس طرح کے فریم میں تو سیٹ نہیں کر سکتا، جیسا کہ سراج نے کیا تھا لیکن ان کوئی دیکھ نہیں رہا میری آرزو ہے، کچھ اس طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو، جس طرح میں نے سراج کے چہرے کو دیکھا تھا۔

پیارے بچو! میں وہاں ایک پتھر پر بیٹھ گیا میں نے وہاں سب سے پہلے اس خدا کا شکر ادا کیا، ڈھیروں ڈھیر کیا اور دل کی گہرائی سے کیا، جو مجھے قیمتی ترین چیزیں مفتا مفت دے رہا تھا، اور وہ آکسیجن تھی، ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے اس کی آکسیجن سے قیمتی چیز کوئی کائنات میں زندگی کے لیے ہے ہی نہیں، وہ سب کو مفت ملتی ہے، اور میں مزے سے اس کو Inhale کر رہا تھا، موسم بڑا خوبصورت تھا۔ شام ڈھل چکی تھی، اور میں بڑے مزے سے اعلیٰ قسم کی آکسیجن کو اپنے رگ و ریشے میں سمو رہا تھا، اور آپ یقین کریں اور کریں گے کہ کسی سپاہی نے سیٹی نہیں بجائی، اوئے بے وقوف بڑھے بابے تو Province کا

آدمی ہو کے فیڈرل کی کیوں ساری آکسیجن کھینچ رہا ہے۔ میں خوش و خرم بیٹھا رہا۔ کسی نے مجھے برا بھلا نہیں کہا، پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے ہر حال میں موجود رہو، ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہونا، مستقبل سے خوفزدہ نہ ہونا، اس حال کے اندر موجود رہو۔ جب میں نے موجود ہونے کی کوشش کی کہ کوئی گانا بھی گانا چاہیے، اچھا اب مجھے گانا نہیں آتا۔ میں نے بڑا زور لگایا، سوچا ہم ٹی وی پر بڑے اچھے اچھے گانے پیش کرتے تھے۔ بھئی کچھ اچھا سا یاد آئے۔ آخر جب میں بالکل ہی کچھ روہانسا سا ہو گیا، میں نے سوچا اتنا اچھا موسم ہے، سراج کو میں یاد کر رہا ہوں جو میرا گرو ہے، میرا Mentor ہے اور میرا لیڈر رہے اب میں چپ چاپ بیٹھا ہوں تو پھر اللہ نے میری مدد کی اور میں نے گانا شروع کیا۔ ”لب پہ آتی ہے دعا بن کے“ چوتھی جماعت میں آخری مرتبہ یہ گایا تھا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر۔ سکول میں دعا کے وقت گایا تھا۔ پھر موقع ہی نہیں ملا۔ پھر اس کے بعد ہم گانے کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ خرابی یہ ہوتی ہے خواتین و حضرات! کہ ہم مستقبل سے اتنے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ہمارا سارا حال، ساری زندگی، ساری سوچ سب برباد کر دیتے ہیں۔ اور ہماری حالت بالکل ویسی ہو جاتی ہے جیسی ہماری ایک بزرگ محترمہ تھیں۔ ایک وزیر کی بیوی، کسی زمانے میں چین کا مشہور بادشاہ تھا ”منگ“ ڈائناسٹی کا۔ اپنے وزیر کو ناراض ہو کے کسی

وجہ سے پھانسی کی سزا دے دی۔ مقررہ وقت پر جب اس کو پھانسی دی جانی تھی۔ بادشاہ کا دستور تھا کہ جس قیدی کو بھی پھانسی دی جاتی تھی تو بادشاہ خود صبح سویرے اٹھ کر بندی خانے (قید خانے) میں آتا تھا، اور اس سے پوچھتا تھا تیری کوئی آخری خواہش ہے، تو میں اس کو پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ ایک خوبصورت سفید گھوڑے پر سوار ہو کر آیا، اس نے اپنا گھوڑا بندی خانے کے باہر روکا، اندر گیا۔ اپنے وزیر سے ملا۔ وزیر سے کہا، کہو کیا حال ہے۔ کہنے لگا، میں بڑا خوش و خرم ہوں۔ آج شام مجھے پھانسی ملے گی اور اب آپ مل گئے ہیں۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا، تم تگڑے ہو۔ ہاں میں تگڑا ہوں، لیکن ذرا بادشاہ سلامت آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ چھوٹے سے جھروکے میں سے ایک نہایت خوبصورت سفید گھوڑا باہر بندھا ہے۔ میں نے تو ایسا گھوڑا کبھی نہیں دیکھا۔ میرے بڑوں کا علم میرے پرکھوں کا علم مجھے یہ بتاتا ہے کہ یہ تو اڑنے والا گھوڑا ہے، چلنے والا نہیں۔ بادشاہ نے کہا، یہ تو میرا گھوڑا ہے۔ سوار ہو کر آیا ہوں۔ اس نے کہا، حضور یہ آپ کو کہاں سے مل گیا، میں نے آپ کا سارا اصطبل دیکھا ہے۔ بادشاہ نے کہا ابھی کچھ خراساں سے سوداگر آئے تھے، اور گھوڑا دے گئے ہیں۔ وزیر نے کہا، حضور یہ تو اڑنے والا گھوڑا ہے۔ یہ تو کمال کی چیز ہے۔ بادشاہ نے پوچھا لیکن یہ کیسے اڑے گا۔ اس نے

کہا، ٹریننگ دینی پڑے گی۔ بادشاہ نے پوچھا ٹریننگ کون دے گا؟ وزیر کہنے لگا،
میں دوں گا۔ بادشاہ بولا کتنی دیر لگے گی۔ کہنے لگا ایک سال لگے گا۔ آپ اس پر
بیٹھیں گے جیسے بوئنگ جاتا ہے شکاگو سے ٹیکساس۔ جدھر مرضی جائیں، گھوڑا
اڑے گا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے، کھول دو دروازہ۔ باہر آ جاؤ، اور گھوڑے کی یہ
باگ پکڑو۔ تم اس کو ٹرینڈ کرو۔ تمھیں ایک سال کے بعد پھانسی دی جائے گی۔
اس نے کہا منظور ہے۔ وزیر گھوڑا لے کر اس کے اوپر چھلانگ مار کر بیٹھا، اور
ایڑی لگا کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی نے چیخیں مارنا شروع کر دیں، یا اللہ تو
کیسے آ گیا؟ تجھے تو پھانسی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا، پروا مت کر۔ یہ بات میں نے
بادشاہ کے ساتھ کی ہے اب ایک سال کی چھٹی ہے۔ مزے کرتے ہیں، گائیں
گے، خوش رہیں گے۔ اس نے کہا، ایک سال تو ابھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس نے
رونا شروع کر دیا۔ اس نے کہا، تم اس حال کے اندر کیوں رو رہی ہو؟ لیکن وہ
بدستور روتی رہی۔ کہنے لگی، ایک سال تو ایک منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ پھر وہی
کیفیت آ جائے گی۔ بہتر یہ تھا کہ تجھے آج ہی پھانسی مل جاتی۔ میں ذہنی طور پر
تیار تھی۔ جیسے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر یہ سال میرے سینے پر خنجر کی
طرح لٹکتا رہے گا۔ نہیں نہیں ایک سال کے اندر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وزیر گھوڑا
لے کر صبح نکل جاتا، اور مزے سے جو جو جگہیں نہیں دیکھیں تھیں، وہ بھی

دیکھیں، اور اعلیٰ درجے کا اسے گھوڑا ملا ہوا تھا، اور کیا چاہیے تھا۔ چنانچہ وقت گزرتا رہا، دن پر دن گزرتے رہے، وہ روتی ہوئی بیوی کو کہتا، بھلی لوگ کچھ بھی ہو سکتا ہے تو کیوں فکر کرتی ہے۔ اس نے کہا، نہیں میرا جو فکر ہے، اندر سے نہیں جائے گا، لیکن وزیر خوش و خرم رہا۔

خواتین و حضرات! ہوا یوں کہ تین مہینے بعد تینوں مر گئے۔ بادشاہ، وزیر، اور گھوڑا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور آدمی اپنے حال کو برباد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرتا رہتا ہے۔ میں آپ سے یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا۔ اپنے حال کو خوش تر، خوب تر بنائے رہنا، اور خوش و خرم رہنا۔ آپس میں محبت کی رسم جو ہے اگر پہلے اس کی بنیاد نہیں ڈالی تھی، تو ضرور ڈال کے رکھنا۔ اس کے بڑے فائدے ہوتے ہیں اور اس کی لہریں بڑی دور دور تک پہنچتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو محبت آپ نے مجھے اس پروگرام کے ذریعے دی، سب کو دی۔ سارے ٹی وی والوں کو دی۔ وہ آپ کا بہت بڑا ایک انعام ہے اور بہت برا احسان ہے۔ ہم اس کے لیے دنیاوی طور پر اور انسانی طور پر آپ کے شکر گزار ہیں اور خالقِ کائنات کے اس اعتبار سے کہ سب کچھ نعمتیں وہی عطا کرتا ہے۔ اپنے بندوں کے ذریعے، اپنے بادلوں کے ذریعے، اپنی ہوا کے ذریعے۔ آپ اتنی جلدی خوفزدہ نہ ہو جایا کریں۔ میں نے اخبار کے لوگوں سے پوچھا، آپ اتنی خوفناک خبریں

کیوں چھاپتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ ، خبر ہوتی ہی خوفناک ہے، جو خوفناک نہ ہو وہ خبر نہیں بنتی۔ میں نے کہا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے کہا، ہر روز تیز گام پشاور سے کراچی چلتی ہے، کوئی خبر نہیں بنتی۔ جس دن اس کا ڈبہ الٹ جائے، تیرہ آدمی مر جائیں تو وہ خبر بن جاتی ہے۔ سیدھے سے چھ آدمی بڑے مزے سے تاش کھیل رہے ہیں، ایک آ کر کہتا ہے السّلام علیکم، کیا حال ہے بھائیو؟۔ خوش رہو، راضی رہو، دیکھو میں ایک اعلیٰ درجے کا کھیرا لایا ہوں۔ نمک لگا کر ایک ایک پھاڑی سب کو دیتا ہے، خبر نہیں بنتی۔ اگر چھ آدمی تاش کھیل رہے ہیں، ایک آدمی پستول لے کر آیا، اور تین بندے پھڑکا دیئے۔ یہ خبر بنے گی تو ایسی خبر بنانے سے پہلے پر سکون بات محبت کی بات ہے۔ ہمارے آپ کے درمیان چلتی رہنی چاہیے۔ جو چیزیں آپ کو ڈراتی ہیں، وہ مصنوعی ہوتی ہیں۔ ڈرانے والی چیز کوئی نہیں۔ اگر کوئی چیز ڈرانے والی ہے، تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکے، بہت خوش رکھے۔ بہت سی آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

دعا

میں سوچتا ہوں کہ آپ لوگ بھی میری طرح کے ہی ہوں گے، کیونکہ جو کوتاہیاں خامیاں مجھ میں سر اٹھاتی ہیں، ان مشکلات سے آپ بھی گزرتے ہوں گے، آپ بھی تو میرے ہی بھائی بہن ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں کئی بار اس کا اعتراف کرلیتاہوں، مثلاً میں یہ سوچا کرتا ہوں اور میری یہ ایک مشکل ہے کہ جب کبھی کوئی سڑک چوراہا کراس کرتا ہوں تو مجھے سرخ بتی ہی کیوں ملتی ہے۔ میں جب بھی گزراہوں، مجھے سرخ بتی ہی ملتی ہے۔ یہ پتا نہیں میری قسمت ہے۔ اچھا چلیے مل گئی، میں وہاں کھڑا ہو گیا، پھر یہ کیوں ہوتا ہے کہ سرخ بتی کا لمحہ جو ہے وہ آدھے گھنٹے پر محیط ہوتا ہے، سبز جو ہوتی ہے وہ دس سیکنڈ میں بدل جاتی ہے، بڑا دکھ ہوتا مجھے، کہ یا اللہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور اس میں میں بہت پریشان ہوتا ہوں کہ کیوں یہ ہوتا ہے۔

میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں، جب میں نئے زمانے کا آدمی نہیں تھا تو میں لال صابن سے نہاتا تھا، ہمیشہ۔ اب بھی لال صابن سے نہاتا ہوں، تو میری بہو جو ہے وہ بہت چڑتی ہیں اور وہ شرمندہ ہوتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں ماموں یہ آپ خدا کے

واسطے چھوڑیں لال صابن نہانے کے لیے نہیں ہوتا۔ تو میں نے کہا، بھئی ہم ایک زمانے سے یہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ کہتی، دیکھیں میں آپ کو اچھے والا صابن دے رہی ہوں، اس سے نہائیں، وہ صابن ہوتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ "ایکٹرسوں کے حسن کا راز اس صابن میں ہے" کچھ اس قسم کی چیز ہوتا ہے اور بہت اچھا خوب خوشبودار اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے، تو میں اس سے جب نہاتا ہوں، خاص طور پر اپنے پیارے لال صابن سے بھی تو خواتین و حضرات یہ کیوں ہوتا ہے کہ نہاتے وقت جب صابن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو وہ غسل خانے کے آخری کونے میں ہی کیوں جاتا ہے۔ پاؤں کے پاس کیوں نہیں گرتا، میں پھر منہ کو صابن لگا ہوا ہوتا ہے اور میں اس کو تلاش کرتا کرتا بڑی مشکل سے وہاں پہنچتا ہوں، اور پھر نہاتا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صابن گرے قدموں میں گھٹنوں کے پاس آ کر ٹخنوں کے درمیان کھڑا ہو جائے۔ میں آرام سے پکڑوں اور نہانا شروع کر دوں، لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ یہ مشکلات ہیں میری۔ مثلاً میری بیوی مجھ سے کہتی ہے کہ آپ جائیں، یہ بہت ضروری فارم ہے، یہ آپ بینک میں خود جمع کروا کے آئیں۔ پچھلے دنوں جب میٹرک کے امتحان تھے نا کسی ملازم کا بچہ وہ میٹرک کا امتحان دے رہا تھا، وہ باہر سے آئے ہوتے تھے، تو اس نے (میری بیوی) کہا کہ جی آپ کروا کے آئیں۔ آپ کا بھی تجربہ ہو گا، اور مجھے یقین ہے کہ

آپ بھی اس مشکل مرحلے سے گزرے ہوں گے، اور گزرتے ہوں گے۔ جب آپ بینک میں جاتے ہیں تو بعض اوقات بینک منیجر دباؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے دو قطاریں لگا دیتا ہے، تاکہ جلدی جلدی کام ختم ہو۔ ڈاکٹر صاحب! اکثر یہ ہوتا ہے، میں جس قطار میں کھڑا ہوں وہ آہستہ چل رہی ہے، اور وہ جو دوسری ہے تیز چل رہی ہے، بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں مفلوک الحال، اس ملک کا، یہ کیوں سست والی رو چھوڑ کے تیز والی میں چلا جاتا ہوں، یوں میں وہاں پہنچتا ہوں تو وہ سست چلنے لگ جاتی ہے، وہ دوسری والی جس کو میں نے چھوڑا تھا وہ تیز چلتی ہے۔ تو زندگی کے اس پیچ و خم سے مجھے بڑی شکایات رہتی ہیں اور میں جھگڑتا بھی رہتا ہوں، لیکن ہوتا یہی ہے، پھر جب میں شام کو تھک ہار کے واپس آتا ہوں، تو پھر میں شکوہ شکایت نہیں کرتا، کیونکہ یہ ہوتا ہے تو سب کے ساتھ ہوتا ہے، یا میرا وژن ایسا ہے یا مجھے یوں لگتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سارے پہاڑ مجھی پر ٹوٹے ہیں، یہ سرخ بتی مجھی کو ملتی ہے، میرا ہی صابن پھسل کر کونے میں جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں ایک تکلیف دہ بات جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ یہ جو دعا ہوتی ہے نا جب ہم دعا مانگتے ہیں، اس کے مانگنے کے وقت اور اس کے مانگنے کے طریق کو اپناتے ہوئے مجھے بڑی خوشی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب بھی پڑتا ہے اب بھی پڑتا ہوں۔ مثلاً یہ

کہ کبھی کبھی نماز پڑھنے کے بعد جب میں التّحیات پر پہنچتا ہوں تو میری جان آفت میں پڑ جاتی ہے، پھر میں کھٹا کھٹ اس کو ختم کر کے، اور سلام پھیرنے کی کرتا ہوں، اور جب میں سلام پھیرتا ہوں! تو پھر آگے آتا ہوں دعا کا مرحلہ تو دعا کے مرحلے میں ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار کر کے بھاگتا ہوں تو اس کا کنکشن جو ہے، جس کے حضور میں دعا سپیشل کی جاتی ہے، جڑتا نہیں۔ پتا نہیں کیوں دعا مانگتے وقت مجھ پر یہ کیا کیفیت طاری ہوتی ہے کہ میں اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں، حالانکہ دعا تو بنی اس لیے ہے کہ آپ اپنی عرض داشت لے کر جائیں تھالی میں رکھ کے، روتے ہوئے منہ بسورتے ہوئے، اور جو وہاں ایک بالکل جس کو کہتے ہیں نا "پچھے" پڑ کے، بس وہیں کے ہو رہیں، اور اس سے کہیں یا اللہ اس کو منظور کر نہیں تو میں نے واپس گھر نہیں جانا۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ جو چیز منتہائے مقصود ہوتی ہے۔

ساری عبادت کی، وہاں پر آ کر ہم رک جاتے ہیں۔ میری خیال میں، اوروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہو گا، کیونکہ میں نے عرض کیا کہ بہن بھائیوں کا رشتہ بڑا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اب یہ بھی ایک مسئلہ رہا میری زندگی میں کہ دعا کو کس طرح سے اپنایا جائے، اور کس طرح سے اس کو اپنی آغوش میں لیا جائے، گرفت کو مضبوط کیا جائے، لیکن یہ فن ہمیں کسی نے سکھایا نہیں، ہمارے بڑوں

نے ٹھیک طرح سے بتایا نہیں۔ یہ ڈھونڈنا پڑتا ہے خود ہی۔ اب جب دعا اتنی تیزی سے مانگی بھی جاتی ہے تو پھر اس میں دوسری کوتاہی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اکثر و بیشتر یہ شکایت کرنے لگتے ہیں کہ بڑی دعائیں مانگیں، بہت وہاں ایڑیاں رگڑیں کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اللہ ہماری دعا تو قبول ہی نہیں کرتا۔ پہلی بات تو میں یہ سمجھ کر کرتا ہوں کہ جو دعا میری طرف سے مانگی گئی ہے وہ تو پہنچی ہی نہیں۔ جو تار ہے کھٹ کھٹ والا وہ تو پورا گیا ہی نہیں، وہاں جلدی سے ہم نے کر دیا تو اب جب تک کمیونیکیشن نہیں ہو گی، تو بڑی مشکل بات ہو گی، پھر کیسے ہمارے درمیان رابطہ قائم ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ قبول کیوں نہیں ہوتیں دعائیں۔ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ آدمی اکثر سوچتا ہے، دعائیں بڑی خلوصِ نیت کے ساتھ مانگی جاتی ہیں، اور بڑی دردمندی کے ساتھ مانگی جاتی ہیں، تو قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ تو میں جسے اکثر ذکر کیا کرتا ہوں اپنے پروفیسر انگارتی جو پروفیسر تھے اٹالین کے اور ملک الشعرا بھی تھے ہم مشکل باتیں ان سے پوچھا کرتے تھے۔ ان کا مذہب ہی اور تھا اور زبان بھی اور تھی، لیکن وہ اتنے بڑے استاد تھے کہ ہم سارے یونیورسٹی کے پروفیسر کھڑے ہو جاتے تھے ان کے احترام میں، جب بھی تشریف لاتے تھے۔ خود زیادہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن ان کی دانش کی وسعت ایسی تھی کہ اس کی آغوش میں ساری چیزیں، سارے مشکل

سوالوں کے حل موجود ہوتے تھے۔ تو میں نے پروفیسر انگارتی سے پوچھا کہ سر مجھے آپ یہ بتائیں دعا کے بارے میں کہ یہ دعا قبول کیوں نہیں ہوتی، اور آدمی دھکے کیوں کھاتا پھرتا ہے۔ بچپن، اور جوانی پروفیسر انگارتی کی اسکندریہ میں گزری تھی، مصر کی بندرگاہ جو ہے۔ ان کے والد کا وہاں پر ایک چھوٹا سا سٹور تھا گروسری کا۔ یہ وہاں پڑھتے تھے، اور ظاہر ہے جب بچہ وہاں بڑھا پلا، تو وہ عربی زبان پر بھی حاوی تھے، بہت اچھی طرح سے جانتے تھے، اور اٹالین ان کی مادری زبان تھی جس میں وہ شاعری کرتے تھے۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اشفاق بات یہ ہے کہ میں اس معاملے میں بہت تخصیصی اندازِ فکر رکھتا ہوں، کیونکہ میں نے دعا کے بارے میں بہت غور کیا ہے، نہ صرف خود بلکہ اسکندریہ کے علما سے بھی میں نے اس پر بحث و مباحثہ کیا، تو ہمارے اسکندریہ کی ایک چھوٹی مسجد کے جو مولوی تھے، عالم تھے، ان سے میں نے یہی سوال پوچھا جو آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ کہا کہ دعا کے قبول ہونے کے تین رخ ہیں۔ ایک یہ کہ جیسی دعا آپ نے مانگی ویسی ہی دعا قبول ہو گئی۔ اور ایک دعا اس کی قبولیت کے لیے، اللہ کو، ظاہر ہے وہ تو مکلّف نہیں ہے، کوئی زحمت نہیں ہو سکتی۔

ایک دعا آپ کی رک جاتی ہے، وہ یہ کہ آپ نے اللہ سے ایک پھول مانگا ہوتا ہے

کہ یا اللہ مجھے نرگس کا ایک پھول عطا کر، مجھے اس کی بڑی آرزو ہے، اور اللہ نے ایک ٹوکرا تیار کر کے رکھا ہوتا ہے پھولوں کا آپ کے لیے۔ جب آپ بار بار ایک پھول کی رٹ لگاتے ہیں۔ تو اللہ کہتا ہے، میں اس کو کیسے سمجھاؤں کہ میں نے تو اس کے لیے، بڑی نعمتوں کی تیاری کر رکھی ہے، لیکن جب آدمی بہت اصرار کرتا ہے، بہت زور دیتا ہے، تو پھر کہتا ہے، چلو اسے ایک پھول ہی دے دو ٹوکرا ابھی رکھ لو۔ لیتا ہی نہیں ہے اب کیا کریں اس کے لیے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ آپ نے مانگا ہوتا ہے، وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ملتا ہے آپ کو۔ آپ کی Judgment پر، آپ کی عقل پر، آپ کی دانش پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ آپ کو زیادہ ہی ملتا ہے۔ تیسرا انہوں نے کہا یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دعا مانگی تو جاتی ہے، لیکن وہ Defer (رد) کر دی جاتی ہے۔ تاخیر میں ڈال دی جاتی ہے، ملتوی کر دی جاتی ہے کہ ابھی اس کو یہ نہیں دیں گے۔ مثلاً دیکھیے! جس طرح آپ اپنے بچے کو اس کے بہتر مستقبل کے لیے کچھ پیسے دینا چاہتے ہیں، تو آپ اس کو اسی وقت نہیں دیتے، اس کے لیے آپ ایک ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لیتے ہیں کہ دس سال کے بعد ایک تو اس کی رقم بھی زیادہ ہو جائے گی، اور ایک انعام بھی پائے گا۔ جو لوگ بہت زیادہ گھبراتے ہیں، اور گلے پڑتے ہیں، اور سینہ زوری کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میری دعا کیوں نہیں قبول

ہوئی؟Why Me ۔ میری جو بھتیجیاں، بھانجیاں ہیں وہ میز پر مکا مار کے کہتی ہیں، دادادیکھیےWhy me ؟ یہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میری بتی کیوں بند ہوئی۔ میں موٹر چلا رہی ہوں، یہ Red (سرخ بتی یا رکنے کا اشارہ) جان بوجھ کر دیتے ہیں۔ بہت غصہ ہوتا ہے ان کو۔ میں نے کہا، تم میں اتنی Courage کہاں سے آگئی؟ تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہے اللہ میاں مجھ سے محبت فرما رہا، کبھی میرا کام ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہے، لیکن تم تو مکا مارتی ہو میز کے اوپر اتنی زور سے، کہ نہیں جی میں تو بہت مقتدر حیثیت رکھتی ہوں، میرا درجہ بہت بڑا ہے۔ پروفیسر یہ کہتے تھے کہ اسکندریہ کی مسجد کے مولوی صاحب نے کہا، کئی دفعہ تو ایسا ہو گا کہ جب آپ آگے (آخرت میں) جائیں گے تو تاخیر کے لیے رکھی دعاؤں کے وہ جو انعام ہوں گے وہ اتنے بڑے، اور اتنے ارفع ہوں گے کہ آپ کو مسرت ہو جائے گی کہ یا اللہ کاش وہ دوسری دعا دنیا میں پوری نہ ہوتی، یہاں ملتا تو اس کا مجھے فائدہ ہوتا۔

عبد کی شان یہی ہے کہ وہ دعا کرتا ہے، ہماری بھی تو ایک شان ہے نا۔ ہم بھی تو کوئی گرے پڑے لوگ نہیں، ہم دعا کریں گے۔ دے گا تو پھر وہی دے گا۔ اسی کی مرضی کے مطابق ہو گا ہم اس میں گھبرا جاتے ہیں کہ یہ چونکہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے ہم میں کوئی کوتاہی ہے۔ یا پھر ہمارے مانگے جانے میں کوئی

کمی۔۔۔؟ تو میں سمجھتا ہوں، مانگنے میں کوئی ایسی کوتاہی ضرور ہے جس کے اوپر توجہ دی جانی چاہیے۔ بعض اوقات کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ پشیمانی حواس کی ہے۔

وہ خود بڑی اچھی دعا کا ایک روپ اختیار کر لیتی ہے۔ کوئی شرمندہ ہوتی ہے اور اس شرمندگی کو مٹانے کے لیے وہ اللہ کے حضور میں اپنے تخیل میں، جو لمحات اس کو میسر آتے ہیں، اسے ٹالنے کی کوششیں کرتا ہے کہ مجھ سے کوتاہی ہو گئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن دعا مانگنا مشکل یوں ہے کہ دعا مانگنے والا آدمی سب سے پہلے اپنی ذات کے آگے کھڑا ہو کے اس بات کا اعلان کرتا ہے۔ کہ میں نہایت نالائق، کم ظرف، جھوٹا، متکبر، کمینہ، گھٹیا آدمی ہوں، مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں اور اب ان کو کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے میں ایک سہارا چاہ رہا ہوں اور وہ اللہ کے واسطے مجھے سہارا عطا کیا جائے، لیکن انسان میں تکبر، اور انا اتنی ہوتی ہے، یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ جلدی سے "ربنا ظلمنا انفسنا" پڑھا اور پھر بھاگتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ انا اتنی بھری ہوتی ہے دعا کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ انا کا پورے کا پورا توڑنا، اور پھر ایک بھکاری کی طرح اپنا ایک ٹھوٹھا (کشکول) لے کر جانا۔ انا اتنی ظالم چیز ہے، اور اتنی متکبر، اتنی تگڑی چیز ہے کہ سینٹ آگسٹائن تھے، نصاریٰ کے بہت بڑے بزرگ صوفی۔ ٹھیک اللہ کے پیارے تھے، تو وہ

ایک دن دعا مانگ رہے ہیں، بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ۔ اور ان کی دعا مشہور ہے، وہ کہتے ہیں:

O God make me pious but not today

" اک دن ہوروے دے شرارتاں کرن لئی۔ "یعنی اللہ میں مجھے نیک بنادے، لیکن آج ہی نہ بنادینا، تھوڑاسا وقت مجھے مل جائے، اور۔

میں انا کی بات کر رہا تھا، ایک بڑے طوفان میں گھر گئی ایک ملاح کی کشتی، جو پرانے زمانے میں بادبانی کشتی لے کر چلتے تھے وہ ملاح وہ بحری قزاق قسم کا آدمی تھا کشتی ڈولنے لگی، طوفان کی لپیٹ میں آگئی، تو بچے، عورتیں، آدمی چیخیں مار کے رونے لگے۔ تو انہوں نے کہا، اے بد بخت ملاح ہم سارے دعا کر رہے ہیں اللہ سے، ہم یہ شکایت عرض لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہیں کہ ہم کو بچا، تو چپ کر کے بیٹھا ہوا ہے، تو بھی کچھ کہہ۔ اس نے کہا میں نے کبھی دعا مانگی نہیں، میں تو ملاح ہوں، ڈوبتی ہے تو ڈوبے؟ انہوں نے کہا، نہیں تو خدا کے واسطے ہم میں شامل ہو تو اس نے کہا، اچھا ٹھیک ہے۔ اس نے کہا، اے اللہ یہ لوگ مجھے اس بات پر مائل کرتے ہیں کہ میں تجھ سے دعا کروں، اور درخواست کروں، میں نے پچھلے پندرہ سال سے تجھ سے کوئی دعا نہیں مانگی، لیکن ان کے مجبور

کرنے پر دعا مانگ رہا ہوں، مہربانی فرما کر اس طوفان کو بند کر دے، تاکہ یہ سلامتی سے کنارے پر اتر جائیں اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاءاللہ تعالیٰ اگلے پندرہ سال میں تجھ سے کوئی دعا نہیں کروں گا۔ انسان کے ذہن میں یہ بات چلتی رہتی ہے۔ اسی لیے دعا مانگتے ہیں ورنہ یہ کمال کا کام ہے دعا کرنا۔ کبھی آپ کو ایک دیوار میسر آ جائے، اور مغرب کے بعد کا وقت ہو، اور اس سے ڈھو لگانا نصیب ہو جائے اور پھر آپ کا جو Hot line پر کمیونیکیشن آرام آرام کے ساتھ، پھر وہ جو دعا چلتی ہے، ادھر سے اس کا Response ملتا ہے، اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ وہاں یہ دعا قبولیت کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض اوقات کوئی خفت شرمندگی جو ہے، وہ بھی دعا کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ چلتی رہتی ہے جونہی آدمی خفیف ہوا، شرمندہ ہوا، اس کی انا ٹوٹی، وہ بڑی نعمت کی گھڑی ہوتی ہے، پھر انسان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ وہ ابدیت کے دائرے میں پورے کا پورا سما جاتا ہے۔

میرے دفتر میں ایک اکاؤنٹ آفیسر تھے، مبشر نام تھا ان کا۔ وہ کام کرتے تھے، وہ بڑا ریگولر آدمی تھا وقت پر آنا، ٹکا کر کام کرنا، وقت پر جانا، اور کچھ کام Over time کا ہو، اس نے کبھی اوور ٹائم جوائن نہیں کیا۔ وہ دل و جان کے ساتھ، اور لگن کے ساتھ کام کرنے والا تھا۔ ایک دن وہ دفتر صبح آنے کے بجائے ساڑھے

بارہ بجے کے قریب آیا، تو میں باہر کھڑا مالی کے ساتھ کوئی بات کر رہا تھا، تو وہ گزرا۔ میں نے کہا، یہ آپ کے آنے کا وقت ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، لیکن شاید میں تھوڑا غصے میں تھا۔ اس نے کہا، میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں معافی کہنے سے تو کام نہیں بنے گا، ساڑھے بارہ کوئی ٹائم نہیں ہے، چلیے آپ دس منٹ پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتے تو خیر۔۔۔۔؟؟ میں تو اس کا بہت سختی سے نوٹس لوں گا اور میں آپ کی A.C.R میں لکھوں گا۔ کہنے لگا، نہیں سر۔ یہ ساری بات کر کے میں نے کہا، آپ میرے دفتر میں آئیں، بات کریں، تو وہ آ کے بیٹھ گیا۔ وہ انا کی بات جو میں آپ سے عرض کر رہا تھا اس نے آ کر کہا، میں بہت معافی چاہتا ہوں، میں بڑا شرمندہ ہوں کہ میں وقت پر نہیں آ سکا۔ میں نے کہا خالی شرمندگی سے کچھ نہیں بنتا یہ تو آپ کو Explain کرنا پڑے گا۔ کہنے لگا، نہیں، بس آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں باس تھا، جیسے ہوتا ہے باس، ایک نہایت بے ہودہ چیز۔ یعنی باس کچھ بھی نہیں ہوتا، انسانیت تو ہوتی ہی نہیں، اس میں۔ تو میں نے کہا، نہیں۔ وہ کہنے لگا بات یہ ہے کہ میری بیٹی تھرڈ ائیر میں پڑھتی ہے، وہ رات اپنی ماں سے جھگڑی اور غصے میں آئی، ماں کی اور بیٹی کی کچھ تو تو میں میں ہوئی، وہ گھر سے نکل گئی، میں آیا تو رو کے کہا میری بیوی نے کہا شازیہ تو نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں کہاں ڈھونڈوں سردیوں کی رات میں اسے۔

ساری رات بے چارہ آدمی، شریف سا، نیک سا آدمی اور جوان بیٹی، وہ چلتا رہا تلاش کرتا رہا۔ بعد میں کافی تلاش کے بعد مجھے خیال آیا، وہ ایک سہیلی کا ذکر کیا کرتی تھی، وہ یہاں سنہری مسجد کے پاس۔۔۔۔۔؟ تو میں اندازے سے، زور لگا کے، شاید جھگڑی ہے لڑی ہے، اللہ کرے اس کے پاس چلی گئی ہو، ورنہ زمانہ جیسا خراب ہے، آپ اسے جانتے ہی ہیں، اور باپ کا جو حال ہوتا ہے برا، تو میں گیا تو اس گھر کا دروازہ جا کے کھٹکھٹایا رات کے وقت ڈیڑھ بجے۔ تو اس سہیلی کا والد نکلا، میں نے اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا شازیہ، تو اس نے کہا دونوں سہیلیاں سوئی ہوئی ہیں۔ تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں نے کہا شکر ہے یا اللہ۔ صبح میں اپنی بیوی کو لے کر گیا، اس کی منت خوشامد کی، تو میں ذرا سا بیٹھ کے سو گیا کرسی پر ہی، تو ساڑھے بارہ بجے میری آنکھ کھلی، تو میں یہاں آ گیا ہوں۔

جب وہ یہ بات کہہ چکا خواتین و حضرات، اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے پاس اس کو جواب دینے کے لیے یا خفت مٹانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں اٹھا میرا اپنا دفتر تھا، اس کے پیچھے چھوٹا کمرا تھا، اس میں جائے نماز بچھا کر میں نے دو رکعت نمازِ خفت پڑھی، اور میں نے اللہ سے معافی مانگی، اب مجھ میں اتنی جرات تو نہیں رہی تھی کہ میں اس سے معافی مانگتا، لیکن میں نے شرمندگی ٹالنے کے لیے یہ دو نفل جو تھے ادا کیے، اور وہ دن، اور آج کا دن، اس واقعہ کو سولہ سترہ

برس ہو چکے ہیں، اب لڑکی کی ماشاء اللہ شادی بھی ہو چکی ہے، اس کے دو بچے بھی ہیں، ایک بیٹا، اور ایک بیٹی وہ اس عید پر مجھ سے ملنے بھی آئے تھے۔ میں نے ان کو پانچ پانچ روپے دیئے۔ بچوں نے کہا دادا اس پر دستخط کر کے دو تو میں نے کہا بظاہر تو یہ پانچ روپے کا نوٹ ہے، میں دستخط کروں تو یہ پانچ ہزار کا ہو جائے گا۔ اس نے کہا، اسی لیے تو ہم کروا رہے ہیں، تو اس کا باپ بھی تھا، نانا بھی تھا، وہ چلے گئے تو میں اب بھی اتنے برس گزر جانے کے باوجود جب بھی کبھی موقع ملتا ہے، تو پھر میں دو نفل خفت کے ضرور پڑھتا ہوں کہ مجھ سے کوتاہی ہوئی، میں ٹھیک نہیں رو سکا، یوں تو ہر ہر لمحہ ہر ہر قدم پر ہوتی رہتی ہیں، تو میں جلدی میں، چونکہ وقت کم ہے۔ پروفیسر انگارتی کی بات بتاتا ہوں، اور یہ راز کی بات ہے، جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ خاص طور پر آپ کے لیے کہ دعا مانگنے کے لیے انہوں نے کہا کہ زبانی دعا مانگنے سے بہتر ہے کہ عرضی پر لکھ کر مانگی جائے، اچھا صاف ستھرا پاک سا کاغذ لیں، اور اس کے اوپر بسم اللہ لکھ کے محترمی جناب اللہ میں یا جو بھی آپ لکھ سکتے ہیں جل جلالہ، جو لکھ کے کہ حضور مجھ پہ یہ مشکل ہے، اور میں یہ سوچتا ہوں، ایک پیراگراف، دوسرا پیراگراف، تیسرا پیراگراف، اور ادب سے اس کو لپیٹ کے جیب میں ڈالیں۔ اگلے دن آپ نے کوئی Amendment کرنی ہو اس میں، ترمیم کرنی ہو تو وہ بھی اس میں کرتے رہیں

لکھتے رہیں، اور اس عرضی کے اوپر جب تک آپ توجہ نہیں دیں گے آپ میری طرح سے ہی دعا مانگتے رہیں گے، ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و۔۔اس میں تو پورے پورے داخل ہوں، ویسی ہی عرضی جو آپ سرکار کو ڈالتے ہیں دو ٹکے کی سرکار کو، اور پھر اتنے چکر لگاتے ہیں اس کے پیچھے۔ ایسا ہی کاغذ۔ اللہ ان کا بھلا کرے میرے پروفیسر کا، انہوں نے کہا، یہ لکھا کرو۔ تو یہ دعا کا ایک طریق تھا، جو انہوں نے بتایا، میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، آپ اسے آزما کے دیکھیں، اس سے بڑا فائدہ ہو گا۔

اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

قول اور عمل

اس محفل میں یہ بات طے نہیں ہوتی یا میں سوچ کے نہیں آتا کہ آج کیا بات کریں گے۔ بیچ میں گفتگو کے دوران ہی کچھ نہ کچھ نکل آتا ہے، اور وہ آپ تک پہنچ جاتا ہے، لیکن آج پہلی مرتبہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ آپ اپنے بابا کے بارے میں بات ضرور کریں۔ پہلے پہلے ابتدا میں تو کی، پھر اس کے بعد کچھ اور موضوعات رہے، پھر کہیں ان موضوعات سے پھسل کر آگے نکل گئے، تو آج یہ فرمائش جو ہے مجھے بھی دل سے پسند آئی ہے۔

اور آپ سب نوجوان ہیں، اور یہ بات میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بابے کون ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہماری زندگیوں میں آ گئے، اور ان کے ساتھ کیا تعلق ہوتا ہے۔ اور ملتان میں بابے زیادہ کیوں ہوتے ہیں۔ اور شہروں میں کم کیوں ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، تو چونکہ یہ فرمائش کی گئی ہے تو میں یہ عرض کروں کہ ہمارا ایک ڈیرہ تھا، جہاں میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد ولایت میں رہنے کے بعد ولایت کی یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد جب لوٹ کے یہاں آیا، تو 1954ء میں میں اس ڈیرے پر گیا۔ اُس ڈیرے والے کا نام حضرت سائیں فضل

شاہ صاحب رحمۃ اللہ، نور والوں کا ڈیرہ اسے کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں اس کی، اور اندر کچھ بھیڑ بکریاں، اور ایک بھینس بھی ہوتی تھی۔ صفائی کا انتظام ایسا اچھا نہیں تھا، کیونکہ جب آدمی صفائی کی طرف توجہ دینے لگتا ہے تو باہر کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اندر کی صفائی کی طرف کم ہو جاتی ہے۔ خیر یہ میرے لیے ساری نئی باتیں تھیں، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس نوعیت کا، اور کس قسم کا ہو گا۔ ہمارے بابا جی بے چارے تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا، لیکن انہوں نے کہیں سے انگریزی کا لفظ Note سیکھا ہوا تھا۔ جب کوئی بات بہت خیال انگیز ہوتی تھی، نہایت Thought provoking، تو وہ انگلی اٹھا کے کہتے تھے نوٹ۔ تو ہم سب چونک کر متوجہ ہو جاتے تھے کہ کوئی بات نہایت اہم ہو گی، اور ہم اسے سنبھال کر رکھیں اور یہ آئندہ زندگی میں کام آئے گی۔ اسی طرح اس کے ارد گرد جو لوگ تھے، ان کو بھی انہوں نے خطاب دے رکھے تھے ماڈرن قسم کے۔ مثلاً وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے اشرف فاضلی صاحب، تو دوسرے جو ان کی خط و کتابت کا کام کرتے تھے، وہاں ڈاک آتی تھی، جو اس کا جواب دیتے تھے ان کو وہ سیکرٹری صاحب کہتے تھے۔ جو حساب و کتاب پیسے ویسے لوگ دے جاتے تھے کھانے وانے کے تو ان کو وہ فنانس سیکرٹری کہتے تھے۔ تو یہ لوگ بڑے خوش ہوتے تھے

کہ بیٹھے بٹھائے اتنے بڑے رتبے مل گئے۔ ایک روز ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں بہت اچھی باتیں ہوتی ہیں، اور بہت توجہ طلب باتیں ہوتی ہیں، کیوں نہ یہاں سے ایک رسالہ نکالا جائے، اور وہ چھاپا جائے، اور چھاپ کے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ بڑی اچھی بات تھی، ایسے ہی ہوتا ہے۔ تو ہم نے بیٹھ کے رسالے کی پوری ایک ڈمی تیار کی، اس کا فارمیٹ سوچا، ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب اس کے ایڈیٹر قرار دیئے۔ سیکرٹری صاحب ظاہر ہے منتظمِ اعلیٰ وہی تھے، میں نے کہا، اچھا میں بھی کچھ لکھوں گا، سارا کچھ تیار کیا تو ہم یہ ساری سکیم بنا کے ان کے خدمت میں لے گئے۔ ہم نے کہا جی کہ ہم ایک رسالہ نکالنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے کہا، پہلے بھی ایک رسالہ نکلا یہاں سے تھوڑی دیر کے لیے پھر بند ہو گیا۔ تو کہنے لگے، آپ رسالہ کیوں نکالنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، اس لیے کہ ہم آپس میں اتحاد اور Unity پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، اور ملیں گے، اور ان کو یہ Message جو ہے، یہ دور دور تک پہنچتا رہے گا، اور استفادہ ہو گا، ہماری بڑی آرزو ہے کہ مسلمان ایک ہوں، ان میں Unity ہو، ان میں اتحاد ہو، ان میں یکجہتی ہو۔ تو آپ نے کہاNote ۔ جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے۔ صرف قول کے اندر رہنے سے فرض، اور حق پورا نہیں ہوتا، کیونکہ اس ساری چیز کا تعلق قول سے

ہے اور عمل اس سے مختلف چیز ہے، اگر آپ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اور آپ بھی اکثر سوچا کرتے ہیں، اور گھر میں بات بھی ہوتی ہے، تو قول سے، گفتگو سے کبھی نہیں ہو گی۔

دیکھیے ہمارا اللہ ایک ہے، ہمارا رسول ایک ہے، ہمارا نماز پڑھنے کا طریق ایک ہے، ہمارا قیامت کے اوپر ایمان ایک سا ہے، لیکن اس کے باوصف یک جہتی نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوچنے کی بات تھی۔ تو ایسی باتیں بابوں کے ہاں سے ملتی ہیں کہ جب تک ایک دوسرے کا دکھ درد نہیں سنو گے، ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانو گے، کون کس کیفیت سے گزر رہا ہے، تو اس محض گفتگو کر دینے سے کام نہیں بنے گا۔ کہتے تھے Note جماعت عملاً ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے وجود میں آتی ہے، خالی قول کے ساتھ جماعت کی یکجہتی کا حق ادا نہیں ہوتا، تو آپ عمل میں داخل ہوں گے تو پھر یہ حق ادا ہو گا، تو پھر یہ کام ہو گا ورنہ نہیں ہو گا۔ ہم اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہ ایک کتاب رسالہ اخبار نکالتے ہیں، اگر ہم ایک لیکچر دیں، اگر پروفیسر جا کے سٹیج پر کھڑا ہو کر ایک بات بتا دے اور وہ اسٹوڈنٹ کے ذہن میں اتر جائے، اس سے ان کے اندر یکجہتی پیدا ہو جائے، ایسا ہوتا نہیں۔ کبھی بھی نہیں ہوا۔ دنیا کے کسی خطے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قول کی اہمیت نہیں ہے۔ کہی جانی

والی بات کی اہمیت نہیں ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن بابا جی فرماتے ہیں کہ Note ، قول ایک سواری ہے، جو آپ کو عمل کے کنارے پر لے جاتی ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم قول کی سواری کو اختیار کرتے ہیں، اس کشتی میں بیٹھتے ہیں، چپو چلاتے ہیں، عمل کے کنارے پر پہنچتے ہیں، لیکن اس کشتی کو چھوڑتے ہیں ہیں، اس کے اندر رہتے ہیں، وہ وہیں چکر کاٹتی رہتی ہے، عمل کا کنارہ سامنے رہتا ہے، اور ہم اس کر طرف جا نہیں رہے ہوتے، اور ہم کوشش یہ کرتے ہیں پڑھے لکھے لوگ، نوجوان میرے ساتھ ہیں، ہم کوشش صرف یہ کرتے ہیں کہ کمیونیکیشن سے، صرف ڈائیلاگ سے، صرف گفتگو سے بات بن جائے گی، کبھی نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انسان کا وجود، اس کی سائیکی، اس کا ہونا، اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ کوئی بندہ میری بات سنے اور میرے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہ جو آپ نے اکثر دیکھا ہو گا، آج کل خُودکُشیاں ہو رہی ہیں، لوگ خود سوزیاں کر رہے ہیں، عام طور پر ایک اچھا جرنلسٹ یہی کہتا ہے کہ چونکہ ملازمتیں نہیں مل رہیں، بھوک ننگ بہت ہے، اس وجہ سے یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بات نہیں ہے۔ اس وقت آپ کے پاکستان کا نوجوان خاص طور پر ایک عام آدمی اس کندھے کی تلاش میں ہے، جس پر وہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ بیان کر سکے، اور کوئی کندھا دینے کے لیے تیار نہیں۔ کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ اگلے زمانے میں،

ہمارے زمانے میں، ہمارے باپ دادا کے زمانے میں، دکھ سکھ کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان کے پاس اکنامکس کے اتنے مسائل، اور اتنی پرابلمز نہیں تھیں۔ ولایت والوں نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ دکھ سننے کے لیے فیس لیتے ہیں۔ یہ سائیکاٹرسٹ جو ہوتے ہیں، سائیکوتھراپسٹ جو ہوتے ہیں، یہ آپ سے تین سو ڈالر فی گھنٹہ لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں پرسوں پھر آ جانا، تم اپنے دکھ بیان کرو، مجھے پیسے دے دو۔ ہمارے ہاں بھی اب ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ اگر آپ لاہور کی نہر کے کنارے کنارے جائیں تو دو تین بورڈ آپ کو نظر آئیں گے ماہر نفسیات کے۔ جو یہ کہتے ہیں، اگر آپ نے اپنا دکھ بیان کرنا ہے تو دو سو روپے گھنٹہ مجھے دیں۔ دکھ اپنا بیان کر کے چلے جائیں، تو وہ بھی ایک تھراپی ہے، لیکن پہلے زمانے میں ہمارے ہاں مفت اور عام ہوتی تھی۔ اب لوگ اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ کسی وجہ سے پھنس گئے تو جب تک عمل کے اندر آدمی داخل نہیں ہو گا، دوسرے آدمی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ میرا کچھ لگتا ہے، میرا کچھ بھائی بند ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے تقریر کر کے چلے جائیں گے، تو اس کی انفارمیشن میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور خطرہ یہ ہے کہ وہ یہ ساری انفارمیشن سمیٹ کے ایک اگلے آدمی سے وہ بات کرنے لگ جائے گا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا، کبھی آپ نے ہمارے ٹیلیویژن کے پروگرام دیکھے ہیں دینی باتیں،

سوالوں کے جواب بڑی تیزی سے دیئے جاتے ہیں۔ وہ انفارمیشن ہوتی ہے، اس کا ذات کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ یا اپنی سائیکی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تو آپ نے ہمیں منع کیا کہ دیکھیئے ایسے نہ کریں، رسالہ نہ چلائیں، چھوڑیں اس کام کو۔ کسی کے کام آسکتے ہیں تو وہ چھوٹا سا کام کریں۔ میں نے کہا، جی کام (اب میں اتنا پڑھا لکھا آدمی جب میں بہت نوجوان تھا، اور سوٹ پہنتا تھا تھری پیس، اور سونے کی پن لگاتا تھا ٹائی میں)۔ میں نے کہا، میں کسی کے کیا کام آسکتا ہوں، میں تو ایک معزز آدمی ہوں، پروفیسر ہوں، کہنے لگے، نہیں یقیناً آپ کام آسکتے ہیں، کہنے لگے، یہاں اماں جی رہتی ہیں۔ وہاں صابن کی کچھ دکانیں تھیں، وہاں پر ایک مائی تھی، دائی کا وہ کام کرتی تھی، تو اس کی بیٹی کی شادی ہے تو کہنے لگے، اس کی بیٹی کی شادی ہے اور اس کا جو منگیتر ہے، اماں نے لڑکا چنا ہے۔ وہ سگنلر ہے، بابا جی نے پتہ نہیں لفظ کہاں سے سیکھا، سگنلر وہ ہوتا ہے جو مورسی کے اوپر تار باندھے، کہنے لگے وہ سگنلر ہے محکمہ ڈاک بنگلے میں۔ ڈاک بنگلہ نہر کا بنگلہ۔ انگریز کے زمانے میں یہاں ریل تار ڈاک کا انتظام بہت غضب کا تھا۔ جب یہ نہریں کھودیں انہوں نے ان کے کنارے بڑے اعلیٰ درجے کے بنگلے بنوائے، ہچ ٹریز والے بنگلے، ان میں فلمیں بھی بڑی شوٹ ہوتی تھیں، اعلیٰ درجے کی اس کے اندر بلڈنگیں ہوتی تھیں، اور وہاں پر ایک آفس بھی ہوتا تھا، جہاں پر سگنلر

کنڈ کٹر تھا۔ خدانخواستہ اگر نہر میں کوئی خرابی ہو، پانی روکنا ہو یا کوئی اور کھٹا کھٹ ہو۔ تو وہ سگنلر کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے۔ 60 روپے تنخواہ والا سگنلر۔ وہ لڑکا بھی پسند کر لیا تھا۔ تو مجھے کہنے لگے، تمہارے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے، وہ سگنلر کا ابا جو ہے وہ آرہا ہے تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے کہ لڑکی کتنا کام کرتی ہے، چارپائیوں کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھتی ہے کہ نہیں، شام کو بسترے بچھاتی ہے کہ نہیں، گھڑا پانی کا بھر کے لاتی ہے کہ نہیں، تو وہ وہاں رہے گا کچھ دن، وہ جو روٹی کھاتا ہے وہ گندم اور مکئی کا آٹا ملا کے کھاتا ہے، اب نخرہ دیکھیں اس کا۔ تو تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ تم دس سیر پکا مکئی کا آٹا اپنی موٹر میں رکھ کر اماں جی کے پاس پہنچاؤ۔ میں نے کہا، مجھے کوئی اچھا سا کام دیں لکھنے کا، یہ کیا ہے۔ مجھے کہنے لگے، وہ اس لیے دینا ہے کہ ہم نے اس بابے کی عزت افزائی کرنی ہے۔ اور ہماری بیٹی کی شادی ہے۔ تو میں نے کہا، اچھا جی تو میں گیا بھی، اس سے ملا بھی بابے سے، انہوں نے کہا، خبردار اس کی بہت عزت کرنی ہے، اور اس کو سلام کرنا ہے۔ میں نے کہا جی میں دو مرتبہ کرنے کو تیار ہوں۔ جب میں لوٹ کے آیا اگلے دن۔ تو کہنے لگے وہ حقہ پیتا ہے تو میں نے کیکر کی چھال جو ہے نا جس کو کیکر کے سکڑے کہتے ہیں، تو اس کا کوئلہ بہت اچھا ہوتا ہے، اور جو پرانے بابے حقہ تمبا کو پینے والے ہیں، اس کی آگ دھرتے ہیں، تو یہ سکڑے جو ہیں یہ تھے سیر

ڈیڑھ یہ انہیں دے دو۔ میں نے کہا، جی دفع کریں چپا سا آدمی ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں نہیں، یہ نہیں کہنا۔ وہ اللہ کی مخلوق ہے، اور وہ انبیا کا بیٹا ہے۔ میں نے کہا، وہ بندہ۔ کہنے لگے، ہاں حضرت آدم کی اولاد جو ہے۔ اچھا وہ ہر ایک کو کہتے تھے کہ نبی کا بیٹا ہے، تو ہماری برکت ہو گی، لو جی یہ نبی کی دھی، ہمارے ڈیرے پر آ گئی ہے۔ خیر ہمارے لیے یہ بات سیکھنی بہت مشکل تھی، تو جب انہوں نے یہ ڈیوٹی لگائی، ہم بہت روئے پیٹے کہ رسالہ چلنے سے رہ گیا۔

امریکہ سے کوئی صاحب آئے ہیں، انہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ اشفاق صاحب! میں پتہ نہیں کتنے ملین ڈالر اکیس برس امریکہ رہنے کے بعد کما کر لایا ہوں، میں نے اسلام آباد میں کچھ کام شروع کیا ہے اسلام، یک جہتی، اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے، تو آپ آئیں۔ تو میں نے کہا، سنیں آپ جو بھی کریں گے ٹھیک ہو گا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے کیا کروں گا۔ میں آپ کو کوئی اچھا سا سجھاؤ نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے، نہیں آپ ضرور آئیں۔ تو میں نے ٹیلی فون پر ان سے کہا، دیکھیے آپ ایک بہت بڑی ساری بلڈنگ بنائیں گے، پھر اس میں آپ ایک سیکشن رکھیں گے، اس میں درسِ قرآن شروع کریں گے، پھر تجوید کا رکھیں گے، پھر آپ قرأت سکھائیں گے، بس یہی چیزیں ہوں گی۔ یہ آپ کرتے رہیں، اچھی بات ہے، لیکن وہ جو آپ کی آرزو ہے کہ لوگ جو

ہیں، وہ ایک جماعت کا رُخ اختیار کریں، تو وہ عملاً کرنے سے ہو گا، اور رسالہ چھاپنے سے نہیں ہو گا۔ اب بھی جو دینی جماعتیں ہیں، وہ بار بار یہی کہتی ہیں، آپ نے دیکھا ہو گا بے شمار لوگ آپ کے پاس بھی آتے ہیں، کتابیں آتی ہوں گی شاید، بڑی اچھی بات ہے۔ وہ کشتی ضرور ہے، وہ ساحل تک ضرور لے جاتی ہے، لیکن ساحل پر خود اس کو اترنا پڑے گا، اب ہمارے لیے یہ بات بڑی مشکل ہو گئی ہے کہ یہ کیسے کریں؟ کہ ہم اس کو چھوڑ کر عمل کی طرف آئیں۔ انہوں نے کہا اگر Unity چاہتے ہیں آپ، اتحاد چاہتے ہیں، تو پھر آپ کو عمل کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ ایسے کام نہیں بنے گا۔

ایک مرتبہ ہم لاری پر جوہر آباد جا رہے تھے، بڑی دیر کی بات ہے، میرے ساتھ لاری میں ایک اور معزز آدمی پرانی وضع کے ریٹائرڈ تھے، گرمی بہت تھی، انہوں نے پگڑی رکھی ہوئی تھی گود میں، ہوا آرہی تھی۔ تو ایک خاص علاقہ آیا، تو انہوں نے پگڑی اٹھا کے سر پر رکھ لی۔ اور ادب سے بیٹھ گئے، تو میں متجسس آدمی تھا۔ میں نے کہا، جی یہاں کسی بزرگ کا مزار ہے، کہنے لگے، نہیں۔ میں نے کہا، جی کوئی درگاہ ہے یہاں۔ کہنے لگے، نہیں۔ تو میں نے کہا، معاف کیجیے گا، میں نے یہ دیکھا کہ آپ نے پگڑی جو ہے وہ گود سے اٹھا کر سر پر رکھ لی ہے، تو باادب ہو کے بیٹھ گئے ہیں، کوئی وجہ ہو گی۔ کہنے لگے، بات یہ ہے کہ میں اس علاقے کا

واقف ہوں، یہاں ڈیزرٹ تھا، اور ریت تھی، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تو حکومت نے سوچا کہ اس میں کوئی فصل اگائی جائے۔ تو لوگ آتے نہیں تھے، ایک آدمی آیا، اس نے آکر جھونپڑا بنایا، اور جھونپڑا بنا کر یہاں پانی کی تلاش میں ٹیوب ویل وغیرہ سنک کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا آدمی تھا، جس نے یہاں سبزہ اگایا، جس نے عملی صورت میں اس زمین کو ہریالی بخشی۔ جو میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں، پتا نہیں وہ آدمی کہاں ہو، میں نے اس کے احترام میں یہ پگڑی اٹھا کے رکھ لی۔ دیکھیے یہ ایسی چیزیں ہیں، جو ہماری زندگی کے اوپر عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں، اور اگر آپ اپنی آنکھیں بالکل کھلی رکھیں۔ ماشاءاللہ کھلی رکھتے ہیں، کان بھی، تو آپ کو ارد گرد اتنی کہانیاں ملیں گی، جن کے اوپر آپ نے اس سے پہلے توجہ نہیں دی ہو گی۔ ہمارے استاد تھے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب، تو ہم سیانے تھے۔ میں ففتھ ائیر میں پڑھتا تھا، ان کی ایک عادت تھی کہ جب کسی کی شادی ہوتی تھی، لڑکی کے گھر والوں میں، تو ان کے گھر جا کر بارات کو کھانا کھلانے کا بندوبست ان کے سر پر ہوتا تھا۔ تو صوفی صاحب نے ہم کو کہا کہ چلو بھئی فلاں گھر میں کھانا برتانا ہے، دینا ہے، بارات آگئی ہے۔ مجھے یاد ہے ہم بھاٹی دروازے بتیاں والی سرکار کے پیچھے ایک گھر تھا وہاں چلے گئے۔ انہوں نے کہا، لو جی صوفی صاحب آگئے، فکر کی کوئی بات نہیں، نائی دیگیں لے

آئے۔ اب جو بارات تھی اس کے بارے میں خیال تھا کہ 80 کے قریب بندے
ہوں گے۔ وہ 160 کے قریب آ گئے۔ اب صوفی صاحب کی آنکھیں، اگر آپ
میں سے کسی کو یاد ہیں، ماشا اللہ بہت موٹی تھیں، گھبرا گئے، اور ان کے ماتھے پر
پسینہ اور ناک پر بھی آجاتا تھا۔ کہنے لگے، اشفاق ہن کیہہ کریے۔ میں نے کہا، پتا
نہیں، دیگوں میں پانی ڈال دیتے ہیں۔ پہلا موقع تھا، میں Fifth year کا
اسٹوڈنٹ تھا۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا میرے منہ پر۔ زور سے۔ کہنے لگے،
بیوقوف آدمی اس میں پانی ڈال کے مرنا ہے۔ وہ تو فوراً ختم ہو جائے گا۔ اس میں
گھی کا پیپا ایک اور ڈالنا ہے۔ گاڑھا ہو جائے گا تو کھایا نہیں جائے گا۔ اب ہم اندر
سرو کر رہے تھے، اور صوفی صاحب بیچ میں سے نکال کر ڈالتے جاتے تھے۔ ہم
باراتیوں سے کہتے اور لائیں۔ وہ کہتے تھے گرم لاؤ جی۔ ہم تو بھاگے پھرتے تھے۔
اب آخر کیفیت یہ آ گئی کہ دیگیں ختم ہو گئیں، اور ان کا چہرہ دیکھنے والا تھا وہ
کانپ رہے تھے۔ اگر کسی نے اندر سے کہہ دیا کہ اور کاب بھیجیں، تو ان کے پاس
دینے کے لیے صرف ایک رہ گئی تھی، لیکن وہ ڈرے ہوئے تھے۔ جب خوفزدہ
تھے تو اندر سے آواز آئی بس۔ جب دوسرے بندے نے کہا، بس جی صوفی
صاحب۔ تو صوفی صاحب کے ہاتھ میں جو پکڑا ہوا تھا وہ گرا، اور اتنی شدت سے
پیچھے گرے کہ وہ بڑا سا کڑھاؤ تھا، شکر ہے، ان کے سر پر نہیں لگا، تو ہم نے اٹھا

کے ان کو بستر پر لٹایا، اور ٹانگیں پاؤں دبائے۔ جب تلی مالش کی تو اٹھ کے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا، خدا کے واسطے ایسی ٹینشن کا کام آئندہ نہیں کرنا۔ کہنے لگے، نہیں بالکل نہیں، میری بھی توبہ۔ وہاں سے ہم چل پڑے، پیچھے ہم شاگرد۔ اب آگے آگے صوفی صاحب، کوئی پندرہ بیس گز سے زیادہ گئے ہوں گے۔ ایک مائی باہر نکلی، کہنے لگی، لو غلام مصطفیٰ میں تو تینوں لبھ دی پھرنی آں۔ "تاریخ رکھ دتی اے۔ تیرہ بھادوں دی کاکی دی۔" تو صوفی صاحب جو توبہ کر کے نکلے، کہنے لگے، کاغذ ہے، ہاں پنسل ہے۔ کہنے لگے۔ لکھ تیرہ سیر گوشت ایک بوری چول صوفی صاحب لکھوا رہے ہیں۔ تو میں نے کہا، جی یہ پھر ہو گا۔ کہنے لگے، نہیں یہ تو ان کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا، آپ صرف پڑھایا کریں کتاب کی تشریح وغیرہ۔ تو یہ ان کا کام تھا، تو یہ جو عمل کی دنیا ہے، اس میں داخل ہوتا ضروری ہے۔

عالم لوگ پڑھے لکھے میرے جیسے۔ پروفیسر بات کرنے والے، ایڈیٹوریل لکھنے والے، کہتے ہیں گفتگو اگر ہوتی رہے، اگر اس طرح کا مواد چھپتا رہے، تو لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ جب میں بہت تنگ آ جاتا تھا، کبھی لاڈ میں ہوتا تھا۔ تو میں پوچھتا تھا ان سے، کہ بابا جی یہ بتائیں کہ دین کیا ہوتا ہے، اسلام کیا ہوتا ہے، مومن کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے ایک دن پوچھا ان سے۔ میں نے کہا، جی بابا جی بتائیں کہ مسلمان کون ہوتا ہے؟ کہنے لگے مسلمان وہ ہوتا ہے

جس کا دل صاف ہو، اور ہاتھ گندے ہوں۔ میں نے کہا، حضور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے، جو بھائیوں کے کام کرتا رہے گا، اس کے ہاتھ تو گندے ہوں گے، جو آرام سے بیٹھا ہو گا دستانے پہن کے، اس کا تو کچھ نہیں خراب ہونا ہے۔ تو مسلمان وہ ہوتا ہے، جو اس کا گارا لگاتا ہے، اس کی اینٹ اٹھاتی ہے، اس کے لیے لکڑیاں لا کر دیتی ہیں، جو روتا ہے اس کے آنسو پونچھنے ہیں۔ وہ ہوتا ہے مسلمان۔ ہم کو تو ایسی Definition کسی کتاب میں نہیں ملتی ہے۔ یہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے ایسی چیزیں ملتی ہیں تو اب عمل میں داخل ہونے کے لیے کیا کچھ کیا جائے، کیسے کیا جائے، یا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ گفتگو بڑی آسان ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، احسن صاحب، ٹیلی کمیونیکیشن کے چیف انجنیئر ہیں۔ وہ کہتے ہیں جتنی بھی فارن کالز ہوتی ہیں، ان میں اکثر لوگ یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہور سناؤ کیہہ حال اے۔ ہور سناؤ جی کہتا رہتا ہے آدمی۔ یا زیادہ سے زیادہ موسم کا حال پوچھتا ہے۔ تو کہنے لگے، اگر ان ٹرنک کال میں سے لانگ ڈسٹنس کالز میں سے "ہور سناؤ کیہہ حال اے" جمع کیا جائے اور جتنا ٹائم وہ بنتا ہے، اس ٹائم کے اندر ساڑھے تین میل لمبی سرنگ کھودی جا سکتی ہے۔ وہ عمل میں ٹرانسلیٹ کر رہے ہیں نا اس کو۔ تو اب یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ

آپ نے دین کو کس حساب سے اختیار کرنا ہے۔ بابے تو یہ کہتے ہیں کہ کیس کے دکھ درد میں شریک ہوں اور اپنے ہاتھ گندے رکھو، اور دل اپنا صاف ستھرا رکھو، پھر تو مزہ ہے، پھر Unity ہو گی، کہے بغیر، لکھے بغیر۔ یہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کرنے سے ہوتا ہے، اور ان کے قریب جانے سے ہوتا ہے، ان کے دکھ درد کی کہانی سننے سے ہوتا ہے۔ نہ بھی کچھ کر سکیں تو ایک کان ان کے ساتھ لگا کر بیٹھیں، ان کو بڑی ضرورت ہے، سارے اس بات کے لیے تقاضا کر رہے ہیں کہ آئیں، اور ہمارے پاس بیٹھیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

بابا جناح

پچھلے کئی پروگراموں سے ہم بابوں کے بارے میں بات کرتے رہے ہیں۔ بطورِ خاص، یوں تو زاویہ کے سارے پروگراموں، سارے ہفتوں کے اندر کوئی نہ کوئی بابا آ کے کھڑا ہو جاتا رہا۔ لیکن پچھلے تین چار پروگراموں میں بطورِ خاص اس کا ذکر رہا ہے، کیونکہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں، اور سوال کرتے ہیں کہ یہ بابا ہوتا کیا ہے، اور اگر کچھ ہوتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں ملتا، آپ کو کیسے مل جاتا ہے۔ ہم بھی کیا بابا سے نہیں مل سکتے؟

میں نے جیسے عرض کیا تھا کہ سرخ بتی کے اوپر کئی دفعہ جب کاریں رکی ہوتی ہیں، تو کئی آدمی شیشہ اتار کے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اشفاق صاحب! کوئی بابا ہے؟ میں کہتا ہوں، جیسے کوئی سگریٹ مانگ رہا ہو، میں کہتا ہوں، نہیں۔ بابا اس وقت تو نہیں ہے، لیکن ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہمیں تو کوئی نہیں ملتا۔ چلے جاتے ہیں تو جب تک اس کی آرزو تمنا نہ پیدا ہو، اس وقت تک بابا تو نہیں ملا کرتا۔ آرزو کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ میں آپ سے اس آدمی، اور پانی کے گلاس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں کہ پانی کیا ہوتا ہے، گلاس کیا ہوتا ہے، بابا کیا ہوتا

ہے، لیکن ایک شدید پیاسا آدمی یہ سارے سوال نہیں کرے گا۔ اس کو یہ آرزو ہو گی کہ مجھے کہیں سے ٹھنڈا صاف ستھرا پانی ملے، اور میں پی لوں۔ یہ آرزو ذہن میں یا دل کے اندر پیدا ہو جائے کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے، اور میں چاہتا ہوں، پھر ملتا ہے۔ لیکن میں آپ کی آسانی کے لیے عرض کرتا ہوں۔ جیسا کہ اب یہ بچی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اتنی ساری باتیں کیسے اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس ضمن میں مجھے یاد اور آپ کی آسانی کے لیے عرض کروں کہ بابا وہ ہوتا ہے، جو لینے کے بجائے دینے کے مقام پر ہو۔ بہت سے زبانوں میں باپ کے لیے بابا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، تو تھوڑی سی اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ کہیں اسے بابو کہتے ہیں اٹالین میں۔ اسے باپک کہتے ہیں انڈونیشین میں۔ اسے باپو کہتے ہیں انڈیا میں، لیکن اس کا رُوٹ Root جو ہے وہ لفظ بابا سے ہے۔ باپ کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھر کے اندر، اپنے گھروندے کے اندر، اپنے خاندان کے اندر، دینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ جو شخص بھی کسی انسانی گروہ کے درمیان دینے کے مقام پر ہو وہ بابا ہے، اور یہ موٹی سی اس کی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی آدمی کو ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر آپ سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔ اور لینے والا ہو، سمیٹنے والا ہو، وہ بالکل اس کے الٹ ہوتا ہے، اور عیاری کی بہت ساری منازل طے کر کے ایک

گانٹھ کی صورت میں انسان بن کے زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میری زندگی میں جو سب سے پہلے بابا آیا، وہ دیر کی بات ہے، میں اس وقت سیکنڈ ائیر میں پڑھتا تھا، اور پڑھتا تو میں یہاں لاہور میں تھا، لیکن میرا ایک قصبے کے ساتھ تعلق تھا، جہاں مجھے چھٹیوں میں لوٹ کر جانا پڑتا تھا، آنا پڑتا تھا۔ وہیں سے میں نے میٹرک کیا تھا، تو وہاں کے لوگ دیہاتی لوگ، کسان لوگ، وہ ایک بابے کے عشق میں مبتلا تھے۔ اور وہ بابا ایسا تھا، جسے ان لوگوں نے دیکھا نہیں تھا۔ لیکن وہ جان لیتے تھے، سن لیتے تھے نام کہیں سے، خبر پہنچ جاتی تھی، اور وہ اس کو بہت مانتے تھے۔ اور اس تمنا آرزو میں بیٹھے رہتے تھے کہ وہ آئے گا۔ یہ بابا جو ہمارے دکھی دن ہیں، اس کو کسی طرح سے ہماری زندگیوں سے دور کر دے گا، اور ہمیں آسانیاں عطا ہونے لگیں گی۔ لیکن وہ بے چارے اس کے بارے میں زیادہ کچھ جانتے نہیں تھے، تو میں بہت حیران ہو کے ان سے کہتا تھا کہ تمہارا بابا کیسا ہے، جو تمہارے درمیان میں نہیں ہے، اور تمہاری بولی نہیں بولتا، اور تم اس کی بولی نہیں سمجھتے، تو پھر کیسے تمہارا اور اس کا رابطہ ہو۔ وہ کہتے تھے، بھلے ہم اس کی بات نہ سمجھیں، وہ ہماری بات نہ جانیں، لیکن دلوں کے اندر جو آرزوئیں پوشیدہ ہوتیں ہیں، جو تمنائیں ہوتی ہیں، دل کی زبان ایک سانجھی زبان ہے، جو ساری دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اس بابے کو وہ بابا

قائد اعظم کہہ کر پکارتے تھے۔ اور اس کا نام لے کر وہ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ میں کہتا تھا کہ ایسے بابے کو تم کس طرح سے اپنی زندگیوں میں داخل کرو گے، تمہاری کمیونیکیشن پیر دستگیر کے ساتھ ہوتی ہے، جس کی بولی ہم نہیں جانتے، جس گیارہویں والے کی ہر گیارہ تاریخ کو ہم نیاز دیتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری بات سمجھتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہماری بات ان تک کیسے پہنچتی ہے؟ یہ جو پیر دستگیر کا ایک ادنیٰ غلام ہے اور ایک اس کا ماننے والا ہے۔ بھلے اس کی بولی ہم سے مختلف ہو، یہ بات ہماری جانے گا، اور سمجھنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح سے، جیسے ہمارے بڑوں کی زبان ہمارے بابوں کی زبان چاہے مختلف ہے، لیکن ہم اس سے اچھی طرح سے واقف ہیں، اور ہمارے درمیان رابطے کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ میں بہت حیران ہوتا تھا کہ ان کا یہ ایمان کس قدر پختہ ہے۔ ہم اس وقت تھوڑے سے متزلزل تھے، پڑھے لکھے نوجوان لڑکے تھے، کچھ دبدبے کا شکار تھے کہ کبھی آگے بڑھتے تھے، کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انہی لوگوں نے لاہور کے اندر پنجاب یونیورسٹی کی سپورٹس گراؤنڈ میں، جہاں اب ایک ہوائی جہاز کھڑا ہے، اپنے بابے قائداعظم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور کوئی ایک لاکھ کا مجمع، بالکل Pindrop silence میں، بے حس و حرکت خاموش بیٹھا ہوا ہے، اور وہ اپنی زبان میں

بات کر رہا ہے۔ جتنا بھی اس کا گھنٹے کا یا ڈیڑھ گھنٹے کا لیکچر ہو اس میں، اور یہ لوگ سارے کے سارے اس زبان سے واقف نہیں تھے، ایک ایک بات اپنے اندر سمو کے اپنے رگ و پے میں اتار کے وہاں سے اٹھے۔ باوجود اس کے کہ ان پر بہت مشکل وقت آیا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ان معنوں میں بابا تھا کہ وہ عطا کرنے والا آدمی تھا، دینے والا آدمی تھا، لینے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس نے بڑی چو مکھی لڑائی لڑ کے برہمن کے خلاف، اور انگریز کے خلاف، اپنے ماننے والوں کو ایک ملک لے کر دیا، اور جب ملک لے کر دے چکا، تو پھر اس نے اپنا آپ اپنا سرمایہ، اپنا ورثہ ان سے چھپا کر نہیں رکھا، اور جب وہ یہاں سے جانے لگا، تو اس نے اپنی ساری جائیداد سب کچھ اپنی قوم کو دے دیا۔ سب سے بڑا حصہ اس نے پشاور کے اسلامیہ کالج کو دیا، حالانکہ وہ زیادہ وہاں گئے نہیں تھے، لیکن ان کو پسند تھا۔ پھر ایک حصہ علی گڑھ یونیورسٹی کو دیا، پھر سندھ مدرسہ کو دیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، اور یوں ہاتھ جھاڑ کے، اور فاطمہ، جو ان کی بہت چہیتی بہن تھی اور بظاہر جس کے لیے انہیں بہت کچھ چھوڑ کے جانا چاہیے تھا، ان کی اتنی پرواہ نہیں کی، اور وہ سب کچھ جو ان کی گاڑھے پسینے کی اپنی کمائی تھی، جو انہوں نے وکالت کر کے کمائی تھی، یہاں سے کچھ نہیں لیا تھا انہوں نے آپ کے اس اکاؤنٹ سے۔ وہ ساری کی ساری رقم اس کو دے کر رخصت ہو گیا، اس

لیے آپ کے دلوں میں ہم جو آپ سے بڑے ہیں تھوڑے سے عمر میں، ہمارے دلوں میں ان کی قدر باقی ہے۔

آپ کبھی کبھی دیکھیں گے، یہ ہمارے بابوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، خواتین و حضرات کہ ان کے مخالف ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دینے کے مقام پر ہوتے ہیں، اور عام آدمی لینے کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور جب لینے کے مقام پر آدمی ہو تو وہ زیادہ شرمندگی میں گھِر جاتا ہے، کیونکہ ارد گرد کے لوگ دیکھتے ہیں، ان کی نگاہیں ہر وقت دینے والے پر لگی رہتی ہیں تو لینے والا ان لوگوں کا دشمن ہو جاتا ہے۔

ہمارے بابے جو ڈیرے قائم کرتے ہیں۔ ان کی ٹریننگ کا بھی یہی حصہ ہوتا ہے کہ وہاں آنے والوں کو دینے کی تعلیم دی جائے، اور ایک عام آدمی کو کس طرح سے بابا بنایا جائے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے مرشد سائیں فضل شاہ صاحب رحمۃ اللہ گوجرانوالہ گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا ان کو ساتھ وہاں لے کر گیا تھا۔ ہم جب وہاں گوجرانوالہ میں پورا دن گزار کر، مولوی یاسین صاحب سے مل کر واپس آ رہے تھے، تو بازار میں ایک فقیر ملا، اس نے میرے بابا جی سے کہا کہ کچھ دے اللہ کے نام پر۔ انہوں نے اس وقت

ایک روپیہ بڑی دیر کی بات ہے، ایک روپیہ بہت ہوتا تھا، تو وہ اس کو دے دیا وہ لے کر بڑا خوش ہوا، دعائیں دیں، اور بہت پسند کیا اس باباجی کو۔

انہوں نے اس سے پوچھا شام ہو گئی ہے کتنی کمائی ہوئی؟ وہ ایک سچا آدمی تھا۔ اس نے کہا، دس روپے بنا لیے ہیں۔ تو دس روپے بڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بہت زیادہ۔ تو انہوں نے کہا کہ دس روپے تو بنا لیے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ سے بات کی تھی، ”دتے میں سے دیا کرو۔“ یہ ان کا فلسفہ تھا نا۔ اس میں سے یہ نہیں ہوتا کہ جو بہت زیادہ رکھتا ہے وہی دے۔ جس کے پاس دو پیسے ہیں، وہ بھی ایک پیسا دے۔ پچھلی بار جب بات کی، تو میں اس کی وضاحت کرنا بھول گیا کہ دتے میں سے دینا۔ اپنے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے دینے سے تقویت آتی ہے۔ جب تک Post within نہیں کریں گے،

انہوں نے اس سے پوچھا شام ہو گئی ہے کتنی کمائی ہوئی؟ وہ ایک سچا آدمی تھا۔ اس نے کہا، دس روپے بنا لیے ہیں۔ تو دس روپے بڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بہت زیادہ۔ تو انہوں نے کہا کہ دس روپے تو بنا لیے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ سے بات کی تھی، ”دتے میں سے دیا کرو۔“ یہ ان کا فلسفہ تھا نا۔ اس میں سے یہ نہیں ہوتا کہ جو بہت زیادہ رکھتا ہے وہی دے۔ جس کے پاس دو پیسے ہیں،

وہ بھی ایک پیسا دے۔ پچھلی بار جب بات کی، تو میں اس کی وضاحت کرنا بھول گیا کہ دتے میں سے دینا۔ اپنے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے دینے سے تقویت آتی ہے۔ جب تک Post within نہیں کریں گے، اپنی جان کے ساتھ چمٹا کے رکھیں گے، جس طرح تپِ محرقہ ساتھ جان کے چمٹ جاتا ہے نا، اور وہ جان نہیں چھوڑتا، اسی طرح سے یہ دولت، اور سرمایہ جو ہے، یہ انسان کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر چاہے تگڑا کر دے، روحانی طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ تو انہوں نے کہا اس فقیر سے کو تو نے اتنے پیسے بنا لیے ہیں، تو اپنے دتے میں سے کچھ دے۔ تو اس نے کہا، بابا میں فقیر آدمی ہوں، میں کہاں سے دوں۔ انہوں نے کہا، اس میں فقیر امیر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس کے پاس ہے اس کو دینا چاہیے، تو اس فقیر کے دل کو یہ بات بڑی لگی۔ بابا جی سے کہنے لگا، ” میں کیہ کراں۔ “ انہوں نے کہا، کسی کو تو کچھ دے۔ کہنے لگا، اچھا۔ وہاں دو مزدور کدالیں کندھے پر ڈالے کہیں سے بیچارے دیہاڑی جو ان کو ملتی ہے لے کر گھر کو واپس جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رسیاں تھیں، غالباً بنیادیں کھود کر آئے تھے، جو اس کا نشان لگاتے ہیں۔ تو وہ فقیر بھاگا گیا، اس نے چار روپے کی جلیبیاں خریدیں، چار روپے کی ایک کلو جلیبیاں آیا کرتی تھیں، اور بھاگ کے لے آیا، اور آکر اس نے ان دونوں مزدوروں کو دے دیں۔ کہنے لگا لو آدھی آدھی کر لینا۔

وہ بڑے حیران ہوئے۔ میں بھی کھڑا ان کو دیکھتا رہا تو لے کے، وہ خوش ہو کے

چلا۔ اور وہ چلے گئے۔ کہنے لگا، بڑی مہربانی بابا تیری، بابا بڑی مہربانی، شاباش۔

تو وہ جو فقیر تھا کچھ کھسیانا، کچھ شرمندہ سا تھا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے

خیرات دی تھی۔ وہ تو لینے والے مقام پر تھا تو شرمندہ سا ہو کر کھسکا۔ تو میرے

بابا جی کہا، "اوئے لُکیاں کدھر جانا ایں، تینوں فقیر تو داتا بنا دتا اے، خوش ہو، نچ

کے وکھا۔" تو فقیر سے جب داتا بنتا ہے نا، تو اس کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے، اور اگر

باہر نہیں تو اس کا اندر ضرور ناچنے لگتا ہے۔ میرے تو یہ مقدر میں نہیں کہ کبھی

دینے کے مقام پر آیا ہوں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو ضرور دیکھا ہے کہ جو

دینے کے مقام پر ہوتے ہیں اور ان کی خوشیوں کو دیکھا۔ اسی طرح بابے قائد

اعظم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیا، کبھی، اللہ آپ کو وقت دے اور بیٹھ کر

اس کو جانچنے لگیں، آنکنے لگیں، تولنے لگیں تو آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ

وہ ایک دبلا پتلا تپ دق زدہ، جسے آخر میں کینسر بھی ہو گیا تھا، انہوں نے کسی کو

بتائے بغیر کبھی اپنا گلہ کیے بغیر، کبھی ہائے یا اُف کا لفظ نکالے بغیر، اسی معاملے

میں لگا رہا کہ میں دوں گا۔ اور اب آج کے سمجھدار سیاستدان، سیاست کے

پنڈت، لکھنے والے، ولایت کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان نے پچھلے ایک سو

برس میں صرف ایک ہی لیڈر پیدا کیا ہے، اور اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ لیڈر

ایک ہی تھا، باقی کے لوگ اور بھی بہت سے تھے۔ گاندھی جی کا ہم احترام کرتے ہیں، ٹھیک تھے، لیکن وہ لیڈر نہیں تھے۔ نہرو، ایک لاڈلا بچہ تھا۔ اس کو سیاست میں دلچسپی نہیں تھی، ادب میں البتہ تھی، اس نے خط وغیرہ لکھے، بڑے کمال کے، بہت اچھے لکھے۔ لیکن انگریز کے ساتھ سیاست کی لڑائی میں آج کے سیانے کہتے ہیں، وہ ایک ہی بندہ تھا جس نے انگریزوں سے کہا کہ آؤ اگر تم میرے ساتھ Constitutional fight کرنا چاہتے ہو، تو میں، آئین کی جنگ میں لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ایک ایک باریک بات کو کھول کر بیان کروں گا۔ ادھر آؤ میں ہنر آزماؤں تو تیر آزما، ہم بھاگنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ تو گاندھی جی نے اپنا لباس تبدیل کیا، لوگوں کو دھرنے کی تعلیم دی۔ مرن برت (بھوک ہڑتال) کئی کچھ کرتے تھے۔ ان کا اپنا انداز تھا، لیکن وہ انگریز کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ویسی fight ان کو نہ دے سکے، جیسی کہ کرسی کے میدان میں انہی کے مقام پر اس کے چوکھٹے میں لڑائی لڑنے کے لیے یہ تیار تھے۔

قائداعظم کہتے تھے، میں لباس نہیں تبدیل کروں گا، تمہاری زبان میں تم سے بات کروں گا، میں تمہارے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق، میں تمہارے قانون کے مطابق تم سے لڑائی کروں گا، اور پھر بار بار انہوں نے کہا پاکستان تو

بعد کی بات ہے۔ اللہ کرے آپ اس کو پڑھ سکیں، اور پوری تفصیلات کے ساتھ اس کی طرف جا سکیں تو اس بابے نے جو کہ دیہاتیوں، کسانوں، دہقانوں کا بابا تھا، قائد اعظم اسے کہتے تھے۔ اس نے دینے کے مقام پر کھڑے ہو کر کیا کچھ عطا کیا، اس کی تفصیلات آپ اپنے طور پر جان سکیں گے، اور وہ جو بابا میں ذکر کیا کرتا ہوں، وہ کہاں سے چل کر کہاں تک بابا آتا ہے۔ اور اس ذیل میں کون کون لوگ آ جاتے ہیں۔ میں نے آپ سے پچھلی مرتبہ گل سعید کا ذکر کیا تھا، جو ہمارے یہاں تھے۔ وہ بھی ایک بابا تھے، زندہ ہیں۔ قائد اعظم وہ بھی ایک بابا ہیں، یہ گزر جانے والا فقیر جو داد و دہش کرتا ہے۔ یہ بھی اپنی طرز کا بابا ہے، تو اس میں ایک آخری بات جو بہت عجیب و غریب ہے، وہ یہ میرے بچے، میرے پوتے اور میری پوتیاں، اور بہت ذہین آپ جیسے لڑکے لڑکیاں، تھوڑے دن ہوئے، وہ بیٹھے ہوئے تھے، اور یہ ذکر کر رہے تھے آپس میں کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں، تو پھر نیچے کے لوگ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے، یہ عام خیال ہے۔

میں نے کہا، دیکھا، مجھے اجازت دو گے۔ کہنے لگے نہیں بابا، آپ بالکل الٹی بات کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں اتنی سے اجازت دو کہنے کی کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں اور خدانخواستہ نیچے کے نہ ہوئے تو پھر ہم کیا کریں گے۔

کہنے لگے نہیں، دیکھیے یہ مفروضہ نہیں، اوپر سے دیکھ کر ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں۔ میں نے کہا، پیارے بچو یاد رکھو، اور لکھ لو اسے اپنے دل کی ڈائری میں کہ ایک ملک بنام پاکستان اور اس کے رہنے والے پاکستانی دنیا کی اس خوش قسمت ترین قوم میں سے ہیں، جن کو نہایت نیک، نہایت ایماندار، نہایتHonest ، نہایت شفاف، نہایت ذہین، نہایت بڑا سائنسدان، نہایت دوسری زبان جاننے والا، نہایت اعلیٰ درجے کا وکیل عطا کیا ہے۔ اور جس نے اس قوم سے تانبے کا ایک پیسہ بھی محنت کے طور پر نہیں لیا، اور کمال کی اس نے لیڈرشپ فراہم کی۔ جو آپ آج مانگ رہے ہیں۔ لیکن قوم نے اس کے جواب میں کیا کیا کہ ائیر پورٹ کے آدھے راستے کے اوپر اس کی موٹر کار کا پیٹرول ختم ہو گیا اور اس نے اپنی جان آدھے راستے میں جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ یہ ہوتا ہے زندگی میں۔ اس بات کی تلاش نہ کرو کہ وہاں سے ٹھیک ہوں گے تو نیچے آئیں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہونا ہے۔ خدا کے واسطے، یہ مت کہا کرو، اے پیارے مزدور، کسانوں، ان پڑھ لوگو ! کہ اگر بڑے لوگ نماز پڑھیں گے تو ہم پڑھیں گے۔ ورنہ تب تک ہم بیٹھے ہیں۔ نماز تو تمہاری اپنی ہے بابا، اچھے ہونا تو تمہارے اپنے بس میں ہے۔ ذمہ داری تو ہماری اپنی ہے۔ یہ کیا بہانہ لے کر بیٹھ گئے، یہ بات جو میں نے اپنے بچوں سے کہی، یہ میں آپ سے بھی

کہنا چاہ رہا تھا، اور کہہ رہاہوں، اور بڑی درمندی کے ساتھ کہہ رہاہوں، اور اس دین کو، اس ذمہ داری کو، جو ہمارے کندھوں کے اوپر ہے، اور جس کا ہم مداوا نہیں کر سکتے کہ ہم نے کیا سلوک کیا، وہ شرمندگی ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے ساتھ چلتی رہے گی، اور ہم سارے کے سارے اس کے دیندار ہیں۔ کسی ایک بندے کو، یا کسی ایک حکومت کو، یا کسی ایک سسٹم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے پچھلے پروگرام میں عرض کیا تھا کہ یہ ملک، یہ پاکستان، یہ حضرت صالح کی اونٹنی ہے۔ اس کا احترام اور اس کا ادب ہم پر واجب ہے۔ حکومت کا بالکل خیال نہ کریں، حکومت والوں کا نہ ادب کریں، ان کو نہ مانیں، جو کہنا چاہتے ہیں، ان کے خلاف کہیں، مجھے اعتراض نہیں، لیکن اس ملک کے اس سرزمین کے، اس دھرتی کے خلاف اگر آپ نے کوئی بات کی تو پکڑے جائیں گے اور بڑے عذاب کی صورت سے گزریں گے۔ الحمد للہ ابھی تک کسی نے ملک کے خلاف کوئی بات نہیں کی، باریکیاں سی نکال کے کچھ سیاست میں سے الٹی پلٹی باتیں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر اپ کو کوئی دریدہ دہن یا ایسا گندا ذہن آدمی ملے، جو قائد اعظم کی ذات میں کوئی کیڑے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کو ضرور قریب سے جا کر دیکھیں، وہ دینے والوں میں سے نہیں ہو گا، لینے والوں میں سے ہو گا۔

پاکستان کے رہنے والو زندہ رہو، خوش رہو، پائندہ رہو۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

احترام آدمیت

آج تک تو ہم بیشتر بابوں کے بارے میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ آج مجھے ایک چھوٹے سے بچے کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ جو ایک مرتبہ اپنے ماں باپ کے بغیر، اور شاید ان سے اجازت لیے بغیر ڈیرے پر آ گیا تھا۔ وہ گول مٹول سا، پیارا سا بچہ تھا۔ بڑا بنا ٹھنا تھا، اور آ کے بابا جی سے روتے ہوئے کہنے لگا، کہ مجھے اپنے ابا جی سے اختلاف، شکایت ہے۔ میں شکایت لگانے آیا ہوں۔ تو انہوں نے پوچھا، ابا جی سے ایسی کیا شکایت ہے بیٹا بیٹھو۔ کچھ لو کھاؤ پیو، مٹھائی وغیرہ رکھی تھی نا۔ تو اس نے کہا، نہیں میں کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ پوچھا شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا یہ بھی نہیں بتاؤں گا میں۔ بس مجھے ہے۔ وہ آپ کے پاس آتے ہیں، اور وہ بڑا دعویٰ کرتے ہیں، محبت کا اور شرافت کا، لیکن وہ ان میں ہے نہیں۔ السّلام علیکم کہہ کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو بابا جی نے کہا، اس کے پیچھے جائیں اور اس کو منا کر لائیں، لیکن وہ بڑے غصے میں تھا، چوتھی پانچویں کا لڑکا ہو گا، لیکن رُکا نہیں، اور وہ چلا گیا، اور اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا، اور نہ یہ پتا چلا کہ اس کے والدین کون ہیں اور کس کے خلاف شکایت لے کر آیا تھا؟ لیکن وہ شکایت ہمارے ذہن کے رجسٹروں میں درج کر گیا، اور ظاہر ہے ہم اس کا کوئی قلع قمع نہ کر سکے،

کیونکہ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر سے آیا ہے۔ تو میں اس کی یاد میں جو کہ بڑی دیر کے بعد آئی ہے، اور اب وہ کہیں اللہ کے فضل سے بڑے عہدے پر ہو گا، یا کوئی تاجر ہو گا، یا سیاست میں داخل ہو چکا ہو گا۔ وہ اگر کہیں ہماری پروگرام دیکھ رہا ہو تو اس کو ہمارا اسلام پہنچے۔

ہوا یہ کہ ہم پاکستان بنا چکے تھے، اور وہ زمانہ درمیانی مدت کا زمانہ تھا، یعنی ہمیں کچھ آدھا وقت گزر چکا تھا بیس بائیس سال، اور ہم لوگ competition کے میدان میں اتر چکے تھے۔ مسابقت کے میدان میں، مقابلہ کے میدان میں اور ہم competition کو ہی اپنی زندگی کا معیار اور ذریعہ بنا چکے تھے۔ شرافت کا، نجابت کا، آگے بڑھنے کا، یہ جانتے ہوئے کہ competition جو ہے، یہ تخلیقی صلاحیت کی راہ میں ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ ایک آدمی کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں نا۔ کچھ کرنے کی، کچھ کر گزرنے کی صلاحیت، لیکن وہ competition میں اپنا آپ بھی بھُلا چکا ہوتا ہے۔ وہ پھر ایک انسان نہیں رہتا، competition کی ایک مشین بن جاتا ہے، اور دن رات اسی میں الجھا رہتا ہے۔ وہ ساری صلاحیتیں جو انسان میں ہوتی ہیں، وہ ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بظاہر یہ بات نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے، جب بھی اپ competition کرتے ہیں، وہ انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ کبھی بھی کسی پتھر کے، کھمبے کے، سٹریٹ لائٹ

کے، پُل کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ بجینس کے خلاف آپ نے کبھی competition نہیں کیا، جب بھی کرتے ہیں انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ اور جب انسان کے خلاف کرتے ہیں، اور آپ کامیاب ہو جاتے ہیں، اور کامیاب ہو کر تیس بندوں کو گرا دیتے ہیں۔ تو پھر پوچھتے ہیں کہ آپ تو کامیاب ہو گئے۔ اسلام میں competition کی یہ Spirit ، یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے، اور وہ ہے تقویٰ کے لیے، آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہونے میں مسابقت، پیسے کمانے میں، حسین بننے میں، شیمپو اعلیٰ درجے کا استعمال کرنے میں، کپڑے استعمال کرنے میں، یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ لیکن آدمی اس میں competition کرتا ہے۔ میری بچیاں کہتی ہیں کہ نہیں دادا یہ تو قمیص ہم پہن کے نہیں جائیں گی، یہ تو پہلے بھی ہم پہن کے گئی تھیں، سہیلی کی مہندی کے اوپر۔ یہ ہماری بے عزتی ہے۔ ایک دفعہ پہن لی، کیونکہ یہ competition ہے۔ زندگی کے جو زمینی competition ہیں، وہ انسان کو بڑا تنگ کرتے ہیں، اور اس کی صلاحیتوں کے اوپر ایک جال ڈال دیتے ہیں۔

آپ کو اندازہ نہیں ہو گا، آپ تو سمجھتے ہیں کہ competition بہت Healthy فضا میں پیدا ہوا۔ کوشش، جدوجہد، سٹریئیو Strive ، سٹرگل،

بھاگ دوڑ، یہ ساری کی ساری آپ کے اندر انا اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔ آپ دیکھیے امریکہ کو، آپ کے سامنے مثال ہے، کتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے، کتنا تردد کرتا ہے، کتنا competition کرتا ہے، کتنا اعلیٰ درجے کا ملک ہے، اور کیسا متکبر ہے۔ کسی کی کوئی بات بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کہتا ہے، جو میں فیصلہ کرتا ہوں، وہی ٹھیک ہے، جو میں نے حکم دے دیا عراق کے بارے میں، وہ ٹھیک ہے۔ تو یہ بہتر انسان ہونے کی خاصیت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں پر حکم ہے کہ آپ competition نہیں کرسکتے ہیں۔ مثلاً ایک عجیب سی بات آپ سے کرنے لگا ہوں، آپ کے چہرے دیکھ کے، امید ہے آپ انشاء اللہ تعالیٰ اتنا برا نہیں مانیں گے، جتنا عام لوگ مانتے ہیں۔ ایک بچہ کلاس میں فسٹ آتا ہے۔ کوئی تیس بچوں کی کلاس میں سے اب وہ تو فسٹ آ گیا اور تیس بچے جو ہیں وہ تو Down، وہ تو منہ کے بل گر گئے نا، زمین پر۔ اور ان کو شرمندہ ہونے کا موقع ملا۔ تو میرا دین پوچھتا ہے کہ یہ بھی تو Human being ہیں۔ یہ انسان ہیں۔ ان کا کیا بندوبست آپ نے کیا ہے۔ آپ نے تو ایک دکان بنالی، اور بڑے کمال کی چلالی۔ ایک لاکھ روپیہ کمانے لگے اور باقی کے بھی بندے آپ کے ارد گرد رہتے ہیں۔ ان کو بھی زندہ رہنا ہے۔ یہ بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں، جس طرح آپ کو حیات ملی ہے، انکو بھی زندگی ملی ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں اس کے اوپر

تکبر کرنے والے کہ جناب ہم نے بڑا کمال کیا ہے۔ تو یہ بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ competition کی دنیا میں داخل ہو کر اپنی انسانی صلاحیت، اور انسانی تخلیقی قوت جو ہے، اس کو دبا دیتا ہے۔ یہ آج میں، بہت عجیب بات آپ سے کر رہا ہوں، جو کہ عام طور پر نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت ہم تو یہی کہتے ہیں کہ competition ہمارا بہت اچھا ہے۔ تو باقی کے بندے کیا کریں؟ کیا وہ مرتے ہیں تو مریں اور یہ بات میں نے اس لیے شروع کی کہ پہلے تو یہ بڑوں میں بات تھی، اب یہ ہمارے گھروں میں پہنچ چکی ہے۔ اور میں نے Recently دیکھا کہ یہ بات بچوں میں بھی اتار دی گئی ہے۔ اور بچے جو پڑھتے ہیں آپ جیسے ان کو بہت شرمندہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے شرمندہ کیا جاتا ہے کہ میں آپ کو اس کی مثال یہ دیتا ہوں کہ میرے گھرانے میں جو پڑھے لکھے لوگوں کا گھرانہ ہے۔ میں نے اپنے بہت قریبی عزیز جو میرے بچوں کی طرح مجھے عزیز ہے، وہ لڑکا اپنی بہن سے یہ کہہ رہا تھا اپنے بھانجوں کے بارے میں کہ "آپا تیرے منڈے دے کنے نمبر آئے نیں۔" لڑکا بھی وہیں کھیل رہا تھا۔ اس نے کہا اس کے تو 680 نمبر ہیں۔ کہنے لگا، اوہ یہ کوئی نمبر ہیں۔ پھر کہنے لگ، میرے لڑکے نے لیے ہیں اور دبا کے لیے ہیں 730۔ ٹھیک ہے۔ کہنے لگا 730 کیا آپاں نمبر ہی نمبر کر دیئے۔ گھر میں نمبر، اوپر نمبر، چوبارے میں نمبر، وہ کیا سیڑھی پر نمبر، ہمارے

برانڈوں میں نمبر ہی نمبر۔ میرے کان کھڑے ہوئے، جب اس نے کہا نا کہ ہر
جگہ نمبر ہی نمبر بکھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھر میں۔ میں نے کہا، شاید پتا نہیں
یہ کیا بات کر رہا ہے، پھر میں نے اس کی بات غور سے سنی، اور میں نے محسوس کیا
کسی خوفناک بیماری کا انجکشن دے کر کوئی اس بیچاری کو جو میری نواسی ہے چلا جا
رہا ہے۔ تو میں نے اس کو بلایا اور کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس پر میری بھانجی
بولی، نانا یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے اس نے زیادہ نمبر لیے تو آپ فخر کریں۔ میں
نے کہا، اس نے زیادہ نمبر لیے لیکن کسی ایسے باپ پر فخر کرنا نہیں چاہیے، جو اس
کی طرح سے ہذیان بکنے لگ جائے، جیسے یہ کر رہا ہے، وہ بھی انسان ہے، وہ تیری
سگی بہن ہے، اس کا بھی دل ہے، اس کا بھی گھر ہے، اس کا بھی بچہ ہے، جیسا بچہ
تجھے عزیز ہے، ویسے ہی اس کو عزیز ہے۔ اس نے کہا، نہیں جی اگر کوئی کمزور ہو گا
تو ہم اس کو شرمندہ کریں گے۔ کہنے لگا، دیکھیں اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنا
فضل کیا ہے۔ میں کم از کم پانچ ہزار روز کا کماتا ہوں اور ہے کوئی ہمارے خاندان
میں ایسا آدمی، وہ ایک اکیلا آدمی نہیں ہے۔ آپ اپنے ارد گرد اپنے گھروں کے
اندر، اپنے شہر کے اندر دیکھیں۔ لوگ آپ کو، مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے اور
شرمندہ کرنے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں، ایسے طریقے جن کی
مناہی ہے، جو ہمارے یہاں ایک حرام چیز تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی

اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا، آپ نے کبھی انا اور تکبر کے بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ یہ competition کرنے والے، مسابقت کرنے والے، یہ سمجھتے ہیں کہ تکبر کا جو گناہ تھا، وہ تو ابلیس نے کر لیا، اللہ تعالیٰ کے سامنے، ہم تو بالکل تکبر نہیں کرتے۔ یہ تو جی کھلے میدان ہم کام کرتے ہیں، دوسرا بھی ہے تو میدان میں آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے دوسرا نہیں آسکے گا تو کیا تم اس کو شرمندہ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں اللہ نے صرف یہ صلاحیت دی ہے، تم اپنا موبائل ٹیلیفون لٹکا کے سارے محلے میں اس لیے چلتے ہو، کی میرے پاس موبائل ہے، اگر ہے اور اس کو سچ مچ استعمال کرتے ہو، تو اسے بند رکھو، اس کو چھپا کے رکھو، کیوں اس غریب کو دکھاتے ہو جس کے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس اعلیٰ درجے کی کار ہے، اور میرے پاس چھوٹی ہے تو تم مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو کہ لا کے میرے منہ کے آگے کھڑی کر دیتے ہو۔ کہ اشفاق صاحب اپنی چھوٹی سی پدی سے گاڑی نا نکال سکیں۔ تو مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، یہ زمین میری بھی ہے، یہ ملک میرا بھی ہے، اور جو نعمت آپ کو اللہ نے عطا کی ہے، وہ مجھے بھی عطا کی ہے، اور پھر بیوقوف لوگو تم یہ سمجھتے ہو یہ سب کچھ تمہاری کوششوں سے، تمہاری جدوجہد سے، تمہارے competition سے، تمہاری بھاگ دوڑ سے تم کو ملا ہے؟ نہیں، یہ خدا کی عطا ہے۔ اس کا شکریہ

ادا کرو، اور جوں جوں عطا میں اضافہ ہوتا جائے، توں توں سر نگوں ہوتے جاؤ، نیچے سر جھکاتے چلے جاؤ۔

تو میں جس چھوٹے بچے کا ذکر کر رہا تھا، کوئی تقریباً ایک ہفتے کے بعد اس کا باپ ہمارے ڈیرے پر وہیں آیا، بابا جی کے پاس اور کہنے لگا، میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ برا حال، رو رہا تھا، اور چاروں طرف پولیس کو اطلاع دی، اخباروں میں اشتہار دیا، سلائیڈیں چلائیں، ٹیلیویژن پر اس کا اعلان کیا، لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا، اور وہ میرا نورِ نظر ہے۔ اس کی ماں کی ظاہر ہے اور بھی بری حالت ہو گی۔ بابا جی نے کہا، وہ تو یہاں آیا تھا۔ کہنے لگا، یہاں آیا تھا؟ کہنے لگا، ہاں کچھ شکایت کرتا تھا، لیکن وہ اتنا دکھی تھا کہ ہمارے قابو نہیں آ سکا۔ ہم نے بہت بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کی وہ بیچ میں سے کھسک کر نکل گیا۔ اس نے کہا، جی ہوا کیا، کوئی خاص بات تو ہوئی نہیں، ایسے ہی وہ حساس تھا اور ناراض ہو گیا بغیر سوچے سمجھے۔ بات یہ تھی کہ اس نے امتحان دیا، اس میں اس کے کچھ کم نمبر تھے۔ جیسا ہوتا ہے بچوں کے ساتھ۔ تو سارے اس کو گھر میں عزیز رشتے دار موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ موٹو اس کا نام رکھا ہوا تھا، نِک نیم جیسے ہمارے گھروں میں بے ہودہ چیز ہوتی ہے، تو اس کو موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ تو وہ برداشت کرتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا پیار تھا، جیسے باپ کے ساتھ بچے کا پیار ہوتا ہے، تو شام کو

میں آیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے نمبر کم آئے ہیں۔ کہنے لگا، میں نے پہلی دفعہ اس کو موٹو کہا، سات سو آدمیوں کے موٹو کہنے سے وہ مائنڈ نہیں کرتا تھا، برا نہیں سمجھتا تھا، لیکن صرف ایک میرے کہنے سے اس کو اللہ جانے کیا ہوا، اس نے اس کو برداشت نہیں کیا، اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن ہو گئے ہیں، ہم اس کو تلاش کرتے پھرتے ہیں، پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ تو یہ نمبروں کی کمی، اور اس کی تضحیک اور تذلیل۔ خدا کے واسطے میں آپ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ انسان کی تذلیل نہ کیا کریں، ہمیں اس کا حکم نہیں ہے۔ ہم کسی کو ایسے ہی نام سے پکار دیتے ہیں، ایسے ہی برا بھلا کہہ دیتے ہیں، کچھ نِک نیم رکھے ہوتے ہیں نا۔ ایسے بالکل نہ کریں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پورے کا پورا ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ یہ زندگی جو لے کر آپ پیدا ہوئے ہیں یہ آپ کی محنت، کوشش، جدوجہد سے نہیں ہوئی، یہ جو آپ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ تو اللہ کی عطا کی ہے، اگر آپ یہ کہیں کہ بڑی بھاگ دوڑی کی، پھر میں پیدا ہوا، اور میں نے بڑی کوشش کی، یہ غلط ہو گا۔

سب سے بڑی نعمت تو آپ کو مفت ملی ہوئی ہے۔ یہ زندگی، اور دوسرے کو بھی ایسی ہی زندگی ملی ہے۔ اب ہم کو بھی اس بات کی بڑی فکر ہوئی۔ وہاں مشترکہ دعا ہوئی، سارے لوگ بڑے غمناک ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی کہ اللہ اس کو

صحیح و سلامت رکھے اور جہاں بھی ہے، وہ واپس آئے، اور یہ کوتاہی جو ان صاحب سے، اس باپ سے ہوئی دوبارہ نہ ہو۔ کہنے لگے آپ تو سمجھدار آدمی ہیں، سیانے آدمی ہیں، یہاں آتے رہتے ہیں۔ کچھ کام کی باتیں آپ کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ پڑتی رہی ہوں گی۔ آپ کو تو یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا۔ الفاظ گولیوں کے مانند ہوتے ہیں، انہیں استعمال کرنے سے پہلے چیمبر کو صاف کر کے استعمال کریں، جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں اور گولیوں کو ایک طرف رکھ لیتے ہیں، اسی طرح آپ گفتگو کے لیے جب اپنا منہ یا دل استعمال کریں، تو دیکھیں کون سی گولی چلانی ہے، کون سی نہیں چلانی۔ آپ کے ارد گرد اگر آپ کے پیارے بیٹھے ہیں خدا کے واسطے اس چیمبر کی طرف ضرور دیکھیں۔ یہ لڑکیاں بے خیالی میں کوئی باتیں کر جائیں، اب یہ بڑی ہوں گی نا، تو ان کی شادیاں ہونی ہیں، تو انہوں نے اپنی وہ کیا ہوتی ہیں نندیں، اور ساسیں ان کے خلاف کیا کیا کچھ باتیں کر دینی ہیں۔ پہلے تو چھپ کر کرتی تھیں، اب تو سیدھے منہ پر ہی کر جاتی ہیں۔ تو پھر جو ظلم ہونا ہے، ان کی ذات پر بھی اور ان بے چاری بوڑھیوں پر بھی اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم نے دعا مانگی کہ یا اللہ تو مہربانی فرما اور وہ بہت پیارا، اور خوبصورت بچہ تھا تو اس کو واپس لا دے، پھر ہمارے بابا نے یہ کہا، یا اللہ آئندہ زندگی میں اس کو نمبر بھی زیادہ ملتے رہا کریں۔

اگر یہی بات ہے کم بخت زندگی میں تو اس کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم بہت غمناک ہوئے۔ آپ سے بھی میری یہی درخواست ہے کہ جب آپ الفاظ کا استعمال کریں تو دیکھیں یہ گولیاں ہیں، جو آپ نے چیمبر میں ڈالی ہوئی ہیں، اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں چلانا ہے یا نہیں چلانا ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر میں محسوس کر رہا ہوں، میرے پیارے ملک میں، جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، لوگ جو ہیں وہ ایک دوسرے کا مان اور شن نہیں کر رہے ہیں، اور ان کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو رہا کہ دوسرے لوگ جو ہیں ان کے اندر بھی جذبات ہیں، وہ بھی کچھ ہیں۔ competition میں اور مسابقت، اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ، نیکی، اچھائی کے لیے آپ کو ابھارا گیا ہے کہ ہاں یہاں پر جتنا ایک مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہیں کرو۔ راز اس میں یہ ہے کہ تقویٰ میں، اچھائی میں، نیکی میں، جب آپ اپنے مد مخالف کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو ہمیں نیچے ہو کر دیکھنا پڑے گا، جوں جوں آپ نیچے ہوں گے، جتنی آپ عاجزی کریں گے، جتنا آپ جھکیں گے، اتنے آپ تقویٰ میں اونچے ہوں گے نا۔ جتنا تکبر کریں گے، جتنا اونچائی میں جائیں گے، جتنا آپ شیخی بگھاریں گے، جتنا آپ اپنے آپ کو انا عطا کریں گے، اتنا ہی آپ کا مسئلہ جو ہے وہ ایک مختلف رد عمل اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ہاں آپ ضرور competition

کریں۔ میں competition سے منع نہیں کرتا۔ میرا دین competition سے منع نہیں کرتا، لیکن صرف تقویٰ کو حد تک لازم ہے، اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیکی اختیار کریں۔

تقویٰ جس میں competition ہو، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، تو وہ آپ کا طرہ امتیاز نہیں ہونا چاہیے، کسی بھی کسی صورت میں کسی بھی حال میں۔ آپ نے نام سنا ہو گا، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ۔ سب سے بڑے ہمارے صوفی، ان سے ابتدا ہوئی، جس کو کہتے ہیں مڈھ لگا، لیکن وہ صوفی نہیں تھے، وہ خلیفہ بغداد کے دربار میں ایک پہلوان تھے۔ ایک بہت بڑے ریسلر تھے، جیسے اپ کے یہاں گاما پہلوان تھا۔ جنید بغدادی بھی مشہور تھے، اتنے بڑے پہلوان کہ کوئی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے تھے اور خلیفہ بھی تھا وہاں ایک دبلا پتلا کمزور سا آدمی مریل سا فاقہ زدہ بے چارہ شکل و صورت کا بہت پیارا، اور بہت اچھا، آیا اور خلیفہ وقت سے کہنے لگا کہ اے خلیفہ میں جنید رحمۃ اللہ کے ساتھ کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ جو جتنے دربار میں لوگ بیٹھے تھے، ہنس پڑے۔ کہنے لگے کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، تو شکل دیکھ اپنی اور اپنا وجود دیکھ، اور تو اتنے بڑے پہلوان کے ساتھ کشتی کرے گا۔ اس نے کہا، نہیں جناب مجھے کچھ داؤ ایسے آتے ہیں، کچھ چیزیں میں ایسی جانتا

ہوں جو کہ اور پہلوان نہیں جانتے، اور ہمارے پاس کچھ خاندانی گُر ہوتے ہیں نا، وہ داؤ میں لگاؤں گا اور آپ کا جو اتنا بڑا نامی گرامی رستمِ زماں ہے، یہ چاروں شانے چِت ہو گا۔ حضرت جنید بھی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے، اور تھوڑا سا گھبرائے بھی، اللہ جانے ان کو کچھ ایسا راز آتا ہو گا، تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ چنانچہ وقت مقرر ہو گیا، جگہ طے کر دی گئی، اور خلیفہ وقت وہاں پہنچ گیا، سارے درباری اور بغداد کے سارے لوگ کہ یہ آج کیا ہونے لگا ہے، وہ بھی خم ٹھونک کے پدہ، کمزور، دبلا، پتلا آدمی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا، وہ بھی آ گیا میدان میں۔ اور اصل پہلوان جو تھے وہ بھی اپنا لنگر لنگوٹ کس کے آ گئے۔ تو اس نے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پکڑا، سلام کیا۔ ایک دوسرے سے گلے ملے، سلامی لینا جسے کہتے ہیں، اور جب حضرت جنید بغدادی کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا، پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ دبلا، پتلا، کمزور سات آدمی جو تھا، وہ اچھل کر ان کے گلے سے لپٹ گیا، اب یہ تو کوئی داؤ نہیں ہے کہ آدمی اس کے گلے میں۔۔۔۔ جب لٹک گیا، تو ان کے کان کے پاس منہ کر کے کہنے لگا، میں سید زادہ ہوں، اور سات دنوں سے بھوکا ہوں، میرے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں، یہ ڈھونگ میں نے اس لیے رچایا ہے۔ اے جنید رحمۃ اللہ تاکہ میں لوگوں کو دیکھا سکوں کہ میری کوئی عزت ہے۔ جنید بغدادی رحمۃ

اللہ نے یہ سنا اور زمیں پر دھڑ کر کے گرے، اور اس سے ڈھے گئے۔ وہ ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، اور تالی بج گئی، دنیا حیران پریشان ہو گئی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے (جنید بغدادی) کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو ایسا داؤ آتا ہے، جو دنیا میں کسی آدمی کو نہیں آتا، اور اس کے سامنے چت ہو گیا ہوں، یہ واقعی طاقتور ہے۔ وہ تو جناب خلیفہ نے جو بھی کچھ انعامات اکرام خلعت وغیرہ دینی تھی دی، اور حضرت جنید جو تولیہ یا جو صافہ گلے میں تھا جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں، اے اللہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا، لیکن تیرے ایک بندے کی عزت رکھی ہے، اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کوئی روحانی درجہ عطا فرما، جو تُو اپنے بڑوں کو دیا کرتا ہے۔ تو وہ ولی کامل ہوئے، اور ان کی جو تعلیم ہے، وہ یہی ہے کہ انسان کو کبھی بھی ذلیل، چھوٹا، حقیر نہیں جاننا۔ جوں جوں آپ ایسا جانیں گے، آپ کے درجات کم ہوتے جائیں گے۔ جوں جوں آپ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کا رویہ اختیار کریں گے، آپ کے درجات بلند ہوتے جائیں گے۔

ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے، میں پھر چلتے ہوئے آخری بات کہوں، ہم سوچے سمجھے بغیر پہلے تو کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں، اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرہ امتیاز بنا لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتا۔

بچوں کے نمبر آجانا، آپ کا خوش شکل ہونا، آپ کا چہرہ اچھا ہونا، آپ کی رنگت گوری ہونا، یہ محض عطائے خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گردنیں نہ اتارتے رہو، اور خدانخواستہ اگر ایسا وقت آگیا کہ صرف آپ ہی کی ذات اس کرہ ارض پر رہنے لگی تو آپ یا آپ کے بچے کو یہ زندگی گزرانی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خالی ساری ویران دنیا میں لوگوں کو آباد رہنے دیں، ان کے ساتھ ہنسنے کھیلنے دو۔ ہم چلتے چلتے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بچہ مل گیا تھا، پھر وہ ہمارے ڈیرے پر بھی آیا، اور پھر جب تک اس نے میٹرک کیا، جب تک وہ آتا رہا، اور پھر ہم سارے اس سے معافیاں مانگتے رہے، اس اس میں میں سب کو آپ کو بھی شامل کرتا چاہتا ہوں کہ جب بھی اس کی یاد آئے پتا نہیں وہ کہاں ہو گا، آپ بھی اس بات کی معافی مانگیں کہ اس کے باپ نے اسے موٹو کیوں کہا تھا۔ یہ ایک بری بات ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

ریفریجریٹر زندگی

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ جو امریکن قوم ہے اور امریکن لوگ ہیں، یہ بھی بڑے کمال کے آدمی ہیں، اور ان کو کچھ ایسی سوجھتی ہے، اور ان کے دماغ میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، جو عملی صورت اختیار کر کے مختلف کھلونوں کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھ لیں ساری دنیا کے اندر کیسی کھدیڑ مچائی ہوئی ہے۔ اپنوں کو کسی شخص کو اور کسی کمیونٹی کو کسی گروہِ انسانی کو آسانی سے زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا بس ایک وتیرہ ہے۔ ان لوگوں میں سے بہت سے ہمارے دوست بھی ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں، وہ یہاں بہت اونچے عہدے پر فائز ہیں، مسٹر مورلک ان کا نام ہے۔ انکے ساتھ ایک جھگڑا رہتا ہے، کبھی لڑائی، کبھی چھینا جھپٹی اور بے قدری، ہم ان کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت کر لیتے ہیں۔ جھگڑا لیکن ہمیں کمزور رہنا پڑتا ہے ان کے سامنے۔ اس لیے کہ ان کی سوچ بھی بڑی تیز ہے، اور ان کی پیشرفت بھی بڑی آگے کو بڑھنے والی ہے۔ مورلک ایک دن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم لوگ جو ہو یہ

اچھے لوگ ہو، لیکن تم سارے ریفریجریٹر کے اندر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو۔ میں نے کہا، ریفریجریٹر میں کیسے ؟

کہنے لگا، تم ہر چیز کو محفوظ کرنے کے لیے ریفریجریٹر میں رکھنے کے عادی ہو۔ اپنی انسانی زندگی کو بھی۔ تمہارے بچے ہیں، مثلاً پیارے پیارے تم ان کو اٹھا کے ریفریجریٹر کے اندر رکھ دیتے ہو کہ یہ فریش رہیں، اور ترو تازہ رہیں، اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ جب ہم سبزی کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، پھلوں کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے ان کو ریفریجریٹر میں رکھتے ہیں، لیکن کہنے لگا کہ ریفریجریٹر کے اندر رکھی ہوئی یہ چیزیں جو ہیں، باہر سے تو ترو تازہ رہتی ہیں، آپ کا بھی تجربہ ہو گا، سب کا ہے نا۔ اندر سے وہ اتنی اچھی، اور مزیدار اور کھانے کے قابل نہیں رہتیں، نہ لذت میں، نہ تاثیر میں، جتنی کہ تازہ ہوتی ہیں، اس نے کہا۔ میں نے تمہارے ملک کا ایک عجیب و غریب رواج دیکھا ہے کہ والدین یہ چاہیں گے کہ بچے جو ہیں وہ ہم اٹھا کے دن کو ریفریجریٹر میں رکھ دیں، تا کہ وہ ترو تازہ رہیں، اور ان کی خوبصورتی جو ہے، وہ بظاہر ٹھیک ٹھاک رہے۔ بچے یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے والدین بوڑھے ہو رہے ہیں، ان کو بھی ہم ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ تو آپ لوگوں نے ایک عجیب سا رویہ زندگی کا اختیار کیا ہوا ہے، جو نہ تو Human ہے، اور نہ بہادر قوم سے اس کا تعلق ہے۔ تو میں نے کہا، تم یہ عجیب

بات کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے، ریفریجریٹر میں والی بات لیکن اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ اس نے کہا، خرابی کی اس میں یہ بات ہے کہ ریفریجریٹر میں جب چیزیں رکھی جاتی ہیں تو ان کو مجموعی طور پر ایک ہی جگہ پر گھسیڑ ہی نہیں دیا جاتا۔ ان کو الگ الگ کر کے رکھا جاتا ہے، تاکہ ٹماٹر ایک طرف رہیں، بینگن ایک طرف رہیں، مٹھائی ایک طرف رہے، پانی ایک طرف، تو ایسے ہی آپ الگ الگ کر کے رکھتے ہیں اپنے آپ کو۔ تو زندگی میں بھی آپ اپنے دوسرے گروہوں سے الگ الگ رہتے ہیں۔ بیوروکریسی جو آپ کی ہے وہ ایسے فریج میں رہتی ہے کہ اس کے قریب کوئی جا نہیں سکتا۔ آپ کے استاد جو ہیں، ٹیچر جو ہیں، پروفیسر جو ہیں، وہ بھی ایک اپنی خانہ بندی کر کے بیٹھے ہیں، ان کی بھی اپروچ نہیں ہوتی۔ ڈاکٹرز لے لیں، وکیل ہے لیں وہ سارے کے سارے ان لوگوں سے متعلق نہیں ہیں، جن لوگوں سے متعلق یہ ملک ہے۔ ان کو ضرورت پڑتی ہے، مثلاً ڈاکٹرز ہیں، بینگنوں کی طرح پڑے ہیں، اور وہ وہاں سے ہی اپنا آرڈر جاری کرتے ہیں، ہونا یہ چاہیے کہ ان کے، اور مریض کے مابین ایک ارتباطِ باہمی رہے اور وہ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے رہیں۔ ٹیچر جو ہے، استاد جو ہے وہ اپنے طالب علم کے ساتھ ملتا رہے، اور ان کو جانتا پہچانتا رہے، Human Being کے درمیان جب تک تعلق نہیں ہو گا کتاب آپ کو فائدہ نہیں دے

گی۔ اگر کتاب ہی فائدہ پہنچا سکتی، تو اللہ تعالیٰ ایک رسی کے ذریعے دنیا میں ایک کتاب اتار سکتا تھا ہر گھر میں۔ اس کے لیے کیا مشکل تھا، لیکن نہیں اس کے ساتھ پیغمبر ضرور بھیجنا ہوتا ہے، کیونکہ جب انسان نہیں ہو گا، ان کے سامنے اس کی مثال نہیں ہو گی، اس کی شکل و صورت سامنے نہیں ہو گی، تب تک ان لوگوں کو تقویت نہیں ہو گی کہ یہ ہمارے جیسا انسان ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ بابوں کی آپ بڑی بات کرتے ہیں۔ بابوں میں کیا خوبی ہوتی ہے۔ بابوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ بادشاہ وقت اپنے جوتے اتار کر ان کی جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے، حالانکہ کیا ہوتا ہے ان کے پاس کچھ دینے کو۔ بابا جو ہوتا ہے وہ IMF نہیں ہوتا نا۔ ہم تو IMF کے پاس سر کے بل جاتے ہیں۔ بابے کو پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ابھی ایک بی بی کہہ رہی تھی کہ اخلاق کی سربلندی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی حیران ہوتا ہے کہ انسانی وقار، اور یہ اشرف المخلوقات کا لیول اتنا اونچا بھی ہو سکتا ہے، اور ہم جو ہوتے ہیں "ثم رددنہ اسفل سٰفلین" تو ہم ڈر کے مارے سر جھکا جاتے ہیں کہ ہم چوتھے لیول کے آدمی ہیں۔ تو جیسا میں نے کہا کہ مورلک کی یہ بات مجھے بڑی دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے کہا، تم اتنے محتاط ہو کہ اپنے بچوں کے لیے سپیشل اعلیٰ درجے کے سکول بنا دیئے، وہ ایک اور طرح کے ریفریجریٹر ہیں کہ یہاں پر میں اپنا بچہ لے جا کر داخل کرا دوں، اور یہ بالکل

تر و تازہ رہے، اور جب ضرورت پڑے گی تو نکال کر اس کو زندگی کے کاموں میں لے آئیں گے۔ پھر اس نے کہا میری تم سے محبت ہے اور تمہاری وجہ سے پاکستان سے محبت ہے، تم ایسے کرو ریفریجریٹر میں زندگی گزارنے کی بجائے ٹوسٹر میں زندگی گزارہ کرو، تاکہ تھوڑا سا سینک لگے تم کو، اور جو تم میں کچا پن ہے وہ پختگی میں تبدیل ہو اور جب تمہاری ضرورت پڑے چھلانگ مار کر باہر نکلو۔ ٹوسٹ دیکھا ہے، نکلتا ہے ہاں، اور اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

تو تم تو ٹوسٹر سے بہت گھبراتے ہو اپنی زندگی کو سینک دینے کو تیار ہی نہیں ہو، تعلیم دلواتے ہو صرف نوکریاں حاصل کرنے کے لیے، وہ بات جو انسانیت پیدا کرتی ہے، وہ تو سینک لگنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں ہوتی، لیکن تم اتنے محتاط ہو اور اتنے خوفزدہ ہو کہ حالات اور زمانہ کو Face کرنے کے لیے تم اس قسم کی صورتِ حال پیدا کرتے رہتے ہو۔ اس نے کہا، میں تو تھوڑا سا خوش ہوں تمہارے ملک میں جو ابھی فوجی ٹریننگ ہے کاکول وغیرہ کی، وہ ٹھیک ہے، باقی کے تو آپ نے سارے ادارے تباہ کر دیئے ہیں، اور مجھے اندیشہ ہے کل کو یہ اس کے ساتھ بھی تم لوگ یہی نہ کرو۔

میں پچھلے دنوں ایک پروگرام دیکھ رہا تھا، پتا نہیں کہاں۔ اس میں بالواسطہ طور پر

تو نہیں بلاواسطہ طور یہ بات آتی ہے، اس میں کوئی بتا رہا تھا کہ لڑکیوں کے ساتھ رویہ اچھا نہیں ہوتا۔ آج کل یہی ہے نا، اور لڑکوں کے ساتھ بہت اچھا ہوتا ہے۔ لڑکوں کو کھانے میں ناشتے میں انڈہ پراٹھا ملتا ہے، لڑکیوں کو کہتے ہیں تُو کُڑی ہے کوئی بات نہیں، تُو بعد میں کھانا یا نہ کھانا، ہمارے ہاں ایسا ہوتا رہا ہے۔

ہمارے گھر میں میری ماں کہتی تھی میری بہن سے کہ ابا کے بوٹ پالش کر۔ وہ بیٹھی بوٹ پالش کر رہی تھی اور ہم مزے سے کھانا کھا رہے ہوتے تھے، تو یہ ساری باتیں رہتی ہیں تو میں نے جب یہ دیکھا، میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ تو ہمیں کس طرف کھینچے لئے جا رہا ہے، تو میں نے اپنی ماں سے، جو زندہ تھی۔ اس وقت یہ پوچھا۔

میں نے کہا کہ یہ رویہ جو تھا آپ کا اس کی کیا وجہ تھی۔ انہوں نے کہا، یہ بہت ضروری رویہ تھا، اس لیے کہ اس لڑکی کو آگے جا کر بچے پیدا کرنے تھے، اور ان بچوں کو پالنا تھا، اگر اس کو انڈہ کھانے کی عادت اب پڑ جاتی تو وہ سارے انڈے کھا جاتی اور بچے اس کے بیٹھے رہ جاتے ٹیبل کے اوپر۔ یہ اس کی ٹریننگ تھی، یہ ہم جانتے تھے، اس بات کو، اور کہنے لگی، میرے پیارے بچے کہ اسی طرح سے تھا کل کو تم رونے لگ جاؤ گے کہ جو جنٹلمین کیڈٹ ہوتا ہے، اس کی کاکول میں

کتنی سخت ٹریننگ ہوتی ہے۔ صبح سردیوں میں چار بجے اٹھا دیتے ہیں، اس کو پھر پانی میں غوطہ لگواتے ہیں، پھر خاردار تار میں اس کا بدن چھلتا ہے، پھر اس کو کہتے ہیں کراس کنٹری ریس لگاؤ۔ کراس کنٹری بیچارہ لگاتا ہے۔ میں صدقے جاؤں پھر آ کے اس کو ناشتہ ملتا ہے۔ کتنی بری بات ہے لیکن ہرگز بری بات نہیں۔ اس کو تو کارگل کے اوپر Face کرنا ہے، دشمن کو، وہ تو وہاں کھڑا ہے ایسی برفوں میں، جہاں اور کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح عورت جو تھی وہ ایک طاقتور Phenomenon تھی، اور اس کو مضبوط ہونا تھا، اور ان کی مضبوطی دشمنی کی بات نہیں ہے۔ یہ جھاکا جو ولایت والے دیتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں۔ ہماری تو عورت بہت عزت دار ہے، اس سے بڑی محبت ہے، اتنی محبت ہے کہ دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں ہر ایک شے کے پیچھے، ہر گاڑی پر ماں کی دعا لکھا ہے۔ کبھی کسی نے باپ کی دعا نہیں لکھا ہوتا۔ باپ سے نہیں، ہم محبت کرتے ہیں ماں سے کرتے ہیں۔ عورتیں پیاری ہوتی ہیں خیر، یہ ایک بات دوسری طرف بات چلی گئی۔

مورلک کہنے لگا یہ ٹوسٹر کی زندگی جو ہے یہ کامیاب آدمی پیدا کرتی ہے، اور سینک لگنے کی ضرورت ہے، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے اندر جو رویہ ہے وہ بڑا گڈی گڈی بڑا لیے دیے رہنے کا انداز ہے۔ ہاتھ ملتے رہتے ہیں

آپ ہر وقت ڈٹ کر اپنے آپ کو نہیں بتا سکتے کہ آپ پاکستانی ہیں، اور آپ کا، ایک فخر ہے، جیسا کیسا بھی فخر ہے۔ تو میں نے کہا، بھئی ہمارا کیا فخر ہے ہم تو بالکل شرمندہ ہیں۔ مثلاً ہم میں کیا خوبی ہے۔ اس نے کہا کہ دنیا کی واحد قوم ہے جو بڑی مہمان نواز قوم ہے۔ ٹھیک ہے، ہم غریب ہیں ہم چھوڑ رہے ہیں اپنی روایات۔ لیکن آپ سیالکوٹ میں جائیں کہیں گے جی کھانا کھا کے جائیں۔ ہمارے امریکہ میں یہ نہیں ہے، ہالینڈ میں یہ نہیں ہے، آپ اس پر فخر نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا، نہیں ہم ڈرے ہوئے لوگ ہیں، اور ہم فخر نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا، پھر اپنے آپ کو تھوڑا سا ٹوسٹر میں رکھا کرو۔ سینک لو، پھر فخر کی بات کرو۔ میں نے کہا، یہ یار تم عجیب سی بات کرتے ہو۔

کہنے لگا، جی بڑی دیر کی بات ہے پرانے زمانے میں چائنہ میں جب منگ خاندان کے بادشاہ ہوا کرتے تھے، ایک آدمی کو سوئی کی ضرورت پڑی۔ غریب آدمی تھا چائنہ کے لوگ بہت غریب بے حد و حساب غریب تھے، تو اسے سوئی نہ مل سکی۔ تو ایک دن چلا جا رہا تھا، خوش قسمتی سے، اس کو ایک لوہے کا اوزار، جس سے مٹی کھودتے ہیں وہ مل گیا، وہ بڑا خوش ہوا۔ ایک پتھر مل گیا اس کو گھسانے والا۔ اس نے کہا لو جی یہ تو بن جائے گی، سوئی ساٹھ ستر سال میں۔ وہ گھسا کے ساری اس نے باریک کر لی تھی۔ تو اس نے ساٹھ سال کے اندر وہ گھسا کے سوئی

بنا لی، اور اپنے کام میں لے آیا۔ یہ کرنے والے کا کام ہے، جو بھاگ جائے، شکست خوردہ ہو جائے، ڈر جائے، مرعوب ہو جائے، اس کے لیے پھر بڑا مشکل ہوتا ہے زندگی کا کام کرنا۔ جب اس نے یہ بات کی تو مجھے اپنے کالج کا زمانہ یاد آیا۔ میں سیکنڈ ائیر میں تھا، تو یہاں لاہور میں ایک جگہ فلیمنگ روڈ ہے، وہاں رہتے تھے، ابا نے لیکر دیا تھا، ایک چوبارہ، ایک ملازم اور ایک کمرہ ساتھ تھا جہاں بیٹھ کر پڑھتے تھے، گاؤں سے آئے ہوئے۔ تو وہاں پر پرانی میوہ منڈی میں ایک دکان کو آگ لگ گئی۔ وہ دکان تھی گروسری کی۔ آٹا، دال، نمک۔ بساطی کہہ لیں اس کی دکان تھی۔ اور وہ ایسی ظالم آگ لگی، لوگ بیچارے بھاگے بالٹیاں لے کر، پریشانی کے عالم میں، فائر بریگیڈ بھی جیسا تھا اس زمانے میں گڑ گڑاتا ہوا پہنچا، لیکن وہ ساری کی ساری دکان بالکل خاکستر ہو گئی۔ ہم اس آدمی کو جانتے تھے، جس کی یہ دکان تھی۔ اگلے دن کالج جانے کے وقت میں وہاں سے گزرا تو میں بڑا حیران ہوا، وہاں جو راکھ کا ڈیر تھا نا سارا، اس کے اوپر ایک میز، اور کرسی لگا کر اس دکان پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا مالک۔

اور اس نے ایک گتا لکھ کر لگایا ہوا تھا "ساری دکان جل گئی خاک کا ڈھیر بن گیا، بیوی بچ گئی، بچے بچ گئے، الحمد للہ، خدا کا شکر، کام بدستور جاری ہو گا۔ آج کے دن کی معافی چاہتا ہوں، کل دکان اسی میز پر کھولی جائے گی۔"

تو یہ ایک ارادہ اور ایک تہیہ ہوتا ہے۔ ایک مِن مِن ہوتا ہے، رونا، پیٹنا، مارے گئے، لوٹے گئے، جی برباد ہو گئے۔ اب ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اب ہم اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ یہ ہم کام کر سکیں۔ تو جب تک آدمی کو زندگی میں سینک نہ لگے، اور وہ مقابلہ نہ کرے نامساعد حالات کا، تو اس وقت تک اس کے اندر پوری صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، جیسی ایک ٹرینڈ فوجی کی ہوتی ہے۔ اس میں آپ کتنے بھی نقائص نکال لیں، لیکن اس کا ایک چوکھٹا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو ایک اور قسم کے سکولوں میں پڑھے، ان کا میرے ساتھ آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں، بہت اعلیٰ درجے کی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ ایک اس کے درمیان ہے۔ وہ بھی پڑھا رہا ہے، اپنی ترقی کر رہا ہے۔ زندگی کا انداز ان کا، اور ہے۔ ایک، اور ہیں جو دینی تعلیم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، خاص قسم کی پگڑیاں باندھ کر، خاص قسم کے رومال کندھوں پر رکھ کر، بہت اچھا کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں، لیکن ان کے درمیان ایک ربطِ باہمی نہیں ہے۔ تعلیم بسم اللہ الگ الگ ہو، بالکل اپنی مرضی کے مطابق ہو، لیکن ان لوگوں کے درمیان نہ صرف پُل بنا ہوا ہو، ان کے اندر سرنگیں بھی چلتی ہوں، تاکہ جب موقع ملے، تو وہ سرنگ سے گزر کر جا کر پوچھ سکیں کہ خان صاحب کیا حال ہے، کس طرح سے ہیں۔ تو جب تک ہم وہ فریج والی زندگی کا اعادہ کرتے رہیں گے،

ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور ہم جو اپنے آپ کو فریش اور تر و تازہ سمجھتے ہیں، اور ہم یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ اس طرح کی زندگی بسر کرنے میں ہم کو نہ صرف آسائش میسر آئے گی، بلکہ ہم آگے بڑھ کر نامساعد حالات کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔ ایسا ہو گا نہیں۔

یہ بہت ضروری ہے کہ آپ کے حالات جو ہیں، وہ زمانے کے حالات کے ساتھ ٹکراتے رہیں، ورنہ گھوم پھر کر اسی طرف کو لوٹ کر آتے رہیں گے اور آپس میں جھگڑا کرتے رہیں گے کہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے، ہماری تعلیم کو اس طرح سے چلنا چاہیے، ہمارے آپس کے تعلقات اس نوعیت کے ہونے چاہئیں۔ تعلقات تو جب ہوں گے جب آپ ایک دوسرے کے ساتھ ملیں گے۔ اس کے بغیر تو چارہ نہیں ہو سکے گا، پھر تو آپ کی آرزوئیں ہی آرزوئیں رہ جائیں گی۔ اور آرزو جو ہوتی ہے، وہ قال کی بات ہوتی ہے، گفتگو کی ہوتی ہے، گفتگو سے آگے کام بڑھتا نہیں ہے۔ میں آپ کو عرض کروں کہ مجھے بات یاد آ گئی پتا نہیں کرنی چاہیے کہ نہیں۔ ہمارے یہاں پر ایک صاحب تھے، انہوں نے اپنی بیوی کے نام خط لکھے اور اس کمال کے خط وہ تھے، اتنی محبت تھی ان میں، اتنی یگانگت، اتنا پیار کہ میں نے باوجود ایک ادیب ہونے کے ایسی انشاپردازی کے نمونے اردو زبان میں نہیں دیکھے تھے اور اس کی بیوی نے جو بدستور اس کو

خط آتے رہے وہ چھاپ دیئے، مجھے تو جبھی پتا چلا۔ ورنہ مجھے اس نے دکھانے تو نہیں تھے۔ کتابی صورت میں چھپ گئے۔ چھپ کے جب سامنے آئے میں نے پڑھے، میری بیوی نے پڑھے، ہم ایک دوسرے سے شرمندہ ہوئے کہ دیکھو محبت تو اس کو کہتے ہیں، اور یگانگت اس چیز کا نام ہے، اور ایک دوسرے کو جاننا۔ وہ صاحب کہیں باہر تھے، دور ملک میں، کہیں ناروے وغیرہ یا کہیں اور۔ ظاہر ہے وہاں سے لکھے تھے۔ تو مجھے تھوڑے دن ہوئے ان کی بیوی ملی، میرے ساتھ متعارف ہوئی۔ میں ان کو جانتا نہیں تھا میں نے ان سے کہا، بھئی ہم نے خط پڑھے تھے، بہت حیران و پریشان ہوئے اور تم نے بہت اچھا کیا جو تم نے اسے کتابی صورت میں شائع کرایا، تو کمال کی چیز ہے وہ۔ کہنے لگی، ہاں سر جب وہ کتابی صورت میں چھپے تھے، اس کے ڈیڑھ مہینے کے بعد ہماری طلاق ہو گئی۔ میں نے کہا، میں تم سے ان خطوں کی بات کر رہا ہوں۔ تو وہ کہنے لگی، سر اصل میں وہ میں بھی آپ ہی کی طرح سمجھتی رہی۔ دراصل اس میں محبت کا شائبہ نہیں تھا۔ اس میں انشا پردازی کا کمال دکھایا تھا صاحب نے۔ ہوتا ہے نا دسویں جماعت میں پرچا آتا تھا خط کشیدہ الفاظ کو اپنے فقروں میں استعمال کریں۔ ٹھیک ہے نا جی۔ مہنگائی، دردمندی، طمطراق وغیرہ۔ عجیب و غریب بات تھی۔ تو اس نے دکھایا تھا کہ دیکھو میں یہ لفظ بھی استعمال کرتا ہوں۔ محبت کے جتنے شعر ہیں۔ وہ بھی

استعمال کرتا ہوں۔ تو اس لیے قال سے اور قول سے جو طاقتور لوگ ہوتے ہیں، وہ بڑی ہمت کے ساتھ بڑے طریقے کے ساتھ۔ اور پھر میں یہ کہوں گا، بڑے سبھاؤ کے ساتھ، سبھاؤ ایک خاص رویہ ہوتا ہے جس میں کسی کو تنگ کیے بغیر Irritate کیے بغیر، کسی کو کسی کے ساتھ جھگڑا کیے بغیر، آسانی سے آدمی اس پر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ تو ابھی یہ بات چونکہ چلی تھی تو اس میں میں عرض کر رہا تھا کہ اب ہم کو اللہ کے واسطے اس قال کی دنیا سے کسی حد تک نکل آنا چاہیے۔ یہ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا اخباروں میں، کہ ہم کو چاہیے کہ ہم اسلام کے اصولوں پر عمل کریں۔ یہ "چاہیے" جو لفظ ہے نا، یہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ چھوٹے بچے کو ہم کہتے ہیں کہ پیارے بچے تم کو چاہیے کہ سیدھے پاؤں کا بوٹ سیدھے میں ڈالو، الٹے پاؤں کا بوٹ الٹے میں۔ چھوٹے بچے دیکھے ہیں، اکثر الٹا بوٹ پہنتے ہیں تو ان کہ "چاہیے" کہہ سکتے ہیں، لیکن ایک قوم میچور ہو جائے باون برس اس قوم کی عمر ہو جائے، اسے بار بار یہ کہتے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ہم ساری برائی ترک کر دیں۔ یہ بڑا مضحکہ خیز اور شرمناک سا فقرہ لگتا ہے، یا ہم کو چاہیے ہم ایسا کریں۔

اس طرح کی جب نیوز آتی ہیں تو میں چھوڑ دیتا ہوں کہ یہ تو لفظ چاہیے کا استعمال ہے، جیسے خط کشیدہ الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے، تو اس لیے اب ہم میچور ہو گئے ہیں، اب ہم بڑے ہو گئے ہیں، اللہ کے فضل سے ہم ترپن سال میں داخل ہو

رہے ہیں۔

تو ہمیں مقابلے کی جوت ہے، دوسری قوموں سے مقابلہ کرنا ہے اور سب سے بڑی ذمہ داری کی جو میں بات کرتا ہوں کہ ساؤتھ ایشیا میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کو دوسرے ملکوں کی Protection کرنی ہے۔ ان کو حفاظت عطا کرنی ہے، ورنہ ایک بہت بڑا ظالم ملک ہے یہاں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ملک، نیپال ہے، بھوٹان ہے، سکم ہے، سری لنکا ہے، برما ہے، افغانستان ہے۔ یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے، یہ میری اور آپ کی ذمہ داری ہے، ہم طاقتور قوم ہیں، بڑی قوم ہیں، ہم ایک اٹامک انرجی کی مالک قوم ہیں۔ ہمیں تو نہ صرف اپنے آپ کو، بلکہ ساؤتھ ایشیا کی ذمہ داری ہم پر آ گئی ہے۔ اٹامک پاور بننے کے بعد ہم نرم، اور پلپلے ہو کر رہے تو یہ کام نہیں ہو گا۔ پھر تو بہت مشکل پڑ جائے گی۔ ہم بہت پائندہ قوم ہیں، اور ہر آدمی کو ہر وقت چلتے ہوئے، سوچتے ہوئے کوتاہیاں کتنی بھی ہو جائیں گرتا پڑتا رہے آدمی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرا ٹارگٹ کیا ہے؟

حرم شریف میں مجھے ایک آدمی ملا۔ لمبی کہانی ہے، لیکن اس نے اپنی پگڑی دھو کے زم زم میں ڈالی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ کہنے لگا سائیں ہم پاکستانی ہیں۔ میں نے کہا، کہاں سے آئے ہیں۔ کہا ہم

سندھ سے آئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ کب سے ہیں یہاں۔ کہنے لگا، مجھے اکیس برس ہو گئے ہیں یہاں رہتے ہوئے۔ میں نے کہا، سبحان اللہ، کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا، سائیں ہم منڈی میں بوجھ ڈھوتے ہیں۔ صبح وہاں سے چار پانچ ریال مل جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا اللہ کا شکر ہے، پھر ہم حرم میں آ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ سائیں اس کو دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا، سبحان اللہ بڑے خوش نصیب ہو، تو میں نے کہا، سائیں تم یہاں حرم شریف میں اتنی دیر سے کیا کرتے ہو۔ کہنے لگا، سائیں ہم گر پڑتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر گر پڑتے ہیں، پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو انسان کا یہی کام ہے پھسلتا بھی ہے، گرتا بھی ہے، لیکن پھر اٹھ کر کھڑے ہونے کا کام بھی ہے۔ جو سندھی بابا نے بتایا۔ اس سندھی بابا کو سلام ہو جو مزدور تھا، جس نے لاکھ روپے کی، کروڑ روپے کی بات کی، کھڑے ہو جانے کی، تو ان کو سلام ہو۔ آپ کو سلام ہو۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

Snap Shot

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

زندگی کے اطوار بھی عجیب و غریب ہیں۔ اس میں نشیب و فراز، تاریکی، روشنی، ظلمت، نور کے مظاہر آتے ہی رہتے ہیں، لیکن ہمارے بابے ایک بات سے بطورِ خاص منع فرماتے ہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ، اللہ نہ کرے آپ کو دوزخ میں جانے کا اتفاق ہو، تو وہاں سے جلدی فرار اختیار کر لیں۔ اگر مشرق کا دروازہ کھلا ہے تو اس کی طرف منہ کر کے نکل جائیں، پچھم کا، پورب کا، جدھر سے بھی آپ آسانی کے ساتھ نکل سکیں، وہاں سے نکل جائیں، اور ہرگز ہرگز رکیں نہیں۔ زندگی میں ایسے مقام آجاتے ہیں، آدمی پھنس جاتا ہے۔

لیکن بابے کہتے ہیں، ہمارا مشاہدہ ہے، اور ہمارا تجربہ ہے کہ جب آدمی دوزخ میں جاتا ہے، اس میں پھنستا ہے تو وہ بجائے وہاں سے بھاگنے کے، دوزخ کے اندر، دوزخ کے فوٹو کھینچنے لگتا ہے، وہ Snap Shot لینے لگ جاتا ہے، اور اس کی تفصیلات اکٹھی کرنے لگ جاتا ہے، اور پھر جب جا کے خوش قسمتی سے اس کو موقع نصیب ہوتا ہے، تو پھر وہ وہاں سے نکلتا ہے، ورنہ وہ دوزخ اور جہنم کی

تصویریں ہی اتارتا رہتا ہے، اور آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں گزرا ہو گا، جس نے یہ کام نہ کیا ہو۔ تو ہم بڑے حیران ہوتے ہیں، ان کی اس بات پر، اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ Snap Shot لینے کے بعد وہ بڑی محنت اور محبت کے ساتھ ان تصویروں کو رنگین برمائیڈ کو صورت میں کاغذ پر اتارتا ہے، بلیک اینڈ وائٹ فوٹو تیار کرواتا ہے، اور ان کے البم تیار کر کے زندگی بھر اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ اب یہ بات بڑی عجیب و غریب سی لگتی ہے، لیکن جب وہ اس بات کو کھولتے ہیں، تو پھر پتا چلتا ہے کہ بات واقعی حقیقت ہے، اور وہ اعلیٰ درجے کی زندگی گزارنے کے باوصف ہمیشہ آپ کی خدمت میں وہ فوٹو پیش کرتا رہتا ہے، جو دکھ اور تکلیف کے زمانے میں ایک لمحے کے لیے چاہے آیا ہو، اس نے گزارے تھے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ میرے البم کو دیکھیں میں نے کیسی مشکل سے وقت گزارا ہے۔

ہم سارے تقریباً اسی طرح سے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ جب پاکستان بنا، اور میں یہاں آیا تو اکیلا میں یہاں تھا۔ میرے گھر کے لوگ ساتھ نہیں آ سکے۔ ہم بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ میں نے الہٰ آباد یونیورسٹی سے بی-اے کیا تھا اور فرسٹ ڈویژن میں کیا تھا اور لائق لڑکا تھا۔ یہاں آکر میں لاہور میں نہر کنارے، یہ جو نہر ہماری لاہور کے بیچ چلتی ہے، کھڑا

تھا اور بے یار و مدد گار یہ سوچ رہا تھا کہ میں کہاں آگیا ہوں، اور میری زندگی کس طرح سے یہاں بسر ہو رہی ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ مجھے ایک شخص مل گیا۔ اس نے کہا میرے بیٹے کو تعلیم دو، تم کو میں سو روپیہ مہینہ یا پچاس روپیہ مہینہ دیا کروں گا، چنانچہ کہنے لگا میں بڑی مشکل میں، تنگ حالی میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ان کے بچوں کو پڑھاتا رہا۔ روٹی، کپڑا، اور مکان یہ چیزیں مجھے میسر آئیں، لیکن وہ بہت برے دن تھے، اور میرے اوپر بہت بڑا بوجھ تھا، اور میں بڑا دکھی تھا، اور مجھے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ وہ خوراک، جس کا میں عادی تھا وہ مجھے یہاں نہیں ملتی تھی، یہاں کی کچھ اور ہی کی طرح کی تھی۔ تو کہنے لگا، اس کے بعد میں نے C.S.S کا امتحان دے دیا جو پہلا امتحان ہوا تھا، تو اس میں میں آگیا، تو پھر میں نے یہاں ٹریننگ لی۔ ٹریننگ لے کر میں یہاں پر ملتان میں A.C لگ گیا، تو وہاں پر زندگی کے دن گزارتا رہا۔ اس کے بعد میری سرگودھا تبدیلی ہو گئی، تو پھر میں تھوڑی دیر بعد شیخوپورہ کا D.C لگ گیا۔ شیخوپورہ کا D.C لگنے کے بعد، میری خدمات جو تھیں، وہ سنٹرل گورنمنٹ نے لے لیں، اور میں منسٹری آف کامرس میں چلا گیا۔ اکنامکس کا کوئی اچھا بندہ تھا۔ وہاں چلا گیا۔ وہاں جانے کے بعد چار پانچ سال کی سروس کے بعد میرے صوبے پنجاب نے مجھے پھر مانگا اور میں یہاں آگیا۔ خیر وہ ایک زمانے میں لاہور کے کمشنر بھی

رہے، لیکن وہ کہتے ہیں میں بڑا دکھی ہوں۔

یہ میرے البم دیکھیں۔ میں جس کسمپرسی کی حالت میں یہاں وقت گزار تا رہا ہوں، یہ بڑا دردناک، اور تکلیف دہ وقت تھا، اور اللہ کسی کو ایسا وقت نہ دکھائے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے ولایت چلے گئے۔ ولایت میں پاکستان کی نمائندگی کی انہوں نے U.N.O میں کی۔ اس کے بعد انہوں نے ورلڈ بنک میں ہماری نمائندگی کی یا انہوں نے خود سروس کر لی، وہاں رہے، وہاں سے ریٹائر ہوئے، پھر ان کی ایک اعلیٰ درجے کے گھر میں، کوٹھی یہاں بھی تھی، کراچی میں بھی تھی۔ لیکن جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے، وہ اپنے دکھ کا ہی ذکر کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں، بہت تکلیف دہ وقت میں نے گزارا۔ ان سے میں نے کہا، اتنا دکھی وقت کیا تھا۔ کہنے لگے، جس گھر میں میں رہتا تھا، وہاں پر ہر تیسرے روز ٹنڈے پکتے تھے اور مجھے ٹنڈے اچھے نہیں لگتے، تو میری زندگی کا دکھ سب سے بڑا یہ ہے کہ مرضی کے خلاف ٹنڈے کھانے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کمشنر بھی رہا لاہور کا، لیکن مجھے ان ٹنڈوں کا دکھ نہیں بھولتا، اگر انہوں نے تھوڑا سا وقت جہنم میں گزارا تھا، تو اس کے پاس اس کے فوٹو گراف بہت تھے۔ آپ کو اکثر آدمی ملتے ہوں گے جو ہر وقت زندگی میں اپنے ان دکھوں کی بات کرتے رہتے ہیں، جو تھوڑے عرصے کے لیے آئے اور پھر گزر

گئے اور اب وہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔

انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا، اللہ نے مجھ پر کیسے اچھے دن لائے، اور میں کس خوش بختی کے ساتھ اپنی زندگی خوش و خرم گزار رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ بھا جی آپ کو کچھ نہیں پتا ہم نے بڑے بڑے دکھ برداشت کیے ہیں۔ بڑے مشکل راستوں سے گزرے ہیں۔ میں سمجھا سکا ہوں نے اپنا مطلب، سمجھ گئے آپ؟ ایک ہماری خاتون مجھے ابھی تھوڑے دن ہوئے ملی کہ وہ بے چاری کہہ رہی تھیں، بھائی جان، میں بھی فیروز پور کی رہنے والی ہوں۔ اور میں ٹینکاں والی بستی میں تھی۔ میں نے کہا، اچھا وہاں تو ہمارے اچھے خاصے مسلمانوں کے گھر تھے۔ کہنے لگی، میں چھوٹی سی تھی میرے والد فوت ہو گئے، میرے والد گارڈ تھے وہ میری چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ دو میرے بھائی تھے، ایک اوپر کا، ایک نیچے، میں درمیان میں تھی۔ میری والدہ نے بڑے دکھ سہے ہیں، اور بہت مشکلات میں وقت گزارا ہے۔ اور ہم نے بہت تکلیف دہ دن دیکھے ہیں۔ جب میں ان کو یاد کرتی ہوں، تو روتی رہتی ہوں ہر وقت۔ تو میں نے کہا اب کیسی ہو۔ کہنے لگی ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے۔ جو بھی وقت گزر رہا ہے، ٹھیک ہے، لیکن اتنے تکلیف دہ حالات سے گزرنا اور گزر کر یہاں پہنچنا یہ ایک ایسا تکلیف دہ عمل ہے کہ اس میں لوگ آسانی کے ساتھ دور تک چل نہیں سکتے۔ میں نے کہا،

بی بی اب آپ کہاں ہوتی ہیں۔ کہنے لگی، میں وہاں ہوں چکلالہ میں۔ تو میں نے کہا، آپ کیا کرتی ہیں۔ کہنے لگی میرے خاوند بریگیڈیر ہیں اور تین میرے بچے ہیں۔ ایک نے C.A کیا ہے، وہ یہاں لگ گیا تھا ایک فارن فرم میں، پھر وہ اس کو امریکہ لے گئے، وہ وہاں پر ہوتا ہے۔ اور جو چھوٹا ہے وہ پروفیسر ہے، وہاں پر راولپنڈی میں، اور جو سب سے چھوٹا ہے وہ کمپیوٹر کا کچھ کر کے چلا گیا ہے باہر۔

تو بھائی جان ہم نے بڑے دکھی دن دیکھے ہیں، ہم بڑے مظلوم لوگ ہیں اور ہمارے اوپر بہت تکلیف دہ وقت گزرا ہے۔ اور بچپن جو تھا میرا اور جوانی، وہ ایسی مشکلات میں گزری تو سارا دکھ کا اظہار کرتی۔ تو میں نے کہا بی بی اب تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں، بڑی اعلیٰ درجے کی، آپ کو کوٹھی بنگلہ ملا ہو گا، کار ہوتی ہے آپ کی بڑی سیاہ رنگ کی، اس کے اوپر ایک سٹار لگا ہوتا ہے۔ کہنے لگی، آئی تو میں اس میں ہوں، وہ باہر کھڑی ہے، لیکن دکھ بڑا ہے جناب، ہم بہت مظلوم ہیں۔ تو جب یہ ساری باتیں میں نے سنیں تو مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی کوئی اپنا دکھ یاد کرنا چاہیے۔ میں تو اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تو مجھے بھی ایسے دکھ اکٹھے کرنے چاہیں۔ مجھے بھی کچھ دکھ کے، جہنم کے فوٹو کھینچ کے اپنی البم تیار کرنی چاہیے تھی تاکہ میں بھی بچوں کو بتا سکوں، بیٹا تم کو پتا نہیں ہم نے بڑی مشکل میں وقت گزارا ہے۔

مجھے خیال آیا اور تھوڑا سا اس بات پر میری بیوی نے برا مانا۔ ایک زمانے میں میں ایک پرچہ رسالہ نکالتا تھا ماہنامہ، بڑا خوبصورت رنگین "داستان گو" اس کا نام تھا، تو ہماری مالی حالت درمیانی تھی۔ لیکن اس پرچے کو نکالنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ کیونکہ وہ لوگوں کو بہت پسند آ گیا تھا، تو اتنے پیسے نہیں تھے۔ تو میں ایک دفعہ اس کا کاغذ خریدنے کے لیے گیا۔ یہاں ایک گنپت روڈ ہے، وہاں پر کاغذ کی مارکیٹ ہے۔ وہاں کاغذ خریدنے گیا تو کاغذ کا ایک رم خریدا تو میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ میں اس کاغذ کے رم کو کسی تانگے میں، کسی رکشہ میں، یا کسی ریڑھی رکھ کے لے آتا تو میں نے کاغذ کا رم لیا، اس کو دوہرا کیا اور کندھے پر رکھ لیا۔ بائیسکل میں چلاتا تھا بڑی اچھی بائیسکل تھی میرے پاس۔ تو میں سائیکل پر سوار ہو گیا اور جب چلا تو انارکلی میں اس وقت بھی خاصا رش ہوتا تھا۔ تانگے آ رہے ہیں، ریڑھے آ رہے ہیں، سائیکلیں اور جو بھی کچھ اس زمانے کی ٹریفک تھی وہ چل رہی تھی۔ تو کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ کاغذ کا رم جو ہے، اس کے جو بیٹن لگا ہوتا ہے اوپر کا، مضبوط خاکی کاغذ وہ پھٹ گیا، اور پھر دیکھتے دیکھتے چھر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر کر کے پانچ سو کاغذ جو تھے وہ ساری انارکلی میں پھیل گئے، اور ادھر سے آنے والے جو تانگے تھے، اس کے پہیے ظاہر ہے گیلے ہوتے ہیں ایک کاغذ لپٹ کر چر۔ ر۔ ر۔ ر اور میں دیوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کر کہتا ذرا تانگہ روکو ایک

کاغذ وہ لے گیا۔ ایک کاغذ وہ لے گیا۔ تو پھر بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، میں نیچے بیٹھ گیا، اور کاغذ اکٹھے کرنے لگا کہ جتنے بھی بچ جائیں اتنے ہی غنیمت تھے۔ آہستہ آہستہ جتنے بھی کاغذ بچ سکے۔ کچھ تین سو ساڑھے تین سو ان کو میں نے اکٹھا کیا، لپیٹا۔ کسی شخص نے مجھے وہاں ایک چھوٹا سا ستلی کا ٹوٹا دیا، وہ میں نے باندھا، اور باندھ کے پھر اسے کندھے پر رکھ کے چلا، تو پھر مجھے اپنی زندگی کے اوپر، اور اس حالت کے اوپر، اور ہتکِ عزت کے اوپر، اور ذلت کے اوپر، جو سب لوگ تماشا دیکھ رہے تھے، اور میں جھک جھک کے وہاں سے کاغذ اکٹھے کر رہا تھا، بڑی شرمندگی کا بھی احساس ہوا، اور ندامت تو تھی ہی، ساتھ نقصان کا بھی دکھ تھا۔

جب یہ اکٹھے کر کے میں گھر آیا رونی صورت بنا کے تو میں نے یہ سارا واقعہ اپنی بیوی سے بیان کیا۔ اس نے بھی مجھے تسلی دی، لیکن وہ بھی میرے ساتھ اس غم میں شامل ہو گئی۔ یہ واقعہ گزر گیا۔ کئی سال بیت گئے، تو میں نے بھی اپنا ایک البم تیار کر لیا۔ دکھوں کے البم ساروں کے پاس ہوتے ہیں۔ تو میں نے بھی اس البم میں یہ واقعہ جو چھوٹا سا تھا، اور اگرچہ اتنا اہم نہیں رہا تھا کہ شامل کیا جاتا، تو میرے بچے اسے پڑھنے لگے۔ جب میرا بیٹا آٹھویں نویں میں پہنچا تو میں نے اسے کہا، تمہیں پتا نہیں ہم نے کس مشکل سے وقت گزارا ہے۔ میں نے اور تمہاری ماں نے کتنی محنت کی ہے، اور کن دکھوں سے، اور کن مشکل راہوں سے گزرے

ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنا کاغذ خریدنے گیا، اور میں اسے انار کلی میں کندھے پر رکھ کے۔ اور میرا بیٹا حیرانی سے دیکھ رہا ہے کہ بیچارہ ابو کندھے پر رکھ کے یوں بائیسکل چلاتا ہوا گزرا، اور میں نے سارا واقعہ سنا دیا۔ اس کے دل پر بڑا عجیب سا اثر ظاہر ہے ہوا ہو گا، تکلیف وغیرہ۔ لیکن میں اس کی نظروں میں ایک ہیرو بن گیا، اور میں خود بھی اپنے آپ کو ایک ہیرو سمجھتا گیا کہ دیکھو کن مشکلات اور حالات اور کیسے تکلیف دہ اوقات سے گزرا ہوں، پھر میرا دوسرا بچہ، اس کو بھی میں نے یہ بات سُنانی شروع کی، اور جہاں جہاں میں بیٹھتا تھا، اپنا یہ البم کھول کے اس میں سے یہ رنگین تصویر نکال کے سب کو اور پوری تفصیل کے ساتھ سناتا تھا، اس طرح بہت سارے سال گزر گئے۔ تو ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا) ظاہر ہے وہ بھی باباجی کے Influence میں آگئی تھی (یہ نہایت گھٹیا بات ہے جو آپ کرتے ہیں اور جس کے ساتھ میں بھی شامل ہوں، کیا ہوا اگر ایک چھوٹا سا ذرا تکلیف دہ وقت آیا، اور تم نے اس کو اتنا پھیلا کر کے اس کو پورا وہ جو کیا ہوتی ہے پینورا ما سکرین کے اوپر سنانا شروع کر دیا، اس کو بند ہونا چاہیے۔ تو میں نے کہا تو پھر میرے پاس تو یہ جو البم ہے، جس دکھ کی کیفیات میں نے بیان کی ہیں، یہ تو چلنی چاہئیں، کیونکہ ہر شریف آدمی کے پاس اپنی البم ہوتی ہے، اور وہ دکھ کے جو انہوں نے فوٹو کھینچے ہوتے ہیں سکرین پر، وہ کبھی بھی ان کو نہیں

چھوڑنا چاہتا، چاہے کتنے اونچے درجے پر پہنچ جائے۔ تو اس نے کہا، نہیں آپ اپنی البم کو دیکھیں۔ میں نے اس میں تبدیلی کر دی ہے، ان تصویروں کو میں نے کارٹون میں بدل دیا ہے، ایک ہنسی کی چیز بنا دی ہے کہ زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی آیا، اور یوں گزر گیا۔ تو یہ ہنسنے والی بات ہے نہ کہ اتنا دردناک رونے والی۔ خواہ مخواہ آپ توجہ وصول کرتے ہیں، یہ صحت مند ذہن کی نشانی نہیں ہے، تو پھر مجھے خیال آیا کہ ان بات تو ٹھیک ہے۔

اب ہم اس کو ایک کارٹون کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور میرے بچے، اور پوتے تالیاں بجاتے ہیں کہ دادا کے ساتھ یہ ہوا ہو گا، کیسے کاغذ کے پیچھے بھاگے تھے۔ میں نے کہا، میں ایسے ڈھک ڈھک کرتا ہو بھاگا تھا، تو خوش ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں، وہ ہمارے علاقے ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں، وہ جب بھی ہم میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں، جناب کیا وہ زمانہ تھا، اور کیا گھٹائیں کالے نیلے رنگ کی ہوتی تھیں، کوہ شوالک کے اوپر آتی تھیں، اور ہر گھٹا کے آگے ایک بگلوں کی قطار ہوا کرتی تھی، یہاں پر وہ ساری چیزیں نظر ہی نہیں آتیں، اور ہم کتنے خوبصورت آم وہاں کھایا کرتے تھے۔

خواتین و حضرات، میں آپ کو بتاؤں، اور میرے دوست جو ہوشیار پور کے رہنے

والے ہیں، مجھے معاف کریں کہ ہوشیار پور میں آم تو ضرور ہوتے تھے، لیکن اتنے کھٹے، اتنے کھٹے آم کہ آپ نے زندگی میں سلفیورک ایسڈ دیکھا ہو گا، وہ بھی اس سے تھوڑا پھیکا ہو گا۔ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ یہ آم تو ایسے ہیں کہ اگر مردے کے منہ میں نچوڑ دیں، تو اٹھ کر بیٹھ جائے گا، اور کہے گا السّلام علیکم۔

تو ایسے آم وہ ہوتے تھے، لیکن وہ وہاں رہتے ہیں، اور وہ ہمیشہ ایک ہی بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اشفاق صاحب آپ کو یاد ہے نا کہ وہ آم ہوتے تھے، اور وہ نیلی گھٹائیں، وہ یہاں پر نہیں ہوتیں۔ وہ ایک گھر، ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی ہمارے ساتھ، ایک شیش محل، اس کے پاس، بیچارے کرائے پر رہتے تھے۔ اس کو انگریزی زبان میں Nostalgia کہتے ہیں، بہت سے لوگ اس پر کہانیاں بھی لکھتے ہیں، ناول بھی لکھتے ہیں، جو جگہ چھوڑ کر آئے ہوں، اس زمان و مکان کو، جس کو آپ نے ترک کر دیا ہو، یا جو ماضی میں آپ کی زندگی میں سے ہو کر گزرا ہو اور آپ اداسی کی حالت میں اس کو یاد کرتے ہوں، اس کو "ناسٹلجیا" کہتے ہیں۔ اور اس کی ایک بڑی پکی نشانی یہ ہے کہ اگر ناسٹلجیا کے مریض سے، جو یادوں کی کہانیاں، افسانے، ناول لکھتا ہے، اس سے اگر یہ کہا جائے کہ چل تجھے اس جگہ واپس لے چلتے ہیں تو کبھی نہیں جائے گا وہاں پر۔ کیونکہ یہاں پر اتنی

آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو یہ ہمارے دوست ہمیشہ وہی پرانے زمانے کی بات دہراتے رہتے ہیں اور یاد کرتے رہتے ہیں۔ سارے ہوشیار پور میں تین چار یا دس آم میٹھے مل ہی جاتے تھے، لیکن اس وقت تو میں اس سے کہتا ہوں، ناسٹلجیا والے بندے سے کہ تم اس کو یاد کرتے رہتے ہو، اور دکھی ہوتے رہتے ہو، مجھے یہ بتاؤ، اب تم کہاں ہو؟ تو وہ کہتا ہے، آج کل میں ملتان میں ہوں، اور میرے دو آموں کے باغ ہیں۔ سچ، وہ مالک ہے اس کا، ایک تو ثمر بہشت کا باغ ہے اس کا، اور ایک انور رٹول کا باغ ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ میں نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں ہم اسے بیچ نہیں سکتے۔ میں اسے ایکسپورٹ کرتا ہوں، لیکن ان دونوں بڑے باغوں کے باوصف جن کا میں مالک ہوں وہ جو آم ہوتے تھے نا، وہ مردے کے منہ میں نچوڑنے والے ہوتے تھے۔ وہ میں ضرور یاد کروں گا، یہ ناشکر گزاری کی بات نہیں ہوتی ہے۔ انسان کے اندر بابوں کے کہنے کے مطابق ایک ایسی خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر وہ کبھی بھی تکلیف سے گزرے ہوتے ہیں، چاہے تھوڑے عرصے کے لیے ہوں، وہ اس کے زیادہ سے زیادہ فوٹو کھینچ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں، اور جب بھی آپ سے ملتے ہیں، اچھے بھلے ہیں خیریت کے ساتھ ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں دو گنا بلکہ سو گنا زیادہ آرام سے ہیں، لیکن وہ

دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کئی خواتین کرتی ہوں گی۔ کہ بہت مشکل میں وقت گزارہ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے پھر ایک صحت مند ذہن، اور ایک صحت مند روح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ روحیں بھی ماؤف ہو جاتی ہیں، وہ بابے فرماتے ہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ آپ کو کسی وجہ سے دوزخ میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں سے بھاگ کر گزرنے کی کوشش کریں، وہاں کھڑے ہو کر اس کے فوٹو نہ اتارنے لگ جائیں اور ان کے البم تیار کر کے لوگوں کے سامنے، جیسے فقیر دردناک نہیں دیکھے آپ نے، کچھ تو ہوتے ہی پٹی لپیٹ کے، ٹنڈے ہاتھ دکھا کے آپ سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں، تقریباً تقریباً خواتین و حضرات اسی طرح سے وہ لوگ جو آپ کے دوست ہیں، عزیز ہیں، رشتے دار ہیں، ایسی کہانی سنا کر آپ سے جذبہ ترحم، آپ کی توجہ کی بھیک مانگتے ہیں، میں اور آپ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا ہم کو اس قسم کی مصیبت میں یا اس قسم کے عارضے میں مبتلا نہ کرنا، اگر ہمارے اوپر کبھی کوئی مشکل وقت آئے تو ہم وہاں سے بھاگ کر گزریں، اور پھر اس کا ذکر نہ کریں کہ آتا ہے وقت، اور پھر گزر جاتا ہے۔ چنانچہ ان بڑے لوگوں کے قصے جب آپ بیان کرتے ہیں ہمارے اوّلون، اور سابقون کے، تو ان کی زندگیوں میں آپ کو سب سے اعلیٰ درجے کی سب سے ارفع چیز یہی ملے گی کہ وہ اپنے گزرے ہوئے

دکھوں کا، اور تکلیفوں کا ایسے اظہار نہیں کرتے تھے۔ بڑا انسان بننے کے لیے انسان کو وہ مثبت پہلو پیش کرنا چاہیے جو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ہم میں تھوڑی سی عادت پیدا ہو چکی ہے اب ہمارے ملک کے لوگوں کی، کہ دکھ، تکلیف، ناآسودگی کا اظہار بہت زیادہ Exaggeration کے انداز میں بہت زیادہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

قول اور نفس

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے اور خوش ہوتا ہے، لیکن جب عمل کی صورت میں جانا پڑے، تو پھر گھبراتا ہے، اور خدمت کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرتا۔ یہ ایسی بات تھی جو ہم کو سننی پڑی پہلی مرتبہ ڈیرے پر جا کر، تو اس کا مفہوم کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پہلی بات یہ کہ ہمارے لیے نفس کا تصور ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ قول کیا ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہم نے بابا جی سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا، آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا جی میں افسانے لکھتا ہوں۔ کہنے لگے وہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا، جی کہانیاں۔ میں وہ لکھتا ہوں۔ کہنے لگے یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی خوشی ہوئی، لوگ پڑھتے ہیں سنتے ہیں۔ میں نے کہا، جی ہاں۔ کہنے لگے، آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں، اب تک۔ میں نے کہا کوئی سو کہانیاں لکھیں۔ کہنے لگے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کہنے لگے سو کہانیاں تو بہت ہوتی ہیں، اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے لکھیں۔ مجھے یہ بتائیں، اس میں حال پر کتنی

کہانیاں لکھیں۔ یہ میرے لیے ایک نیا لفظ تھا، جیسے آپ کے لیے بھی نیا ہے کہ "حال پر" کا کیا مطلب؟ وہاں ان کے سیکرٹری صاحب تھے انہوں نے کہا، بابا جی پوچھتے ہیں آپ کے اوپر حال کی صورت میں گزری ہوئی کہانی جو آپ نے لکھی ہے، یعنی وہ آپ کی زندگی کا ایک حصہ ہو۔ آپ پر گزری ہو آپ کا حال رہا ہو، آپ کی کیفیت رہی ہو، تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا، سر جس بات کا تعلق میرے حال سے ہے میرے مشاہدے سے نہیں، میرے مطالعے سے نہیں، بلکہ میری اندر کی ذات سے ہے وہ تو ان سو میں سے شاید تین بنتی ہیں۔ تین یوں کہ ایک دفعہ مجھے ایف - اے میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی، تو وہ بیچاری فوت ہو گئی تھی۔ وہ کہانی میں نے بڑے دردناک انداز میں لکھی تھی، جی وہ تو میرا ایک حصہ تھا۔ اس طرح سے دو اور کیفیات میں سے گزرا ہوں۔ تو کہنے لگے باقی ستانوے آپ نے کیسے لکھیں۔ میں نے کہا پڑھ پڑھا کے، اخبار میں کچھ چھپا کہ ملتان میں یہ ہو گیا، ساہیوال میں یہ کیفیت گزری، پنوں عاقل کے لوگوں کے اوپر یہ ہوا، تو اس کی کہانی بنا ڈالی۔ کہنے لگے، نہیں یہ تو نفس کو دھوکہ دینے والی بات ہے، اور قول کو ایسے ہی پھیلانے والی بات ہے۔ ہم سوچنے لگے غور کرنے لگے کہ نفس ہوتا کیا ہے۔ جناب نفس ایک اہم شے ہے۔ آپ نے کبھی وہ باجا دیکھا ہے جو پرانے زمانے میں ہوتا تھا، جس پر توے لگتے تھے۔ Disk چلتی

تھی۔ پرانے گھروں میں ہوتا ہے۔ اس میں ہم چابی بھرتے تھے، تو اس کے اندر ایک چار گٹوروالا گورنر چلتا تھا۔ وہ سپیڈ کو باندھ کر رکھتا تھا۔ نہ وہ کم ہونے دیتا تھا، نہ بڑھنے دیتا تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک پنکھے کا Regulator ہوتا ہے، اس طرح نفس بھی انسانی وجود کے اندر ایک Regulator ہے، اور وہ اپنی مرضی کے ساتھ وجود کا اتار چڑھاؤ، گرمی سردی، مزاج مقرر کرتا ہے۔ جیسے آپ کے A.C یونٹ میں ہوتا ہے۔ کبھی اس کو فین پر کر دیتے ہیں، کبھی اس کو یونٹ پر کر دیتے ہیں، جیسے آپ کی کار کا اسٹیئرنگ ہوتا ہے، جیسے آپ کے ہوائی جہاز کا Telescope ہوتا ہے کہ اونچا نیچا ہونے پر وہ بتاتا رہتا ہے کہ کتنا اونچا گیا ہے۔ اسی طرح انسانی وجود کے اندر اس کا نفس ایک Telescope ایک اسٹیئرنگ ہے۔ وہ اس کو بتاتا رہتا ہے کہ تو میری مرضی کے مطابق کام کر۔ اپنی مرضی کے مطابق یا جو تجھے احکام ملے، یہ مت کر، اور پھر ہم سوچتے ہیں یہ بدبخت کدھر سے آ گیا۔ ہم نے نہ اسے بازار سے خریدا، نہ اسے رشتے داروں سے لیا، نہ اسے کہیں سے منگوایا ہے۔ تو دو سال کی عمر تک کے بچے کے اندر تو نفس موجود نہیں ہوتا۔ وہ بڑی خوشی کے ساتھ دوسرے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے کھلونے شیئر کرتا رہتا ہے، اور ان کے ساتھ لڑائی کرتا ہے۔ چھینا جھپٹی، بھاگا دوڑی، لیکن اس کے اندر کسی قسم کی منافقت یا رنجش پیدا نہیں ہوتی، پھر سے دوست

بن جاتے ہیں، پھر کھیلنے لگتے ہیں۔ وہاں پر اس کا نفس موجود نہیں، لیکن دو سال
کی عمر گزرنے کے بعد ماہرین کہتے ہیں نفس کا بیج بویا جانے لگتا ہے، اور یوں
سمجھیں آپ کی آسانی کے لیے کہ یہ نفس کمزور ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے آپ
اپنے گھر میں مری جاتے ہوئے، سوات جاتے ہوئے، یا صحت افزا مقام پر جاتے
ہوئے اپنے ملازم کو چھوڑ گئے ہیں، وہ گھر کی نگہداشت کرے۔ تو جب آپ لوٹ
کر آئیں تو وہ ملازم گھر کا مالک بن جائے اور آپ سے پوچھے، جناب آپ کیا چاہتے
ہیں؟ کس سے ملنا ہے؟ وہ کہے، میری مرضی کے بغیر، میری اجازت کے بغیر
یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو کنٹرول کروں گا۔ اس نفس کی جو
سب سے زیادہ مرغوب غذا ہے وہ قول ہے، گفتگو ہے۔ گفتگو سے یہ بہت موٹا
ہوتا ہے اور یہ اپنی گفتگو کو عام کرنے میں لوگوں کو مرعوب کرتا ہے۔ اس کی
مرغوب غذا تو قول ہے، لیکن لوگوں کو اپنے اختیار میں رکھنا، اور ان کو مرغوب
کرنا یہ اس کا فعل ہے۔ تو یہ ذرا پیچیدہ سی بات شروع ہو گئی، کیونکہ بابا جی کا خیال
آ گیا تھا، قول کے ساتھ جب آدمی وابستہ ہوتا ہے، تو اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتا
ہے۔ لوگوں کو بھی دھوکہ دیتا ہے، جیسے سیاستدان۔ وہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ
قول کی بات کرتے ہیں کہ جب میں حکومت میں آ گیا تو میں آپ کی تنخواہ دس
ہزار روپیہ فی مہینہ کر دوں گا۔ یہاں آ گیا تو گھر بنوا دوں گا۔ آپ کے گھروں میں

دیواروں پر کارپٹ اور پردے لگوادوں گا اور ہم لوگوں سمیت سبھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتنی اچھی بات کر رہا ہے۔ وہ شاید خود نہیں کر رہا ہوتا، اس کا نفس اس کے اندر چابی بھر کے کہہ رہا ہوتا ہے کہ کہہ دے، کیونکہ میں نے یہ آزما کے، اور پرتا کے دیکھا ہے کہ گفتگو کر دینا کافی ہوتا ہے۔ اس سے آدمی کبھی بھی تحقیق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ صرف کہتا اچھا لگتا ہے، مجھے ایسے ہی خیال آگیا، جب ہم مڈل میں تھے تو ہمارے ایک استاد تھے، وہ ہمیں جغرافیہ پڑھاتے تھے، لیکن وہ بہت موٹے تھے۔ ان کا جسم پلپلا تھا۔ کافی قد تھا۔ بچہ انکا کوئی نہیں تھا۔ صرف بیوی تھی۔ ڈاکٹر نے ان کو ورزش کرنے کو کہا تو انہوں نے ورزش کرنے کی ایک کتاب خریدی، جس میں ورزش کرنے کے بارے میں ہدایات تھیں۔ تو وہ چارپائی پر لیٹ کر اپنی بیوی سے کہا کرتے تھے کہ میری پیاری بیوی مجھے یہ کتاب پڑھ کر سناؤ اور وہ سناتی تھیں۔ ہم انکے پاس جاتے تھے، تو ہم ان سے پوچھتے تھے ماسٹر صاحب آپ یہ کیوں سنتے ہیں؟ کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایکسر سائز کرنے کا حکم دیا ہے۔ میری بیوی پڑھتی جاتی ہے، اور میں غور سے سنتا جاتا ہوں۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ اس کے قول سے اور اس کے کہنے سے ایکسر سائز ہوتی رہے گی اور میرا وزن کم ہوتا رہے گا اور میں سمارٹ ہوتا رہوں گا۔ لیکن وہ بیچارے اسی موٹاپے میں فوت ہو گئے اور ان کی کوئی ایکسر سائز نہ ہو

سکی۔ عمل اور قول میں یہ تضاد جو ہے نا، یہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، اور عام زندگی کا اگر آپ مطالعہ کریں تو لوگوں کو منافق کہنے سے پہلے یا ان کو ڈبل سٹینڈرڈ کا کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیں کہ ہمارے اندر بیٹھے ہوئے اس طوطے کا یہ فعل ہے جو ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ قول اور عمل کو ساتھ ملا کر چلنے سے البتہ آدمی کی فلاح کے راستے نکلتے ہیں۔

ایک دفعہ بہت بادل سا چھا گیا لیکن اس میں بادل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں اور میرا بڑا بھائی جو کہ کلاس میں بھی مجھ سے ایک سال بڑے تھے۔ ہم کتنی دیر سے چلے، اور گھر سے سکول کا فاصلہ ذرا زیادہ تھا۔ جس گاؤں میں ہم رہتے تھے فاصلے پر تھا، اور اساتذہ ہمارے سخت تھے تو اندیشہ اس بات کا تھا کہ ہم دیر سے سکول پہنچیں گے۔ میری عادت تھی کہ جلد پریشان ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا بھائی صاحب! سکول تک ہم نہیں پہنچ سکتے، بہتر یہی ہے کہ یہاں بیٹھ کر اللہ سے دعا کریں کہ اے خدا ہماری مدد فرما اور یہاں بیٹھ کر چاروں قُل پڑھیں اس کا اچھا اثر ہو گا۔ تو میرے بھائی نے کہا، اٹھو تیز تیز بھاگتے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ قُل بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ خالی بیٹھ کر پڑھنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ یہ چیز مکس کر دو۔ تو یہ بات نفس پر گراں گزرتی کہ یہ اتنی ساری چیزیں لے کر ساتھ کیسے چلا جائے۔ بلکہ یہ تو زندگی میں چیزیں آتی

جاتی رہتی ہیں۔ اب چونکہ مجھے اپنے گاؤں کی بیک گراؤنڈ یاد آگئی، وہاں ہماری بہت بڑی منڈی تھی، وہاں ہفتے کو دانہ آتا تھا، کیونکہ Agriculture لینڈ تھی، وہاں ہمارا ایک آڑھتی تھا، وہ بہت "درد مند" قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے گوداموں کو موٹے موٹے تالے لگا کر لمبی لمبی چابیاں لگا کر کہتا رہتا تھا کہ بیچارے غریبوں کا بہت برا حال ہے۔ اب بھی آپ نے اکثر سنا ہو گا، جس آدمی کے پاس بھی فارغ وقت ہوتا ہے، کہتے ہیں مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ بیچارے غریب کیا کریں گے۔ آپ بھی روز گفتگو میں کہتے ہیں۔ ایسے ہی وہ کہا کرتا تھا، بیچارے غریبوں کا برا حال ہے۔ ان کو ایک وقت کی روٹی نہیں ملتی کیا کریں۔ وہ قول کی بات کرتا تھا، قول کے ساتھ وابستہ تھا، اس کی زندگی ایسی ہی تھی۔

اس کا بیٹا ہمارا ہمدرد تھا۔ ساتویں آٹھویں میں پڑھتا تھا، اس کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کیونکہ جب بھی کوئی فقیر یا گداگر آتا اور کہتا کہ اللہ کے نام پر مجھے ایک سیر گندم دے یا مکئی دے، اس وقت سیر ہی وزن میں استعمال ہوتا تھا۔ تو وہ کہتا تھا، بھئی یہ اللہ نے کیا کیفیت بنا رکھی ہے، میں بڑا دکھی ہوں، تجھ کو اور تیرے بچوں کو اللہ سلامتی عطا کرے، اور تمہارے گھر پر بارش ہو نعمت کی فراوانی کی۔ فقیر بیچارہ چلا جاتا تھا، اس کی باتیں سن کر۔ اس کا بیٹا اس سے ہمدرد تھا، تو اس نے ایک روز اپنے باپ سے کہا، باپو! تو ایسے کر کہ تو یہ جو لوگوں کی

بہتری کا کام کرتا ہے نا، یہ میں کر دوں گا۔ اس نے کہا، تو کیسے کر دے گا۔ کہنے لگا، یہ گودام کی چابی مجھے دے دے، تو دعا مانگتا رہ، میرے پاس چابی ہو گی۔ آڑھتی نے غصے سے کہا خبردار تو نے ایسی بات کی۔ دعا مانگنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اچھا اللہ بھلا کرے، لیکن چابی جو ہے وہ مضبوطی کے ساتھ لگی رہنی چاہیے۔ تو میں کہہ رہا تھا نفس کو ٹرینڈ کرنے کے لیے اور اس نفس کو صحیح راہ پر رکھنے کے لیے بزرگوں نے، لوگوں نے، سائنسدانوں نے، سائیکوتھراپسٹ نے بڑے طریقے ایجاد کیے ہیں، لیکن یہ قابو میں نہیں آتا، اور ہر وقت آدمی کو Vigilantہوکے Attentive ہوکے، ہوشیار ہوکے، چوکس ہوکے، اس کی طرف نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ آدمی کا انجام جو ہے، اچھا نہیں ہونے دیتا۔ شیطان اتنا نقصان نہیں کرتا۔ جتنا نفس کرتا ہے۔ اس کا بنیادی تعلق گفتگو کے ساتھ ہے اور بات کے ساتھ ہے اور یہ بات سے نکلنے نہیں دیتا۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہو گا اس وقت بھی، اس سے پہلے بھی، جب اخبار نہیں چھپتے تھے، الیکٹرانک میڈیا نہیں تھا۔ میرے جیسا پروگرام نہیں ہوتا تھا تو اتنی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ اب اخبار بھی چھپتے ہیں، ایڈیٹوریل بھی لکھے جاتے ہیں، کالم بھی روز آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن وہ سب کچھ جو ہونا چاہیے، وہ ہو نہیں رہا۔ یہ انسانی زندگی جو کہ ایک بڑا اتناور وجود ہے، اس کی ایک Entity ہے جس

کا ایک بوجھ ہے، اس کا سہارا نہیں ہے۔

ایک بادشاہ تھے، وہ شاید چین کے تھے، یا کسی اسلامی دنیا کے تھے۔ ان کے ایک پیر تھے اور ان کے بہت بہت پیروکار، اور مرید تھے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی، تو لوگ حیران ہوتے تھے اور وہ جس راہ سے جس گاؤں قریہ سے گزرتے تھے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ جو جب وہ دربار، بادشاہ یا خلیفہ کے مقام پر پہنچے تو انہوں نے بڑی آؤ بھگت کی، اور ان کا بڑا جشن منایا تو تقریباً 50 ہزار ان کے پیروکار جو تھے وہ کھلے میدان میں جمع ہو گئے اور وہ سب اپنے مرشد کے درشن کرنے کے لیے دن رات وہاں بیٹھے رہے۔ بادشاہ نے بہت خوش ہو کر اس مرشد سے کہا آپ بہت خوش نصیب آدمی ہیں کہ آپ کے معتقدین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں گنا بھی نہیں جا سکتا، اور دیکھیے کیا جمِ غفیر بیٹھا ہے۔ لوگوں کے سر ہی سر دکھائی دے رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا، یہ جو سارے کے سارے بندے جو میرے مرید ہیں، اور یہ جو میرے معتقدین ہیں، یہ سارے کے سارے قول کے آدمی ہیں۔ ان کا میرے ذات کے ساتھ یا میرے وجود کے ساتھ یا میری روحانی درس و تدریس کے ساتھ کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ یہ مجھے ماننے والے نہیں ہیں۔ بس چلے آ رہے ہیں میرے پیچھے پیچھے۔ آپ سڑک پر نکل کر کھڑے ہو جائیں اور ایک طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھنے

لگیں، آہستہ آہستہ ٹریفک رکنے لگے گی اور کوئی نہ کوئی آدمی آپ کے ساتھ ساتھ منہ اٹھا کے ادھر دیکھنے لگے گا پوچھے گا نہیں کہ اپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ پھر ایک اور آ جائے گا، اس طرح بے شمار لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ ویسے ہی لوگ ہیں۔ اسی طرح کے۔ انہوں نے کہا، میں یہ بات نہیں مانتا یہ تو بہت گہرے عقیدت مند نظر آتے ہیں۔ ان کی دل و جان نگاہیں، آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ یہ کیسے کہتے ہیں، یہ خالی قول کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا اگر آپ ٹیسٹ کرنا چاہتے ہیں تو یہ لیبارٹری ٹیسٹ ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہاں یہ جو پچاس ہزار آپ کو نظر آتے ہیں میرے مریدین، میرے معتقدین، میری پیروی کرنے والے، ان میں سے صرف ڈیڑھ شخص ایسا ہے جو میری عقیدت والا ہے اور مجھ پر جاں نثاری کر سکتا ہے اور مجھ کو مانتا ہے، اور باقی کے ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے کہہ رہا ہے۔ یہ ڈیڑھ کیسے کہہ رہا ہے اور اس نے کہا، ٹیسٹ کیسے کریں؟ اس نے کہا ٹیسٹ ایسے کریں کہ ان کے نفس کا ٹیسٹ کریں۔ پرانے لوگ اپنے طرز پر ٹیسٹ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا، اسی میدان کے اوپر ایک ٹیلا ہے، اور اس ٹیلے کے اوپر مجھے آپ ایک جھونپڑی بنوا دیں، فوراً رات کی رات میں بنوا دیں، جیسے بزرگ لوگ جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ میں اس میں رہوں گا۔ تو بادشاہ نے جھونپڑی بنوا دی۔ اس

جھونپڑی میں اس بزرگ نے دو بکرے باندھ دیئے اور کسی کو پتا نہیں کہ اس میں دو بکرے باندھے گئے ہیں، اور پھر وہ جھونپڑی سے باہر نکلا اور کچھ دم درود اور وظیفہ کیا، اور اونچی آواز میں کہا، ہے کوئی میرے سارے مریدین میں سے جو مجھ پر جان چھڑکتا ہو؟ میری بات دل کی گہرائیوں سے مانتا ہو، اور میرے ساتھ ہر بری اچھی میں ساتھ دینے والا ہو اگر کوئی ایسا ہے تو وہ میرے پاس آئے اور میرے ساتھ رہے، جو قربانی اس سے مانگوں وہ دے۔ بس سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ جہاں بیٹھے تھے دم بخود بیٹھے رہے۔ دم بخود بیٹھے رہے۔ کہ اللہ جانے یہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اب اس پچاس ہزار کے جمِ غفیر میں سے صرف ایک آدمی اٹھا، وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا، ڈھیلے پاؤں رکھتے اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا تجھ میں یہ دم خم ہے؟ اس نے کہا، ہاں ہے۔ کہا، آ میرے ساتھ۔ اس نے اس کی کلائی پکڑی اس کو جھگی کے اندر لے گیا، اور وہاں کھڑا کر دیا، اور کہا خاموشی کے ساتھ کھڑا رہ۔ پھر اس نے ایک بکرے کو لٹایا، چھری نکالی، اور اسے ذبح کر دیا جھونپڑی کی نالی کے پاس۔ اور جب خون نکلا تو پچاس ہزار کے گروہ نے دیکھا، اور وہ خون آلود چھری لے کر باہر نکلا، اور کہا قربانی دینے والے شخص نے قربانی دے دی۔ میں اس سے پوری طرح سے مطمئن ہیں۔ اس نے بہت اچھا فعل کیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو حیران، اور پریشان ہو گئے۔ اب ان میں سے

لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ کچھ جوتیاں پہن کر کچھ جوتیاں چھوڑ کر پیچھے بیٹھنے والے سوچتے ہوئے کہ اللہ جانے، یہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ کم ہونا شروع ہو گئے۔ جب کم ہونے لگے، تو انہوں نے کہا، اے لوگو! قول کے آدمی نہ بننا صرف مضبوطی، اور استقامت کے ساتھ کھڑے رہنے کو کوشش کرنا۔ یہ تو جو ہوا قربانی دینے والا اس کو تو مانا آپ نے بھی۔ اب میں پھر ایک اور صاحب سے کہتا ہوں، وہ بھی اپنے آپ کو قربانی دینے کے لیے پیش کرے، اور میرے پاس آئے، کیونکہ یہ اس کے نفس کا ٹیسٹ ہے۔ تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آگے نہ بڑھا۔ اس دوران ایک عورت کھڑی ہوئی۔ تو اس نے کہا۔ اے آقا میں تیار ہوں۔ اس نے کہا بی بی آ۔ اس نے کہا، بسر و چشم۔ چنانچہ وہ بی بی چلتی چلتی جھگی میں گئی، اس بیچاری کے ساتھ بھی وہی ہوا، جو پہلے کے ساتھ ہوا۔ اندر اسے کھڑا کیا، اور دوسرا بکرا ذبح کر دیا، اور اس کے پرنالے سے خون کے فوّارے چھوٹے۔ جب یہ واقعہ ہو چکا تو بادشاہ نے کہا کہ آپ صحیح کہتے تھے، کیونکہ وہ میدان سارا خالی ہو گیا تھا۔ پچاس ہزار آدمی، ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا، میں نے کہا تھا تھا میرے ماننے والوں میں سے صرف ڈیڑھ شخص ہے جو مانتا ہے۔ بادشاہ نے کہا، ہاں میں مان بھی گیا اور سمجھ بھی گیا، اور وہ شخص تھا وہ مرد تھا وہ پورا تھا، جبکہ وہ عورت جو عورت تھی وہ آدھی تھی۔ اس نے کہا

نہیں بادشاہ سلامت یہ مرد آدھا تھا اور عورت پوری تھی۔ پہلا جو آیا تھا اس نے کوئی خون نہیں دیکھا تھا۔ اس بی بی نے دیکھا تھا، جو واقعہ گزرا، پھر بھی اٹھ کر آنے کے لیے تیار ہوئی تھی، اس لیے وہ سالم Entity پر ہے خاتون، اور آدھا وہ مرد ہے۔ میرے ماننے والوں میں ڈیڑھ لوگ ہیں، باقی سارے نفس کے بندے ہیں۔ تو اس نفس کے ساتھ انسان کی اپنے طرز کی لڑائی رہتی ہے۔ کہیں کامیاب ہوتا ہے کہیں گر جاتا ہے۔ یہ وہ گیند ہے، جب زمین پر مارو تو اچھلتا ہے، پھر زمین کی طرف آتا ہے۔ اللہ ہم آپ کو تقویت عطا کرے۔ ہم اپنے نفس کا معائنہ کر کے اس کو قابو میں لانے کے لیے ان لوگوں کی تعلیم پر علم پیرا ہو سکیں، جنہوں نے ہمیں بنے بنائے نسخے دیئے ہیں کہ اس پر عمل کریں، اور جیسے نبیوں نے، جو انسانوں کی صورت میں نبی ہم کو ملتے رہے ہیں، انہوں نے ہمیں بنا بنایا پروگرام دیا۔ اس پر عمل کرتے رہیے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

انسان اپنی خواہش پوری ہونے کی راہ میں خود حائل ہو جاتا ہے

اب تک کا وقت اچھا، اور بے حد خوش گزرا، اور ہماری ہر خواہش پوری ہوتی رہی۔ لیکن خواہشوں کے پورے ہونے کا لوگوں کو یقین نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں، جب ایک خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے تو باوجود اس کے کہ مہاتما بدھ نے بڑی شدت سے منع کیا تھا کہ خواہشوں کو پیدا نہ ہونے دینا ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، لیکن میں سمجھتا ہوں اور ہمارے بابے یہ کہتے ہیں کہ خواہش اگر دل میں پیدا ہو اور آپ کی کوئی آرزو ہو اور آپ نے کوئی دھارنا دھاری ہو، تو وہ ضرور پوری ہو کر رہے گی، رکتی نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ جب آپ کوئی آرزو دل جوان کرتے ہیں، اس کو پالتے پوستے ہی، تو جہاں پر یہ آرزو اپنے پورے دباؤ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، وہاں پر ایک ویکیوم پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، اور جہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے، اس کو بھرنے کے لیے تند و تیز، خوشگوار نا خوشگوار ساری ہوائیں اس کی طرف چلتی ہیں۔ آپ نے بگولا دیکھا ہو گا۔ کبھی آپ گاؤں میں رہے ہوں تو گاؤں میں زیادہ آتے ہیں، شہروں میں تو نکال ہی

دیئے ہم نے۔

یہ بڑی تیزی کے ساتھ گھومتا ہے اور اس کے اندر بڑی شدت کا خلا ہوتا ہے، اور اتنا خوفناک کہ ہر قسم کے ڈبے، سرکنڈے کیا کیا کچھ نہیں اڑتا چلا جاتا اس کے ساتھ پورا ستون سا بن جاتا ہے بہت اونچا۔

میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، اور سکول سے آرہا تھا، جب ایک بگولا میں نے دیکھا، تو میں بمعہ بستہ اس کے اندر گھس گیا۔ اندر اتنی خاموشی، اتنا سکون، اتنی صفائی، کوئی نیچے سے صفائی بھی کرتا چلا آتا ہے۔ میں اس کے اندر چلتا چلتا ایک سکون کی کیفیت میں چلتا آرہا تھا۔ جب آرزو پیدا ہوتی ہے دل میں، آدمی چاہ رہا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تکمیل کو پہنچے تو اس کے حصول کے لیے قدرت بھی چاروں طرف سے آپ کی مدد کرتی ہے۔ لیکن آپ کہیں گے کہ اشفاق صاحب الٹی بات کر رہے تھے۔ ہمارے دل میں آرزوئیں، خواہشیں ہیں کہ کبھی ایک بھی پوری نہیں ہوئی، تو اس میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ خواہش کے پوری ہونے کی راہ میں آدمی خود کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ایک بلے باز کی طرح جو کرکٹ کا بیٹ ہاتھ میں رکھتا ہے، اس مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے، جہاں اس کی خواہش کو آکر پورا ہونا ہو، وہ آنے والے ہر خوش آیند، اور خوش گوار عنصر (Element) کو ہر

اس تکمیل کو پہنچنے والی چیز کو، بلے کے ساتھ چھکے مار مار کر وہاں سے بھگاتا رہتا ہے۔

یہ عجیب انسانی فطرت ہے۔ کبھی آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ عجیب لگے گی۔ خاص طور پر کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم نے خواہش پیدا کر دی تو وہ پوری ہو۔ لیکن تم نے اگر غور کیا، تو دیکھو گے، اس کے راستے میں اور کوئی بندہ حائل نہیں ہے، صرف آپ کی ذات، آپ کا وجود حائل ہے، اور آپ بھی کوشش کر کے اسے لاشعوری طور پر جان بوجھ کر نہیں ہٹانے اور مٹانے کو کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ اس کو فوراً پورا ہونا چاہیے۔ یہی ہے نا، کبھی آپ آئس کریم جمائیں، آپ نے آئس کریم والی مشین تو دیکھی ہو گی نا۔ اب تو بجلی والی آ گئی ہے۔ تو آئس کریم جمانے بیٹھیں تو خدا کے واسطے اس کا ڈھکنا بار بار نہ کھول کر دیکھتے رہیں کہ جمی ہے یا نہیں۔ اس طرح تو وہ کبھی بھی نہیں جمے گی۔ آپ اس کی راہ میں کھڑے نہ ہوں۔ جب آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس کو بننا ہے، اس میں سارا مصالحہ ڈال کر مشین کو چلانا شروع کر دیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب وہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔

میری اور میری آپا کی ایک بڑی بے چینی ہوتی تھی کہ ہم نے اپنی چتری مرغی کے نیچے انڈے رکھے تھے کہ اس میں سے چوزے نکلیں گے اور ہم دونوں اس بات کے بہت شوقین تھے۔ اب اس کے تئیس دن بعد چوزوں کو نکلنا تھا۔ ہم میں یہ خرابی تھی کہ ہر تیسرے چوتھے دن بعد ایک دو انڈے نکال کر انہیں سورج میں کر کے دیکھتے تھے، آیا ان کے اندر ایمبریو بنا ہے کہ نہیں، تو خاک اس میں سے چوزہ نکلنا تھا۔ بار بار اٹھا کے دیکھتے تھے، اور پھر جا کر رکھ دیتے تھے، آخر میں ہماری والدہ نے کہنا، خدا کے واسطے یہ نہ کیا کرو۔ اس لیے جب آپ نے پورے ایک فریم ورک کے اندر ارادہ باندھ کے چھوڑ دیا، پھر اس کو راستہ دو۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی آرزو کو راستہ دو، اچھی بری جیسی کیسی ہے اس کو راستہ دو۔ اس کے راستے میں کھڑے نہ ہوں، آپ اگر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ بہت سے مقامات پر آپ خود اس کے راستے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی ساری خوبیوں کو خود ہی خرابیوں میں تبدیل کر لیتے ہیں، اور پھر الزام دوسروں کو دیتے ہیں۔ اتنی تو آپ میں صلاحیت ہونی چاہیے۔ یہ الزام مجھے اپنی ذات پر دینا چاہیے۔ دیکھیے آپ نے جب ایک چٹھی لیٹر بکس میں ڈال دی، تو پھر اس کے پاس جا کر کھڑے نہ ہوں کہ کب نکلتی ہے۔ ڈاکیا اسے کہاں لے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس خط کے ساتھ

ساتھ چلنے لگے، تو پھر وہ ساہیوال کبھی بھی نہیں پہنچ سکے گی۔ آپ بار بار پوچھیں، بھئی یہ کدھر لے جا رہا ہے، کس گاڑی میں چڑھا دیا ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تیز والی پر جائے۔ جب آپ کی خواہشیں ہوتی ہیں، اس میں رخنے اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ آپ کر چکنے کے بعد بھی اس میں رائے اپنی دیتے رہتے ہیں۔ میں اکثر دیکھتا ہوں اور تکلیف بھی ہوتی ہے، مثلاً بچیوں کی شادیاں ایک بڑا مسئلہ ہے اور بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس میں والدین کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ جلدی ہو اور یہ ہے بھی ٹھیک بات۔ لیکن ایک مرتبہ آرزو کر چکنے کے بعد وہ پھر اتنا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں اور اس کو اللہ پر چھوڑنے کی بجائے یا اس آرزو پر چھوڑنے کے بجائے جو آپ نے اپنے اللہ کے ساتھ باندھ دی ہے، پھر اس میں اپنی ذات داخل کرتے رہنا، اور وہ آپ کی ذات اس میں داخل ہو کر کبھی بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ میں آپ کو جیسے کہ پچھلی باتیں بتا رہا تھا اور آئس کریم کی مثال دے رہا تھا، ہمارے گھر میں بچے اس وقت بڑے ہو چکے تھے۔ میں تو فرسٹ ائیر میں تھا، ہمارے گھر میں ایک کیمرا آیا، اس زمانے میں کیمرا آنا بڑی کمال کی بات تھی۔ باکس کیمرے بہت ہوتے تھے۔ باکس کیمرا آیا ہمارے قصبے میں آیا۔ لوگ بڑی بڑی دور سے گھوڑوں پر بیٹھ کر دیکھنے آئے اور انہوں نے کہا کہ خان صاحب کے گھر کیمرا آیا ہے۔ انہوں نے کہا جی کہ تصویر کھینچی

ہے، ذیلدار صاحب آئے اونٹ پر سوار ہو کے کہ تصویر کھینچنی ہے۔

بڑے بھائی بی-اے میں پڑھتے تھے۔ ان کو اباجی نے باکس کیمرہ لا دیا۔ اب اس میں فلم ڈال کے اس زمانے میں شیشے کی پلیٹ ہوتی تھی پتلی سے۔ Negative کھینچنے کے لیے اس کو ڈال کے تصویر کھینچی، تو پھر ہم بھائی کے گرد جمع ہو گئے۔ ہمیں نکال کے دکھائیں کیسی ہوتی ہے۔ اس نے کہا، نہیں ابھی نہیں۔ ہم نے کہا، اس کا پھر کیا فائدہ۔ کیمرا تو یہ ہوتا ہے آپ نے تصویر کھینچی ہے اور ابھی پوری ہو۔ تو ہم کو یہ بتایا گیا کہ اسی وقت نہیں آتی ہے تصویر، لیکن آتی ضرور ہے، لیکن ہماری یہ تربیت نہیں تھی، ٹریننگ نہیں تھی، ہم چاہتے تھے ابھی ہوا ہے تو ابھی اس کا رزلٹ ہمارے سامنے آئے، اور ہم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آرزو کو، اپنی پیاری آرزو کو جو آپ کی زندگی کا بہت عجیب سہارا ہوتی ہیں، میں منع نہیں کرتا، ہونی چاہیں۔ پیدا ہوتی رہتی ہیں انسان کے ذہن میں ہوتی ہیں، قدرتی بات ہے، لیکن اگر آپ ان کے راستے میں خود ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کے پورے ہونے کی راہ میں حائل ہو جائیں گے، تو وہ کبھی پوری نہیں ہوں گی۔

یہ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، ہم بھی نہیں مانتے تھے اس بات کو، کہ آپ

(ڈھیلے) Relaxed ہیں، اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں، اتنا ڈھیلا چھوڑ دیں، جس طرح نہر کے اوپر لکڑی تیرتی آتی ہے نا، ہر لہر کے ساتھ، کبھی اونچی ہو جاتی ہے کبھی نیچی۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہو گی، جب تک آپ Resistance دیتے رہیں گے، تو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آپ کی کامیابیاں بتدریج ناکامیوں میں تبدیل ہو جائیں گی، حالانکہ آپ کا راستہ سامنے بنا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ ہو کر رہے گا اور آپ اپنی زندگی کا خود نظارہ کرتے جائیں گے۔ دیکھتے جائیں ان کے اندر بے شمار واقعات نظر آئیں گے، اور پھر آپ کو محسوس ہو گا، اور کئی مرتبہ آپ نے زندگی میں کہا بھی ہو گا کہ کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا۔ اور پچھتاوا بھی ہوتا ہے، اس پچھتاوے سے بچنے کے لیے آپ ذہین آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں، سمجھدار ہیں۔ آپ جانتے ہیں، اس سے کس طرح اجتناب کیا جائے، اور کس طرح سے اپنا پھول اپنی مرضی سے کھلایا جا سکے۔ تو یہ بات اچانک بیٹھے بیٹھے آپ کو دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں آئی کہ آپ اپنی آرزوؤں کو اپنی حسرت کو تکمیل کرنے کے لیے خود ہی سب کچھ کر سکتے ہیں۔

دیکھیے ایک پیچ کس کو، ایک پلاس کو، آری کو یا ایک برمے کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے، اور اسے کیا کرنا ہے۔ ایک ہاتھ آتا ہے، وہ پیچ کس کو اٹھاتا ہے، اور

اس سے کمال کا کام کرتا ہے۔ ایک ہاتھ آتا ہے، اور اس آری کو اٹھاتا ہے۔ کمال کا کام لیتا ہے۔ اس کا ایک مستری ہوتا ہے، لیکن اگر آپ ان چیزوں کو جو آپ کی راہ میں آپ کی مدد کے لیے رکھی گئی ہیں، استعمال نہیں کریں گے، بلکہ اس حد تک کسی اور کو بھی استعمال نہیں کرنے دیں گے، تو پھر آپ کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔

آج کے بعد اگر آپ غور کر کے دیکھیں اور جائزہ لیں زندگی کا، ایمانداری کے ساتھ۔ مغرب کے بعد دیوار کو ڈھو لگا کے جب دونوں وقت ملتے ہیں تو پھر اپنا جائزہ لیں کسی کو ڈائری پیش نہیں کرنی کسی کے آگے آپ نے بیان حلفی نہیں دینا، خود اپنے سامنے، یہ بھی بڑا مشکل کام ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ نے کس طرح خوبصورت مسرتوں کو، آرزوؤں کو اپنے ہاتھوں پامال کیا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے کہ آدمی اپنا احتساب خود کرے۔ سب سے زیادہ آدمی ڈرتا ہے اپنا آپ فیس کرنے سے۔ اور اسی لیے بہت سے لوگ عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن خود احتسابی میں داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔ اس لیے جو خود احتسابی کرتا ہے، وہ وجود تو اس کے سامنے سچ بولے گا اور بہت ساری باتیں ایسی ہیں، جنہیں آپ فیس Face کرنے کے لیے یا ماننے کے لیے تیار نہیں، لیکن یہ عمل اتنا ضروری ہے کہ جیسے آپ احتساب۔ کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ اس

سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، اپنی ذات کے ساتھ احتساب کرنے کا تعلق ہے۔ یہ ضروری ہے۔

اور بزرگانِ دین ایک اور عجیب و غریب بات کہتے ہیں، اگر آپ اہلِ کتاب و شنید کے پاس جا کر بیٹھو گے، جیسے ہمارے لوگ ہوتے ہیں، تو لوگوں کی ذات میں کیڑے دکھائی دیں گے، اور اگر بزرگانِ دین کے پاس جا کر بیٹھو گے، تو اپنا حال روشن ہونے لگے گا۔ اور یہ سچ ہے، اور بڑی عجیب و غریب بات ہے، میں نے تجربہ کیا۔ اگر ان کے پاس جا کر بیٹھو تو ایک ایسی تسلی، اور تشفی بھی ملتی ہے کہ اپنی خرابی جو ہے باوجود اس کے آپ کو بھی پتا ہے، ان کو بھی پتا ہے، لیکن ایک سہارا ملتا ہے کہ یہ ساری کمیاں، یہ خرابیاں یہ ساری ہیومن ہیں، کوئی بات نہیں یہ گزر جائیں گی۔ ان بزرگانِ دین کے مقابلے میں مغرب کے لوگوں نے سائیکو تھراپسٹ، اور سائیکو انالسٹ تیار کیے ہیں، ان کو ڈھیر سارے پیسے اور فیس دے کر لوگ ان کے پاس جاتے ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ اس طرح سے ان کی ذات میں شامل نہیں ہوتے، جس طرح بزرگانِ دین ہوا کرتے ہیں، یا ان کو ہونا چاہیے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے تھوڑا سا وقت ضرور نکالیں، مگر آپ کو کسی نے بتانا نہیں ہے۔ آپ کو خود اپنی اینٹیں لے کر گارا لگا کے خود اپنی عمارت تیار کرنا ہے۔ آپ کو اللہ نے

صلاحیت دی ہے کہ آپ یہ ساری چیزیں بڑی آسانی کے ساتھ تیار کر کے اپنا بہت اعلیٰ درجے کا مکان یا اعلیٰ درجے کا پلازا بنا سکتے ہیں۔ جس میں اور لوگوں کو بھی دعوت دے سکتے ہیں کہ وہ آکر رہیں۔ تو میں یہ درخواست کروں گا آپ سے، اللہ نے آپ کو اچھے چہرے دیئے ہیں، اچھے ذہن دیئے ہیں، اچھی روحیں دی ہیں کہ آپ ضرور ایسا کام کریں۔ آرزوئیں تو ہیں، لیکن خود ہی ان کی راہ میں آپ کھڑے نہ ہوں۔ آرزوئیں تو ہیں لیکن بار بار ان کا ڈھکنا اٹھا کر نہ دیکھیں، بار بار اس کیمرے کو کھول کر نہ دیکھیں کہ ریل کے اوپر کوئی امپریشن آیا ہے کہ نہیں۔ جب آپ نے ایک بات طے کر دی، اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان یہ طے کر دیا کہ یوں ہونا چاہیے، مجھے یہ چاہیے، پھر اگر اس کا فیصلہ میری خواہش، اور مرضی کے خلاف بھی کرے تو مجھے منظور ہو گا، کیونکہ تُو میرا اللہ ہے۔ تو پھر دیکھیے کہ اللہ بھی بڑا مہربان ہو گا اور وہ کہتا ہے باوجود اس کے اس کی خواہش کچھ ایسی پسندیدہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی یہ اس کی ہے، اس انعامی بانڈ میں سے دو لاکھ تو نہ دیں 30 ہزار روپیہ دے ہی دیں، اور مل ہی جاتا ہے، باوجود اس کے مل جاتا ہے۔ ایک کہانی مثنوی شریف کی ہے۔ یعنی مثنوی مولانا روم کی کہ حماقت سے آدمی کس طرح اپنی راہ میں کھڑا ہوتا ہے۔ وہ کوئی چور تھا، تو اس کے اندر کچھ پیسا بنانے کی خواہش پیدا ہوئی، کیونکہ وہ اپنی محبوب بیوی کو کچھ دینا چاہتا تھا یا

اپنی ذات کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک رات ایک گھر کے روشن دان میں سے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی کہ یہ اچھا گھر ہے، اور مجھے یہاں سے کوئی مال و متاع ملے گا۔ لیکن جب وہ اتنا اونچا چڑھا، اور روشن دان کے اندر سے گزرنے کی کوشش کی تو وہ روشن دان جس کا چوکھٹا بظاہر ٹھیک نظر آتا تھا، ڈھیلا لگا ہوا تھا۔ وہ بمعہ چوکھٹے کے اندر فرش پر سر کے بل آگرا، اور اس کو سخت چوٹیں آئیں، چنانچہ اس نے وہ چوکھٹا اٹھایا اور قاضی وقت کے پاس شکایت کے لیے لے گیا۔ دیکھیں کیا کمال کے آدمی تھے۔ اس نے کہا، جناب دیکھیں میں چوری کرنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ یہ کیسا نالائق مستری ہے، جس نے ایسا چوکھٹا بنایا کہ یہ ٹوٹ گیا ہے، اور کرچیاں کرچیاں ہو گئی ہیں، تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔ قاضیِ وقت نے کہا یہ تو واقعی بری بات ہے۔ اس لکڑی بیچنے والے کو بلایا گیا، چنانچہ وہ پیش ہو گیا۔ اس نے کہا جناب اس گھر کی کھڑکی تو میں نے بنائی تھی۔ اس سے کہا گیا، تم نے ایسی ناقص قسم کی ناکارہ لکڑی لگائی۔ اس نے کہا، جناب اس لکڑی کو بھی دیکھ لیں کسی سے بھی ٹیسٹ کروالیں، اس گھر کے دوسرے دریچوں، دروازوں، روشن دانوں کو دیکھ لیں، کیونکہ یہ تو اب ٹوٹ گیا ہے تو اگر آپ اس میں کوئی نقص نکال دیں تو میں ذمہ دار ہوں۔ حضور بات یہ ہے کہ اس میں خرابی ہماری لکڑی کی نہیں ہے۔ اس ترکھان کی ہے، جس نے یہ چوکھٹا ڈائی

مینشن کے مطابق نہیں بنایا۔ چھوٹا یا بڑا جیسا بھی بنا دیا ہے، چنانچہ اسے کہا، تم کو معافی۔ انہوں نے ترکھان یا بڑھئی کو بُلوایا، اور وہ پیش ہو گیا۔ انسانی زندگی کا تماشہ دیکھیں کیا حضرت مولانا نے بیان کیا ہے۔ ترکھان نے کہا کہ میں چوکھٹا بالکل ٹھیک بنایا ہے۔ آپ اس کو نقشے کے مطابق دیکھ لیں، یا جو بھی اس کی ریکوائرمنٹ ہیں ملاحظہ فرمالیں۔ یہ میرا قصور نہیں ہے آپ ماہرین کو بلوالیں، اور وہ بتا دیں گے کہ میرے چوکھٹے میں کوئی خرابی ہے کہ نہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں، یہ چوکھٹا بالکل ٹھیک ہے۔ راج، معمار جس نے اس کو فٹ کیا تھا، جب وہ عمارت بنا رہا تھ، جب عمارت بن جاتی ہے تو پھر بیچ میں لگاتے ہیں۔ یہ ساری کوتاہی اس کی ہے اس نے اس میں خرابی پیدا کی ہے ورنہ میرا چوکھٹا تو بنا ہوا ٹھیک تھا۔ چنانچہ راج کو بُلوایا گیا، وہ عدالت میں پیش ہو گیا۔ قاضیِ وقت نہ کہا، اے نالائق آدمی بہت اعلیٰ درجے کا چوکھٹا بنا ہوا ہے۔ ڈائی مینشن اس کی درست ہے، تو نے کیوں "موکھا" اس کا ڈھیلا بنایا۔ جب تو بلڈنگ بنا رہا تھا، اور عمارت سازی کر رہا تھا تو نے اسے صحیح طور پر فٹ نہیں کیا تو اب راج پھنس گیا، اس نے سوچا واقعی عدالت ٹھیک پوچھ رہی ہے۔ چوکھٹے میں، اور دیوار میں فاصلہ تو ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے مجھے اب یاد آیا، جب میں چوکھٹا لگا رہا تھا اور میں سیڑھی پر چڑھا ہوا تھا، تو میں نے باہر سڑک پر دیکھا اس وقت ایک نہایت

خوبصورت عورت نہایت اعلیٰ درجے کالباس پہنے، بے حد رنگین لہنگا، اور بے حد رنگین دوپٹہ اوڑھے جارہی تھی مزے سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی۔ تو میری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ جب تک وہ سڑک پر چلتی رہی میں اس کو دیکھتا رہا، اور میں پوری توجہ نہ دے سکا۔ اس چوکھٹے کو ٹھیک طرح سے نہ لگا سکا۔ انہوں نے کہا اس عورت کو بلاؤ۔ عورت کو تلاش کرنے لگے کہ کس نے اس دن ایسا لہنگا پہنا تھا۔ بتاؤ۔ شہر میں سب جانتے تھے جو تھی چھمک چھلو، کہ وہ وہی ہو گی۔ عدالت میں پیش ہو گئی۔ پوچھا گیا، تم یہاں سے گزری تھیں۔ کہا ہاں میں گزری تھی۔ اس نے کہا تم نے ایسا لہنگا، ایسا غرارہ پہنا ہوا تھا۔ تم نے کیوں پہنا تھا؟ حضور بات یہ ہے کہ میرے خاوند نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تم کیا ڈل وے کلرز پہنتی ہو، یہ کچھ اچھے نہیں لگتے تمہارے رخِ زیبا کے اوپر کہ کپڑے سجتے نہیں ہیں۔ بہت اعلیٰ قسم کے شوخ، اور بھڑکیلے قسم کے پہنو۔ میں نے کہا، میرے پاس تو ہیں نہیں۔ اس نے کہا میں تمہیں تمہارے کپڑے رنگ کے دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ بازار سے رنگ لایا۔ اعلیٰ درجے کی محبت کو استعمال کر کے انہیں رنگا اور مجھے دیئے۔ وہ کپڑے میں اس روز پہن کر جارہی تھی۔ عدالت نے کہا اس کے خاوند کو حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کے خاوند کو پکڑ کر لے آئے، عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ خاوند وہی شخص تھا، جو روشن دان سے چوری کرنے کے

لیے اترا تھا۔ اس کی خواہش میں وہ خود کھڑا تھا۔

اتنا چکر کاٹ کے آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ وہ کہاں پر اپنی ہی آرزو اپنی ہی خواہش کے درمیان کھڑا تھا۔ ساری دنیا سے شکوہ کرتا تھا، جیسا کہ اس نے شکوہ سب لوگوں کے ساتھ کیا تو یہ بات بظاہر سیدھی سی لگتی ہے، لیکن بڑی باریک ہے، اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہم قومی زندگی کے 52 برس گزار چکے ہیں، اور ہم کو میچور ہو جانا چاہیے، اور ہمیں اپنی سوچ کی لہریں جو ہیں، اس کو مضبوطی کے ساتھ خود بھی پکڑنا چاہیے، اور لوگوں کو بھی توجہ دلانی چاہیے۔ اب یہ وقت آ گیا ہے ہم اپنی سوچ، جس کا ہم کو حکم ہے، تفکّر بھی کریں، اور تدبر بھی کریں۔

آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔

اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

حقوق العباد کا بوجھ

میرے گھر کے فون پر فون کرنے والے کا جلی ہندسوں میں نمبر آجاتا ہے اور نام بھی کیونکہ اس میں نمبر نام کے ساتھ ریکارڈ کرنے کی سہولت ہے۔ مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ کس کا فون ہے اور اب مجھے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ میں نمبر دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہوں کہ میں اس سے بات کروں یا نہ کروں۔ ایک ہمارا بہت یہ ”گپی“ دوست ہے۔ وہ بہت لمبی بات کرتا ہے، گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ۔ اس کا نام آئے تو میں کہتا ہوں کہ میں فون نہیں اٹھاتا۔ یہ میرے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ جان نہیں چھوڑے گا۔ اس طرح سے کچھ ایسے نمبر ہیں جن کے اوپر دل نہیں ٹکتا کہ ان کو رسپانس دیا جائے، یا ان سے بات کی جائے اور جب مجھے کسی پسندیدہ ٹیلیفون کی آمد کا پتہ چلتا ہے، تو میں بڑی خوشی کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ پرسوں، ترسوں میری پوتی نے اسلام آباد سے فون کیا تو میں نے ٹیلیفون اٹھاتے ہی اور اس کی ”ہیلو“ سے پہلے ہی کہا ”ہیلو مایا! کیا حال ہے، کیا کر رہی ہو؟“ اس نے کہا ”دادا! آپ بڑے سمارٹ ہو گئے ہیں۔“ میں نے کہا ”مجھے پتا چل جاتا ہے کہ مایا فون کر رہی ہے، یا اس کا ابو کر رہا ہے۔ اس لیے میں پہچان جاتا ہوں۔ میرے پاس ایک اعلیٰ درجے کا سسٹم ہے۔“

اس نے کہا " دادا! یہ اعلیٰ درجے کا کالر آئی ڈی نہیں ہے، جس کی آپ بڑی تعریف کر رہے ہیں۔" میں نے کہا" اس نے مجھے بڑی آسانیاں عطا کر دی ہیں اور میں بڑی آسائش میں ہو گیا ہوں۔" اس نے کہا" ٹھیک ہے۔ اب میں آپ کے سامنے بولتی تو نہیں۔ لیکن میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ فون کریں تو پھر آپ کیا کریں گے؟ یعنی اگر اس کے اوپر "God Almighty Calling" آجائے، تو پھر آپ کیا کریں گے؟ اس طرح آپ کا کالر آئی ڈی اچھا نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آدمی کان کو فون لگالے اور پتہ چلے کہ کون ہے؟ میں نے کہا" اگر اللہ میاں کا فون بھی آئے تو (ابھی تک تو آیا نہیں) مجھے پتا نہیں کہ میں کیا کروں۔" لیکن اگر آیا اور میں کام میں مصروف ہوا تو مجھ میں ایک خرابی ہے، جیسے میرے سارے ساتھیوں میں ہے کہ ہم عبادت کے ساتھ بہت مشغول ہوتے ہیں اور عبادت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں دراصل میں بچی کی بات سن کر ڈر گیا میں نے اپنے طور پر سوچا اور اس کو نہیں بتایا۔ آپ کو خفیہ طور پر بتاتا ہوں کہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ اگر اللہ میں کا فون آئے، تو میں کہوں گا کہ اللہ میاں! میری ابھی چار سنتیں رہتی ہیں، وہ پڑھ لوں۔ تو پھر آپ سے بات کروں، حالانکہ وہ سنتیں بھی اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ عبادت اہم ہے، اللہ کی ذات سے بھی، جس نے مجھے

عبادت کا حکم دیا ہے اور جس نے اپنے آپ کو برائے عبادت ٹھہرایا ہے۔ یہ غلط قسم کا خیال میرے ذہن میں آیا، کیونکہ میری تربیت اور طرح کی ہوئی ہے کہ یہ کام پہلے کرنا ہے، یہ کام بعد میں کرنا ہے۔ تو مایا نے مجھے کہا کہ یہ بات آپ یاد رکھیئے کہ اس کا (اللہ میاں کا) فون آجانا ہے اور آپ سے کوتاہی ہو جانی ہے۔ اس لیے الرٹ ہو جائیں اور بہتر ہے کہ سی ایل آئی یا کالر آئی ڈی اتروا دیں۔ ایسے ہی رہنے دیں جیسے پہلے تھا۔ یہ واقعی اس سے میرے لیے مشکل پڑ گئی۔ ایسے ہی جیسا کہ میں نے آپ سے ذکر کیا۔ عشاء کا وقت تھا۔ میں نماز پڑھ کر آیا تھا اور وتروں کے بارے میں آدمی کچھ اور طرح کا ہوتا ہے کہ یہ صبح پڑھنے چاہئیں یا۔۔۔۔۔ کچھ آتا رہتا ہے بدستور خیال۔ لیکن آدمی اس میں مصروف رہتا ہے۔ عشاء کا وقت ہوتا بھی ایسا ہے۔

میرے پڑوسی کے چوکیدار نے آکر کہا یہ گرمیوں کا واقعہ ہے کہ وہ سب میرے پڑوسی حاجی صاحب کی فیملی تو گئی ہوئی ہے مری، صرف چھوٹے صاحب شاہد میاں، جو فورتھ ائیر کے سٹوڈینٹ ہیں، وہ گھر پر ہے۔ چوکیدار کہنے لگا کہ پتا نہیں اچانک اسے شاہد کو کہا ہوا کہ وہ پہلے تو تشنّج میں مبتلا ہوئے اور پھر تڑپے اور پھر اچانک بے ہوش ہو گئے۔ انہیں ہسپتال لے جانا ہے۔ میں اکیلا ہوں آپ میری مدد کریں۔ میں نے کہا کہ دیکھو میاں میں اپنی نماز ختم کر لوں، پھر دیکھوں گا کہ

کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میں نماز پڑھ چکا، تو میں نے اپنے سلیپر پہنے، پنکھا بند کیا۔ پھر آرام سے باہر گیا کہ اسے پوچھوں کہ شاہد کو کیسے لے جانا ہے۔ باہر نکلا تو پتا یہ چلا کہ چوکیدار نے یہ بتایا کہ ہم اسے لے گئے۔ یہاں ایک پنوں نام کا گدھا گاڑی والا ہے۔ جو لڑکے سے بورے میں رکھ کر "چھلیاں" (مکی کے سٹے) بیچتا ہے۔ اس کی گدھا گاڑی میں رکھ کر ہسپتال لے گئے ہیں۔ ہسپتال والوں نے ٹیکا ویکہ دیا اور انہوں نے کہا کہ اسے یہیں چھوڑ جاؤ، کل صبح ہم آپ کو بتائیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ لیکن خیریت ہے آپ نے اسے وقت پر ہسپتال پہنچا دیا، ورنہ مشکل پڑ جاتی۔

میں نے چوکیدار سے کہا کہ چلو یہ اچھا ہوا۔ مایا نے پوچھا پتا نہیں اسے کشف ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ میاں کا فون آیا سی ایل آئی پر۔ میں نے کہا نہیں ابھی تک تو نہیں آیا۔ کہنے لگی کہ دادا آیا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ بالکل آیا اور بڑی وضاحت کے ساتھ آیا اور اس نے آپ کو حکم دیا کہ یہ کرو۔ میں نے کہا تجھے یہ کیسے معلوم ہے؟ کہنے لگی میری ایک تار آپ کے ساتھ بھی تو لگی ہوئی ہے۔ اسے پورے واقعے کا تو نہیں پتا، لیکن اس کا دل کہتا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ بھئی ایسا واقعہ گزرا تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھئے آپ نے فائدہ نہیں اٹھایا پورا۔ آپ چھوڑ دیتے نماز، پھر پڑھ لیتے۔ آ کے پڑھ لیتے۔ اگلے دن پڑھ لیتے۔

یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔ اس نے یہ مجبوری میرے ساتھ وابستہ کر دی کہ میں اسے اتروا دوں اور میں ہر کال موصول کروں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ وہ ویسے ہی لگی ہوئی ہے اور مجھے فون کرنے والے کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ لیکن کوتاہی اس کے ساتھ ساتھ ہی چلتی رہتی ہے کہ میں ایک نظر دیکھ کر کہتا ہوں کہ یہ فون سننے والا نہیں ہے۔ لیکن اب مجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔

زندگی میں اور بھی کام ہوتے ہیں، لیکن انسانوں سے متعلق جو کام ہوتا ہے، اس کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے اور ناقابل برداشت ہوتا ہے، اٹھایا نہیں جاتا۔ پھر ایسے ہی میری پوتی کے کہنے کے مطابق ایک کال ہی کہہ لیجئے، اسے اور آ گئی۔ وہ بھی کافی مشکل تھی اور میں یہ سمجھتا رہا کہ میں حق بجانب ہوں۔ ہوا یہ کہ جس گھر میں، میں رہتا ہوں اس سے دو تین گھر چھوڑ کر ایک بہت بڑی کوٹھی ہے اور اس میں بہت معزز لوگ رہتے ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں وہاں کھڑی ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں جب الیکشن کا کام چلا اور الیکشن میں یہ خوشخبری سنائی گئی کہ بہت ساری خواتین کو بھی ایم پی اے اور ایم این اے بنا دیا جائے گا اور مبارک ہو۔ اس گھر کے باہر ایک جمگھٹا لگ گیا۔ خواتین آتی رہیں، خواتین جاتی رہیں۔ کاریں آتی جاتی رہیں تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ مسز اکرم بھی ایم پی اے ہونے کی آرزومند ہیں، یا ایم این اے ہونے کی ہیں۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں بھی

خوشی ہوئی کہ چلو ہمارے علاقے کی بھی ایک بی بی ہو جائے گی اور یہ بھی جا کے ڈیسک بجائے گی (مسکراتے ہوئے)۔ ایک دن یہ ہوا، اس دن میں ساہیوال جا رہا تھا، اپنی ہمشیرہ کے پاس۔ ہوا یہ کہ انہوں نے (مسز اکرم نے) بہت بڑی دعوت کا بندوبست کیا اور اس میں امیدوار خواتین، جو ایم این اے اور ایم پی اے شیپ کی تھیں، وہ آئیں۔ بہت معزز لڑکیاں Colour Full قسم کے کپڑے پہنے ہوئے۔ اس نے اعلیٰ درجے کے کھانے بھی تیار کیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کھانا شامی کباب بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے بنے ہوئے تھے۔ وہ شامی کباب ان کے خانساماں نے بجائے میری میز کے اوپر رکھنے کے، میز کے نیچے رکھ دیے۔

ان کا کتا جیکی بہت چھوٹا سا پیارا کتا۔ وہ آیا اس نے جناب ایک شامی اٹھایا اور آدھا گٹ گٹ کر کے کھا گیا اور آدھا منہ میں دبا کر کھڑا تھا کہ مالکن اور دیگر بیرے خانساماں آئے اور دیکھا تو کہا کہ روکو اس کو، پکڑو پکڑو۔ خیر کتا ان کی نظروں کے سامنے کھا گیا، یا خراب کر گیا۔ اب اصل دعوت شروع ہوئی۔ ظاہر ہے خواتین خوش گپیوں میں مصروف ہوں گی۔ اپنے سنہرے مستقبل کی باتیں کر رہی ہوں گی۔ پروگرام طے کر رہی ہوں گی کہ کیسے سیاست میں جانا ہے اور اسمبلی میں کدھر سے داخل ہونا ہے۔ یقیناً ایسی باتیں ہوئی ہوں گی۔ جب وہ کھا رہی تھیں

اور اختتام کو پہنچیں اور سویٹ ڈش کھارہی تھیں، تو ان کے مالی نے آکر روتے ہوئے یہ کہا کہ جیکی مر گیا ہے اور وہ سڑک کے اوپر مرا پڑا ہے۔

اب مالکن جان گئی کہ اس نے جو کباب کھایا ہے اس میں کوئی زہریلی چیز تھی۔ گھر کی مالکن نے کہا سب دوڑو، بھاگو اللہ کے واسطے۔ سب نے بطرف اسپتال موٹروں میں چھلانگیں لگا دیں۔ وہاں ان کے گلوں میں لمبی لمبی نالیاں ڈال کر ان کی واشنگ شروع کی گئی۔ جتنا اچھا کھانا کھایا تھا، وہ تین مختلف ہسپتالوں نے نکالا اور سب نے دعا کی کہ یا اللہ! ہم اگر زندہ سلامت بچ جائیں تو تیری بڑی مہربانی ہو گی۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ نے خوشی میں دو دیگیں داتا صاحب بھجوائیں کہ اللہ تیرا فضل ہے کہ میں اس ناگہانی مصیبت سے نکل آئی۔ میں یہ ہنگامہ دیکھ کر ہی ساہیوال جارہا تھا اپنی گاڑی میں۔ وہاں کسی وقت مقررہ پر جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں پانچ دس پندرہ منٹ کے لیے رُک بھی سکتا تھا، لیکن میں چلا گیا اور دوسرے تیسرے دن وہاں سے واپس آیا۔ واپس آکر میں نے مسز اکرم سے کہا بڑا افسوس ہے۔ مجھے آپ کے کتے کا افسوس کرنا تھا۔ وہ آپ کا اتنا پیارا کتا تھا۔ اس نے کہا ہاں بھائی صاحب! یہ ہمارے ساتھ تو بڑی ٹریجڈی ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ جب وہ ٹرک بیک کر رہا تھا، ٹرک بیک کرتے ہوئے ٹرک کا لوہا کتے کے سر پر لگا اور وہ

وہیں "چوں" کر کے ختم ہو گیا۔ مجھے ان لوگوں کو جا کر بتا دینا چاہیے تھا کہ یہ کتا کس وجہ سے فوت ہوا ہے۔ لیکن میں نے ان کو نہیں بتایا۔ میری پوتی مایا کہتی ہے کہ دادا! ایک ٹرنک کال آپ کو اور آ گئی ہے اللہ میاں کی۔ وہ بھی مس ہو گئی۔ اس لیے کہ آپ کو یہ بات ان تک پہنچانی چاہیے تھی۔ کوئی سی اچھی بات ہو۔ خیر کی بات ہو۔ یہ بتائی جانی چاہیے۔ حضور نبی کریم کے پاس ایک صحابی تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ کوئی یمن سے آئے تھے۔ انہوں نے پتا نہیں کس صحابی کو دیکھا اور حضور نبی کریم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ کے یہ صحابی بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آنحضور نے کہا کہ آپ نے ان کو یہ بات بتا دی ہے کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ انہوں نے کہا جی نہیں۔ میں تو شرم سے ایسا نہیں کیا۔ وہ صحابی اس وقت تک جا چکے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ آپ بھاگ کر ان کے پیچھے جائیں اور انہیں گلے ملیں اور بتائیں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس کا اظہار کیا جانا بہت ضروری ہے۔ ہم یہ جھوٹی موٹی شرمندہ سے ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ ضرور کہیں اپنے پڑوسی سے، ہمسائے سے آپ کا فلاں بچہ مجھے پیارا لگتا ہے اور اس سے بھی کہیں کہ ماشاء اللہ بیٹے آپ کس کے بیٹے ہیں۔ وہ کہے گا جی میں شمس الدّین کا بیٹا ہوں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ کہے گا کہ جی وہ یہ کرتے ہیں۔ آپ اس سے کہیں بیٹے آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز

کریں۔ کہاں پڑھتے ہیں؟ فلاں فلاں۔ یہ بات کی جانی چاہیے۔ اپنے تک محدود نہیں رکھنی چاہیے۔ نہ کہ میری طرح سے اگر میں ساہیوال جانے سے پہلے انہیں سب کچھ بتادیتا تو آگے اتنی بڑی کہانی نہ چلتی اور ان بیچاریوں کا اتنا اچھا کھایا ہوا کھانا یوں ٹونٹیاں ڈال ڈال کر نہ نکال دیا جاتا۔ تکلیف دہ بات ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ بڑے بڑے انداز میں برے روپ میں آپ کے پاس آتا ہے۔ میرے پاس آتا ہے اور وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے فرمادیا ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے اور بالکل یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے، لیکن ہم نے اپنی ذات کے ساتھ ایسی سی ایل آئی لگائی ہوئی ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی جو نہی اللہ کا نمبر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کوئی نہیں پھر ان سے بات کرلیں گے۔ پہلے یہ دنیاداری کا کام پورا کرلیں۔ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس میں زیادہ نفع ہے۔ اللہ کی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ آج نہیں تو کل پوری ہو جائیں گی، تو اس سی ایل آئی کا یقیناً کوئی فائدہ نہیں، جو مجھے اور آپ کو اس راہ سے روک دے کہ ہمارا راستہ نہایت پھولوں بھرا اور گل فروشوں کی گلی بنا ہوا ہے۔ اس میں سے نہ گزریں اور اٹک کر بیٹھے رہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں خواتین و حضرات جب آپ ان پر غور کریں یا غور نہ بھی کریں، اکیلے بیٹھے ہوئے سوچیں، تو آپ کو اس میں بڑی اچھی پھلجھڑیاں بڑے پھول اور شگوفے

نظر آنے لگیں گے۔ آپ اس پر عمل نہ بھی کریں، لیکن اس سے وابستہ ہو کر بیٹھ رہنا اور بیٹھنے کی عادت ڈالنا اور اس شعور کے ساتھ کہ میں اس اللہ کی دھرتی اس اللہ کے آسمانوں تلے موجود ہوں، جو اللہ نے خصوصی طور پر میرے لیے بنائے ہیں اور میں اس کا احساس رکھ کر اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کچھ ایسی جگہ لپکنا چاہتا ہوں، جہاں میری پہنچ آج تک ہو ہی نہیں سکی۔ تو پھر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عجیب و غریب رستے کھلیں گے۔ بعض اوقات تو انسان یقین نہیں کرتا کہ میں ایسے رستوں کو اپناؤں کہ نہ اپناؤں، لیکن ایسے رستے کھلتے ضرور ہیں۔

مجھ میں یہ کمی ہے کہ مجھے ایسا وقت نہیں ملتا۔ ایسی دھوپ نہیں ملتی۔ ایسا لان نہیں ملتا کہ جہاں پر میں ہوں اور میرا پالن ہار Creator ہو اور کچھ نہ کچھ اس سے بات ہو۔ عبادت اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، لیکن اللہ خود فرماتا ہے کہ جب تم نماز ختم کر چکو تو پھر میرا ذکر کرو۔ لیٹے ہوئے بیٹھے ہوئے پہلو کے بل۔ یعنی یہ بھی اجازت دی ہے کہ جس طرح سے چاہو مرضی کرو۔ لیکن آدمی ایسا مجبور ہے کہ وہ اس ذکر سے محروم رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سوچیں کہ اس وقت میرا اللہ کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ شاہ رگ کے پاس تو ہے ہی، لیکن میں کیوں خالی خالی محسوس کرتا ہوں۔ تو پھر بھی آپ کو ایک آواز سے وائبریشن سے، جسے بدن کا

ارتعاش کہتے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے۔ یہ بڑے مزے کی اور دلچسپ باتیں ہیں لیکن ہم اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ ہم اس طرف جا ہی نہیں سکتے اور اللہ نے چاہا تو جوں جوں وقت آگے جائے بڑھتا جائے گا، ہمارے اندر شعور کی لہریں اور بیدار ہوتی جائیں گی۔ ہم پہنچیں گے ضرور، لیکن جس طرح سے "کے ٹو" کی برفوں سے بہنے والا ایک چھوٹا سا نالہ دھکے کھاتا ہوا، جغرافیہ جانے بغیر، نقشہ لیے بغیر سمندر کی طرف جارہا ہوتا ہے اور ایک دن سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم بھی انشاء اللہ اپنے سمندر کے ساتھ ضرور جا کر ہمکنار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !

خواب اور معجزہ

معجزہ کیا ہے؟ ایک عرصے سے مجھے یہ بات ستا رہی ہے کہ میں معجزے یا کرامت کا تعین کیسے کروں، یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ معجزہ، کرامت یا اعجاز کس چیز کا نام ہے؟ اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ یہ بات پوچھنے والے اور بتانے والے کے لیے پریشان کن ہے کہ معجزہ، کرامات، اعجاز، جادوگری، سائنس اور تماشا کے درمیان لائن کہاں کھینچی جائے؟ میں نے بہت عرصہ قبل ریڈیو سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت ہم آزاد کشمیر سے پروگرام پیش کرتے تھے اور یہ پروگرام بڑے توجہ طلب ہوتے تھے۔ ان دنوں اچھی تنخواہ نہ تھی نہ اچھے حالات تھے، اس کے باوجود وہاں کئی اچھے لکھنے والے جمع ہو گئے تھے جن میں ممتاز مفتی، اعجاز بٹالوی جیسی شخصیات شامل تھیں۔ ایک دن دوپہر کو شارٹ ویوز ٹو ۴۸۔۴ پر ایک پروگرام چل رہا تھا، جس میں میڈم نور جہاں، سب جگ سوئے ہم جاگیں تاروں سے کریں باتیں، گانا گا رہی تھیں۔ اچانک گانا چلتے چلتے رک گیا اور آواز گونجی؛ ”روبینہ کتھے گئی اے۔ کل وی چلی گئی سی۔ اج وی چلی گئی اے۔ چابیاں وی نال لے گئی۔ غرض کبھی “چاند تاروں سے کریں باتیں” کی آواز آنے لگتی، کبھی یہ مداخلت۔ ہم سب حیران ہو گئے کہ یہ شور یا آواز (Stray Noise)

کہاں سے آ گئی۔ یہ سائنسی لفظ ہم نے استعمال کر کے جان چھڑا لی، لیکن سب ٹھیک ٹھاک تھا تو پھر یہ آواز کہاں سے آئی، کیا یہ کوئی معجزہ تھا، کرامت، جادو گری یا کچھ اور!!

میں ایسے واقعات پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ آیا ایسا کہیں اور بھی ہوتا ہے؟ تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ لندن میں ایک گٹار بجانے والا جب ہزاروں کے مجمعے میں سٹیج پر آیا اور گٹار بجانے لگا تو اس کے گٹار میں سے بی بی سی کے پروگرام کی نشریات شروع ہو گئیں اور جب تک پورا بلیٹن ختم نہ ہوا، گٹارسٹ چپ چاپ پریشان کھڑا انتظار کرتا رہا اور شا کا وقت ختم ہو گیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیا معجزہ ہوا، یہ کیا کرامت ہوئی، اسے کس کھاتے اور کس خانے میں رکھیں اور اس واقعہ کو کیا معانی پہنائیں۔

ایسے واقعات میں نے اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کر دیئے۔ ایک بار میرے ایک دوست نے اپنے ساتھ ہونے والا ایک واقعہ بتایا اور کہا کہ آپ اسے بھی اپنی ڈائری میں لکھیں۔ اس وقت نئی نئی سوئی گیس دریافت ہوئی تھی۔ ایک شخص جو میرے دوست کا ملنے والا تھا، وہ اسے لاہور میں ایک کوکنگ رینج تحفے کے طور پر دے کر گیا۔ وہ میرپور سے تعلق رکھتا تھا۔ میرپور اس وقت امیر علاقہ سمجھا جاتا

تھا، کیونکہ وہاں سے بڑی تعداد میں لوگ ولایت گئے ہوئے تھے۔ جب وہ کوکنگ رینج گیس کے ساتھ منسلک کر کے چلائی گئی تو اس میں سے نزاکت علی، سلامت علی گانے لگے اور ان کی آوازیں آئیں۔ ان صاحبان کا پروگرام کراچی سے نشر ہوتا تھا اور آدھ گھنٹہ کے دورانیے پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ پروگرام مسلسل کوکنگ رینج پر چلتا رہا۔ جس پر دوست کی بیوی ڈر گئی اور سوچا کہ اس میں ولایت سے کوئی بھوت وغیرہ آ گیا ہے۔ سمجھانے کے باوجود وہ نہ مانیں اور اس نے کہا کہ وہ تو اپنا چولہا لکڑی سے ہی جلائے گی۔

امریکہ کی ریاست ٹیکساس کا ایک نوجوان ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا۔ وہ کارخانے میں کام کرتا تھا۔ کام کے بعد گھر جاتا تو اس کے منہ کے اندر حلق میں ریڈیو پروگرام چلنا شروع ہاجاتا۔ یہ سوچ کر وہ نفسیاتی مریض بن گیا کہ اس کے اندر کوئی بھوت پریت سرائت کر گیا ہے۔ کچھ ماہ بعد ڈاکٹروں سے اسے معجزہ قرار دیا۔ اسے اپنے حلق سے پورے پروگراموں کی آواز آتی تھی۔ خبریں، گانے سب کچھ چلتا تھا۔ اس شخص کو ماہرین نفسیات کے سپرد کیا گیا۔ اس امریکی لڑکے پر بڑے بڑے تجربات کیے گئے۔ آخر کار ایک الیکٹرانک انجنیئر نے کہا کہ یہ لڑکا چونکہ ریگ مال کی فیکٹری میں کام کرتا ہے جس سے ریگ مال کے باریک ذرات اس کے منہ کے اندر چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک دانت کی

جگہ سونے کی Filling کروائی ہوئی تھی۔ جس طرح ہم بچپن میں کرسٹل ریڈیو سیٹ بنایا کرتے تھے جس میں سرمے کی ڈلی لے کر اس کو باریک تانبے کی تار سے باندھ دیا کرتے تھے۔ اسے ایک طرف سے Earth کر دیتے تھے اور اس پر ہیڈ فون لگا کر بڑی آسانی کے ساتھ پورا پروگرام سن لیا کرتے تھے۔ اس الیکٹرانک انجنیئر نے کہا لڑکے کے منہ میں چونکہ ذرات چلے جاتے ہیں اور سونے سے ان کا ایسا تعلق بن جاتا ہے کہ اسے آوازیں آتی ہیں۔ بعد ازاں اسے کرسٹل ریڈیو سیٹ بنا کر باقاعدہ طور پر دکھایا گیا۔ جب اس کے باقاعدہ دانت صاف کروائے گئے تو آوازیں آنا بند ہو گئیں اور اس معجزے کی حقیقت کھل۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

امریکہ کے علاقے نیو جرسی میں دو پہلوان سٹیج پر آکر کسرت کرتے اور جب ان کا جسم بالکل تن جاتا اور ان پر مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی، تو وہ تاروں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتے تھے، جس سے پورے کا پورا اکسٹرا بجنا شروع ہو جاتا تھا۔ اسے صرف سائنٹیفک حوالوں سے ہی نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اس میں بندے کا مسلز سے کام لینا، اپنی روحانی کیفیت سے کام لینا اور سب چیزوں کو ملا کر اپنی مکینکل چیزوں سے ملا دینے کا نتیجہ تھا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معجزہ یا کرامت کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں جتنی ہمارے افسانہ نگار ذہن نے پیدا کر دی ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ البتہ خواب کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس بارے میں قرآن پاک کی سورۃ یوسف میں حوالہ بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ خواب کے بارے میں ضرور چاہتا ہے کہ ہم جانیں۔ بدقسمتی سے ہمارے کسی بزرگ، عالم یا روحانی پیشوا نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر فرائیڈ نے اس پر تحقیق کی۔ لیکن وہ بیچارہ بالکل الٹی راہ پر چل نکلا۔ البتہ اب ولایت میں اس پر کام ہو رہا ہے کہ خواب کی کیا اہمیت ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا سہارا نہیں لیں گے، جس نے خواب کو معنی عطا کیے ہیں، اس وقت تک وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اب میں آپ کو ایک معجزہ نما خواب کی بابت بتاتا ہوں۔

خراساں میں ایک غریب آدمی شاد علی رہتا تھا کہ ایک وقت کی روٹی سے بھی محتاج تھا۔ وہ بیچارگی کی آخری سٹیج تک پہنچ گیا تو ایک رات اسے خواب آیا کہ "تو یہاں سے ہندوستان کا سفر کر"۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ اسے کہا گیا کہ "اٹک کا پل آئے گا وہاں تک پہنچ۔ اٹک کے پل کے آخری سرے پر جہاں ستون ہیں، وہاں کے آخری پائے پر داہنی ہاتھ پانی کے اندر پوری بادشاہت کا خزانہ ملے گا۔" وہ غریب آدمی پا پیادہ چل پڑا، مہینوں کی منزلیں

برسوں میں طے کرتا ہوا نہایت تنگدستی میں وہاں پہنچا۔ پل پر انگریز کا پہرہ تھا۔ جب پہرے دار اس سے کچھ پوچھنے کے لیے قریب آتے تو وہ ڈر کے مارے دور بھاگ جاتا۔ آخر ایک ماہ کے بعد ایک سپاہی نے پل سے نیچے اتر کر اس حالت کی وجہ پوچھی تو اس غریب آدمی نے سپاہی کو اپنا خواب سنا دیا۔

اس پر پوچھنے والا قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور کہا کہ کیسی احمقوں جیسی بات کرتے ہو اور کہا کہ مجھے پچھلے دو سال سے خواب آ رہا ہے کہ خراسان میں ایک فقیر ہے اور اس کے گھر کے چولہے کے پیچھے ٹین کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہے اور اس ٹکڑے کو اکھاڑو تو اس کے نیچے سات بادشاہوں کا خزانہ ہے۔ غریب نے فقیر کا نام دریافت کیا تو سپاہی نے علی شاد بتایا۔ غریب آدمی واپس بھاگا اور گھر پہنچا۔ اس نے ٹین اکھاڑا تو اسے خزانہ مل گیا۔

اس طرح خواب کی اہمیت اور معانی رکھتی ہے اور معجزات کی باتیں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں۔ میں نے اپنے بابا سائیں صاحب سے پوچھا کہ معجزہ کیسے ہوتا ہے؟ کہنے لگے کہ کمالیہ سے قوال آئے ہیں اور یہ جھوٹے قوال ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے چوکی بھرنی ہے، جبکہ ان کے پاس ایک ہی طبلہ ہے اور ان کے ہارمونیم سے ہوا نکل جاتی ہے اور یہ اب ہمارے سامنے قوالی کریں

گے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں۔ اگر ان قوالوں کا کچھ بن گیا تو اسے معجزہ کہیں گے، نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ اس لیے معجزہ ہمیشہ بندے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اگر بندے کا کچھ بن گیا تو معجزہ ہو گیا۔

اب آپ خدا کے لیے معجزے کی تلاش میں اٹک کے پل کی طرف نہ چل پڑنا۔ خواب کی اہمیت مسلم ہے۔ میری خواہش ہے کہ علما اس پر توجہ دیں۔ اس پر بڑی توجہ دی جاتی رہی ہے، لیکن سائنٹیفک طریقے سے اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اگر توجہ دی جائے تو اس سے بہت سے مطالب اور معانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مغرب والے اس پر جتنی بھی تحقیق کریں، وہ کسی مقصد تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ کیونکہ ان کا رخ الٹا ہے۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

زبانی دعوے اور ضمیر کی آواز

بڑا اچھا موسم ہے اور بڑے اچھے دن ہیں، لیکن جو خوشی دلوں کے اندر ناچتی ہے اور چہروں پر رقص کرتی ہے، وہ عام لوگوں میں مفقود ہے۔ پتہ نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ کسی سیانے سے پوچھیں تو وہ بھی اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ کسی اکانومسٹ سے دریافت کریں تو وہ بھی اپنی تمام علمیت کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہماری انسانوں کی بھری پری دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مغموم، ملول اور پریشان اور دردمند رہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دن بھی کچھ سکھانے کے لیے ہوتے ہیں اور آدمی جب سیکھ جاتا ہے تو بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بڑی بڑی باتیں آپ کے سامنے آجاتی ہیں، بشرطیکہ آپ غور کریں۔

رمضان شریف سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں اپنے گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ ایک عجیب و غریب آواز سنی، جو اس سے پہلے کبھی سنائی نہیں دی تھی۔ وہ آواز کچھ کچھ پرندے کی لگتی تھی اور کچھ کچھ مشینی اور کچھ کسی سیارے کے اوپر سے آنے کی سی ککو، کک، ککو میں پریشان ہوا اور میں نے اٹھ کر صحن کا چکر لگایا۔ آواز

بدستور آرہی تھی، لیکن پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں سے آرہی ہے۔ پھر میں اٹھ کر باورچی خانے میں گیا، وہاں سے بھی ایسی ہی آوازیں آرہی تھیں، لیکن ذرا مدھم تھیں۔ باورچی خانے کے ساتھ ایک کوٹھری ہے جس میں بانو کھانے پینے کا سامان یعنی سوکھی رسد وغیرہ رکھتی ہیں۔ وہاں بھی ویسی کک کی آواز آرہی تھی، پھر میں باہر نکلا اور محسوس ہوا، جیسے یہ آواز میرا پیچھا کر رہی ہے، جس طرف میں جاتا ہوں میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میں خاصا پریشان ہوا۔ اس عمر میں آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے میرا بیٹا جو اپنی فائل بھول گیا تھا، دفتر سے گھر آیا تو میں نے کہا، یار دیکھو یہ عجیب سی آواز آتی ہے اور پھر رُک جاتی ہے اور دیر تک نہیں آتی۔ وہ کہنے لگا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے یہ آواز ہماری سڑک سے پچھلی سڑک پر جو سرونٹ کوارٹرز کی جو کالونی ہے، اس کے پیچھے سڑک بن رہی ہے۔ اس طرف سے آرہی ہے اور زمین کو ہموار کرنے والے بلڈوزر کی ہے۔ میں نے کہا بلڈوزر کی آواز تو اور طرح کی ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ ابو بلڈوزر جب ریورس کرتا ہے تو پھر یہ مخصوص قسم کی آواز دیتا ہے۔ خطرے کے طور پر کہ پیچھے کوئی ہے تو محتاط ہو جائیں۔

میرا بیٹا چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ سائنسدان لوگ بھی کیا کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے مادیت سے اتنا کچھ نہیں سیکھا، جتنا روحانیت سے سیکھا ہے اور

میرے اندر بھی یہ وارننگ کا سگنل اکثر اسی آواز میں چلتا ہے اور چلتا رہا ہے۔ اس کو آپ ضمیر کی آواز کہ لیں، اس کو آپ احساس گناہ کا نام دیں، میرے اندر کی آواز سے فائدہ اٹھا کر ہی سائنسدانوں نے اپنی مشینوں میں اس طرح کی آواز بھر دی ہے، جیسے ضمیر کی آواز ہوتی ہے، تاکہ آدمی کو پتا چلتا رہے کہ وہ کیسی غلطی کر رہا ہے اور کیوں ریورس جا رہا ہے اور یہ کہ اسے خداوند تعالیٰ نے آگے جانے کا حکم دیا ہے۔ وہ بیک کیوں جا رہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ ساری باتیں آئیں تو بہت ساری گزشتہ باتیں اور کیفیتیں جو آدمی کے ذہن پر طاری ہو جاتی ہیں، طاری ہو گئیں۔ مجھے اللہ کی ایک بات یاد آئی، جس کی میں نے ہمیشہ ہی حکم عدولی کی ہے اور جس کو نہیں مانا۔ یہ کہ اللہ کہتا ہے کہ وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں اور بہت دفعہ کہا ہے۔ میری یہ کیفیت رہی ہے اور شاید میرے ساتھیوں کی بھی ہو کہ ہم جب سٹیج پر بیٹھے ہیں یا گھر والوں یا دوست احباب میں بات چیت کرتے ہیں تو ضرور ایسی باتیں کرتے ہیں، جن پر ہمارا عمل نہیں ہوتا۔

میرے ایک استاد تھے اور میں خود بھی ٹیچر رہا ہوں۔ وہ اپنے طلبہ، اپنے ساتھیوں اور سارے ملنے والوں کو بتایا کرتے تھے کہ "نبی اکرم اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، اپنے کرتے کو خود پیوند لگاتے تھے، اپنے جوتے گانٹھ لیتے تھے، اگر جگہ صاف نہ ہو تو جھاڑو دیتے تھے اور اگر کوئی کارکن، کارندہ یا

خادم سویا ہوا ہے تو اسے کبھی نہیں جگاتے تھے۔" لیکن میں اکثر یہ پوچھتا ہوں وہ بشیرا کہاں ہے۔ پتا چلا سویا ہوا ہے تو کہتا اسے جگاؤ اور اسے بولو کہ میرے لیے چائے کی ایک پیالی بنائے۔ میری طرح میرے بعد آنے والے استاد پھٹے ہوئے کپڑوں کو پیوند لگانے کی یا جوتا گانٹھنے کی بات اکثر کرتے ہیں، لیکن میں نے کبھی کسی استاد کو آج تک سکول میں نہیں دیکھا کہ اس نے قمیض کو کوئی پیوند ٹاکی لگائی ہو۔ یہ ہم کہ ضرور دیتے ہیں، لیکن کتنی بری اور نقصان دہ بات ہے کہ میرا عمل نہیں ہے۔ لیکن میں اسے زبردستی دھکیلے چلا جاتا ہوں کہ آپ اس پر عمل کریں، میں قبول کروں یا نہ کروں، یہ تکلیف دہ بات ہے۔

پچھلے دنوں میں ٹی وی پر ایک تقریر سن رہا تھا، ٹی وی پر سمجھدار لوگوں کا ایک پینل کہہ رہا تھا کہ دیکھیے ہمارے اسلام میں تو عورت کو خداوند تعالیٰ نے اتنی آسانیاں دی ہیں اور اس کے لیے ایسے قانون طے کر دیے ہیں، جو دنیا کے کسی معاشرے اور مذہب میں نہیں ہیں۔ اس کو پوری آزادی دی ہے۔ ولایت والیاں تو اب بڑی مشکل سے وہاں پہنچی ہیں، جو آج سے ۱۴ سو سال قبل اللہ نے عورت کو دے دیا تھا۔ بیان تو یہ ہو رہا ہے، لیکن جب میں عمل کی طرف لوٹتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو وہ کہتے ہیں، کرتے کہاں تک ہیں۔ میرے ایک عزیز ہیں، چچا زار بھائی۔ وہ بڑے نیک مولوی آدمی ہیں اور ہمیں اچھی نصیحتیں

کرتے ہیں۔ ان کی رحیم یار خان میں زمین ہے، جس میں باغ بھی ہے، بارہ مربع زمین ہے، وہ ایک بھائی اور ایک بہن ہیں، ان کے اباجی حیات تھے تو وہ سب کام سنبھالتے تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو بڑی سیدھی سی تقسیم تھی کہ آٹھ مربعے بھائی کے اور چار مربع بہن کے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اس میں کوئی باریکی بھی نہیں تھی تو وہ بھائی صاحب جو بار بار یہ کہتے تھے کہ اللہ نے طے کر دیا ہے، انہیں جب ۴ مربع زمین دینے پڑے (ایک مربع کی آمدنی تقریباً چار لاکھ روپیہ سالانہ تھی) اور سولہ لاکھ روپیہ سالانہ بہن کو جانے لگا تو ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ خدا اور رسول کے فرمان بتاتے تو بہت تھے، مگر عمل نہیں تھا۔ میں نے کہا یار تو تو ہمیں سمجھایا کرتا تھا، اس لیے آپا کا جو حصہ بنتا ہے اسے دو۔ کہنے لگا نہیں میں ظالم نہیں ہوں، سنگدل نہیں ہوں، میں بڑی احتیاط اور سنبھال کے ساتھ اس کے مربع کا انتظام بھی کرتا ہوں۔ میں نے کہا تو دفع کر۔ ایسا نہ کر۔ اس کا خاوند جانے۔ کہنے لگا نہیں، میں اس کی بہتر مدد کر سکتا ہوں اور میں اس کا خرچ چلانے کے لیے گزارے کے طور پر دو ہزار روپے ماہانہ دے رہا ہوں۔

دیکھیے جب یہ سب کچھ ہو گیا تو میں نے ایک روز اپنے اس بھائی کو دیکھا، خواتین و

حضرات لاہور میں ایک جگہ ہے شاہ جمال کالونی، وہاں پر سڑک کے کنارے ایک چڑی مار بیٹھا تھا۔ یہ طوطے چڑیاں پکڑ کر بیچنے والے ہوتے ہیں۔ وہاں میرا وہی بھائی کھڑا تھا اور اس نے چڑی مار سے کہا، سو چڑیاں چھوڑ دے اور بتا کتنے کی آتی ہیں۔ اس نے کہا پانچ روپے کی ایک چڑی ہے۔ میرے بھائی نے کہا یہ لو پانچ سو روپے، چڑی مار نے جنگلے کا دروازہ کھول دیا اور چڑیاں پھر پھر اڑنے لگیں۔ میں گاڑی میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا بتاؤ طوطا کتنے کا ہے۔ اس چڑی مار نے جواب دیا پچیس روپے کا۔ میرے بھائی نے کہا کہ چلو دس طوطے چھوڑ دو۔ یہ پیسے دے کر میرا بھائی سمجھا کہ اللہ کے حکم پر اس نے عمل کر لیا ہے اور جو لوگ وہاں کھڑے تھے، وہ سب کہہ رہے تھے کہ کتنا نیک دل آدمی ہے، جو جانوروں پر اتنا رحم کرتا ہے تو بندوں پر کیوں نہیں کرتا ہو گا۔ اس طرح کی کوتاہیوں میں ہم سب شامل ہیں، کسی نہ کسی طور پر۔ میں زور لگاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ یا اللہ ایسی کوئی بات نہ نکلے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو بندہ محفل میں بیٹھا ہے، وہ معتبری بنانے کے لیے چاہے گا کہ اس کی واہ واہ ہو۔ رہا اس کا عمل تو اسے کون دیکھنے جاتا ہے۔ اس طرح آدمی کو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

میں نے شاید آپ کو پہلے بھی یہ قصہ سنایا تھا کہ ہمارے سکول میں دو لڑکے آپس

میں لڑ پڑے پرنسپل نے انہیں سکول سے نکال دیا دونوں لڑکوں کے والدین میرے پاس آ گئے اور آپ صاحب عقل ہیں پرنسپل صاحب کو منائیے۔ میں پرنسپل کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے ہر گز تیار نہیں اور انہیں سکول سے نکال دیا اور اس سختی سے نکالا کہ وہ لڑکے کسی اور سکول میں داخلہ ہی نہیں لے سکتے تھے، یعنی ان کا کیریئر ہی تباہ کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ صبح Prayer کے وقت ایک نے دوسرے کو دھکا دیا اور وہ آپس میں لڑ پڑے۔ بس اتنی بات تھی۔ میں نے پرنسپل سے درخواست کی کہ آپ تو معاف کر دینے والوں میں سے ہیں، تو کہنے لگے ہاں ہم اپنے بچوں کو معافی کا درس دیتے ہیں۔ میں نے کہا، سر! جب تک آپ معاف کرنے کا علم نہیں عطا کریں گے تو انہیں لفظ کے معانی کی سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ انہیں آگے بڑھنے کا مقابلہ کرنے کا سبق سکھاتے ہیں تو معاف کرنے کا بھی سکھا دیں۔ یہ سکول سے ایسے ہی نکل گئے اور انہیں کسی نے معافی کا درس نہیں دیا اور اتفاق سے جا کر کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر بن گئے تو انہیں تو معافی کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہو گا، جیسے میں نے باکسنگ کا فن نہیں سیکھا۔ اگر کوئی مجھے اکھاڑے میں کھڑا کر دے تو میں تو مارا جاؤں گا۔ کہنے لگے نہیں دیکھئے اس کا کورس میں ذکر ہے اور ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ بھاگ کر وہ کتاب لائیں اور اسے اشفاق صاحب کو

دکھائیں۔

اس میں لکھا تھا کہ ایک بد بخت بڑھیا مکہ شریف میں حضور نبی اکرم پر ہر روز کوڑا پھینکا کرتی تھی اور آپ اپنی زلفیں، سر اور کپڑے جھاڑتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ یہ کہانی آپ لوگ جانتے ہیں۔ ایک دن یہ سب کچھ نہ ہوا تو آپ کو پتہ چلا کہ وہ عورت بیمار ہے، آپ عیادت کے لیے اس کے گھر گئے اور فرمایا بی بی کیا حال ہے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ پرنسپل صاحب کہنے لگے دیکھئے کتنا اچھا معاف کرنے کا سبق ہے۔ میں نے کہا جی یہ تو کہنے کی بات ہے۔ کہنے لگے نہیں ہم پڑھا دیتے ہیں۔ اگلے سبق میں پڑھئے، جب حضور نبی اکرم طائف میں تشریف لے گئے تھے، وہاں پر شریر نوجوان پیچھے پڑ گئے اور آپ کو تکالیف دیں تو نبی پاک نے دعا کی کہ "اے اللہ یہ لوگ جانتے نہیں" فرشتہ جبرائیل ان کے پاس آیا اور کہا آپ چاہیں تو ہم پہاڑوں کو ہلا دیں۔ یعنی فرشتے کو تکلیف ہوئی کہ یہ کم بخت لوگ کیا کرتے ہیں، تو آپ نے فرمایا "انہیں کچھ نہ کہنا۔ انہیں پتا نہیں ہے جب پتا چل جائے گا تو۔۔۔۔"

اچھا ہم سارے یہ بار بتا تو دیتے ہیں، لیکن ہم اس پر کسی طور عمل نہیں کرتے اس لیے بہتر یہ ہے کہ جب تک عمل نہ ہو سکے۔ بتائیں بھی نہیں۔ جب بات

کریں تو لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی ایسا ضرور آتا ہے زندگی میں جو اس کک، کک، کک سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا ضمیر جب اس کو روکتا ہے اور کہتا ہے کہ ریورس مت چل، تو وہ ریورس سے رک جاتا ہے۔ آواز سب کو آتی ہے۔ پتا سب کو چلتا ہے، لیکن وہ خوش قسمت ہوتا ہے۔

آپ کو ایک واقعہ سناؤں بریلی کے کوئی رئیس تھے۔ وہ میر ضامن کے مرید بھی تھے۔ ان سے بیعت تھے۔ ان کے ہاں ایک دفعہ چوری ہو گئی تو لوگوں کو اکٹھا کیا۔ ایک بے چارہ جولاہا وہاں موجود تھا جو بڑا ڈرپوک قسم کا کارندہ ہوتا ہے۔ اس کو بلا کر ڈرایا دھمکایا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ لوگوں نے کہا کہ جناب یہی چور ہے۔ اس کی شکل دیکھیں پیلی رنگت ہو رہی ہے۔ اس پر انہوں نے اس کو تین چار بید مارے وہ تڑپا اور چلایا۔ رئیس جب گھر آیا تو اسے خیال آیا کہ اس کے پاس کوئی ثبوت تو تھا نہیں۔ میں نے ایسے ہی اسے بید لگا دیئے۔ وہ وہاں سے نکلے اور مولوی ضامن صاحب کے پاس گئے، جو اس وقت اپنے کمرے میں تھے اور معمولات میں مصروف تھے۔ خادم نے رئیس سے کہا کہ وہ اس وقت نہیں مل سکتے۔ رئیس نے کہا کہ آپ مولوی صاحب سے کہہ دیجئے کہ یا تو وہ ملاقات کر لیں، یا پھر میں اپنا منہ کالا کروں یا جھیل میں ڈوب کر مر جاؤں، کیونکہ میں واپس گھر نہیں جاؤں گا۔ اس پر پریشان ہو کر مولوی ضامن نے انہیں اندر بلایا اور کہا

میاں کیا شور مچا رکھا ہے۔ اس نے کہا جی مجھ سے یہ کوتاہی ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا اس میں شور مچانے والی کیا بات ہے۔ اس شخص سے جا کر معافی مانگ لو۔

رئیس کہنے لگا یہ تو مشکل ہے (کیونکہ وہ بڑا آدمی تھا) مولوی ضامن نے کہا کہ بس خودکُشی کرنے، مرنے یا خود کو ایذا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی حل ہے کہ معافی مانگو۔ وہ واپس آیا۔ گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور جولاہے کو بھی بلایا۔ وہ بے چارہ پھر ڈرا کہ سردار نے پھر بلایا ہے۔ رئیس نے کہا یا تو مجھے اتنے بید مارو، نہیں تو میں تجھے اس گاؤں سے جانے نہیں دوں گا۔ تیرا تر کھان بچہ (خاندان) مار دوں گا۔ وہ کہنے لگا، خواہ مجھے آپ جان سے مار دیں، آپ رئیس ہیں اور ہمارے سردار ہیں میں آپ کو بید کیسے مار سکتا ہوں۔ رئیس نے کہا نہیں یہ تو تجھے مارنے ہی پڑیں گے۔ وہاں جھگڑا ہو گیا۔ لوگوں نے کہا حضور یہ بیچارہ غریب آدمی ہے اور آپ سے خوفزدہ ہے۔ یہ اتنا بڑا اقدم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ آپ معافی مانگ لیں، کافی ہے۔ وہ رئیس گھٹنوں کے بل جھک کر جولاہے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا کہ مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ اس پر جولاہے نے کہا جی میں نے آپ کو معاف کیا۔ جب رئیس گھر پر آئے تو پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا کہ پتا نہیں معافی ملی ہے یا نہیں۔ مجھ سے بری کوتاہی ہو گئی۔ گویا رئیس کے اندر

بلڈوزر کی ''کک، کک، کک'' چلی آرہی تھی اور وہ اس کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر رئیس نے جولاہے کو بتائے بغیر اپنے آپ کو اس کے گھر کا خادم بنالیا۔ صبح اٹھتے تو بگھی لے جاتے اور اس کے گھر والوں سے کہتے کہ بازار سے جو سودا منگوانا ہے، مجھے بتادیں۔ بیبیوں کے مزے ہو گئے۔ وہ دو سیر چینی، سیر آٹا اور مُولیاں وغیرہ سب کچھ منڈی سے خرید کر انہیں لادیتے۔ جب تک زندہ رہے وہ ایک خادم کی حیثیت سے اس گھرانے کا کام کرتے رہے۔

یہ تو خوش قسمت لوگوں کی کہانی ہے کہ انہوں نے جو کہا اس پر عمل بھی کیا، کیونکہ مجھ سے یہ ہوتا نہیں ہے اور میں کافی کوشش بھی کرتا ہوں۔ اسلام کی برتری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان بڑے لوگوں کہ مثالیں ہم دیتے ہیں کہ جن کے قریب تک پہنچنے کا ہم میں یارا نہیں ہوتا، ہمت نہیں ہوتی اور انہیں ہم کسی تقابل میں لا نہیں سکتے۔ جب اللہ یہ کہتا ہے اور وضاحت سے کہتا ہے ''تم کیوں ایسا کہتے ہو، جو کرتے نہیں ہو۔'' یہ بڑی غور طلب بات ہے۔ اس میں یقیناً تھوڑی سی بے رونقی ضرور آئے گی، لیکن جس بات کا میں نے پہلے تذکرہ کیا کہ دلوں کے اندر خوشی کا سامان ضرور مل جائے گا، جیسے رئیس کے اندر ہوا۔

میں جو سمجھ سکتا ہوں کہ ہماری معاشی کمزوری ہے کہ ہم لوگ سارے کے

سارے اعلیٰ درجے کی مثالیں دے کر اسے اپنی زندگی کے اوپر حاوی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رات کو اپنے دفتر کا حساب کر رہے تھے۔ دیا روشن تھا۔ دوست باتیں کرنے لگا، تو آپ نے پھونک مار کے دیا گل کر دیا اور کہا یہ قوم کا تیل ہے، جس سے یہ جل رہا تھا۔ ہم آپس میں ذاتی باتیں کر رہے تھے، اس لیے یہ دیا نہیں جلے گا۔ اندھیرے میں بات کرو۔ ہم جب یہ بات کہتے ہیں تو سننے والا بھی بیچارہ اور ہم خود بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید ہم بھی اسی رنگ میں ہیں، حالانکہ ہم قومی یا سرکاری سرمائے کو بلا دریغ جو استعمال کرنے میں ہرگز کوئی برائی نہیں سمجھتے۔ اس دن کی ریورس کی کک کک کک میرے اندر بڑی شدت سے چل رہی ہے۔ گو میں ابھی اس کک کک پر ویسے قابو نہیں پا سکا، جیسے میر ضامن علی صاحب کے مرید رئیس نے پایا تھا۔

میں آپ کو دعا دیتا ہوں کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

دوستی اور تاش گیم

میں اس سے پہلے بھی گفتگو کے اسی سلسلے میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر کہوں گا کہ میں میری بیگم بانو قدسیہ درمیانے درجے کے اچھے لوگ ہیں۔ بہت اچھے تو نہیں، لیکن ایک خرابی ایسی ہے جو ہمارے درمیان چلی آرہی ہے اور اس کا کوئی سدباب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تاش کھیلنے کی عادت ہے۔ مجھ میں تو نہیں تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ تاش کیسے کھیلی جاتی ہے، لیکن میرے سسرال والے اس کھیل میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ میری ساس جو تھیں اگر کوئی ساتھی نہ بھی ہوتا تو وہ اکیلے ہی تاش کھیلتی رہتیں۔ میری بیوی نے بھی سیکھی، لیکن اس کے بعد تاش ہمارے گھرانے میں آگئی۔ ہم دونوں صبح سویرے بیڈ ٹی لیتے ہیں اور ہماری بیڈ ٹی یہ ہے کہ ہم خود ہی چائے بناتے ہیں۔

صبح بچے سوئے ہوتے ہیں۔ ہر طرف ہو کا عالم ہوتا ہے۔ ہم دونوں اس وقت باورچی خانے میں اکیلے ہوتے ہیں۔ چائے کی ایک ایک پیالی پی کر ہمیں جو وقت ملتا ہے، اس میں ہم تاش کھیلتے ہیں اور بچوں کے جاگنے سے پہلے تاش کھیل کر سمیٹ لیتے ہیں، تاکہ انہیں پتا نہ چلے۔ جب ملازم آتے ہیں تو ان کے آنے سے

بھی قبل ہم تاش سمیٹ لیتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک خوب صورت ڈبہ ہے جس کے چاروں طرف بہت خوب صورت جنگلی پھول بنے ہوئے ہیں۔ اس ڈبے کے ڈھکنے پر نہایت خوب صورت ایک ہرنی ہے، جو چراگاہ میں چر رہی ہے اور اس ہرنی کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے، جو ابھی دودھ پیتا ہے اور گھاس کھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بہت پیاری تصویر ہے۔ اس کے اندر ہم نے اپنے پتے رکھے ہوئے ہیں۔ میں تو ان پتوں کو پھینٹ نہیں کر سکتا، کیونکہ میری پریکٹس نہیں ہے۔ میری بیوی ہی انہیں پھینٹتی ہے اور وہ پتے چونکہ مختلف قسم کے ہیں اور ان کا سائز ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے کے ساتھ ملتا نہیں ہے، اس لیے اس بات کی مشق میری بیوی ہی کو ہے۔ پھر تاش بانٹی جاتی ہے۔ جس کے پاس آخری پتا آتا ہے اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس پتے کو دیکھ کر بتائے۔

اس تاش کا میں کچھ حصہ لے آیا ہوں جس کا سائز کچھ اونچا کچھ نیچا ہے۔ یہ جو پتے ہیں میں آپ کے سامنے رکھوں گا اور شاید آپ کو نظر بھی آئیں۔ یہ ہماری تاش ہے جو ہم اپنے پاس رکھ کر ہر روز صبح کھیلتے ہیں۔ یہ عید کارڈ ہیں جو پچھلے سال ہمیں موصول ہوئے تھے اور جن کی تعداد تقریباً تین یا ساڑھے تین سو ہے۔ ہر روز ان پتوں کو نکالنا اور چھانٹنا اور پھر اس گیم کو شروع کرنا کافی مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ جب آپ شروع کریں گے تو آپ کو بھی خاصی دقت کا سامنا پڑے گا۔

پھر ایک پتا، جو میری بیوی اٹھاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ عید کارڈ پچھلے سال یوسفی صاحب نے بھیجا تھا۔ مشتاق یوسفی ہمارے دوست ہیں۔ ہم دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔ کہ یا اللہ! یوسفی صاحب جہاں بھی ہوں اور جس مقام پر بھی ہوں اور جیسے کیسے بھی ہوں، ان پر، ان کے گھر والوں پر، ان کی بیگم پر، ان کے بچوں اور پوتوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما اور پھر اس کے بعد جو ان کی ذات سے وابستہ کچھ باتیں یاد آتی ہیں، ان کو بھی ہم دہراتے ہیں تاکہ یہ سلسلہ نہ ٹوٹے اور سال بھر کا کم از کم جو رشتہ ہے، وہ اسی طرح سے قائم رہے۔ پھر میری بیوی مجھے بتاتی ہے کہ جب وہ کسی بڑی تقریب پر قطر گئے تو مشتاق یوسفی نے ان سے بانو قدسیہ سے کہا تھا کہ آپ بڑی رائٹر ہیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھئے کہ زوال نعمت سے پہلے ریٹائرڈ ہو جانا ضروری ہے۔ آپ بہت عروج پر پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ میں اس مقام پر پہنچا تو سمجھدار آدمیوں کا یہ تقاضا ہے کہ اس نعمت کو آخر زوال تو آنا ہی ہے اس سے پہلے ہی یہ فیلڈ چھوڑ دینا چاہیے۔ اور پویلین میں واپس جا کر بلا رکھ دینا چاہیے کہ اللہ تیری مہربانی۔

یونس جاوید نے ہمیں ایک کارڈ بھیجا تھا۔ وہ میں اٹھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ بہت اچھا نوجوان ہے اور اس نے ہم کو یاد رکھا اور اس کے اپنے گھر والوں پر بہت احسان ہیں۔ اور اس نے میٹرک سے عملی زندگی شروع کی اور ایم اے تک

پہنچا۔ یہ ہمارا ادیب ہے۔ اے اللہ اس کو اس کے دنیاوی مقام پر بھی پہنچا اور دینی مدارج بھی طے کرو اور اس کو دین اور دنیا میں سرخرو کر۔ جتنے بھی ہمیں الفاظ اس وقت یاد آتے ہیں اس تاش کے کھیل میں ہم کھیلتے ہیں اور بڑے شوق اور محبت اور جذبے کے ساتھ، کیونکہ اس وقت کوئی ڈسٹرب کرنے والا، خلل ڈالنے والا نہیں ہوتا۔

پھر بیچ میں سے ایک کارڈ نکل آتا ہے۔ ظہیر کا مہراب پور سندھ ہے۔ یہ کون آدمی ہے؟ ہم نہیں جانتے ظہیر کچھ ایسی محبت والا آدمی ہے۔ عجیب وغریب کہ کبھی کبھی اس کی طرف سے ایک پیکٹ بھی موصول ہوتا ہے کہ جو کوریئر کے ذریعے آتا ہے۔ ہم اسے کھولتے ہیں تو سلور کے ایک خوب صورت ڈبے میں گاجر کا حلوہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے آپا جی! یہ گاجر کا حلوہ میں نے خود پکایا ہے اور میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ آپ چونکہ شوگر کی مریضہ ہیں تو اس میں چینی زیادہ نہ ہو تو آپ تجربہ کر کے مجھے بتائیں کہ مجھے گاجر کا حلوہ بنانا آتا ہے کہ نہیں۔ ہم اس سے ملے تو نہیں، لیکن خط و کتابت یا ٹیلیفون کے ذریعے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ حلوہ بہت اچھا تھا۔

اب ایک رضوانہ ہیں، جس نے لاڑکانہ سے ایک عید کارڈ بھیجا ہے۔ اب رضوانہ

کون ہے؟ کہاں ہے؟ پتا نہیں، مگر ظاہر ہے کہ ہماری دعائیں اس کے لیے ہیں۔ وہ کتنی بڑی ہے، کتنی چھوٹی ہے، اس کی شکل صورت کیسی ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس نے اپنا پتا بھی نہیں لکھا، جیسے عیسیٰ خان نے ہائی کوہاٹ سے خط لکھا اور وہ تین چار روز پہلے ڈبے سے نکلا تو میری بیوی، چونکہ سر تاش کی باری اسی کی بنتی تھی تو اس نے کہا کہ یا اللہ! عیسیٰ خان جہاں بھی ہو اگر شادی شاہ ہے تو اس کے بیوی بچوں پر تیری رحمتوں کی بارش ہو، اگر ابھی تک کنوارا ہے، دکاندار ہے، پڑھ رہا ہے تو اس اکیلے پر، اس کے ماں باپ پر اپنی رحمت فرما۔

اس قسم کی کہانیاں چھوٹے چھوٹے افسانے بنتے رہتے ہیں اور تاش کی یہ گیم چلتی ہے۔ اب یہ کہ کچھ مانوس لوگ ہوتے ہیں، کچھ نامانوس، کچھ ہمارے دوست ہیں، جن کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کچھ دوست نہیں ہیں۔ ان کارڈز کی وجہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوست کون ہوتا ہے، ملاقاتی کون ہوتا ہے، نامانوس ملاقاتی کون ہوتا ہے؟ لیکن اس کا تعلق اور اس کا رشتہ ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا دوست کا !!

پچھلے دنوں ممتاز مفتی صاحب کا ایک کارڈ نکل آیا، پرانا کارڈ آکر شامل ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ وہ تو اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جب

بھی مجھے یاد کرو تو الحمد شریف اور تین مرتبہ قل شریف پڑھ کر مجھے بخشا کرنا۔ تو ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ خواہش تو بہت آسان ہے۔ ہم پوری کر دیتے ہیں تو کر دی۔ پھر میں نے کہا کہ مفتی صاحب مزاج کے بہت سخت تھے۔ جلدی غصے میں آجاتے تھے۔ ہم اکٹھے کام کرتے تھے۔

خواتین و حضرات میں آزاد کشمیر ریڈیو سے منسلک تھا۔ مری سے ہمیں آرڈر ہو گیا ۱۹۵۲ء میں کہ یہ اسٹیشن بند ہوتا ہے، شام کی ٹرانسمیشن ہے وہ پنڈی سے چلے گی۔ ہم لوگ بڑے مزے سے وہاں رہتے تھے، ہمارا خیال بھی نہیں تھا کہ اسٹیشن میں اتنی جلدی تبدیلی ہو جائے گی۔ بہرحال قرض پر زندگی چل رہی تھی۔ جو لوگ نوکری پیشہ ہوتے ہیں اور ان کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے، وہ دودھ والے کے مقروض ہوتے ہیں، وہ ہوٹل والے کے بھی مقروض ہوتے ہیں، جہاں سے نان آتے ہیں۔ ہم سارے کے سارے کسی نہ کسی انداز میں قرضے کے بوجھ تلے تھے، تو میں نے ممتاز مفتی سے کہا، کیونکہ وہ احتیاط سے چلتے تھے، ان کو کمرہ بھی الاٹ ہوا تھا، جبکہ ہم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ میں تو گزر نہیں سکوں گا، کیونکہ ہوٹل والے نے کہا تھا کہ ریڈیو کے بندے جا رہے ہیں، اور جہاں سے لاری پر بیٹھتے ہیں، وہاں وہ اپنا بندہ بٹھا دے گا، جو لاٹھی بردار ہو گا۔ لہٰذا سو روپے لیے اور گوالے کا بل ۸۰ یا ۹۰ روپے کا ادا کیا،

پھر ہوٹل والے کے ۲۳۱ روپے تھے، وہ بھی ادا کر دیئے اور کچھ قرضے دینے تھے، وہ بھی دیئے۔ میرے پاس چالیس روپے بچ گئے، تو خوشی سے مزے سے سیٹی بجاتے راولپنڈی پہنچ گیا اور وہاں رہنے لگا۔ اب جب میں نے چونکہ ان سے قرض لیا تھا۔ لہٰذا ان سے دب کے رہتا تھا۔ وہ میرے بڑے عزیز دوست تھے اور ہماری آپس میں توں تڑاک قسم کی بے تکلفی تھی۔ پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ جب وہ کوئی بات کرتے ٹھیک ہوتی یا ٹھیک نہ ہوتی، میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ اب جناب بات یہ ہے کہ ہم ورلڈ بینک سے قرضہ لیا ہے جو آئی ایم ایف کہہ دے کہ جناب بجلی کا بل ۲ روپے ۳۵ پیسے کے بجائے سات روپے لینا ہے، تو ہم کہتے ہیں جی حضور! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جس نے بھی خدا نخواستہ قرضہ لیا ہو یہی تکلیف رہتی ہے کہ ہمیشہ اس کے سامنے دم ہلانا پڑتی ہے۔

میں، جب بھی مفتی صاحب کوئی بات کرتے، کہتا سبحان اللہ آپ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی تھے۔ ایک دن چڑ گئے۔ کہنے لگے، دیکھو تم میری ہر بات کے ساتھ Agree کرتے ہو، ہر بات کو Yes کہتے ہو، تم کبھی میری بات سے نااتفاقی کا اظہار نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں، تو آئندہ سے اس بات کا خیال رکھو جیسے میرے ساتھ پہلے بولا کرتے تھے جیسے میری سٹیٹ منٹ پر پہلے تنقید کیا کرتے تھے،

ویسے ہی کرو ورنہ میری پانچ سو روپے واپس کر دو۔ میں نے کہا کہ میں وہ بھی انشاءاللہ واپس کر دوں گا۔ انہوں نے ایسی دھمکی دی تھی مجھے حوصلہ نہیں ہوا۔ تو ایسے پیارے پیارے پتے ہم کو ایک نئ گیم کھیلنے کے لیے دے جاتے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی یاد بھی جڑی رہتی ہے۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ دوست ملاقاتی اور ساتھی کا جو ایک فرق ہے، وہ سمجھ میں آنے لگا ہے۔ ان عید کارڈوں کی آمد سے کچھ ہمارے صبح سویرے متوجہ ہو کر بیٹھنے سے، کچھ ان لوگوں کے ساتھ ایک رابطہ قائم کرنے سے جسے کمیونیکیشن کہتے ہیں۔ آپ کسی کے لیے بھلائی کا کام کریں۔ کسی کے خلاف آپ کا غصہ ہو جیسے میں اپنی بچیوں سے کہتا ہوں جو اب بہوئیں بنی ہیں کہ اگر ساس کو تم نے سزا دینی ہے۔ اور اس کا بہت بری طرح "مکو ٹھپنا" ہے تو اس کے حق میں دعا کیا کرو، دیکھو وہ کتنی بے چین ہو گی، بجائے اس کے کہ اس سے جھگڑ کر کے اپنی ماں کے پاس دوڑتی ہوئی جاؤ کہ اماں اس نے مجھے یہ کہا ہے، تو تم تجربہ کر کے دیکھ لو، اس میں کیا حرج ہے، چالیس دن کہو کہ اللہ تعالیٰ میری ساس کو سلامت رکھ، حالانکہ ساس بڑی بلا ہوتی ہے اور نند بھی، کیونکہ میں نے تو یہی سنا ہے۔ میری ایک بھانجی کی بیٹی کا بر دکھاوا تھا۔ ہم دیکھنے گئے تو اس نے کہا نانا ضرور جائیں۔ میں نے کہا میں تو تجربہ نہیں رکھتا، میں کیا کروں گا؟ تو اس نے کہا، نہیں نانا آپ کو ضرور

جانا ہو گا۔ آپ نے جا کر یہ دیکھنا ہے اور خبر لے کر آنی ہے کہ میری نندیں کتنی ہیں۔ میرے لیے بڑا مشکل ہو گیا کہ کیسے پوچھیں کہ بھئی تیری بہنیں کتنی ہیں؟ یہ تو پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں، کہاں ہوتے ہیں؟ پھر میں نے طریقے طریقے سے معلوم کر لیا۔

میں نے واپس آ کر شازیہ کو بتایا کہ بھئی پانچ ہیں۔ وہ کہنے لگی اوہو!! در لعنت میں تو کبھی وہاں شادی نہیں کروں گی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ نند واقعی خوفناک چیز ہوتی ہے۔ ہم مردوں کو تو اس سے واسطہ نہیں پڑتا اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر دعا کریں تو دل چاہے کتنا ہی جلا ہوا کیوں نہ ہو، پھر بھی آپ کو فائدہ پہنچ جائے گا، بلکہ زیادہ پہنچے گا، چاہے تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ بجائے غصہ یا نفرت کے اظہار کے اور یہ جو ہم کلاشنکوفوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں، خواہ کتنی ہی کرتے چلے جائیں، یہ کام ختم نہیں ہو گا۔

ایک دن دعا کے لیے بیٹھ جائیں، بڑا سکون آ جائے گا اور رحمتوں کا نزول ہونا شروع ہو جائے گا۔ اب ان پر رحمتیں رکی ہوتی ہیں۔ جس دن آپ ہاتھ سے کلاشنکوف چھوڑ دیں گے اور دعا شروع کر دیں گے، رحمتوں کا نزول شروع ہو جائے گا۔

ابھی بات ہو رہی تھی کہ دوست کون ہوتا ہے؟ اور ملاقاتی کون ہوتا ہے؟ میں نویں دسویں جماعت میں سکول میں پڑھتا تھا، ہمارے دو ٹیچرز ماسٹر حشمت علی اور ماسٹر قطب الدّین ہوا کرتے تھے۔ دونوں ریاضی کے بہت ماہر تھے۔ انہیں خدا نے اس بارے میں بڑی صلاحیت دی تھی۔ ہمارے ضلع سے باہر اور دور دور کے مقامات سے ہندو، سکھ استاد ان سے الجبرا اور چونکہ یہ ہے ہی مسلمانوں کا علم کے مشکل مسائل پوچھنے آتے تھے۔ اور وہ دونوں استاد سکول ٹائم کے بعد لان میں بیٹھ کر ریاضی کے مسائل حل کیا کرتے تھے جو ہماری سمجھ سے باہر ہوتے تھے۔ ساتھ رہنا، اکٹھے کھانا، ایک دوسرے کے گھر کے ساتھ گھر، سیر کو اکٹھے جانا، اکٹھے سکول آنا۔ کبھی ہم نے انہیں الگ الگ نہیں دیکھا تھا۔ ان کے درمیان اتنی گہری دوستی تھی کہ آپ جتنا بھی ذہن میں اس کا تصور کریں۔ وہ کم ہے۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے ماسٹر حشمت علی کی تبدیلی کر دی اور وہ ہمارے ضلع کی کسی اور تحصیل میں چلے گئے۔ دونوں دوستوں کے درمیان اس تبدیلی سے جو خلیج پیدا ہوئی، وہ تو ہوئی، ہم جو طالب علم تھے یا جو دوسرا اسٹاف تھا، ان کے لیے بھی بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ ہم سب نے وہ تکلیف وہ لمحات محسوس کیے۔ میں نے ماسٹر قطب الدّین سے کہا، کیونکہ میں

ذرا سمجھدار بچہ تھا، آپ کی حشمت علی صاحب سے بڑی دوستی تھی؟ کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے کہا ان کے جانے سے آپ کی طبیعت پر بوجھ پڑا؟ کہنے لگے، ہاں پڑا ہے، لیکن زیادہ نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ حیران کن بات کرتے ہیں۔ وہ تو آپ کے بہت عزیز دوست تھے، قریب ترین تھے۔ کہنے لگے اشفاق میاں بہت عزیز تھے، بہت قریب ترین تھے۔ لیکن آپ اس کو اعلیٰ درجے کی معیاری دوستی قرار نہیں دے سکتے۔ بے شک ہمارے معمولات اکٹھے تھے، اکٹھے کھاتے پیتے تھے اور کوئی لمحہ بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزارا لیکن یہ دوستی کی نشانی نہیں ہے۔ دوستی کی نشانی یہ ہے کہ جب تک آدمی اکٹھے بیٹھ کر روئے نہ، اس وقت تک دوستی نہیں ہوتی اور ہم کبھی اکٹھے بیٹھ کر روئے نہیں تھے، اس لیے آپ نہیں کہہ سکتے کہ ہم دوست تھے۔

ہمارے پاس جو کارڈز آتے ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جن کے ساتھ ہم اتنے قریب تو نہیں ہوئے جتنے ماسٹر قطب الدّین صاحب نے کہا تھا، لیکن ہم ایک اور رشتے سے ایک اور ناتے سے ان کے ساتھ ہیں۔ عید آتی ہے تو ہمارے لیے یہ بڑی خوشیاں بھی لے کر آتی ہے اور ایک طرح کا بوجھ بھی کہ اب نئی تاش نئے ڈبے میں بند ہو گی اور پھر ہم کو یہ گیم کھیلنا پڑے گی، جس کی خوشی بھی ہے، جس کی ذمہ داری بھی ہے اور جس کا بوجھ بھی ہے۔

اب یہ بات میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ہم کو یہ گیم جاری رکھنی چاہیے یا اسے بند کر دینا چاہیے؟ آپ بھی حیران ہوتے ہوں گے کہ یہ عجیب سا گھرانہ ہے اور عجیب سا جوڑ ہے۔ یہ کیسی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ہم دونوں کافی حد تک خود غرض لوگ ہیں اور ہم نے یہ دیکھا ہے کہ اصلاح کی بات کرنے میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سائے میں رہنے سے ہم بڑی مرادیں پا سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو رحمت للعالمین کا خطاب دنیا والوں نے نہیں دیا، آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو "کل عالموں کے لیے رحمت" کا خطاب اوپر سے ملا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تو ان صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نقش پا کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر اتنی سی بات کو ہی پکڑ لیا جائے کہ رحمت، شفقت، محبت اور عطا سے میری ذات کو فائدہ ہو گا تو ہم تو خود غرض لوگ ہیں۔ لہٰذا اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہم نے یہ طریقے اختیار کر رکھے ہیں اور اس سے ہمیں واقعی فائدہ ہوا ہے، ہو رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہوتا رہے گا۔

میں دنیاوی فائدے کی بات کر رہا ہوں، آگے بھی شاید ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، لیکن آگے فائدہ ضرور ہو گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسانی عقل اور رضائے الٰہی

بعض اوقات زندگی میں کچھ ایسے مراحل آتے ہیں، جن کے لیے انسان تیار نہیں ہوتا۔ ایک مشکل مرحلہ میرے سامنے تھا۔ پچھلے آٹھ دس روز سے مشکل میں اضافہ ہو گیا، کیونکہ وہ بوجھ تو پہلے ہی موجود تھا، لیکن سوال کرنے والے چند نوجوانوں نے اس میں اضافہ کر دیا۔ پوچھا گیا کہ ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں، کیا قوم کا تصور محض افراد کے سانس لینے کا نام ہے؟ میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ ہاں، یہ افراد کے سانس لینے کا نام ہے اور جن افراد کے سانسوں کے اوپر پہرے ہیں اور جن کے سانس گھونٹ دیئے گئے ہیں، وہ زندہ قوم نہیں۔ جتنی زندہ قومیں آپ کو اپنے گرد نظر آئیں گی، ان کی خوبیاں تو بعد میں دیکھیں گے، پہلے اس بات کی آپ کو تسلی کرنا ہو گی کہ کیا وہ سانس لے رہی ہیں، پورا سانس اندر لے جاتی ہیں اور پورا باہر چھوڑتی ہیں؟

میرے ملک میں ایک گروہ انسانی جس میں، میں بھی شامل ہوں، بڑی آسانی کے ساتھ بہت اچھی سانس لیتا ہے اور بڑی آرام دہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں، خوشحال ہیں، لیکن باقی 14 کروڑ جو

ہیں، ان کی اکثریت سانس لینے کی بات تو بعد میں ہے، ان کو ان کی عزت نفس بھی نہیں لوٹائی گئی۔ بحیثیت انسان کے اور اللہ کی مخلوق کے، وہ ایک عزت لے کر آتے ہیں، پیسہ نہ دیں، ان کو روٹی نہ دیں، کپڑا نہ دیں، مکان نہ دیں، لیکن ان کی عزت تو ان کا حق ہے۔ میں اپنی نواسی سے کہتا ہوں کہ یہ جو آپ کا ڈرائیور ہے، آپ اس کو رمضان صاحب کہہ سکتی ہیں۔ "نہیں نانا میں نہیں کہوں گی، یہ تو رمضان ہے ہمارا ملازم" وہ کہتی ہے۔ گویا یہاں آ کر کام رُک گیا ہے۔ اسی طرح آپ عام زندگی میں دیکھ لیں، دفتروں میں، گھروں پر اگر وہ سانس ہی ٹھیک طور پر نہیں لے رہے تو پھر زندہ قوم کیسے ہو گئی؟ کسی نے پوچھا کہ بابا یہ بتاؤ کہ کچھ لوگ بڑے امیر ہوتے ہیں اور کچھ بڑے غریب ہوتے ہیں۔ جو غریب ہوتے ہیں وہ شکل و صورت سے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ دانش کے اعتبار سے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ پڑھائی اور خاندانی اعتبار سے بھی اچھے ہوتے ہیں اور جو لوگ امیر ہو جاتے ہیں، بعض اوقات وہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ ان میں نہ عقل نہ دانش نہ شکل نہ صورت، لیکن دیکھیں پھر بھی وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے کہا یہ تخصیص اور تقسیم جو آپ نے متعین کی ہے یہ محض آپ کو بے چین رکھنے کے لیے ہے۔ ہم سب کے دل میں یہ مشکل اور مصیبت قائم ہے۔ میرا پوتا کہہ رہا تھا کہ میرے ابو کہتے ہیں کہ یہ شخص سول لائن ایریا میں

جہاں افسر لوگ رہتے ہیں وہاں بڑ کے ایک درخت میں کیل ٹھونک کر، شیشہ لٹکا کر وہاں دو چار آنے میں حجامت بناتا تھا۔ اب اس کے تین پلازے اسلام آباد میں ہیں، وہ یہاں ہیں، پانچ گاڑیاں ہیں اور سونے چاندی کے زیورات سے اس کی بہوئیں، بیٹیاں لدی ہوئی ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہاں پر آکر اس کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ڈیپریشن کی جتنی بھی بیماری چل رہی ہے، وہ محض اسی وجہ سے چل رہی ہے۔ اگر آدمی اللہ کو مان لے، شرک کے بارے میں کہتے ہیں کہ جی قبروں پر سر جھکانا اور تعویذ گنڈا کرانا یہ شرک ہے۔ یہ شرک اگر ہے تو بہت معمولی درجے کا ہے۔ اصل شرک وہ ہے جب اللہ کے کیے ہوئے کام کے اندر بندہ بیٹھ کر نقص نکالے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ یہ ٹھیک نہیں ہے، فلاں کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔ اب ان بچوں کو کوئی کیسے بتائے کہ ایک تمہاری دانش ہے، ایک تمہاری عقل ہے، ایک تمہارے انصاف کے تقاضے ہیں، ایک اللہ کی دانش ہے، اس کے لیے دانش سے بھی بڑا لفظ چاہیے۔ وہ علیم مطلق ہے۔ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کیا کرنا ہے؟ میں یہ نہیں جانتا۔

میں چونکہ ان کی آسانی کے لیے یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اللہ کے بالکل واضح الفاظ ہیں اور وہ بیشمار مرتبہ فرماتا ہے اور جگہ جگہ فرماتا ہے کہ بیشک اللہ ہی روزی دینے والا ہے اور وہی بڑی مضبوط قوت والا ہے اور اللہ جس کی چاہتا ہے روزی

فراخ کرتا ہے اور جس کے چاہتا ہے روزی تنگ کرتا ہے۔ اب اس میں ہم کیا ہیں؟ وہ شخص بڑا ہی خوش نصیب ہے، جو مُسکرا کے پہلے "سبحان اللہ و بحمدہ تبارک الذی کمالہ" پھر وہ لُوٹ کر لے گیا گڈی اور پر سکون ہو گیا اور اللہ کے بندوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ اگر اس نے بیٹھ کر یہ کہا کہ " اللہ میاں (نعوذ باللہ) ادھر بیٹھو سامنے میں آپ سے دو دو ہاتھ کر لوں کہ تو نے یہ کیا انصاف کیا۔" پھر وہ مارا گیا یعنی وہ اپنی ذات کے لیے مارا گیا، اپنے سکون کے لیے مارا گیا۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے۔ دیکھیئے اس آیت میں کہ "جو لوگ ایمان لائے سچ مچ اور مومن ہو گئے، وہ ایسی بات نہیں کرتے، ان کے لیے ایک نشانی ہے۔"

میرے جیسے لوگ جو سطحی علم رکھتے ہیں، وہ ضرور اعتراض کرتے ہیں۔ ایسی بات خداوند فرماتا ہے "اے حضور نبی اکرم صلی اللہ و سلم فرما دیجئے کہ میرا پروردگار اپنے بندوں کے لیے جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو، اس کا عوض ضرور دیتا ہے" اور عموماً "خرچ کرتے ہو" کے ساتھ جو ترجمے ہوتے ہیں، ان میں بریکٹوں میں یہ لکھا ہوتا ہے "اور جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، اس کا عوض دیتا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ خرچ کرو، روپیہ ایک جگہ پڑا نہ رہے، کیونکہ یہ کھاد کا جوڈھیر ہوتا ہے "روڑی" جسے کہتے ہیں، اگر اسے کھیتوں میں پھیلا دیا جائے تو یہ سونا ہے اور اگر اسے ایک جگہ پر جمع رکھا جائے تو یہ بدبُو کا گھر ہے، کوئی گاؤں اس کے قریب بس نہیں سکتا۔ یہی دولت کا حال ہے کہ جب اس کو پکڑ کر رکھ لیا، میرے جیسے لوگوں نے اکاؤنٹ بھی کھول لیا، نمبر بھی مجھے 41-22007 یاد ہے اپنا، تو پھر جب دولت گھومتی نہیں ہے لوگوں کے ہاتھوں میں، تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اللہ کہتا ہے خرچ کر دو، کسی جگہ بھی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میری سوچ ہے کہ بس اس کو خرچ کر دو، لگادو اور خود اس سطح پر آجاؤ جس سطح پر اور لوگ موجود ہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے، میری ہی عمر کے، اللہ بخشے وہ فوت ہو گئے۔ شروع سے ہی اللہ نے اس کی ایسی طبیعت بنائی تھی۔ کراچی کا بات ہے وہاں الفنسٹن سٹریٹ میں شام کو دفتر سے فارغ ہو کر ایک ریستوران میں بیٹھ جاتے چائے کی پیالی پینے کے لیے۔ ان کاروں کو دیکھ کر وہ بڑے خوش ہوتے کہ بھئی یہ بڑی خوبصورت ہیں۔ کئی کاروں پر جا کر ہاتھ پھیرتے اور کہتے یار آج میں نے کمال کی ایک کار دیکھی۔ میں نے کہا بدبخت تیرے دل میں نہیں آتا کہ تیرے پاس بھی ایسی کار ہو، تو کہتا، نہیں یہ کار کراچی ہی میں ہے، جب چاہیں گے دوبارہ دیکھ لیں

گے۔ وہ تو بہت اچھی ہے۔ وہ میری عمر کا ہو کر فوت ہوا۔ بڑا خوش و خرم بہت آسان زندگی میں رہنے والا بندہ تھا۔ اب اللہ کی مرضی کے سامنے "اڑ" کے بیٹھ جانا درست نہیں۔ میں یہ مشکل آپ سے بیان کر رہا تھا کہ ایک چیز پھنسی ہوئی تھی، سورہ رحمٰن میں جسے آپ بڑی محبت اور شوق سے سنتے ہیں اور قاری باسط کی تو ماشاءاللہ قرات بھی اچھی ہے، اس میں ایک آیت آتی ہے کہ اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔ اس پر میں ہمیشہ رکتا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ "اللہ کو ہر دن ایک انوکھا دھندہ ہے۔" وہ پرانے زمانے کا ترجمہ کرتے تھے بہت پیارا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کہتے ہیں اپنے ترجمے میں "اور اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔" فتح محمد جالندھری نے لکھا ہے کہ "اور اللہ کو ہر روز ایک کام ہے۔" تو میں اپنے طور پر بہت حیران ہوتا تھا اور ہوتا رہا ہوں کی اللہ کو ہر روز کیا کام ہو سکتا ہے۔ بڑی پریشانی ہوتی، کئی تفاسیر دیکھیں، سمجھ میں بات نہ آئی۔ الحمد للہ جب یہ بچے مجھ سے ملے تو ایک ایسی کتاب جس کی جلد پھٹی ہوئی تھی اور پتہ نہیں تھا کہ کس کی ہے؟ کیسی ہے، اس کو میں ایسے ہی دیکھ رہا تھا تو اس میں ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے سوال کیا کہ اللہ نے یہ جو کہا ہے کہ مجھے ہر روز ایک نیا کام ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو وزیر بیچارے کا یہ سن کر رنگ فق ہو گیا۔ بادشاہ نے

وزیر سے کہا کہ ایک ہفتے کے اندر جواب دو، ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ وزیر روتا ہوا گھر آ گیا۔ بڑا رنجور اور پریشان اور درد مند۔ اس کو سوال کے معنی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

ایک روز وہ بازار میں گیا۔ اس جگہ ایک عمارت بن رہی تھی۔ ایک سیاہ فام مزدور، اس زمانے میں وہ عرب افریقہ کا ہو گا، چنائی کے لیے گارا تیار کر رہا تھا۔ اس نے وزیر کو دیکھا اور پوچھا وزیر سلامت آپ کیسے پریشان بیٹھے ہیں، کیا بات ہے؟ وزیر نے کہا کہ بادشاہ نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہے اور اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مزدور نے کہا اس کا مطلب میں بتا دیتا ہوں۔ وہ سیاہ فام جو کچھ بھی پڑھا لکھا نہیں تھا، اس نے کہا لیکن تمہیں نہیں بتاؤں گا، یہ تو بادشاہ سلامت کو ہی بتاؤں گا ان کے سامنے۔ وزیر اسے بادشاہ کے دربار میں لے گیا اور جا کر کہا کہ حضور یہ ایک بندہ ہے، یہ مطلب بتائے گا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا، کیونکہ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں خستہ حالت میں تھا۔ مزدور نے کہا، حضور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر روز ایک نئے کام میں داخل ہوتا ہے۔ صحتمند آدمی کو بیمار کر دیتا ہے، بیمار کو صحتمند کر دیتا ہے، غنی کو محتاج کر دیتا ہے اور محتاج کو غنی کر دیتا ہے، پتہ نہیں کل ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیتا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے

کرتا ہے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اپنا لباس اتار کر اسے پہنا دو۔ آج سے یہ وزیر ہوگا، تم نالائق ہو۔ مزدور نے کہا کہ دیکھا آپ کو آج کیا ہو گیا۔ میں آپ کے حکم کے مطابق ایک بار لباس پہن لیتا ہوں، لیکن اسے اتار کر پھر وزیر کو دے دوں گا، کیونکہ یہ تو اللہ کے کام ہیں۔

آپ کو زندگی میں عجیب و غریب واقعات پیش آئیں گے۔ میں جلدی سے آپ کو آپ کے دور کی ماڈرن کہانی سناتا ہوں، کیونکہ اس کی آپ کو زیادہ سمجھ آئے گی۔ ایک لڑکا تھا پیٹر بین کوک، وہ گاؤں میں غربت سے دھکے کھا رہا تھا۔ ماں باپ اس کے تھے نہیں، وہ شکاگو میں آ گیا۔ وہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس زمانے میں بگھیاں چلتی تھیں، موٹریں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ گھوڑے سڑکوں پر لمبا سفر کرتے تو بھاگتے ہوئے اکثر مر جاتے تھے۔ کارپوریشن اس وقت انہیں اٹھانے کا ذمہ نہیں لیتی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر میں مرے ہوئے گھوڑے اٹھا لیا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو اس کے لیے آپ کے بڑے شکر گزار ہوں گے۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ گاڑی بنا لی اور دن بھر گھومتا۔ جہاں اسے مردہ گھوڑا نظر آتا تھا، وہ اس کو ہاتھ گاڑی میں ڈال لیتا اور سریش فیکٹری، جہاں گھوڑوں کے غدود اور ہڈیوں سے گودا نکال کر سریش بناتے ہیں، میں جا کر اسے مہنگے بھاؤ بیچ دیتا۔ اس کا خرچ کچھ ہوتا نہیں تھا۔

چلتے چلتے ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اتنا امیر ہو گیا کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ اس دولت کا کیا کرے۔ جب اس کے پاس کچھ بلین ڈالر جمع ہو گئے تو اس نے کہا میں یہ کام چھوڑتا ہوں، لیکن مجھے جیسا کہ گھوڑوں سے ایک طرح کی محبت ہے، اس نے ایک اعلیٰ درجے کا گھوڑوں کا فارم بنایا۔ اس میں بڑی نسل کے وشیرے اور وشیریاں منگوائے اور ریس کے میدان میں داخل ہو گیا۔ گویا وہ ریس کھیلنے لگا اور اس کا سارے امریکا میں شہرہ ہو گیا کہ ریس کا جو ٹریک اس بندے نے بنایا ہے اور جو اصطبل اس کا ہے، اور جو 180 گھوڑے اس نے رکھے ہیں، ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ریس کھیلتا رہا۔ جتنی زندگی اس نے ریس کھیلی اور جتنے اعلیٰ درجے کے گھوڑے اس نے بھگائے، ان میں ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ گو کہ گھوڑے اعلیٰ نسل کے تھے، لیکن وہ ہر دوڑ میں ہار جاتا تھا اور ہارتا چلا جاتا تھا۔ پھر اس نے بنک سے قرضہ لیا اور اس نے گھاٹے پورے کیے، لیکن اس کا برا حال ہو گیا۔ وہ پھر انہی سڑکوں پر گھومنے لگا، جہاں سے اس نے اپنا آغاز کیا تھا۔ وہ مرے ہوئے گھوڑوں سے ارب پتی ہو گیا اور زندہ گھوڑوں سے پھر فقیر ہو گیا۔ تو اللہ جو چاہتا ہے، جو ٹھیک سمجھتا ہے کرتا ہے، یا جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہی کرتا ہے اور ہمارا سرِ تسلیم اس کے آگے خم ہے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ پیٹر ہین کوک اسی سڑک پر کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہے، جہاں

سے وہ مردہ گھوڑے اٹھایا کرتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اسے اٹھایا اور ویسی ہی ہتھ ریڑھی میں اس کو ڈال کر لے گئے۔

اب اس پر آپ اپنا کیا فیصلہ دیں گے، اسے کیا کہیں گے؟ میں یہ ساری کہانی اس لیے عرض کر رہا تھا کہ آپ کو آسودگی کے ساتھ رہنا ہے، خوشی کے ساتھ رہنا ہے تو اس کا ایک ہی راز ہے کہ اللہ کے کاموں میں آپ دخل نہیں دے سکتے، کیونکہ اللہ سپریم ہے۔ وہ جو کرتا اور فرماتا ہے، وہی ٹھیک اور بہتر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کی تحقیقات اپنی عقل سے کریں گے تو وہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔

میں پرسوں پڑھ رہا تھا، جرمنی کا ایک بہت بڑا اکانومسٹ پیٹر مائیکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ملکوں کی اکانومی فیل ہوتی ہے تو اس کی اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہم سارے لوگوں نے سر جوڑ کر دیکھا ہے کہ اتنی اعلیٰ درجے کی اکانومی اتنی اوپر جاتی ہے اور جب عروج پر پہنچتی ہے تو خود بخود گلنا سڑنا شروع کر دیتی ہے اور اس کو زوال آ جاتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی چڑھی ہوئی بادشاہی، جس کو دیکھ کر انسان حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور کہتا ہے کہ یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ اس بادشاہی کو زوال آ جائے، خود بخود اس کے اندر ایسا نظام اور عمل شروع ہو جاتا ہے کی اسے زوال آ جاتا ہے۔ آپ نے مغلیہ خاندان کی سلطنت کے زوال کا تو

پڑھا ہو گا۔ ہم بعد میں نکتے نکالتے ہیں کہ یہ کیوں ایسا ہوا تھا کس لیے ہوا تھا۔ جس طرح سے گیند کو ہوا میں بہت اونچا پھینکتے ہیں، وہ اونچا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ اونچا گیند خود بخود زمین پر گرتا ہے۔ اسی طرح سے معیشت کا حال ہے، اسی طرح سے ساری چیزوں کا حال ہے۔

اللہ کو مانتے ہوئے، اس کے احکامات تسلیم کرتے ہوئے، یہ مان لینا ضروری ہے کہ جو تو نے فرمایا ہے ٹھیک ہے اور اللہ کے احکامات کو بجا لانا تو خوش قسمت لوگوں کے اختیار میں ہے اور ہوتا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کرتا ہے۔ لیکن ہم کمزور لوگ ہیں، ہم اپنی عقل و دانش کو ضرور اس میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں اس میں معافی دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم لالچی لوگ ہیں۔ ہم کو سکون بھی دیا جائے، جو کبھی اس طرح سے نہیں ملتا زیادہ مین میخ نکالنے سے بلکہ اس طرح ملتا ہے، جیسے میرا موٹروں کو پسند کرنے والا دوست تھا۔

میرے ایک اور دوست ہیں، جی پی او کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور کار میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے اور کہتے ان کی شکلیں دیکھو، اس کی پکوڑے جیسے ناک ہے اور کتنی اعلیٰ درجے کی کار میں جا رہی ہے۔ میں کہا اب کیا کریں؟ کہنے لگا، بس میرے جی میں آتا ہے کہ میں اسے توپ سے

اڑا دوں۔ توپ سے اڑانے والی ذہنیت اپنی اپنی جگہ پر ہم سب میں ہے۔ لیکن اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو لالچ کے ساتھ زندہ رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ اپ اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اللہ سپریم ہے اور جو اس نے چاہاہے، وہ ہو گا اور میں اس کے ان بندوں میں سے ہوں، جو اس بات کو مانتا ہوں کہ وہی ہو گا، جو اللہ چاہے گا۔ لیکن کام کرتے رہنا انسانیت کا شرف ہے۔ وہ میں ضرور کروں گا۔ جیسے بدصورت سے بدصورت عورت بھی میک اپ ضرور کرتی ہے، تو میں بھی میک اپ کروں گا۔ اے میرے پیارے اللہ تعالیٰ ! میں کسی بات کو اس کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا کہ میری دانش، میری عقل اور میری کوشش کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ میں ناچتا رہوں گا اپنا کشکول ہاتھ میں لے کر۔ اگر اس میں کچھ پڑنا ہے تو پڑ جائے، لیکن میں اپنا ناچ نہیں روکوں گا، جو تیری بارگاہ میں چوبیس گھنٹے ہوتا رہے گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ !!

اللہ کا فضل

آج کل ہمارے ارد گرد جو باتیں بڑی شدت سے ہونے لگی ہیں کہ یہ دنیا بڑی Materialistic ہو گئی ہے، ہم مادی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں، لالچی ہو گئے ہیں اور ہماری توجہ روپے پیسے کی طرف زیادہ ہے۔ پہلے شائد ایسا زمانہ نہیں تھا، لیکن میں سوچتا ہوں اور اپنے بچپن کی طرف لوٹتا ہوں اور اس مسئلے پر غور کرتا ہوں، تو مجھے یوں لگتا ہے کہ بڑی دیر سے ہماری Material اور مادے کے ساتھ وابستگی چلی آرہی ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ جو اتنی وابستگی نہیں ہونی چاہیے تھی، پھر بھی موجود ہے، پتا نہیں کیوں؟

اس وابستگی کی بیشمار وجوہات ہوں گی، لیکن میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ بڑا عجیب ہے اور میں اسے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ آپ بھی اس پر غور کریں اور سوچیں۔ جب ہم بچپن میں لڑکپن میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تھے، تو اپنے ابا جی کے خوف کے باعث جاتے تھے۔ وہ تیار ہو کر کپڑے بدل کر ہمیں بھی نئے صاف کپڑے پہنا کر جمعہ پڑھانے لے جاتے تھے۔ میٹرک تک ہم نے تقریباً ایسا ہی جمعہ پڑھا ہے، زور زبردستی۔ لیکن جب میں فرسٹ ائیر میں آیا اور

یہاں آ گیا، بڑے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے، تو پھر عجیب بات ہے کہ جمعہ مجھے اچھا لگنے لگا اور میں اس میں اپنی مرضی ایما اور دل کی خوشی سے داخل ہو گیا اور جمعہ پڑھتا رہا۔ پڑھائی کا دور ختم ہوا۔ نئی زندگی میں داخل ہوئے، میں نے نوکری شروع کر دی۔ پھر بھی جمعہ کا چلن ویسے ہی رہا اور جمعہ کے بارے میں اللہ کا یہ حکم ہے، اس کا مفہوم بیان کرتا ہوں:

”اے مومنو! جب نماز کی اذان دے جائے، تو جمعہ کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت بند کر دو اور جب نماز ادا کر چکو تو پھر دُور دُور پھیل جاؤ اور اپنے اللہ کے فضل کا تلاش شروع کر دو۔“

اس میں اللہ کے فضل کا جو بریکٹوں میں ترجمہ عام طور پر دیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ تم پھر اپنی روزی کی تلاش کی طرف لگ جاؤ۔ ہم بھی یہی سمجھتے رہے اور اب تک بھی یہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ پچھلے چند سال کی بات ہے میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی قریب قریب اکثر جمعہ پڑھنے آتے تھے۔ میری ہی عمر کے تھے، لیکن میں نے ان سے کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں۔ کبھی علیک سلیک بھی نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ایک دوسرے کی طرف مقناطیسی طور پر ضرور متوجہ ہوتے تھے۔ ایک دن جب وہ نماز ادا کر چکے اور نکلنے لگے اور ہم جوتے پہن رہے تھے، تو میں نے

کہا، صاحب! آپ کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟ اس نے کہا میں سکول ٹیچر ہوں اور ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا میں بھی ریٹائرڈ ہوں۔ جو آدمی ریٹائرڈ ہوتا ہے وہ بہت بے چین ہو جاتا ہے۔ نئی نوکری تلاش کے نے کے لیے۔ اس میں اتنا خوف پیدا ہو جاتا ہے ریٹائرمنٹ کے قریب کہ وہ گھر کے کام کا نہیں رہتا اور لڑائیاں کرتا ہے اور جلدی فوت ہونے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا نوکری کا کام تو ختم ہو گیا، گھر والے بھی اسے بڑا نالائق سمجھتے ہیں کہ یہ خوامخواہ ریٹائرڈ ہو کر گھر بیٹھ گیا ہے۔

ہم دونوں تقریباً اسی کیٹیگری میں تھے۔ میں نے کہا آب آپ کیا کرتے ہیں؟ اس نے کہا، میں جمعہ کی نماز پڑھ کر پھیل جاتا ہوں اور اللہ کے فضل کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ میں نے کہا، اللہ کے فضل کی تلاش تو یہ ہے کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں جمعہ پڑھ کے میں اس زمانے میں ریڈیو میں ملازم تھا، دور دور تک تو نہیں پھیلتا تھا، کیونکہ میرا کام ہی لاہور میں ہوتا تھا۔ میں امریکن سفارتخانے کو جمعہ کے دن انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی سے تراجم کر کے دیتا تھا اور معقول معاوضہ حاصل کرتا تھا۔ پھر انہیں وائس آف امریکہ میں کچھ ریکارڈنگز کی ضرورت تھی، تو ظاہر ہے کہ میں وہ کام بطریق احسن کرتا رہا۔ میں جمعہ پڑھنے کے بعد اللہ کے فضل کا سہارا لیتا تھا اور جمعہ سے قبل خرید و

فروخت بند کر دیتا تھا۔

میں نے اس سے کہا آپ نے کچھ طے نہیں کیا ہوا، پہلے سے پتا ہونا چاہیے کہ آپ کو جا کر کیا کرنا ہے۔ آڑھت منڈی جانا ہے، اکبری منڈی جانا ہے یا سوتر منڈی میں جا کر کام کرنا ہے۔ انہوں نے کہا میں تو بس فضل کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے جمعہ کے حوالے سے یہ قرآنی آیات پڑھیں تو میرے دل پر یہ وارد ہوا کہ اللہ کا فضل خالی روزی ہی نہیں اور رزق خالی کھایا جانے والا، ماش کی دال، چھلکے والی، بغیر چھلکے والی، گرم مصالحہ ''لون'' (نمک) مرچ ہی نہیں، اللہ کے فضل کے بڑے روپ ہیں۔ اس نے کہا کہ جب میری شادی ہوئی اور میری ماں نے لڑکی کو تلاش کیا تو میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا، کیونکہ پہلے دیکھنے کا اس وقت رواج ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا اماں! کیسی ہے؟ اس نے کہا کہ بس ٹھیک ہے۔ تھوڑی سی اس میں کسر ہے، ذرا بھینگی ہے۔ تم اسے برداشت کرنا کہ یہ اللہ کا رزق ہے اور تمہیں اس میں اللہ کا فضل تلاش کرنا ہے۔ لڑکی کی شکل صورت میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔

جب میں نے اپنی بیوی کو دیکھا تو اس کی شکل تقریباً نور جہاں سے ملتی تھی۔ بہت

خوبصورت تھی اور اس کی آنکھوں میں کوئی "ٹیڑھ ویڑھ" (بھینگا پن) بھی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اس سے مجھے بڑا شاک ہوا کہ اماں نے میرے ساتھ اچھا مذاق کیا ہے۔ میں نے کہا، اماں وہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ کہنے لگی، یہ تو تجھ پر اللہ کا فضل ہو گیا اور وہ تیری بیوی نہیں، وہ اللہ کا فضل ہے۔

اب میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ نکل سکتا ہوں۔ اس نے کہا ذرا دور تک آپ پیدل چلیں گے؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ پیدل چلتا رہا، مجھے تو اتنی پریکٹس نہیں تھی اس لیے میں منہ میں گولی رکھ کے چلتا رہا۔ یہ جو عمران خان کا ہسپتال ہے، ہمارے لاہور میں شوکت خانم یہ کھلی جگہ ہے، وہاں قریب ہی بہت ساری جھگیاں ہیں چنگڑوں کی اور ان کے بچے جو ہیں وہ پرانے لفافے اکٹھے کرتے ہیں۔ ہم وہاں پہنچے ان کے چودہ پندرہ سولہ سال کے بڑے اچھے کڑیل قسم کے لڑکے جو لفافے اکٹھے کرنے کا پیشہ کرتے تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلا کر کہا "آ گئے، آ گئے، آ گئے،" اور خوشی کا نعرے مارے۔ میرے ساتھ جانے والے نے اپنی جیب سے نکال کر سیٹی بجائی۔ وہ سارے آٹھ لڑکے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا میچ تیار ہے۔ لڑکوں نے کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا وکٹیں لگاؤ اور پھر وہاں کرکٹ کا میچ شروع ہو گیا اور یہ امپائر بن کر

کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، یہ کئی مہینوں سے کرکٹ کھیلتے تھے اور ان بیچاروں کو کوئی امپائر نہیں ملتا تھا، تو لڑتے تھے۔ میں جب اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلا تو میں نے دیکھا وہ تو یہاں پڑا ہے۔

وہ بڑے سخت امپائر تھے اور بڑی سختی کے ساتھ فیصلہ دیتے۔ جب انہوں نے ایک لڑکے کو ایل بی ڈبلیو دیا تو میرے اندازے میں وہ غلط تھا، لیکن جب انہوں نے انگلی اٹھائی تو بیٹسمین وہیں بلا چھوڑ کر چلا گیا۔ انہوں نے ایسے ڈسپلن والے بچے تیار کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ جو انہیں کھلانے والے تھا، وہ کسی اور پچ پر کھیل رہا تھا اور وہ پچ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں ہر جمعہ یہاں آ جاتا ہوں۔ میرا ان کے ساتھ وعدہ ہے اور اس طرح میں اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلتا ہوں اور مجھے اس کا فضل کثیر صورت میں نصیب ہوتا ہے۔

اب میں ان سے بڑا شرمندہ ہوا کہ میں تو جا کر ترجمے کرتا تھا اور پیسے کماتا تھا، کیونکہ بریکٹ میں یہی لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ جب میں نے آیات کے ترجمے میں پھیل جانا پہلی بار پڑھا تو مجھے اس پھیلنے کا یہی مطلب ملا کہ چلتے جاؤ، چلتے جاؤ۔ سو اشفاق صاحب میں چلتا گیا چلتا گیا اور ریلوے سگنل کے پاس پہنچ گیا، جہاں پر میرے رشتے کی ایک بھانجی رہتی تھی اور وہ بیچارے غریب لوگ تھے۔

تھی تو وہ میری چچازاد بہن کی بیٹی، لیکن چونکہ وہ امیر نہیں تھے اور ہم نے ان کی جانب توجہ نہیں دی تھی اور کبھی ملے ہی نہیں۔ جب چلتے چلتے اس کا گھر آ گیا تو میں اندر چلا گیا، تو اس نے خوشی سے چیخیں ماریں کہ "ماما جی آ گئے، ماما جی آ گئے" اور اپنی دونوں بیٹیوں کو بلا لیا کہ یہ میرے ماما جی ہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ لپٹ گئیں اور کہنے لگیں "ماما جی! آپ ہمارے پاس آتے کیوں نہیں؟ میں نے کہا، میں جمعہ پڑھنے کے بعد اس کے فضل کی تلاش میں نکلا ہوں، تو آج مجھے یہ فضل نصیب ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے اپنی بھانجی کے گھر جا کر پتا چلا کہ میری بھانجی کی بیٹیاں اور وہاں کی پانچ لڑکیاں پرائیویٹ کالج سے ایف ایس سی کر رہی تھیں اور کسی بڑے کالج نے انہیں جمعہ کی شام کو پریکٹیکل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ چونکہ سب اکیلی ہوتی تھیں اور علاقہ بہت دور کا تھا، تو وہ ڈرتی تھیں اور جاتی نہیں تھیں۔ لہٰذا جب مجھے پتا چلا تو میں ان کا سپاہی بن کر ہر جمعہ انہیں کالج لے بھی جاتا تھا اور لے کر بھی آتا تھا۔ یہ میری ڈیوٹی مجھے اس آیت کی وجہ سے لگی رہی۔ میں خوش رہا۔ میں زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں ہوا، جتنا کہ اللہ کا فضل ملنے کے بعد رہا۔

ایک دن میری بھانجی نے کہا کہ ماما جی! آپ آتے تو رہیں گے یہاں کہ نہیں؟ میں نے کہا، میں یہاں ضرور آتا رہوں گا۔ بھانجی نے کہا کہ عقیلہ اور سجیلہ کا

بندوبست ہو گیا ہے اور کالج نے کچھ چندہ کے عوض ایک وین کی سہولت دے دی ہے۔ میں نے کہا نہیں پھر بھی آتا رہوں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے ربط کے ساتھ نہیں آسکوں گا۔ مجھے کوئی نوکری یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ فضل کی نوکری بڑے مزے کی ہوتی ہے۔ یہ بیٹھے بٹھائے ہر کسی کو نہیں ملتی۔ کہنے لگے کہ یہ بھی اللہ کی بڑی مہربانی رہی کہ میں بھانجی کو ملنے وہاں جاتا رہا اور مجھے ایک کھوئی ہوئی بھانجی مل گئی۔ بھانجی نے کہا کہ ماما جی! یہاں قریب ہی ایک خاتون ہیں، جو معذور ہیں۔ چلنے پھرنے سے اور اکیلی رہتی ہیں۔ انہیں سودا وغیرہ لانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ ڈیوٹی ذرا سخت تھی۔ تو میں جمعہ کے بعد اس کے پاس گیا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، لیکن طبیعت کی سخت تھیں۔ کہنے لگے، میں نے ان سے کہا کہ جی سودا میں لا دیا کروں گا۔ اس خاتون نے پہلے میری شکل غور سے دیکھی اور کہنے لگی، دیکھو! تم مجھ پر مہربانی کرنے آئے ہو، لیکن میں تمہیں پہلے پیسے نہیں دوں گی۔ تم سودا لا دیا کرو اور حساب کر دیا کرو، تو پھر میں پیسے دوں گی، کیونکہ کئی لوگ دھوکہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں جی، یہ تو میری توہین ہے۔ میں کیوں بے ایمانی کروں گا آپ کے ساتھ۔ میں تو پہلے پیسے لوں گا۔

جب میں اڑ گیا تو خاتون نے میرے چہرے سے بھانپ لیا کہ ماسٹر کریم شرارت

کے طور پر ایسا کر رہے ہیں۔ اب اس خاتون نے پٹّو کی سے پھولوں کے بیج منگوائے۔ پٹّو کی جہاں بہت پھول ہوتے ہیں، پٹّو کی سے ہم پھول ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ پٹّو کی جیسا علاقہ خشک بے آب و گیاہ۔ کڑوا پانی۔ وہاں اللہ نے اتنے پھول پیدا کر دیئے ہیں کہ ہم وہ ولایت کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ وہ خاتون ہر بار سودے اور چیزوں کا بغور جائزہ لیتی تھیں۔ کبھی کہتی یہ دار چینی تو اتنے کی نہیں ہوتی، تم تین آنے زیادہ دے آئے ہو، یہ سوکھا دھنیا جو بھی کچھ ہوتا تھا، ان کی قیمتوں کا سخت جائزہ لیتی تھیں اور اسے سخت طریقے سے بار بار چیک کرتی تھیں اور میں نے کئی دفعہ یہ ارادہ کیا۔ میں اس "فضل" کو چھوڑ دوں، لیکن جب جمعہ کی اذان ہوتی تو میں دوڑتا ہوا نماز کے لیے آتا تھا اور نماز پڑھ لیتا تھا، تو میرے کانوں میں یہ گونجنے لگتا تھا کہ "تم پھر اللہ کی زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو" تو میں پھر رہ نہیں سکتا تھا اور اس سخت اور کڑوی خاتون کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔

میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے فضل کی ایک ہی شکل نہیں ہے، اللہ کا فضل تو وسیع ہے۔ یعنی میری اور آپ کی سانس سے لے کر کبھی کبھی آدمی ناشکرا ہوتا ہے کہ مجھے زندگی میں کیا ملا۔ یہ بیبیاں ہوتی ہیں کہ ذرا ذرا سے بات پر چڑ جاتی ہیں۔ میری پوتی ناراض ہو کر جب دروازے میں چابی ڈالتی ہے تو وہ کھلتا نہیں،

پھر چڑ جاتی ہے اور کہتی ہے "بابا یہ مجھ سے کیوں نہیں کھلتا ہے؟بس ذرا سی بات پر رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بیچارہ کھل رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں کہوں کھل جا سم سم تو یہ جھٹ سے کھل جایا کرے۔ میں نے کہا اللہ نے تم کو اتنی نعمتیں دی ہیں۔ کہنے لگی نہیں نہیں کوئی نعمتیں نہیں دیں۔ میرے پاس کون سے نعمت ہے بتائیں؟ اس نے کہا کہ ہم نے مرسیڈیز لینی ہے، یہ ٹویوٹا کرولا تو فضول چیز ہے۔ میں نے کہا، دیکھو یہ اللہ کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ تم کو سب سے قیمتی چیز مفت مل رہی ہے۔ وہ آکسیجن ہے۔ دنیا کی بیش قیمت چیز اگر تمہیں ہر صبح جا کر خریدنی پڑے تو کتنی مشکل ہو۔ قتل و غارت گری ہو، کچھ کنٹرول ہی نہ ہو۔ اللہ جو ہمیں پانی دیتا ہے اور میں پانی کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ یا اللہ تعالیٰ تو نے یہ کیسے بنایا اور ہمارے کتنے کام اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہمارا کام مفتا مفت چلا جا رہا ہے۔ تو اللہ کے فضل کے بڑے رُوپ ہیں۔

یہ "زاویہ" پروگرام تو آپ سے ملاقات کا ایک بہانہ ہے۔ میں اسی لیے عرض کرتا ہوں اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے بھی۔ میرے اندر ایک چڑ رہتی ہے اور میں ایک سخت گیر آدمی ہوں اور ایک انسان میں لچک ہونے چاہئے۔ وہ میرے اندر نہیں ہے اور اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے میں آپ کا سہارا لیتا ہوں کہ اے اشفاق احمد! اللہ کا فضل تو بڑے مختلف روپ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے تو

کبھی غور نہیں کیا کہ جب آپ کرکٹ کا کوئی میچ دیکھنے بیٹھتے ہیں، تو بڑا افضل بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی Tension میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ "اوہ" اگر اس کا چھکا لگ جاتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ اچھا شوکت خانم کی جھگیوں کے پاس جو لڑکوں کی ٹیم ہے، وہاں چوکے تک کی تو اجازت ہے، چھکے کی نہیں ہے۔ اب دیکھئے امپائر نے کتنی سخت شرط لگائی ہوئی ہے، چھکے کی اجازت اس لیے نہیں ہے کہ چوکے کے باہر ارد گرد کوٹھیاں شروع ہو جاتی ہیں اور چھکے سے خطرہ ہوتا ہے کہ بال ان کے شیشوں میں جا نہ لگے، لیکن اگر کوئی چوکا چھکے کی اہمیت کا ہو تو امپائر جو پاکستان کا واحد امپائر ہے، جو دونوں ہاتھ کھڑے کر کے چھکے کا فیصلہ دے دیتا ہے اور اس کے فیصلے کو دونوں ٹیمیں تسلیم کرتی ہیں، کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ سو، جناب اللہ کی مہربانیوں کے بڑے روپ ہیں۔ اگر ہم تھوڑی سی لچک پیدا کر کے چِڑنا چھوڑ دیں، جلنا بھننا چھوڑ دیں تو آسانیاں اور اللہ کا فضل حاصل ہو سکتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر چِڑنا کہ بس لیٹ آتی ہے، دیر ہو جاتی ہے، فلاں کام ہماری مرضی سے نہیں ہوا۔

ایک نابینا بابا بس سے اترا اور میں نے ہی اسے مدد کر کے اتارا۔ عین اسی وقت جب نابینا بزرگ کو میں اترنے میں مدد دے رہا تھا، ان کے ساتھ ہی اترنے والے ایک صاحب کے Cell Phone پر فون آگیا۔ انہوں نے کہا "ہیلو!" تو

نابینا صاحب نے بھی کہا "ہیلو" اس صاحب نے کہا "کیسا حال ہے؟ نابینا صاحب کہنے لگے اللہ کا شکر ہے۔ وہ صاحب تو اپنی بات کر رہے تھے، لیکن نابینا صاحب اسے پورا ٹھیک جواب دے رہے تھے۔ وہ صاحب فون پر کہنے لگے، کل آپ آئے نہیں؟ نابینا صاحب کہنے لگے، کل آپ نے مجھے کب بلایا تھا۔ وہ کہنے لگے تم نے وعدہ کیا تھا، نابینا صاحب کہنے لگے، نہیں میں نے وعدہ نہیں کیا۔ اب میں درمیان میں کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں زندگی میں کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات سامنے آتے ہیں۔ آپ اگر غور سے سفر کریں تو ایسی عجیب و غریب چیزیں ملتی ہیں۔

میں جو آپ سے عرض کرتا ہوں یہ یہیں کہیں وہیں سے اکٹھی کی ہوئی باتیں ہوتی ہیں، لیکن ہم نے چونکہ ایک سخت قسم کا اور تنگ راستہ بنالیا ہوا ہے اور ہم سارے سرنگ میں چلنے کے عادی ہیں۔ کھلے راستوں کے عادی نہیں رہے، اس لیے یہ سارے واقعات اور اللہ کے فضل اور رحمتیں نظر نہیں آتیں، ورنہ اللہ کا فضل تو مسلسل جاری ہے۔ اب یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ ہماری آنکھیں سلامت ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فضل کی تلاش میں زیادہ آسانیاں فرمائے

اور اتنی آسانیاں عطا فرمائے کہ آپ انہیں تقسیم کریں اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کریں اور انہیں آگے تقسیم کر سکیں۔ اللہ حافظ۔

صبر، ڈسپلن اور آزادئ کشمیر

ہم گھر میں کل تین بڑے تھے۔ ایک دادا، ایک دادی اور ایک بہو اور ارسلا۔ اور ارسلا بڑی بیمار تھی۔ دو برس کی عمر کی ایک نہایت پیاری، خوبصورت، سنہرے بالوں والی بچی۔ اسے شدید بخار تھا اور موسم یہی سردیوں کا تھا۔ بخار اترنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی۔ بڑی اینٹی بائیوٹک دی تھیں، لیکن وہ ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ارسلا بڑی بے چین تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑی تیز تھی۔ وہ صرف دادا کے ساتھ چمٹ کر ہی تھوڑی دیر آرام کر سکتی تھی۔ میں اس وقت بڑا جوان تھا، ابھی ساٹھ برس کا نہیں ہوا تھا۔ ابھی پانچ ماہ کم تھے اور میں ''تگڑا'' تھا۔ ارسلا کا سب سے بڑا تقاضا یہ تھا کہ وہ میرے سینے کے ساتھ لگ گئی، جس طرح چٹان پر کوئی مینڈک چپکا ہوتا ہے۔ میں پیچھے کی طرف جس قدر بھی زاویہ بنا سکوں، تو ٹھیک۔ لیکن اگر سیدھا کھڑا ہوتا یا عموداً تو پھر وہ رونے لگتی۔ اتنی دیر تک پیچھے کو جھک کر کھڑے رہنا کافی مشکل تھا۔ لیکن اس کی خوشنودی اور آرام مقصود تھا۔ اتنی سردی میں اس کا پسینہ اس کی ناک سے اس کے ماتھے سے ٹپک رہا تھا۔ میرے نیلے کُرتے پر اور بڑے بڑے ''چٹاک'' پڑ رہے تھے اور مجھے پتا چل رہا تھا کہ یہ میرے کُرتے کا رنگ کچا ہے۔

جب بھی قطرہ گرتا مجھے اور تکلیف ہوتی اور دوسرے اپنے کُرتے کی بھی کہ اس کا رنگ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کیفیت سے ہم گزر رہے تھے۔ رات کے وقت میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں ایک ایسی کرسی پر بیٹھتا ہوں، جس کی "ڈھو" (سہارا) ذرا سلانٹ ہو تو ارسلا اسی طرح میرے سینے کے اوپر آرام سے لیٹی رہے، کیونکہ وہ اپنی ماں پر اعتماد کرتی تھی نہ اپنی دادی کے پاس جاتی تھی۔ اپنے بستر پر نہیں لیٹتی تھی۔

آپ ایسا کریں کہ میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اور مجھے ٹی وی لگا دیں اور اس کی آواز بند کر دیں۔ تصویر گزرتی رہے گی اور میں دیکھتا رہوں گا اور میرا دل لگا رہے گا۔ اس زمانے میں ٹی وی بارہ بجے تک چلنے لگا تھا۔ وہ وقت بھی گزر گیا اور میں اور ارسلا ایک کمرے میں بیٹھے رہے۔ میری بیوی بڑی پریشان تھی اور ارسلا کی ماں بھی۔ میرا بیٹا بھی بار بار آتا تھا اور کہتا تھا ابو آپ کو تکلیف ہو رہی ہے، میں نے کہا مجھے اپنی تکلیف سے زیادہ اس کی تکلیف کا خیال ہے کہ میں اس کی کیسے مدد کروں کہ اس کی تکلیف کسی طرح سے ذرا سی کم ہو جائے اور مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ میں اپنے عہد کا بڑا لائق آدمی تھا۔ لائق پڑھائی لکھائی کے اعتبار سے نہیں، میری ہابی تھی کہ مشینوں کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ اس عمر میں، میں اپنی گاڑی کا تیل گھر پر بدلتا۔ آپ تو تیل تبدیل کروانے جاتے ہیں، میں گاڑی کے نیچے لیٹ کر

بڑے رینچ سے کھول کر ڈبہ رکھ کر تیل بدلی کر لیتا تھا۔ میں پرانی ٹوٹی پھوٹی سولڈر وائر کو ٹانکے ٹچ لگا کر بچوں کو لوکل ریڈیو سیٹ بنا دیتا تھا۔ لاہور اسٹیشن بجتا تھا اس کے اوپر۔ میں نہایت Sensitive ٹرانسسٹرز کو بغیر گیلے کپڑے میں پکڑے ٹانکے لگا دیتا تھا اور ٹھیک رہتا تھا۔ یہاں میں پریشان تھا کہ کچھ نہیں ہو رہا اور کئی دفعہ ایسی کفر کی سی حالتوں میں سے گزرا کہ یا اللہ یہ کیا ہے؟ ایسا کس لیے ہے؟ اور وہ میری بہت پیاری پوتی تھی اور ہمیں ڈر تھا کہ اگلا بیٹا نہ ہو جائے۔ مجھے کم از کم ڈر تھا۔ ہمارے گھر میں ماشاء اللہ سے بڑے بیٹے تھے اور ہمیں آرزو تھی پوتیاں ہوں۔ میں نے کہا اللہ میاں مجھے پوتی سے نواز اور پھر اللہ کی مہربانی ہوئی اور جب ارسلا پیدا ہوئی تو میں نے اس کا نام ارسلا رکھا، یعنی ارسال کی ہوئی۔ تو پھر مجھے خیال آیا کہ دیکھ میں کیسی چیزیں ایجاد کر لیتا ہوں۔ مجھے اللہ نے یہ خاص صلاحیت دی ہے۔ میں اب اس کے ساتھ لیٹا ہوا ہوں اور وہ چھوٹا سا مینڈک میرے سینے کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ مجھے طرح طرح کے خیال آ رہے ہیں۔ ان میں کچھ مثبت بھی تھے، کچھ منفی بھی۔ اللہ کے شکرانے کے بھی اور ناراضگی کے بھی۔ عجیب و غریب خیالات اور اس کی کیفیت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے یاد آیا، جب میں روم میں رہتا تھا اور میں یونیورسٹی جاتا تھا۔ تو صبح ناشتے میں ہر روز میں ایک چیز سینڈوچ لیتا تھا، وہ پانچ روپے کا ملتا تھا اور چائے میں اپنے

کمرے میں بنالیتا تھا۔ وہاں چائے کا رواج نہیں ہے، کافی پی جاتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ پانچ روپے کا تو بڑا مہنگا ہے۔ اس میں تھوڑا سا Cheese اور دو سلائس ہوتے ہیں اور وہاں میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ جس سے میں ہر روز سستے بھاؤ ایک سینڈوچ تیا کر سکتا۔ میں نے ایک دن یوں کیا کہ وہاں سے دو سلائس لیے "آٹھ آنے کے دو سلائس اور آٹھ آنے ہی کا تقریباً Cheese کا ٹکرا بھی لے لیا اور اوپر کمرے میں آگیا۔ میں ٹھنڈا کھانے کا عادی نہیں تھا۔ گرم کھانے کی عادت بڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا اسے گرم ہونا چاہیے۔ میں نے اسے اس جگہ کے اوپر رکھا، جہاں میں اپنی ٹائی اور سوٹ استری کیا کرتا تھا، میں نے استری گرم کی اور اسے ان سلائیز کے اوپر رکھا، جس سے بہترین چیز سینڈوچ تیار ہو گیا۔ اب مجھے وہ ایک روپے میں پڑنے لگا۔ آپ کو بھی بتادوں کہ استری سے Cheese سینڈوچ بڑا اچھا بن جاتا ہے۔ جب میں نے یہ بات سوچی تو میں نے کہا، میں ارسلا کی مدد کیوں نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ ہی چونکہ میں ٹیکنیکل چیزوں کے ساتھ وابستہ تھا، جو بھی چیز لینی، سب سے پہلے اس کا مینول مطالعہ کرنا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اس کے مطابق ہی اسے استعمال کرتا تھا۔ لاہور میں سب سے پہلے ٹیپ ریکارڈر جس میں آواز بھرتے ہیں، وہ میں نے ہی خریدا تھا۔ وہ اس وقت یہاں کے اسٹوڈیوز میں بھی نہیں تھا۔ اتنا شوق تھا ان

چیزوں کا۔ میں سوچ رہا تھا اللہ مجھے معاف کرے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا مینول کیوں نہیں آتا۔ میری آرزو تھی، ایک دل کی پکار تھی کہ یا اللہ اس کا بھی کوئی مینول ہو اور میں دیکھوں کہ خرابی کہاں ہے۔ یہاں ٹانکا لگانا ہے، یہاں نئے سرے سے پیچ کسنا ہے اور یہ میرے سامنے بیٹھ کے کھیلنے لگے گی، لیکن کوئی مینول ایسا نہیں آتا جو اس کے جسمانی عارضوں کو دور کر سکے۔ ایک مینول آتا ضرور ہے، جو انسان نبی، اللہ کی مہربانی سے ہم کو دیتا ہے۔ نبیوں نے بتایا ہے کہ زندگی کیسے بسر کرنی ہے۔ ہم کو تو اللہ نے بنا دیا بغیر ہمارے پوچھے ہمیں بنا دیا اور جب ہم بن گئے تو پھر ہم نے پاچھا کہ اے کوزہ گر تو نے یہ جو کوزہ بنایا ہے، اس میں ڈالنا کیا ہے ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارا پرچۂ ترکیب استعمال نبیوں کے ذریعے دے دیا ہے تو اس کے مطابق کر لو جو خوش قسمت ہوتا ہے وہ اس پرچہ ترکیب استعمال کو استعمال میں لے آتا ہے، جو ہمارے جیسا کوتاہ بین ہوتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں اپنے اس مینول کے بارے میں بھی غور کرتا رہا، لیکن پوتی کو کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پھر ایسی ہی دوسری رات آگئی۔ پھر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ علم جو میرے پاس ہے، وہ مجھے عطا کیا جا رہا ہے۔ یہ ٹانکے لگانے یا گاڑی کا تیل بدلنے کا علم نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کسی مینول ہینڈلنگ سے کوئی تعلق ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ مجھے اور ارسلا، دونوں دادا پوتی کو ایک صبر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ صبر کیا ہوتا ہے اور اس کے اندر انسان کیسے گزر سکتا ہے اور اسے کیسے گزرنا چاہیے۔ اس میں غصہ بھی آتا ہے، آدمی چڑتا بھی ہے اور وہ کہتا ہے "Why Me" میری پوتی جب کسی سے چڑتی ہے تو کہتی ہے دادا "وائی می"۔ میری پوتی نے تیزی، بلکہ بہت ساری تیزی کو اپنا لیا ہے۔ لیکن صبر انسان کو ڈسپلن سکھاتا ہے اور یہ کس طرح سے انسان کو ادب کی تعلیم دیتا ہے اور ایک ایسی ترکیب میں گزارتا ہے کہ وہ ڈسپلن کی جانب آتا ہے۔

میں آپ اور ہمارا ملک اس لیے پسماندہ ہے کہ ہم میں ڈسپلن نہیں ہے۔ ہم منظّم نہیں ہیں۔ کیا نام ہے؟ ٹورنٹو ریڈیو کی بہت خوبصورت آواز۔ ہاں یوری انڈریو نامی اناؤنسر ہے۔ وہ مسلمان ہو گیا۔ جب میں کینیڈا میں تھا تو میں نے اس کا ایک کیسیٹ سنا۔ وہ بہت حیران ہے۔ کہتا ہے کہ وہ سورہ روم سن کر مسلمان ہوا۔ جس میں ہے کہ دنیا نے یہ کہا کہ ایران فتح ہو گیا اور ایران فتح ہو بھی گیا تھا۔ لیکن اللہ کہتا ہے یہ غلط ہے۔ رومی ہارے نہیں فتح یاب ہوئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ چھ دن کے بعد ہی پانسہ پلٹ گیا اور رومی فتح یاب ہو گئے۔ یوری کے دل پر پھر کچھ ایسی گزری کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ خیر! میں یوری سے ملنے گیا اور اس سے کہا تم اسلام کو کیسے دیکھتے ہو؟ کہنے لگا " The Future of World is Islam, It

belongs to Islam۔ میں نے کہا کیسی بات کرتے ہو؟ ہمارے ہاں بھی ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کی کوئی بنیاد کوئی منطق نہیں ہے۔ اس نے کہا، ہاں! اس کے پیچھے کوئی منطق نہیں ہے لیکن اس کے پیچھے ایک اور چیز ہے۔ اسلام ایک اور طرح کا مذہب ہے۔ تم لوگ اس کو نہیں سمجھو گے۔ تم نے پتہ نہیں کیوں یہ مذہب اختیار کر رکھا ہے۔

وہ کہنے لگا، جب امریکہ کے دو ہزار سنہرے بالوں والے گورے مسلمان ہو جائیں گے، کالے نہیں، ایک ہزار کینیڈین، چھ سو سیکنڈے نیوین ممالک مسلمان ہو جائیں گے، تو پھر ہمارا قافلہ نکل چلے گا اور ہم لوگوں کو بتا دیں گے کہ اسلام کیا ہے۔ میں نے کہا ہماری تعداد تو اکیلے ہی ماشاء اللہ چودہ کروڑ ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ Sorry آپ غیر منظّم ہو اور ایسے غیر منظّم لوگ اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ تب میرا دل دُکھ سے بھر گیا کہ اتنی بڑی اسلام کی فتح ہو گی۔ کبھی ہو گی۔ میں آپ شاید اس وقت ہوں نہ ہوں، لیکن کیا ہم اس میں شریک نہیں ہوں گے؟ میں نے یوری سے کہا یار! یہ تو ہمارا بہت پیارا دین ہے، تو تم اکیلے ہی کامیاب رہ جاؤ گے۔ دنیا داری میں بھی اور جب یہ وقت آئے گا تم گورے ہی کامیاب رہو گے۔ اس نے کہا، کیا کریں، بس اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا حصہ کچھ نہیں؟ کہنے لگا، نہیں! تم پھر ایسے کرنا تم ہاتھ اوپر اٹھانا اور اونچی

آواز میں کہنا "I am also Muslim" تو ہم کہیں گے، اچھا "جُلی بسترا" اٹھا کے پیچھے پیچھے چلتے آؤ، تم سے ہونا تو کچھ نہیں۔ ڈسپلن تم میں نہیں، تم ناچ سکتے ہو، یا رو سکتے ہو، یا قتل ہو سکتے ہو یا قتل کر سکتے ہو۔

اللہ صبر سکھاتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر محسوس کیا۔ ارسلا اب بڑی ہو گئی ہے اور اب تو ماشاء اللہ وہ اٹھارہ برس کی ہے۔ وہ نیوکلیئر فزکس کی بڑی اچھی طالبہ ہے اور میں اس سے کہتا ہوں اللہ کے واسطے یہ نیوکلیئر فزکس نہ پڑھ۔ تمہیں پکڑ ہی نہ لیں۔ بہر کیف یہ ایک تیسری بات ہے۔ وہ کہتی ہے، نہیں دادا یہ مجھے بہت پسند ہے۔ ایک صبر ہوتا ہے جو مجبوری کا ہے کہ کیا جاتا ہے، ہاں ٹھیک ہے جی "خیر کوئی گل نئیں اللہ نے کہیا تے فیر صبر ای کر لینے آں" یہ صبر نہیں ہے، یہ تو ڈسپلن نہیں سکھاتا۔

میں اس دُکھ میں سے گزرتا تھا، پھر اللہ نے فضل کیا اور مجھے یہ بات سمجھ میں آئی۔ میں دفتر آیا ہوا تھا کہ میری بیوی نے ٹیلیفون کیا کہ ارسلا کا بخار اتر گیا ہے اور وہ مٹی کے کھلونے جو آپ نے اس کے لیے بہاولپور سے منگوائے تھے، ان سے کھیل رہی ہے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہ آئی کہ اس کا بخار اچانک کیسے اتر گیا۔ میں اس وقت دفتر میں سارا کام چھوڑ کر بھاگا اور حیران رہ گیا کہ یہ کیسے ہوا؟ میں

نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ میری وہ ساری باتیں معاف کی جائیں اور خداوند تعالیٰ جو آپ نے درس دیا ہے، میں معلوم نہیں کہ ثابت قدمی اس پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح آج میں دیکھتا ہوں۔ اسی ارسلا کی طرح میرا ملک بھی خدا نے مجھے ارسال کیا تھا۔ یہ ہماری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے، ہم نے کچھ بڑے کام نہیں کیے ہیں۔ یہ اس کی مہربانیاں تھیں۔ یہ اللہ کا فضل تھا جو اتنا بڑا ملک اتنے بڑے وسائل کے ساتھ اتنے خوبصورت موسموں والا، ایسے پھلوں، پھولوں والا ہمیں مل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب جب میں دکھ کی بات آپ سے کرتا ہوں وہ یہ کہ جو میرے سینے سے چمٹی ارسلا تھی وہ پوری طرح سے اتر نہیں سکی ہے اور اس سے زیادہ تکلیف میں مبتلا بچے کی طرح کشمیر بن کر میرے سینے کے ساتھ لپٹی ہے اور کسی آدمی کے پاس ایسا سینہ نہیں ہے جو اس مریض، پامال، خوار، پریشان کشمیر کے لیے اپنا سینہ پیش کر سکے اور اس مشکل میں سے گزر سکے۔

آپ یقین نہیں مانیں گے کہ کشمیر آج سے دکھوں میں نہیں کھڑا۔ یہ بڑے طویل عرصے سے ڈوگرہ راج کے زمانے سے تکلیفیں سہتا چلا آ رہا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ جس قدر محبت کرنی تھی، وہ ہم نہیں کر سکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ

ہم نے اس کے لیے درد محسوس کیا ہے، لیکن جس طرح سے ایک دکھی دادا اپنی ارسلا کے لیے محسوس کرتا ہے، یا کرتا رہا ہے۔ ویسے ہم نہیں کر سکے۔ بڑی آرزو یہ ہے کہ سیاستدان اور لیڈر تو ایسی محبت عطا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے کچھ اور کاموں میں لگے رہتے ہیں، لیکن لوگ اگر اجتماعی طور پر اپنی محبت کو جمع کر کے، اپنے اپنے گھر بیٹھ کر اپنی اپنی دل بستگی کے ساتھ اس کشمیر کے لیے دعا ہی کریں، تو بہت کچھ ممکن ہو جائے۔ ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا۔ ہم نے اپنی اپنی زندگی ساری طویل زندگی میں کسی رات کبھی نو بجے بیٹھ کر خالی اس کشمیر کے لیے دعا نہیں کی، جہاں پچھلے دس برس میں ایک ہزار نئی قبریں بن چکی ہیں، تو اس پر کچھ گزری ہے نا! کچھ ہوا ہے!!

ہم جذباتی، روحانی، نفسیاتی، اور قلبی اثر ضرور ڈال سکتے ہیں اور جب سب مل کر ایسا کریں گے، اپنے خالی لمحات میں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر ہر گھر میں یہ ٹیلیفون بجے گا کہ کشمیر آزاد ہو گیا ہے اور اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، جو پھولوں کی صورت میں اس کی ساری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کئی دنوں کا میرے دل پر بوجھ تھا، جو میں نے آج آپ کی خدمت میں بیان کر کے اتار دیا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

بابے، جسم اور خیال کا کِلا

یہ سوال میری روح اور میرے ذہن کے ساتھ اکثر ٹکراتا ہے، جس میں لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ آپ "بابوں" کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمیں تو "بابے" کوئی ملتے نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھی، اونچی کرسی لگا کر گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی بابا پکڑ کے لاؤ اور ہماری خدمت میں پیش کرو، ایسا تو ہوتا نہیں ہے۔ اس کے لیے تو مختلف Efforts کوشش جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جیسے آپ اور دوسرے کاموں کے لیے کرتے ہیں۔ میں اب لوٹ کر بہت پیچھے کی طرف جا رہا ہوں۔ میری عمر میں پہنچ کر پرانی باتیں زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد آتی ہیں اور کل کیا کھایا تھا، وہ نہیں پتا چلتا۔ مثلاً میں راستے میں سوچتا آ رہا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کل کیا کھایا تھا، تو عین ٹی وی کے دروازے پر پہنچ کے یاد آیا کہ آلو مٹر کھائے تھے۔ لیکن پرانی باتیں مکمل وضاحت اور تفصیل کے یاد ہیں۔

میرا گاؤں، گاؤں نہیں بلکہ ایک قصبہ تھا، جس کی آبادی کوئی پچیس ہزار کے قریب تھی۔ وہاں ہم رہتے تھے، لیکن وہ پچیس ہزار کا قصبہ جنوری کے مہینے میں

دس تاریخ کے بعد تین لاکھ کا قصبہ بن جاتا تھا، وہاں ایک میلہ لگتا تھا۔ اسے ہم "ماڈھی" کا میلہ کہتے تھے۔ جنوری کی دس، بارہ، تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو ضلع سے پولیس آتی تھی۔ دُور دُور سے تماشے تھیٹر آتے تھے، جو اپنی زندگی میں، میں نے دیکھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھایا کہ مجھے ڈرامہ لکھنا آنے لگا۔ وہ تھیٹر اور طرح کے ہوتے تھے، لیکن ان کے پس منظر میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو پرانے پارسی تھیٹروں میں تھا۔ اس میلے میں دو بڑے سرکس آیا کرتے تھے۔ میں چونکہ چھوٹا تھا اور میری عمر پانچ سال تھی، اس وقت سرکس میں زیادہ دھیان دیتا تھا۔ جانوروں کے ساتھ وابستگی ہوتی تھی۔ وہاں ایک رتنا بائی گرینڈ سرکس بھی آتا تھا۔ ایک رتنا بائی بنگالی عورت وہ کرتب بھی کرتی تھی اور اس سرکس کی مالک بھی تھی۔ وہ اتنا بڑا جوڑا کر کے اور پلس فور پہن کے، پاؤں میں چمڑے کے جوتے اور وردی اور ہاتھ میں ہنٹر پکڑے ہوتی تھی۔ سارے جانور اس سے ڈرتے تھے۔

میں نے ایسا کوئی رِنگ ماسٹر اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا جو شیروں کے ساتھ جا کر پٹاخا مار کے بات نہ کرے بلکہ وہ موٹا "لگا" ان کے منہ پر مارے اور ان سے کام کرائے۔ رتنا بائی کے سات ہاتھی تھے جو بڑے وزنی تھے۔ میں بڑی بہادری کے ساتھ اس کے سامنے جا کر کھڑا تو ہو گیا، لیکن جب ہاتھی آگے کو جھکا تو میں ڈر

کے مارے پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میرے ساتھ میرے والد صاحب بھی تھے جو وٹرنری ڈاکٹر تھے اور ہاتھی کا ٹمپریچر لینے آئے تھے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا اس کی سونڈ پکڑو، لیکن میں ڈرا۔ اس پر میرے والد نے پوچھا کہ تم اس سے ڈرے کیوں؟ میں نے ان سے کہا میں ڈرا اس لیے ہوں ابو کہ یہ ہاتھی جس "کلے" کے ساتھ باندھا گیا ہے، وہ بڑا کمزور ہے اور میرا خیال ہے کہ زمین میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ یہ اگر زور دے تو یہ اسے اکھاڑ پھینکے گا۔ میرے والد نے کہا یہ ایسا نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ "کلے" کے ساتھ نہیں بندھا ہوا، یہ اس خیال کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ "کِلا" مضبوط ہے۔ اگر یہ اپنے خیال میں تبدیلی لائے تو پھر البتہ یہ ضرور کَلے کو اکھاڑے گا۔

میں نے کہا ابو اسے اب یہ خیال کیوں نہیں آتا؟ تو انہوں نے کہا کہ جب یہ چھوٹا تھا تو اسے اس "کَلے" کے ساتھ باندھا گیا۔ اس نے اپنا پورا زور لگایا، پوری طاقت آزمائی تھی، لیکن یہ اسے اکھاڑ نہیں سکا تھا۔ اس جدوجہد میں تقریباً پانچ چھ سات ماہ گزرے، پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ میری طاقت سے اکھڑ نہیں سکتا اور اب وہ اسی خیال اور اندازے پر قائم ہے۔ تاہم وہ بات جب کی تھی اور اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کے بعد یہ تصور میرے ذہن میں ابھرنے لگا ہے کہ ہم خیال سے کس قدر بندھے ہوئے ہیں اور

مائنڈ میٹر یعنی جسم کے اوپر کتنی حکمرانی کر رہا ہے۔ اگر مائنڈ طاقتور ہو تو آپ کا
جسم آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرنے لگے گا۔ لیکن آپ کہتے ہیں میں
سگریٹ چھوڑ نہیں سکتا۔ سگریٹ چھوڑنا کوئی مشکل بات نہیں۔ ایک خیال نے
آپ کو اس کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔ میں اپنی نواسی سے کہ رہا تھا کہ "تو نہ لڑیا کر
اپنی سس نال" (آپ اپنی ساس سے نہ لڑا کرو) کہنے لگی، نہیں میں ساس کے
ساتھ لڑنے سے رہ نہیں سکتی۔ نانا میرا خیال یہ کہ بس یہ بڑی کمینی عورت ہے۔
میں نے کہا، تو اپنے خیال کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ ساس کے ساتھ بندھ کر
دیکھ بڑا مزہ آئے گا۔ اس نے کہا دفع دور میں نہیں بندھتی! زندگی میں اور جتنے
مسائل ہیں وہ ایسے ہی ہیں۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں امریکہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہیلن
کیلے تھا۔ وہ مادر زاد اندھی تھی اور مادر زاد بہری بھی تھی اور اسی طرح پیدائشی
گونگی بھی، لیکن وہ ایک صحت مند لڑکی کی طرح پرورش پا رہی تھی۔ وہ عجیب و
غریب کیس تھا۔ اس نے یہ تہیہ کیا کہ میں تعلیم حاصل کروں گی۔ اس نے اپنے
آپ کو اپنی ذات کے اس "کِلے" کے ساتھ نہیں باندھا۔ وہ اب نہ کچھ بیان کر
سکتی تھی کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں، نہ دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ کیا آرزو رکھتی
ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ طلب پیدا ہوئی اور یہ طلب اتنی شدید ہوئی کہ اس کی

ایک سہیلی کی خالہ تھی۔ اس کا بازو اس نے پکڑ کر اس طرح سے دبایا کہ خالہ نے محسوس کیا کہ یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے بڑی مدت کے بعد زور لگا کر Language (زبان) ڈویلپ کی، جو اس کے بدن کو دبا کر بیان کرتی تھی اور وہ اسے سمجھتی تھی۔ ایک بار Ship کا لفظ آیا۔ لیکن اس لڑکی کو شپ یا جہاز کے بارے میں تصور ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کی استاد نے کہ شپ سمندر میں چلتا ہے۔ اب اسے سمندر کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ لیکن لڑکی نے کہا وہ علم ضرور حاصل کرے گی اور اس کا خیال اس ہر حاوی نہیں ہو گا اور میں خیال کو خود پر حاوی ہونے نہیں دوں گی۔ چنانچہ اس لڑکی نے سارا وقت اور ساری توجہ اپنے ذہن کے ساتھ جدوجہد کرنے میں گزار دی اور اپنے مائنڈ کو حکم دیا کہ میرے بدن پر اپنے آپ کو اپلائی کر۔ مجھے وہ علم عطا کر جو دوسرے لوگ اپنی جسمانی ساخت پوری ہونے کے سبب حاصل کرتے ہیں اور اس نے یہ کیا اور پانچ کتابیں اس نے لکھیں۔

وہ یہاں لاہور بھی آئی تھی پاکستان بننے کے بعد اور ہم بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے گئے تھے وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اپنے اُستادوں کے مخصوص طریقے سے سوالات کے کھٹ کھٹ کر کے مخصوص انداز میں جواب دیتی تھی۔ وہ اپنی آٹو بایو گرافی میں ایک کمال کی بات لکھی ہے کہ دیکھو میں بہت خوش ہوں کہ

میرے خدا نے میرے اوپر بڑا اکرم کیا ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں، یہ ساری نعمتیں اندھے ہونا، بہرے ہونا، گونگے ہونا مجھے نہ ملی ہوتیں، تو میں دنیا کی ایک نامور عورت نہ ہوتی، بلکہ ایک معمولی سی گھریلو عورت ہوتی۔

اللہ کی نعمت کے کیا کیا روپ ہیں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور شاباش ہے اس بی بی پر جس نے اسے نعمت کہہ کر پکارا۔ جب آپ کو کوئی خیال پکڑ لیتا ہے اور آپ اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو معاملہ گڑبڑ ہوتا ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ کبھی کبھی بیٹھ کر جب وقت ملے تو ضرور غور کیا کیجئے کہ آیا مجھ کو کسی "کلے" یا "سنگل" نے پکڑا ہوا ہے، یا کسی خیال نے پکڑا ہوا ہے۔ جب یہ بات آپ کے ذہن میں آ جائے گی، آپ بڑی آسانی سے اپنا مسئلہ خود حل کر لیں گے۔ خیال کی طاقت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد میں کالج میں ایم اے کے چوتھے سال میں پڑھتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس سال آدمی بڑا لائق فائق اور ذہین ہوتا ہے۔ اس جیسا دنیا میں اور کوئی ہوتا ہی نہیں اور ہم یہی سمجھتے تھے۔ میرے والد اور میرے ماموں کو خاص طور پر میرے ماموں کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ میں نماز پڑھا کروں۔ چنانچہ دونوں بیچارے اپنے اپنے طریقے سے کوشش کرتے تھے۔ لیکن میں اپنے خیال میں اتنا پڑھا لکھا تھا کہ میں باقاعدہ دلائل دیتا تھا کہ نماز میں کیا رکھا ہے۔ اللہ کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جیسے پڑھے

لکھے لوگ کہا کرتے ہیں۔

وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ مجھے پکڑ کر ایک مولوی صاحب کے پاس لے گئے، جو ہمارے شہر لاہور میں نیلا گنبد کی مسجد کے علاقے میں تھے۔ وہ مولوی صاحب وہاں بیٹھے لیکچر دے رہے تھے اور ان کے پاس تین پہیوں کی چیئر تھی۔ وہ چل نہیں سکتے تھے۔ ایک ٹانگ پر بڑی خوفناک بیماری کا حملہ تھا، جیسے "گھمبیر" وغیرہ کہتے ہیں۔ میرے والد نے کہا جی! یہ میرا بیٹا ہے۔ وہ کہنے لگے ماشاء اللہ بڑا اچھا ہے۔ لائق، ذہین، خوبصورت اور فتین لڑکا ہے۔ میرے والد صاحب نے ان سے مجھے کچھ سمجھانے کا کہا، تو کہنے لگے، نہیں پھر کسی دن آپ لوگ آئیں گے تو تلقین کریں گے۔ آج موقع نہیں ہے اور تلقین زیادہ کرنی بھی نہیں چاہیے۔ یہ آتا رہے، ملتا، ملاتا رہے۔ مجھے ان کی شخصیت نے بڑا امتاثر کیا، لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی نوجوانوں کے پاس کہاں وقت ہوتا ہے، ایسے کام کرنے کا، شرافت کا یا عبادت کا۔

میں نے کالج میں اپنے دوستوں کو بتایا تو انہوں نے کہا، ناں ناں خبردار! اس چکر میں نہ پھنس جانا۔ ہمیں دنیا بنانی ہے، ترقی کرنی ہے۔ ایک ہمارا ساتھی مولوی سے پڑھتا تھا۔ اس نے فوراً ایک آیت قرآنی کا ترجمہ پڑھا "کوشش کرو دنیا کی

طرف۔" خیر وقت گزرتا گیا اور میں کبھی کبھی مولوی صاحب کے پاس جا کر ملتا رہا۔ ان مولوی صاحب کا نام تھا مفتی محمد حسن۔ بڑے جید عالم تھے۔ انہوں نے بڑے اونچے اونچے کام کیے تھے۔ آپ نے فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ دیکھا ہو گا۔ اس کی بنیاد مفتی محمد حسن نے ہی رکھی تھی اور ان کی نگرانی میں اتنی بڑی یونیورسٹی بنی۔ ان کے جو مریدین تھے اور ان کے جو چاہنے والے تھے جن میں میرے ماموں بھی شامل تھے۔ مولوی صاحب بار بار ان سے کہتے تھے یہ ٹانگ اب ٹھیک نہیں ہو گی۔ کاٹنی پڑے گی۔ اس سے ان کے چاہنے والوں کو بڑی تکلیف تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب سے ٹانگ کاٹنے پر بہت زور دیا اور کہا اگر ڈاکٹر ٹانگ کاٹنے کا کہتے ہیں، تو پھر اس میں کیا مضائقہ ہے۔ میں آپ کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا واقعہ بتا رہا ہوں۔ اس زمانے کے بڑے اعلیٰ سرجن کرنل امیر الدّین ہوا کرتے تھے۔ بڑے نامی گرامی سرجن تھے۔ انہوں نے بھی ٹانگ کاٹنے کی ہی رائے دی۔

آخر کار ٹانگ کاٹنے کا وقت مقرر ہو گیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر لوگ کرتے ہیں۔ صبح کے وقت ان کی ٹانگ کاٹی جانی تھی اور اس سرجری میں ڈاکٹر کرنل عطاء اللہ، ڈاکٹر ریاض قدیر اور کرنل امیر الدّین نے حصہ لینا تھا۔ سب بڑی محبت اور پیار اور عقیدت اور تپاک کے ساتھ مفتی صاحب کو لے کر آئے۔ اب ایک لائق بے

ہوش کرنے والا Anaesthetist چاہیے تھا، جو بالکل مستعد رہے، تاکہ اس عمر کے شخص کی زندگی کو کوئی خدشہ یا خطرہ نہ ہو۔ اب Anaesthetist کو بلایا گیا، انہوں نے کہ مفتی صاحب آپ کو تھوڑی سی تکلیف ہو گی، کیونکہ انجکشن دینا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا یہ کیوں دیتے ہو، تو انہوں نے کہا جی اتنا بڑا کام کرنا ہے، تو اس وجہ سے بے ہوشی مقصود تھی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ آپ مجھے بے ہوش کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا جی! آپ کی ٹانگ کاٹنی ہے۔ اس میں چاقو، چھری اور آری کی ضرورت پڑے گی۔ مفتی صاحب کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب! آپ ایسا کریں کہ مجھے ایسے ہی چھوڑ دیں اور Anaesthesia وغیرہ نہ دیں۔ مجھے یہ پسند نہیں۔ یہ دخل انداز ہو گا میرے ذہن پر، اور میں اپنا ذہن سوائے اللہ کے اور کسی کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تو آپ اپنا کام کریں، میں اپنا کام کرتا ہوں۔

انہوں نے کہا، سر! آپ اپنا کام کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا، جو بھی میرا کام ہوا کروں گا اور منہ پر کپڑا لے کر لیٹ گئے۔ اب ٹانگ کٹ رہی تھی اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر جلدی جلدی ٹانکے لگا رہے تھے اور کرنل عطاء اللہ نبض پکڑے بیٹھے ہوئے تھے، تاکہ پتا چلتا رہے کہ ان کا بلڈ پریشر کہاں چلا گیا ہے۔ کام ختم ہوا اور جب پٹی باندھ دی گئی اور تینوں ڈاکٹر حیران

پریشان کھڑے ہو گئے، تو پھر مفتی صاحب نے ان سے پوچھا "میاں ہو گیا کام؟" انہوں نے کہا، جی ہو گیا۔ تب مفتی صاحب نے کہا "بہت بہت شکریہ! میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔" جو شخص اپنے خیال پر حاوی ہو جائے اور خیال اس کے تصور کی گرفت میں آجائے اور انسان یہ جان لے کہ Mind over matter کیسے ورک کرتا ہے، تو ساری مشکلات جو روز ہمیں پیش آتی رہتی ہیں اور ہم ہاتھی جتنا ڈیل ڈول لے کر اپنے "کلے" سے ڈرتے رہتے ہیں، جو ایک فٹ کا بھی نہیں ہوتا اور ساری مشکلات لپیٹ کے ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے لیے علم کا، اور تفکّر کا، فکر کرنے کا بڑا حکم آیا ہے کہ غور کریں، اب تفکّر کرنے کے طریقے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ تو عبادات میں آجاتی ہیں۔ تفکّر کرنے کے لیے آپ کو الگ سے جیسا کہ اللہ چاہتا ہے کہ جب نمازیں ادا کر چکو تو تب میرا ذکر کرو۔ دیکھیے نا کہ ذکر سے مفتی محمد حسن کہاں پہنچ گئے اور کیسے انہوں نے تقویت حاصل کر لی کہ میڈیکل ہسٹری میں یہ بات درج ہو کر رہ گئی۔

اگر آپ میں اور ہم سب اس باریکی کو سمجھنے لگیں کہ مائینڈ کے اوپر جسم کا اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا مائینڈ کا اپنا ہوتا ہے، تو پھر آپ ان مشکلات سے خود بخود نکل آئیں گے۔ آپ کو کسی بابے کی، کسی پیر کی، کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ

خدا حافظ !!

چیزوں کی کشش اور ترک دنیا

ہمارے ہاں ڈیفنس کالونی بہت خوبصورت ہے اور اس میں بڑے شاندار گھر ہیں، جو دید کے قابل ہیں۔ ایک روز ہم وہاں بیٹھے تھے۔ ایک نہایت خوبصورت گھر میں۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کے فانوس کے نیچے۔ وہ سامان و اسباب سے بھرا ہوا گھر ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے اچانک یاد آیا کہ ہوائی جہازوں کی ایجاد کا ایک سو سال پورا ہو گیا ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی زندگی میں داخل ہوئے تو اس کا جشن منایا گیا۔ اس حوالے سے ہم نے اخباروں میں بھی پڑھا، ٹی وی پر بھی دیکھا اور اور ان گزرے سو برسوں پر ہم اپنے اپنے بیان دے رہے ہیں۔ میں برسوں سے ہوائی سفر کا مسافر ہوں۔ کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ بہت خفیہ بات ہے اور آپ تک ہی رہنی چاہیے کہ 1947ء میں جب پاکستان بنا اس کے تین ماہ بعد اگست، ستمبر، اکتوبر اور نومبر میں لاہور میں ایک بہت بڑا ریفیوجی پناہ گزین کیمپ تھا۔ میں وہاں پر ہیڈ کلرک کے طور پر ملازم ہو گیا۔ کہیں نوکری ملتی نہیں تھی۔

تقسیم کے بعد بھارت سے بڑی بے چینی کے عالم میں آئے تھے۔ میں اس وقت

بی اے کر چکا تھا۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر وہ نوکری نہیں دیتا تھا۔ میں وہاں پر جا کر کہتا تھا کہ جی میں بی اے پاس ہوں۔ وہ کہتے تھے ہم اس کا کیا کریں؟ پھر میں نے ایک ٹرِک لیا اور وہاں جا کر کہا کہ جی میں میٹرک پاس ہوں فرسٹ ڈویژن میں، تو انہوں نے کہا کہ بسم اللہ اور فوری مجھے نوکری مل گئی۔ ایک آدھ مہینہ کام کیا، پھر نہرو اور لیاقت خان پیکٹ کے مطابق یہ طے پایا کہ جو یہاں کے سکھ اور ہندو شرنارتھی (پناہ گزین) ہیں، وہ بذریعہ ہوائی جہاز بھارت جائیں گے، انہیں لے جانے کے لیے ہندوستان سے ہوائی جہاز آتے تھے ہمارے پاس تو تھا کوئی نہیں۔ وہ جہاز وہاں سے مسلمان پناہ گزینوں کو بھی لے کر آئیں گے۔ یہاں مسلمانوں کو اتار دیں گے اور پھر راولپنڈی سے پشاور سے لاہور اور ملتان سے اپنے مطلوبہ مسافر بھر کر لے جائیں گے۔

اس زمانے میں سول ایوی ایشن کا ادارہ تھا اور اعوان صاحب اس کے انچارج تھے۔ والٹن ائیرپورٹ پر ان کا دفتر تھا اور وہ پرمٹ ایشو کرتے تھے کہ جو جہاز بھارت سے آیا ہے اس میں واقعی مسلمان پناہ گزین آئے۔ یہاں پر خالی ہوا اور اب آگے جا رہا ہے۔ پھر لاہور آئے گا اور پھر اسی طرح واپس جائے گا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ انہوں نے سارے والٹن کیمپ میں اپنے ادھر ادھر دیکھا، انہیں میں بڑا اسمارٹ سا کلرک نظر آیا۔ کہنے لگے، میاں! تم نے میٹرک کی ہوئی ہے۔

بڑے پڑھے لکھے ہو۔ وہ مجھے سول ایوی ایشن میں لے گئے۔ اور میری سروسز ایوی ایشن کے لیے مُستعار لے لیں۔ وہاں میری کرسی لگادی چھاؤں میں اور کہا تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ میں بہت محنت سے وہ کام کرتا رہا اور پرمٹ ایشو کرنے لگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خدا کلرک کو اتنی عزت دے تو اس کا دماغ کہاں پہنچ جاتا ہے۔

ونگ کمانڈر اعوان صاحب نے مجھے بتایا کہ یہاں جہاز کا نمبر بھرو، یہاں یہ کرو، وہ کرو اور پھر پرمٹ ایشو کرو۔ اب میرے پاس بیس، پچیس، تیس پرمٹ ہیں۔ یہ پرمٹ کیا ہے گویا کلاشنکوفیں ہیں۔ اس وقت کینیڈین اور انگریز پائلٹ آتے تھے اور میں انہیں پرمٹ ایشو کرتا تھا۔ دو تین دن تو میں نے دیکھا، پھر میں نے کہا یہ تو میرے مطیع ہیں۔ میں انہیں ایسے کیسے جانے دوں۔ ایک کینیڈین سے کہا کہ پناہ گزینوں کو یہاں ڈراپ کر دیا ہے اور جہاز خالی جارہا ہے، تو میں تمہارے ساتھ راولپنڈی چلوں گا۔ اس نے کہا "یس سر!" اس کی جان تو میری مٹھی میں تھی۔ اس نے مجھے اعلیٰ درجے کی سیٹ دے دی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ اس طرح میں آتا جاتا رہا، اور ظلم جو ہوا، جس کی میں معافی مانگتا ہوں کہ میرے وہاں جانے میں اور آنے میں، واپسی پر چار چار جہاز لینڈ ہو کر کھڑے تھے۔ انہیں چونکہ پرمٹ نہیں ملا تھا، وہ کیسے فلائی کرتے۔ تو کلرک بادشاہ جو ہوتا ہے

اور اس کی جو طاقت ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں۔

میں نے عام طور پر جب بھی ہوائی سفر کیا۔ اس میں اللہ کی مہربانی میرے ساتھ یہ رہی کہ پتا نہیں کیوں منزل مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اکثر و بیشتر میرا سامان نہیں پہنچتا تھا، یہ اکثر و بیشتر ہوا۔ اس میں خاص بات جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ 1950ء میں، میں روم سے میڈرڈ گیا۔ میڈرڈ پہنچا اور وہاں اترا تو انہوں نے کہا کہ پتا نہیں آپ کا سوٹ کیس کہاں رہ گیا۔ بہر حال ہم اسے ٹریس کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو فلاں ہوٹل میں ہوں، مل جائے تو پہنچا دیجئے گا۔ اب میں ہوٹل میں تین کپڑوں میں بیٹھا ہوں۔ ایسے ہی تین کپڑوں میں جیسے خواتین کہتی ہیں میرے خاوند نے مجھے تین کپڑوں میں گھر سے نکال دیا۔ اسی طرح جہاز نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

اس وقت میرے پاس ایک پتلون تھی۔ ایکرلک کی۔ وہ نئی نئی چلی تھی جیسے پیاز کا چھلکا ہوتا ہے۔ بہت پتلی شاید آپ کو یاد ہو۔ وہ کھٹا کھٹ دھل جاتی تھی اور استری کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی اور ایک شرٹ اور ایک بنیان تھی۔ کل تین کپڑے تھے۔ رات کو تو میں زیر جامہ میں ہی سو گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ صبح اٹھ کر وہ کپڑے پہن لیے اور میڈرڈ کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ شام کو ہوٹل آ

کر لیٹ گیا۔ دوسرے دن کپڑے خراب ہونے کی فکر لاحق ہوئی۔ سنک میں ڈال کر پہلے پتلون کو دھویا، پھر شرٹ پھر بنیان کو دھو کر وہاں لٹکا دیا اور سوتے وقت یہ دعا کی کہ یا اللہ! یہ صبح اٹھنے تک سوکھ جائیں۔

تین دن اسی طرح گزرے۔ مجھے اصل میں قرطبہ جانا تھا۔ وہاں میڈرڈ سے لاری جو پرانی وضع کی تھی، قرطبہ جاتی تھی۔ لاری کے اندر ہی انہوں نے بکرے دُنبے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس لاری میں سفر کیا۔ قرطبہ پہنچے تو میں نے کہا یا اللہ! جو میں پہنے ہوئے ہوں اب مجھے قرطبہ میں دنیا کی عظیم ترین مسجد میں جانا ہے۔ کچھ اور طرح کی کپکپی بھی طاری تھی اور میرے پاس صاف کپڑے بھی نہیں۔ وہاں نہا بھی نہیں سکتا تھا۔ مسجد موجود ہے اور میں وہاں پر نماز ادا نہیں کر سکتا۔ حکم ہی نہیں اس کا۔ یہ ساری تکالیف میرے ساتھ چلتی رہیں، لیکن ایک بات کا مجھے احساس ہوا جو اب تک ہے، وہ یہ کہ اگر انسان کے پاس چیزیں اور سامان نہ بھی ہو، تو بھی زندگی گزر سکتی ہے اور وہ سات دن میں نے اس خوشی میں اور اس سکون و آرام میں گزارے کہ مجھے کسی چیز کے چوری ہونے کا خوف، نہ مجھے اس بات کی پرواکہ کچھ میرے اوپر کیا گزرے گی۔ اتنی آسودگی کے دن کسی بہت بڑے صوفی نے تو گزارے ہوں گے۔ میری زندگی میں بس وہ سات آٹھ دن ہی تھے۔

میں لوٹ کر روم آیا تو ہوٹل میں میر اسوٹ کیس پہلے ہی آیا ہوا تھا۔ میں پھر انہی لوازمات میں گم ہو گیا جن میں ہم سب غرق ہیں۔ ہمیں ان چیزوں نے پکڑا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ممتاز مفتی صاحب نے یوں لکھا ہے: "حاجی لوگ جو حج کرنے جاتے ہیں، وہ بیچارے چیزوں کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی جان عذاب میں ہوتی ہے۔" اور ہم پاکستان کے لوگ اپنی چیزوں کے ساتھ، خواتین خاص طور پر اتنا منسلک ہو جاتی ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے لوگ جن کی میں تعریف تو نہیں کیا کرتا، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ عام روزمرہ کی چیزیں رکھتے ہیں اور باقی نہ ان کی کوٹھیاں ہیں نہ مربعے ہیں نہ سامان نہ کچھ۔ میں امریکہ میں ایک "روڑی" کچرے سے قیمتی اور بالکل صحیح حالت میں لیپ ٹاپ لایا تھا۔ امریکہ میں ہمارا یہی کام تھا صبح سویرے روڑی پر چلے جاتے۔ ایک اعلیٰ درجے کا صوفہ وہاں پڑا تھا، لیکن میں کیا کرتا۔ دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر جھولے لے کر آجاتا تھا۔ لیکن لیپ ٹاپ میں اٹھا لایا۔ بالکل چلتا ہوا۔ نیا ماڈل آنے پر کسی نے پھینک دیا ہو گا۔ ہم ابھی تک چیزوں کے ساتھ بہت بری طرح وابستہ ہیں اور آگے پیچھے ہمارے چیزیں ہی چیزیں ہیں، جو جان کا عذاب بنی ہوئی ہیں۔ میں نے جو چند روز چیزوں کے بغیر گزارے، وہ کمال کے دن تھے۔

جب میں اس کوٹھی میں بیٹھا ہوا تھا، جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا اور جو خوبصورت تھی اور کمرے میں ایک اعلیٰ درجے کا فانوس لٹک رہا تھا، جس کے نیچے ایک نوجوان لڑکا اپنے اولیول کی تیاری کر رہا تھا اور اس کا ٹیوٹر اسے پڑھا رہا تھا، تو مالک مکان داخل ہوا۔ اس نے آکر کہا، دیکھا اشفاق صاحب! اس نے چیزوں سے بھرے کمرے کے بارے میں کہا، کیا کمرہ اور اس کی سجاوٹ پسند آئی؟ میں نے کہا، جی سبحان اللہ ایسی چیزیں تو آدمی خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔ وہ ماسٹر سے کہنے لگا، آپ بھی اپنا بوریا بستر اٹھا کر اس کمرے میں آگئے ہیں۔ اس نے کہا، جی! یہاں روشنی بہت اچھی ہے۔ پڑھانے میں آسانی رہتی ہے۔ میرے دوست نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ بغیر میری اجازت کے آگئے ہیں۔ یہ اتنا اعلیٰ درجے کا فانوس ہے اور ایسی خوبصورت روشنی جو تجلّی کی طرح ہے یہ ان کے الفاظ تھے ہمارے اشفاق صاحب بھی گواہی دے رہے ہیں۔

اس نے کہا، ماسٹر صاحب! یہ ساری روشنی جو آپ کے لیے ہے، یہ صرف ایک سمسٹر کے لیے ہے، پھر تو آپ نے چلے جانا ہے۔ جتنا انجوائے کرنا ہے کر لیں۔ وہ استاد تھا تو غریب سا آدمی مگر اس نے کہا، صاحب! یہ آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ یہ ایک سمسٹر کے لیے ہے، پھر تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔ مگر آپ کے لیے بھی یہ سازوسامان زیادہ سے زیادہ چند سمسٹروں کے لیے ہے۔ آپ کے دو ہو جائیں

گے ، تین ہو جائیں گے۔ ہم دونوں بھی اسی طرح دراصل ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے ہیں۔ اس کی بات مالک کو بری لگی، لیکن بات تھی اتنی مدلّل کہ مالک کہنے لگے، کوئی بات نہیں آپ آرام سے بیٹھیں۔ اتنے ناراض نہ ہوں۔

تو جناب! یہ چیزیں انسان کو ایسا پکڑتی ہیں اور ان میں یہ بڑا کمال ہے کہ آدمی انہیں جتنا بھی جھٹکے، جس طرح سے "گوکھڑو" کے کھیت میں "پکھڑا" کپڑوں کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ آدمی اسے فوری نہیں جانتا، لیکن بعد میں یہ آپ کو تنگ کرتا ہے۔ آدمی طبعی طور پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر دیکھیں، لیکن ان کے اوپر چیزوں اور دِکھاوے کا اتنا بوجھ پڑ جاتا ہے، جیسے خالی کنستر "چبا" ہو جاتا ہے۔ وہ "چبے" ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگوں پر نگاہ ڈالیں وہ لوگ جو طبعاً بہت اچھے ہوتے ہیں، مزاجاً بھی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن دکھلاوے نے ان کے اوپر بوجھ ڈال رکھا ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ اچھی اور قیمتی، دلکش، خوبصورت چیزوں کا ہی مسئلہ نہیں ہوتا، ایک اور طرح کی چیز بھی اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔

جب ہم نور والے ڈیرے پر ہوتے تھے، تو ہمارے بابا جی کے پاس ایک نوجوان آیا۔ بڑا اچھا پڑھا لکھا۔ اس نے کہا، جی! میں نے دنیا ترک کر دی ہے اور میں نے

رہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور میں ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟ میں وہاں بیٹھا تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں تمیز نہیں ہوتی کہ بزرگ یا جس کو مخاطب کیا گیا ہے، وہی جواب دے اور وہی جانتے ہیں کیونکہ علم والے ہوتے ہیں۔ بس میں بھی بول پڑا۔ میں نے کہا، تم کو شرم آنی چاہیے۔ تم نوجوان ہو۔ کچھ کرنا چاہیے۔ ہمت سے جدوجہد سے کوشش سے یہ تم کیا کر رہے ہو، تمہیں پتا ہے تمہارے اسلام میں دنیا ترک کرنے کی اجازت ہی نہیں اور تم ترک دنیا کر رہے ہو۔ کتنی بری بات ہے۔

میری ساری گرمجوشی دیکھ کر بابا جی مُسکرائے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، بسم اللہ! بسم اللہ!! جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں ضرور کریں۔ آپ کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہو گا۔ میں حیران ہوا کہ اتنے بڑے بزرگ، ایسے بابا جی اور کیا رائے دے رہے ہیں۔ وہ نوجوان چلا گیا۔ مجھ میں جرأت ہوتی تھی بات کرنے کی، میں نے کہا بابا جی! آپ نے یہ کیا کہا؟ کہنے لگے، کوئی بات نہیں۔ ان کو آسانیاں جو عطا کرنی ہیں، یہ ان کا مقولہ تھا، اس طرح ہی آسانیاں عطا ہوتی ہیں۔ آپ نے جو کہا ٹھیک کہا وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن آسانیاں عطا کرنی بھی لازم ہیں۔ جیسے وہ نوجوان خوش ہو ایسے ہی ٹھیک ہے۔ دو تین ہفتے بعد وہ نوجوان پھر آیا اور بڑی خوشی کے انداز میں کہنے لگا، لو بابا جی! اللہ کے فضل سے سارا کام

ٹھیک ہو گیا۔ ترک دنیا کے لیے میرا تہیہ اور میری ڈیٹ ساری فکس ہو گئی۔ میرا ایک سوٹ رہ گیا ہے۔ میں نے کہا کون سا سوٹ؟ کہنے لگا، میں نے بوری کا سوٹ ، پاجامہ اور کرتہ باری کا بنایا ہے۔ وہ بن جائے تو اس کے بعد میں جنگل کو نکل جاؤں گا اور پھر کہنے لگا، میرا کشکول بھی آ گیا ہے۔ یہ کالے رنگ کا جو کشکول آپ نے دیکھا ہے یہ جرمنی میں بنتا ہے، جو عام فقیر لیے پھرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ڈپارٹمنٹل سٹور والے سے پوچھا کہ کہاں سے ملتا ہے؟ کہنے لگے، جی ہم جرمنی سے امپورٹ کرتے ہیں۔ میں نے کہا فقیر بڑے سیانے ہیں۔ بڑے باذوق ہیں جو جرمنی سے منگواتے ہیں۔ اس نوجوان نے کہا کہ "کھونڈے" لٹھ کو بھی گھنگھرو لگ گئے ہیں۔

جب اس نے یہ چیزیں گنوائیں تو میں نے کہا بابا جی! آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ نوجوان تو الٹا عذاب میں پڑ گیا ہے۔ یہ تو چیزوں کے چکر سے نکل ہی نہیں سکا۔ یہ تو الٹا چیزوں کو جمع کر رہا ہے۔ انہی چیزوں کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ اس نے تو دوسری بلا گلے میں ڈال لی ہے۔ جب اس نے چیزوں کی تیاری کی بابت اظہار کیا تو بابا جی نے کہا، اتنی "کھیچل" مشقت جو کرو گے، اتنی مشکل جو اٹھاؤ گے، ایسے ہم سے دوری اختیار کرو گے تو دفع کرو ترک دنیا کو اور دفع کرو رہبانیت کو جیسے بیہودہ ہم ہیں ویسے تم ہو جاؤ۔ یہیں رہا کرو، لنگر کھایا کرو اور چین کی نیند سویا کرو۔

تب اس کی سمجھ میں آئی بات۔

انسان بعض اوقات یہ سوچتا ہے کہ جناب اگر میں یہاں سے جگہ چھوڑ کر اسلام آباد چلا جاؤں، تو ساری مشکلات کا حل نکل آئے گا یا بچے کی شادی ہو جائے تو معاملات حل ہو جائیں گے۔ جب آپ اسلام آباد جائیں گے تو آپ اپنا آپ بھی تو ساتھ لے جائیں گے نا۔ جو ان ساری چیزوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے، کشش رکھتا ہے۔ آپ تو دراصل مقناطیس ہیں اور مشکلات تو وہ لوہے کے ذرّے ہیں، جو آپ سے چمٹے ہیں۔ شہر بدلنے سے، لباس تبدیل کرنے سے، مزاج بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک خاص طرح کی رحمت ہوتی ہے، جو بندہ اللہ سے درخواست کرے کہ مجھ پر خصوصی فضل فرمایا جائے، تاکہ میں اس عذاب سے نکلوں۔ تب نجات ملتی ہے، لیکن چیزیں تبدیل کرنے سے یا چھوڑنے سے یا نئی چیزیں اختیار کرنے سے ایسے ہوتا نہیں۔ یہ بات تھی جو میرے ذہن میں آگئی۔ تو میں نے آپ کے حضور عرض کر دی۔ آپ کی محبت اور توجہ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

دِل کا معاملہ

"زاویہ" اب محض پروگرام نہیں رہا۔ اس میں کچھ اندر کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اندر کی باتیں اتنی اہم اور ضروری نہیں ہوتیں لیکن گھر والے چونکہ گھر والے ہوتے ہیں اس لیے اندر کی باتیں چلتی رہتی ہیں جیسے گھروں میں چلتی ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں شروع ہی سے لالچی اور خود پرست انسان رہا ہوں۔ میری ماں ہم سب بھائیوں کو لوکاٹ، بیر، گنڈیریاں، جامن بانٹا کرتی تھیں تو میری عادت ہوتی تھی کہ مجھے زیادہ ملیں اور کسی نہ کسی طریقے سے میں یہ کوشش بھی کرتا تھا کہ تم کہو تو مجھے یہ چیزیں زیادہ ملیں۔ آج بازار سے گزرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ تب میں حلوائی کی دکان کے آگے سے بہت آرام اور آہستگی سے گزرتا تھا اور چیزوں کو اس وقت تک گردن گھما کر دیکھتا تھا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتیں اور عید کے روز تو میں ہر بڑے بزرگ کو خوامخواہ سلام کرتا تھا اور انہیں بھی جنہیں میں جانتا بھی نہیں تھا تاکہ عیدی مل سکے۔ زندگی ایسے ہی چلتی رہی۔ پچھلے سال یہ خواہش بڑے تیزی سے پیدا ہوئی کہ کیا میں بھی کوئی سروس کر سکتا ہوں یعنی میں بھی کسی "خدمت" کی جانب رجوع کر سکتا ہوں۔ میرے سے چھوٹے بڑے بڑے کام

کر رہے ہیں۔ ہسپتال بنا رہے ہیں اور تعلیمی ادارے کھول رہے ہیں اور رفاہی کام کر رہے ہیں۔ مجھ سے آیا یہ کام ہو سکے گا۔ میری قسمت میں ایسا کرنا لکھا ہے یا نہیں۔ مجھے اس بات کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

گزشتہ دنوں بائیس دسمبر کو بہت دھند پڑی اور ساری رات ہمارا علاقہ شدید دھند میں لپٹا رہا۔ لاہور اور سیالکوٹ خاص طور پر۔ میں اپنے کمرے میں رات کے وقت بالکل اکیلا تھا۔ باقی سارے گھر کے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں کھڑکی کھول کر دھند کا نظارہ کرتا رہا اور میرا خیال تھا اور مجھے یقین تھا کہ جب میں اکیلا ہوں اور بہت ہی اکیلا ہوں اور رات کا وقت جس کی بڑی تعریف کی گئی ہے، ہو تو مجھے میرے سوال کا جواب موصول ہو گا۔ میں اس وقت اپنی محبوب چائے ”کیمو ملائی“ پی رہا تھا۔ یہ چائے بڑی مفید ہوتی ہے۔ اس سے ایک تو ذہن کے پردے کھلتے ہیں اور کچھ روح کے پردے بھی کھلتے ہیں اور ان میں کچھ عجیب طرح کی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میں اٹلی میں تھا چون، پچپن برس پہلے تو ایک واقعہ پیش آیا۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرے باس نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جو برداشت نہیں ہوتیں۔ دیارِ غیر میں کسی اور حکومت کی نوکری کرتے ہوئے کچھ ایسا تاثر پوچھا جائے کہ ”آپ کے قبیل کا کوئی اور شخص آپ

کے ملک میں موجود ہے جسے ہم اگلے سال ٹرائی کر سکیں۔"یعنی مجھ سے ہی پوچھا جارہاہے کہ تمہاری جگہ کسی اور کو لا سکیں۔ میں بہت دکھی تھا حالانکہ میں اپنی لیاقت کا پورا اظہار کر رہا تھا، لیکن ہمارے باس کی اپنی محبوبہ سے کچھ لڑائی ہو گئی تھی اور جو پہلا بندہ اس کی راہ میں آیا وہ میں تھا حالانکہ نہ میں نے لڑائی کروائی تھی نہ میرا قصور تھا۔ تو وہ ایک تکلیف دہ شام تھی جب میں گھر آیا تو میں نے اپنی لائن لونگ (Line Living) سے پوچھا کہ مجھے کوئی اچھی سی Sleeping Pill لکھ دیں۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ وہ کہنے لگی تمہیں یہ کیوں چاہیے۔ میں نے کہا میں آرام سے سونا چاہتا ہوں۔ میں تکلیف میں ہوں۔ اس نے کہا ہم تو نیند کی گولیاں نہیں استعمال کرتے۔ ہم نہیں جانتے یہ تو ولائتی انگریز لوگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا جب تم پر کوئی مشکل آجائے تو پھر آپ لوگ کیا کرتے ہو، کہنے لگا ہم تو"کیمو ملاٹی" پی لیتے ہیں اور آرام سے سو جاتے ہیں۔ تم بھی پیو تمہارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ اس نے اپنا اوور کوٹ پہنا، اونی جوتے پہن کر نیچے سیڑھیاں اتر گئی اور جا کے کیمو ملاٹی کا ایک ساشے خرید لائی اور مجھے اس میں گرم پانی ملا کر ایک پیالی دے دی۔ میں نے اسے پیا تو نیند آنے سے پہلے، اب یہ تصور کی بات آپ کہہ لیجئے میں بیٹھا تھا اپنی کرسی پر تو مجھے بڑا اچھا سا لگا اور میں نے کہا میں کل صبح اپنے باس کو جا کر بتاؤں گا کہ ہاں میرے جیسے تین آدمی اور بھی ہیں

وہاں پر اور آپ انہیں بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ میں نے کہا یہ تو کمال کی چیز ہے۔ اس وقت سے لے کر میں اب تک جب کبھی اچھی کیفیت کی ضرورت محسوس کرنا چاہوں تو "کیمو ملائی" پی لیتا ہوں۔ میرے دوست مجھے وہاں سے بھیجتے ہیں اب یہاں بھی یقیناً ملتی ہوں گی۔ نہ بھی ملے تو میں آپ کو یہ تفصیل سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ کیمو ملائی آپ خود بھی پی سکتے ہیں۔ یہ ہمارے عطا کے ہاں سے ایک روپے کا اتنا پڑا ابھر دیتے ہیں اسے بابونہ کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں اگنے والی جڑی بوٹیاں ہیں۔ گل بابونہ آپ مع اس کی شاخوں کے لے کر اسے چورا کر کے ململ کی پوٹلی میں باندھ کر چائے میں غوطہ دیں۔ تو اس دھند کی رات کو میں اپنی پیاری کیمو ملائی پی رہا تھا اور "بابونہ قہوہ" بھی۔ پھر بھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی تھی جو آرزو تھی کہ پیدا ہو اور جب کبھی مجھ پر یہ خواہش طاری ہوتی ہے تو دھند کے جو دبیز پردے چھٹ جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے دھند کو بہت قریب سے ملاحظہ کیا ہو تو دھند ساری کی ساری ایسے نہیں چھائی رہتی جیسے ہمارے ذہنوں پر چھائی رہتی ہے۔ یہ دھند جو اصلی ہے اس کا رنگ کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔ یہ رول کرتی ہے۔ اور رول کرنے کے بعد اس کی دبازت جب کم ہو جاتی ہے تو درمیاں میں سے ایک لائٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتہ نہیں وہ لائٹ کہاں سے آتی ہے۔ آپ دھند کو دیکھیں، چاہے گاڑی میں بیٹھے ہوں، دبیز دھند گہری ہو جائے گی اور

آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔

دھند کو دیکھنا اور اس کے ساتھ وابستگی پیدا کرنا ان مراحل کو طے کرنے میں بڑی آسانی عطا کرتا ہے، اگر لوگ باطن کے سفر کو اختیار تو نہیں کرتے میری طرح سے بیٹھ کے دیکھتے ضرور ہیں۔ میں جب وہاں بیٹھا تھا تو مجھے میرے سوال کا جواب تو نہیں ملا کہ میں رہنے والوں میں سے بھی ہو سکتا ہوں یا نہیں یا میں کوئی بڑا کام کر سکتا ہوں یا نہیں۔ البتہ مجھے اپنے اندر سے ایک حکم نامہ ضرور جاری ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ کوئی لمبا اور بڑا کام نہیں کیا جا سکتا، لیکن تم اپنے افعال کو اپنے ارادوں کو لمحات میں، حصوں میں بانٹ سکتے ہو۔ قدم ایک اٹھانا ہے پھر رکھنا ہے اور پھر اس کے بعد تمہیں نیا قدم ملتا چلا جائے گا۔ لیکن اس ایک قدم میں یہ شرط ہے کہ تمہیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جو کام کرنے لگو اس کام کے اندر دل بھی ہے کہ نہیں۔ کام ایک وجود والی چیز ہے اور وجود کا ایک دل بھی ہوتا ہے۔ اگر اس کا دل نہیں میں داخل ہونے کی کوشش کرو، بہت کام ایسے ہوتے ہیں جو دل کے بغیر کیے جاتے ہیں اور چلتے ہیں، نہ کام میں دل ہوتا ہے نہ اس فعل میں دل ہوتا ہے نہ آپ کے آگے آنے والی چیز میں دل ہوتا ہے۔ اب تو سائنسدان کہتے ہیں کہ دل مکھی سے لیکر ہاتھی تک ہر ایک میں ہوتا ہے وائرس تک میں ایک چیز ایسی ہوتی ہے جس کو آپ دل سے مشابہ کر سکتے ہیں۔ اگر اس

میں دل ہے تو پھر کسی کام میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم خلوص اور نیک نیتی سے داخل ہو گے کسی بھی چھوٹے کام میں تو پھر آپ کو ایک Step اور ملے گا چھوٹے انداز میں اور یہ جڑتے جائیں گے اور وہ بڑا کام جس کا تم ذکر کرتے ہو یہ ان سے بھی بڑھ جائے گا۔

میں اس وقت سوچنے لگا میرے چھوٹے کام تو بس اتنے ہی ہیں کہ کبھی کبھی میں دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے انداز میں کسی کو بتائے بغیر میوزیم میں چلا جاتا ہوں اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم پھر کر سامنے بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں چاہے Fasting Buddha ہو چاہے نہ ہو یہ میرا عمل ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ میں لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں چلتا جاتا ہوں تھک جاتا ہوں تو کسی قبر کے چبوترے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کبھی کوئی کتبہ پڑھ لیا کبھی نہ پڑھا۔ اس عمل سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوتی ہے اب تو عمر کی وجہ سے میں اس طرح سے نہیں جا سکتا پھر میں اپنی پوتی مایا جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ، میرے بڑے بھائی ہیں، کے پوتے پوتیوں کے ساتھ وقت گزار لیتا ہوں۔ بچوں کو اپنے بڑوں کے بارے میں جاننے کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ وہ کیسے تھے۔ کیسے رہتے تھے؟ میں انہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے دادا کو جانوروں کا بڑا شوق تھا اور انہیں ایک عجیب

طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ڈیڈی کہتے ہیں کہ انہوں نے کتّے رکھے ہوئے تھے میں نے کہا کہ ہاں بڑے خونخوار کتّے تھے یہ ان کا شوق تھا اور عام سے سیدھے سادے کتّے گلی کے وہ بھی ان کے پاس آجاتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ چلو تم بھی آجاؤ۔

میں نے کہا وہ تمہارے دادا تھے یعنی میرے بڑے بھائی تھے اب بچے ان کے بارے میں اور جاننا چاہتے ہیں۔ مایا کہتی ہے دادا وہ سنا ہے کتّے لڑاتے بھی تھے۔ میں نے کہا ہاں کتّے لڑاتے بھی تھے اب میرے اور آپ کے ذہن میں جاگتی ہے کہ ہم رحم دل لوگ ہیں اور اخبار میں ہم پڑھتے ہیں کہ بڑے جاگیر دار زمیندار لوگ کتّے لڑاتے ہیں اور وہ بڑے خون خوار انداز میں لڑتے ہیں تو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کتّوں کی لڑائی ایسی نہیں ہوتی جیسے ہماری ذہن میں ہے یہ بات میں مایا کو بھی بتاتا ہوں۔

گاؤں میں تین چار ہزار کا ایک بڑا کھلا ''پڑ'' ہوتا ہے۔ کھلا میدان چھوڑا ہوتا ہے، کرکٹ کے میدان جتنا۔ ایک شخص ادھر سے کتّا لے کر آتا ہے جو اس نے بڑی محنت کے ساتھ پالا ہوتا ہے۔ بادام چھوہارے، گھی، مکھن کھلا پلا کے۔ دوسرا اپنی طرف سے لے کر آتا ہے لیکن وہ عام سے دیسی کتّے ہوتے ہیں جو انہوں نے

پالے ہوتے ہیں پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں اور پھر وہ ان کی سنگلی (زنجیر) کھول دیتے ہیں اور کتّے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔

میں نے جب تک یہ لڑائی نہیں دیکھی تھی کہ کتّے جھپٹتے کس طرح سے ہیں اور وہ کیسے ایک دوسرے کی کھال ادھیڑ دیتے ہیں اور برا حال ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن اور تصورات میں ایسی تصویریں بنتی تھیں لیکن خواتین و حضرات جب وہ کتّے آپس میں لڑتے ہیں تو ایسے لڑتے ہیں جیسے اکھاڑے میں پہلوان لڑتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی گردن میں دانت بھی گاڑتے ہیں جس سے تھوڑا بہت خون بھی نکلتا ہے لیکن وہ کتّے بس اکھاڑے کے پہلوانوں کی طرح ہی لڑتے ہیں۔ ایک کتّا اپنا دایاں پنجا اٹھا کر دوسرے کے گلے میں ڈالتا ہے اور اسے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اس کو دھکیل کے پیچھے کر دیتا ہے وہ دانتوں سے بہت کم کام لیتے ہیں اور اس طرح پنجوں سے بھی کم کام لیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی جسمانی طاقت سے ٹکراتے ہیں۔ جیتنے اور ہارنے کی یہ شرط یہ ہوتی ہے کہ جو کتّا گر جائے اور اس کی زمین پر پیٹھ لگ جائے جسے "کنڈ" لگ جانا کہتے ہیں وہ ہار جاتا ہے اور دوسرا جیت جاتا ہے، اور پھر ڈگا ڈگ ڈگ ڈھول بجتا ہے اور دوسرا ہارا ہوا کتّا شرمندہ سا دُم دبا کے مالک کے ساتھ جا رہا ہوتا ہے۔ مالک بھی شرمندہ سا ہو کے جاتا ہے۔ جب میں بچوں کو یہ بتا رہا تھا کہ

تمہارے دادا کتوں کے ایسے ہی شوقین تھے اور انہیں اسی قسم کے کتّے پسند تھے تو مایا کہتی ہے یہ دادا برا فعل ایسا ہے جو نہیں کیا جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ جانور سے محبت کے انداز اور مظہر ہیں۔ اب دیکھ لو کہ یہ مظہر سچ مچ آپ کے اندر موجود ہے یا کہ نہیں کیونکہ جب تمہارے دادا ایک اور عمر کو پہنچے جو بالکل آخری عمر ہوتی ہے تو بے شمار چڑیاں ان کے ہاتھ پر بیٹھ کر ان کے ہاتھ سے آٹا چھین لیتی تھیں۔ تقریباً تیس تیس چڑیاں ہاتھ کے اوپر بیٹھ کر آٹا کھانے کے لیے لڑائی کر رہی ہوتی تھیں۔ یہ لمبی ساری کہانی سنانے کا میرا مقصد یہ تھا کہ جب آپ بات کرتے ہیں تو ایک تعلق پیدا ہوتا ہے ایک رشتہ بنتا ہے بچے کے ساتھ یا کسی بندے کے ساتھ اور آپ اس بات میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اس کہانی کا دل بن جاتا ہے۔ سننے والے کے لیے بھی اور سنانے والے کے لیے بھی۔ تو پھر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ہاں اب آپ کو اس کے بعد ایک نیا Step ملنے والا ہے اور آپ اس نئے Step میں داخل ہو سکتے ہیں ورنہ میری آپ کی روٹین وہی رہے گی جو چلتی آئی ہے اور چلتی آ رہی ہے۔ اس دھند کے اندر یہ ایک سیاہ اور دبیز پردوں کے اندر سے جب یہ روشنی پیدا ہوتی ہے ایسے انسان کی زندگی میں بہت دبیز اور بڑی گہری دھند کے بعد روشنی کا ایک سپاٹ آتا ہے جس میں بڑی آسانی کے ساتھ جا کر وہ اپنی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ کریز کے اندر آ سکتا ہے۔

زندگی میں کام کرنے کے لیے، اپنی کریز کے اندر رہ کر کھیلنے کی ضرورت ہے۔ آپ ہر وقت چھکا نہیں مار سکتے۔ ہر وقت چوکا نہیں مار سکتے لیکن آپ اپنی کریز کے اندر رہ کر بہت محدود کریز کے اندر رہ کر بہت بڑا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ۲۲ دسمبر کو اس دھند کی وجہ سے یہ بات کھلتی گئی اور چلتی گئی ظاہر ہے کہ اس میں " کیمو ملاٹی "کا بھی ضرور اثر تھا اور اس سوچ کا بھی جو میرے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔

میں نے اب تہیہ کیا اور میں آپ کی خدمت میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آپ نے بھی تہہ کیا ہو گا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں نیا سال شروع ہونے والا تھا جو اب شروع ہو گیا ہے۔ تو اس کے لیے کوئی بڑا پلان بنانے کی، کوئی اونچا تاج محل تیار کرنے کی، کوئی عظیم پاسٹیل بنانے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب ایسا سفر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر کوئی یہ کام نہیں کر سکتا۔ بہت ہی چھوٹے کام ایسے ہیں کہ آدمی کتنے دلوں کو خوش کر سکتا ہے " نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری " نہ آپ کو زکوٰۃ مانگنی پڑے نہ کسی کے پاس جانا پڑے گا نہ آپ کو کوئی اونچا کام پڑے گا۔ جسمانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے کام ہو رہے ہیں تعلیم دی جا رہی ہے، ہسپتال کھل رہے ہیں، ہسپتال ہمیں جسم عطا کر سکتے ہیں ہمیں "جھارا" "بھولو" اور "انو کی" بنا سکتے ہیں لیکن آدمی تو کچھ اور بھی مانگتا ہے۔ آدمی خالی جسم کا تقاضا نہیں کرتا۔ بھیس خالی جسم ہے۔ بندر، نیولا، چوہا، ہاتھی،

زرافہ، شیر، ببر شیر یہ ایک جسم ہیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے یہ خالی جسم نہیں ہے۔

دھند کے اندر سے جو روشنی کا ایک سوال نکلا ہے وہ کہ ہمیں بالکل چھوٹا ایک کام کرنا ہے۔ اپنے ارد گرد کے بندوں کو، نہایت چھوٹے بندے کو یہ تسلی اور تشفی عطا کرنی ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم میرے ساتھ ہو اور اس ساتھ کے اندر ایک انگڑا چلا کہ ہمیں آگے چلنا ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم نے کچھ بڑا کام نہیں کرنا ہم نے کچھ چندے اکٹھے کرکے پمفلٹ چھپا کے ایسا کچھ نہیں کرنا ہے لیکن ہمیں چلتے رہنا ہے آپ نے کبھی دکانداروں کو دیکھا ہو گا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو دکاندار بہت زیادہ بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے اس نے آیتوں کے چھوٹے چھوٹے کارڈ چھپوا کے رکھے ہوتے ہیں (یہ میں اس رمضان شریف میں دیکھا ہے) ایک طرف درود شریف چھپا ہوتا ہے کچھ حل المشکلات کی آیات ہیں وہ آپ کو ساتھ ضرور دیتا ہوں۔ ہم نے کارڈ نہیں چھپوانے، ہمارے دل کا کارڈ جب نکلے تب ہی نکلے۔ ضروری نہیں ہر وقت نکلے۔ کئی دفعہ ہم ایسی کیفیت میں بھی ہوتے ہیں جیسے میں تھا اٹلی میں اور اس خاتون نے مجھے چائے پلائی اور مجھے آرام سے بستر میں چھپا کر سلا دیا۔ بڑی مہربانی، اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

بابا رتن ہندی کا سفر محبت

یوں تو زندگی کے ہر کام کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لیے کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اور آدمی بغیر کوشش کے کہیں پہنچ نہیں سکتا لیکن کسی بابے کو پانا یا کسی روحانی شخصیت کو تلاش کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ آپ اس طرح نہیں کر سکتے کہ مزے سے پلنگ پر بیٹھے حقّہ پیتے یا میز پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لگاتے رہیں اور بابا چل کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ بابے کو تلاش کرنے کے لیے آپ کو کچھ محنت، کچھ کوشش کرنی پڑے گی اور کچھ بھی آرزو رکھنا پڑے گی اور کچھ نہیں تو ایک یقین محکم اور پختہ ارادہ، ایک سچی تمنا ضرور چاہیے چونکہ تمنا ہو تو پھول کھلتا ہے۔ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اشفاق صاحب کسی "بابے" کا ٹیلی فون نمبر بتائیں یا اس کا موبائل ہمیں دے دیں۔ بھئی ایسے تو نہیں ہوتا نہ ان کا کوئی نمبر اور نہ پوسٹل ایڈریس۔ آپ حیران ہوں گے اور جب بہت دور آگے نکل جائیں گے تو پتا چلے گا کہ یہ تو اندر سے ہی پیدا ہوتا ہے اور یکا یک سامنے آجاتا ہے اور آپ کو اندر کی باتیں بتاتا ہے اور اندر ہی کی باتیں سکھاتا ہے اور انسان کے دل میں، ذہن اور روح میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ میں کسی ایسی شخصیت سے ضرور ملوں جو ہر حال میں اور ہر رنگ میں مجھ سے بہتر

ہو اور ارفع ہو۔ پھر انسان کے ذہن میں یہ آرزو پیدا ہونے لگتی ہے کہ جیسے لڑکیاں میک اپ کرتی ہیں، میں بھی میک اپ کروں لیکن اندر کا میک اپ ہو۔ ویسے باہر کا بھی ہونا چاہیے، یعنی لپ سٹک، نیل پالش، مسکارہ وغیرہ وغیرہ۔

بسم اللہ، یہ ساری چیزیں بھی استعمال کریں جو بندہ استعمال کرتا ہے کہ اچھا لگے۔ پھر ایک سٹیج ایسی بھی آجاتی ہے کہ اس کو اپنا اندر اچھا نہیں لگتا اور اس کی آرزو ہوتی ہے کہ میں اندر کا میک اپ کر کے کسی مقام تک پہنچوں اور پھر ایسی روح کے ساتھ ساز اور تعلق رکھوں جو بہت ارفع و اعلیٰ ہو۔

ہمارے یہاں قریب ہی بھارت میں ایک جگہ ہے جسے بٹھنڈہ کہتے ہیں۔ یہ بڑا مشہور شہر ہے۔ کیونکہ ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ تقریباً جتنی بھی گاڑیاں بھارت کے شمالی علاقوں میں چلتی ہیں، وہ سب کی سب یہاں سے ہو کر جاتی ہیں۔ جو میری عمر کے لوگ ہیں وہ اس محاورے کو بھی جانتے ہوں گے۔ کہ "اس نے B.A VIA BATHINDA کیا ہے-" اس لیے وہ آسان بی اے ہوتا تھا۔ کوئی منشی فاضل، مولوی فاضل کر کے صرف انگریزی کا امتحان دے کر ایک لولی لنگڑی بی اے کی سند حاصل کر لیتا تھا اس اعتبار سے بھی بٹھنڈہ بہت مشہور تھا، لیکن میری نگاہوں میں اس شہر کا رتبہ ان ساری چیزوں سے بلند ہے۔ کسی

زمانے میں، صدیوں پہلے اس شہر میں ریت کے میدان میں شام کو نوجوان اکٹھے ہوتے تھے اور اپنی اس زمانے کی (بہت عرصہ بہت صدیاں پہلے کی بات کر رہا ہوں) کھیلیں کھیلتے تھے اور لٹھ گھماتے "۔ "گدھا کا کھیلتے" اور "بلم" کے کھیل دکھاتے تھے۔ پھر تھک ہار کے، کیونکہ یہ جوان اور کڑیل کھیلیں ہوتی تھیں، چاندنی رات میں اسی ریت پر بیٹھ کر کہانیاں کہتے " ایک دفعہ کہانیاں کہتے کہتے کسی ایک نوجوان لڑکے نے اپنے ساتھیوں سے یہ ذکر کیا کہ اس دھرتی پر ایک "اوتار" آیا ہے لیکن ہمیں پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے ایک ساتھی رتن ناتھ نے کہا: "تجھے جگہ کا پتا نہیں ہے" اس نے کہا مجھے معلوم نہیں لیکن یہ بات دنیا والے جان گئے ہیں کہ ایک اوتار اس دھرتی پر تشریف لایا ہے۔

اب رتن ناتھ کے دل میں یہ "کھد بد" شروع ہو گئی کہ وہ کون سا علاقہ ہے اور کدھر یہ اوتار آیا ہے اور میری زندگی میں یہ کتنی خوش قسمتی کی بات ہو گی اور میں کتنا خوش قسمت ہوں گا اگر اوتار دنیا میں موجود ہے اور اس سے ملوں اور اگر نہ ملا جائے تو یہ بہت کمزوری اور نامُرادی کی بات ہو گی۔ چنانچہ اس نے ارد گرد سے پتہ لیا، کچھ بڑے بزرگوں نے بتایا کہ وہ عرب میں آیا ہے اور عرب یہاں سے بہت دور ہے۔ وہ رات کو لیٹ کر سوچنے لگا کہ بندہ کیا عرب نہیں جا سکتا۔ اب وہاں جانے کے ذرائع تو اس کے پاس تھے نہیں اس کا تہیہ پکا اور پختہ ہو

گیا۔ اس نے بات نہ کی اور نہ کوئی اعلان ہی کیا۔ کوئی کتاب رسالہ نہیں پڑھا بلکہ اپنے دل کے اندر اس دیوتا کا روپ اتار لیا کہ میں نے اس کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا ہے اور میں نے یہ خوش قسمت آدمی بننا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی مضبوط موٹی ''ڈانگ'' لی۔ اس کو تیل پلایا، اس پر ''کھرکے'' لگائے اور اس کے آخر پر بلم (برچھی) لگائی، خونخوار، خوفناک جانداروں سے بچنے کے لیے۔ اپنا تھیلا لیا، دو جوتے موٹی کھال کے اور موٹے تلے کے بنوائے اور ڈانگ کندھے پر رکھ کر چل پڑا۔

وہ چلتا گیا، چلتا گیا، راستہ پوچھتا گیا اور لوگ اسے بتاتے گئے۔ کچھ لوگوں نے اسے مہمان بھی رکھا ہو گا لیکن ہمارے پاس اس کی ہسٹری موجود نہیں ہے۔ وہ چلتا چلتا مہینوں کی منزلیں ہفتوں میں طے کرتا ہوا مکہ شریف پہنچ گیا۔ غالباً ایران کے راستے سے اور اب وہ اپنی بولی میں وہاں تڑپتا پھرتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ ایک ''اوتار'' آیا ہے۔ اب کچھ لوگ اس بات کو لفظی طور پر تو نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کی تڑپ سے اندازہ ضرور لگاتے تھے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ وہ یہاں نہیں ہے بلکہ وہ یہاں سے آگے تشریف لے جا چکے ہیں اور اس شہر کا نام ''مدینہ'' ہے۔ اس نے کہا میں نے اتنے ہزاروں میل کا سفر کیا ہے یہ مدینہ کون سا دور ہے، میں یہ چھ سو کلو میٹر بھی کر لوں گا۔ وہ پھر چل پڑا اور آخر کار مدینہ

منوّرہ پہنچ گیا۔ بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں اور کہیں بھی اس کا ذکر اس تفصیل کے ساتھ نہیں آتا جس طرح میں عرض کر رہا ہوں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی کتاب میں ایک جملہ لکھا ہے کہ "بابا رتن ہندی" حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا پھر معلوم نہیں کہ اس کا کیا ہوا" لیکن غالب گمان ہے اور عقل کہتی ہے اور ہم اندازے سے یقین کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں کہ وہ مدینہ شریف میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں رہا اور حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے پسندیدہ لوگوں میں سے تھا۔ اب وہ کس زبان میں ان سے بات کرتے ہوں گے، کیسے رابطہ کرتے ہوں گے یہ رستے بھی بڑی آسانی سے کھل گئے ہوں گے اور رتن کس طرح سے مدینہ شریف میں زندگی بسر کرتا ہو گا؟ کہاں رہتا ہو گا، اس کا ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے لیکن وہ رہتا وہیں تھا اور وہ کب تک وہاں رہا اس کے بارے میں بھی لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طلب تھی اور اس کی خوش قسمتی تھی اور خوش قسمتی ہمیشہ طلب کے واسطے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کی طلب نہ ہو تو خوش قسمتی خود گھر نہیں آتی۔

وہ اتنے معزز میزبان کا مہمان ٹھہرا اور وہاں رہا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب رسول پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم مدینہ شریف تشریف لے گئے تو وہاں کی

لڑکیوں نے اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دف پر گانا شروع کر دیا کہ "چاند کدھر سے چڑھا" وہ خوش قسمت لوگ تھے، ایک فکشن رائٹر کے حوالے سے میں یہ سوچتا ہوں کہ اس وقت کوئی ایسا محکمہ پبلک سروس کمیشن کا تو نہیں ہو گا نہیں، اس وقت کوئی پبلک ریلیشن یا فوک لور کا ادارہ بھی نہیں ہو گا کہ لڑکیوں سے کہا جائے کہ تم ٹیلے پر چڑھ کے گانا گاؤ۔ وہ کون سی خوش نصیب لڑکی ہو گی جس نے اپنے گھر والوں سے یہ ذکر سنا ہو گا۔ رات کو برتن مانجھتے یا لکڑیاں بجھاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم تشریف لا رہے ہیں اور اندازہ ہے کہ عنقریب پہنچ جائیں گے اور پھر اس نے اپنی سہیلیوں سے بات کی ہو گی اور انہوں نے فیصلہ کیا ہو گا کہ جب وہ آئیں گے تو ہم ساری کھڑی ہو کر دف بجائیں گی اور گیت گائیں گی۔ اب جب حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے آنے کا وقت آیا ہو گا تو کسی نے ایک دوسری کو بتایا ہو گا کہ بھاگو چلو، محکمہ تو ہے کوئی نہیں کہ اطلاع مل گئی ہو گی، یہ طلب کون سی ہوتی ہے، وہ خوش نصیب لڑکیاں جہاں بھی ہوں گی وہ کیسے کیسے درجات لے کر بیٹھی ہوں گی۔ انہوں نے خوشی سے دف بجا کر جو گیت گایا اس کے الفاظ ایسے ہیں کہ دل میں اترتے جاتے ہیں۔ انہیں آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو دیکھ کر روشنی محسوس ہو رہی ہے، پھر وہ کون سی جگہ تھی جسے بابا رتن ہندی نے قبول کیا اور سارے دوستوں کو چھوڑ کر اس

عرب کے ریتلے میدان میں وہ اپنی لاٹھی لے کر چل پڑا کہ میں تو او تار سے ملوں گا۔

بہت سے اور لوگوں نے بھی رتن ہندی پر ریسرچ کی ہے۔ ایک جرمن اسکالر بھی ان میں شامل ہیں۔ جنہوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ ہمارے ایک دوست اکرام چغتائی ہیں وہ بڑے تحقیق کے آدمی ہیں انہوں نے مجھے جرمن زبان میں رتن ہندی کے بارے ایک ریسرچ سنائی کہ رتن ہندی کون تھے؟ کتنی دیر وہاں رہے، کہاں رہے، کیسے تھے؟ کب چلے۔ دیکھئے یہ باہر کے لوگ بھی کمال کرتے ہیں، ہمیں تو پتہ تک نہیں۔۔۔۔۔رتن ہندی بھی کمال کا آدمی تھا کیوں اس نے خود کو تاریخ میں آنے نہیں دیا؟ کیوں کہ اس نے شور مچا کر نہیں کہا کہ میرا نام درج کرو لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے محبت ہو تو اونچی آواز میں بولنے لگیں، ایک دوسرے کو بتانے لگیں۔ یہ کام تو رتن ہندی ہی کر سکتا تھا۔

جب یہ سب کچھ میں دیکھ چکا اور پڑھ چکا تو میرے دل میں خیال آیا کہ بعض اوقات ایسی حکایتیں بن جایا کرتی ہیں، لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ میں بڑی پریشانی میں رہا کیونکہ مجھے ایسا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تھا جس کا سہارا لے کر میں ان کے

روٹ کو جس راستے سے وہ گئے تھے پہچان سکوں۔ یہ پتہ چلتا تھا جرمن ریسرچ سے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ارشاد پر ان کی اجازت لے کر واپس ہندوستان آ گئے۔ ہندوستان آئے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے گاؤں ہی گئے ہوں گے اور بٹھنڈہ میں ہی انہوں نے قیام کیا ہو گا۔ میری سوچ بھی چھوٹی ہے۔ درجہ بھی چھوٹا ہے، لیول بھی چھوٹا ہے پھر بھی میں نے کہا اللہ تو میری مدد کر کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ چل جائے۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے میں بٹھنڈہ جا بھی نہیں سکتا اور پوچھوں بھی کس سے چودہ سو برس پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک مرتبہ میری داڑھ میں بلا کا درد ہوا اور رات بھر میں بیٹھا رہا تکلیف کے عالم میں۔ اب ہمیں کسی معروف دندان ساز کا پتہ بھی نہیں تھا۔ بہر حال صبح میری بیوی گلبرگ میں مجھے ڈاکٹر مسعود کے پاس لے گئیں۔ ان سے ملے۔ بڑے خوش اخلاق اور اعلیٰ درجے کے سرجن اور اس وقت کی ہماری کرکٹ ٹیم کے ڈاکٹر تھے۔ پھر ان کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ ان سے ملنا ملانا ہو گیا، وہ گھر آتے رہے، ملتے رہے، ان کے والد سے بھی ملاقات ہوئی وہ کسی زمانے میں سکول ٹیچر رہے تھے اور اب بھی اسی سال کی عمر میں سائیکل پر بیٹھ کر ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ اتنے بڑے سرجن کے باپ، ٹیوشن پڑھاتے تھے لیکن مفت۔ الجبرے کے بہت اچھے ٹیچر تھے میں ان سے کہتا تھا کہ چھوٹی سی گاڑی خرید لیں، کہنے لگے

"نہیں، مجھے سے سائیکل چلتی ہے اشفاق میاں میں ٹھیک جاتا ہوں، آپ گھبرائیں نہیں۔"

ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ میں کافی سال بٹھنڈہ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر رہا ہوں۔ میں نے کہا یا اللہ یہ کیسا بندہ آپ نے ملوا دیا، میں نے کہا آپ یہ فرمائیں ماسٹر کہ وہاں کوئی ایسے آثار تھے کہ جن کا تعلق بابا رتن ہندی کے ساتھ ہو۔ کہنے لگے ان کا بہت بڑا مزار ہے وہاں پر اور وہاں بڑے چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ ہندو مسلمان عورتیں، مرد آتے ہیں اور تمہارا یہ دوست جو ہے ڈاکٹر مسعود، میرے گھر ۱۳ برس تک اولاد نہیں ہوئی، میں نے پڑھا لکھا شخص تھا، ایسی باتوں پر اعتبار نہیں کرتا تھا جو ان پڑھ کرتے ہیں، لیکن ایک دن جا کر میں بابا رتن ہندی کے مزار پر بڑا رویا۔ کچھ میں نے کہا نہیں، نہ کچھ بولا، پڑھے لکھے سیانے بندوں کو شرک کا بھی ڈر رہتا ہے، اس لیے کچھ نہ بولا اور مجھے ایسے ہی وہاں جا کر بڑا زبردست رونا آ گیا۔ ان کی کہانی کا مجھے پتہ تھا کہ یہ مدینہ تشریف لے گئے تھے۔ مزار پر جانے کے بعد میں گھر آ گیا۔ رات کو مجھے خواب آیا کہ جس میں ہندوستانی انداز کے سفید داڑھی والے باباجی آئے اور کہنے لگے "لے اپنا کاکا پھڑ لے" (لو، اپنا بچہ لے لو) یہ اللہ میاں نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ میں نے کہا جی یہ کہاں سے آ گیا، ماسٹر صاحب نے بتایا کہ جب میں نے خواب

میں وہ بچّہ اٹھایا تو وہ وزنی تھا۔ میں نے پوچھا "باباجی آپ کون ہیں" تو وہ کہنے لگے "میں رتن ہندی ہوں، کیا ایسے بیوقوفوں کی طرح رویا کرتے ہیں، صبر سے چلتے ہیں، لمبا سفر کرتے ہیں، ہاتھ میں لاٹھی رکھتے اور ادب سے جاتے ہیں۔"

ماسٹر صاحب کہنے لگے مجھے سفر اور لاٹھی بارے معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا باتیں ہیں، میں نے ان سے کہا کہ جی اس کا مصالحہ میرے پاس ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لڑکیاں جو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھیں وہ خوش قسمت تھیں۔ ہم کچھ مصروف ہیں۔ کچھ ہمارے دل اور طرف مصروف ہیں۔

ہم اس سفر کو اختیار نہیں کر سکتے لیکن اس سفر کو اختیار کرنے کی "تانگ" (آرزو) ضرور دل میں رہنی چاہیے اور جب دل میں یہ ہو جائے پکا ارادہ اور تہیہ تو پھر راستہ ضرور مل جاتا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ کوئی وظیفہ وغیرہ کر لیتے ہیں۔ یہ وظیفہ کرنا اچھا ہے لیکن یہ راستہ نہیں ہے۔ راستہ تو وہی ہو گا جو ایک چھوٹے موٹے ٹوٹے پھوٹے گھروں سے نکل کر اس ٹیلے کی طرف جاتا ہو گا جہاں وہ لڑکیاں کھڑی ہوں گی، انہیں کیا علم اور پتہ تھا۔ انہوں نے کوئی کتابیں نہیں پڑھ رکھی تھیں لیکن ان کے دل کے اندر ایک آرزو ضرور تھی جو نور کی صورت میں

آگے بڑھتی چلی گئی اور ان کو دنیا میں بھی ایک اونچا مقام ملا اور آخرت میں بھی یقیناً ان کا بہت اونچا مقام ہو گا۔ اس کے لیے میں اپنے آپ سے فارغ اوقات میں یہ ضرور کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنے آپ سے بھی مخاطب ہوتا ہوں کہ پڑھنے سے علم حاصل کرنے سے تو یہ سب کچھ نہیں ہو گا، یہ تو میری معلومات میں اضافہ کرے گا، مجھے معلومات حاصل ہو جائیں گی، لیکن محبت کا راستہ اور ہے جبکہ معلومات کا راستہ اور ہے۔

آپ ملاحظہ کرتے ہوں گے کہ آج کل ہم معلومات کے راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ یہ انفارمیشن کی صدی ہے اور ہم اس صدی میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں، لیکن محبت کا رستہ دوسرا ہے جو ہم کو بہت اوپر لے جاتا ہے اور محبت کا راستہ حاصل کرنے کے لیے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ چلیں محبت نہ کی جائے۔ چلیں انہیں کچھ دیا نہ جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔ کبھی کبھی اسے جاری کر دیا کریں۔ ہنس کے بول پڑو، لیکن ہمارے ہاں یہ بھی مفقود ہو گیا ہے۔ حسد ہو گیا، لڑائی ہوئی، جھگڑے ہو گئے۔ ہم محبت تو ایک طرف رہی مسکراہٹ بھی کسی کو ادا نہیں کر سکتے حالانکہ جب آپ کسی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، گھوری ڈالتے

ہیں، ماتھے پر سلوٹیں ڈالتے ہیں تو آپ کے چہرے کے ۷۲ مسلز یعنی عضلات کام کرتے ہیں اور اگر مُسکرائیں تو صرف دو مسلز ٹینشن میں آتے ہیں یا Tension Feel کرتے ہیں۔ کتنا آسان کام ہے لیکن ہو نہیں پاتا۔

مجھے یہ سارے راز معلوم ہیں، لیکن مجھ سے ایسا ہوتا نہیں۔ اندر کی بات چھوڑ کے ہم تو صرف سامان ہی اکٹھا کرنے لگے ہیں، لیکن یہ سامان کم بخت کسی کام نہیں آتا، بالکل کام نہیں آتا، اگر آپ سوچیں تو میرے پاس ایک بار کچھ پیسے جمع ہو گئے ایک لاکھ تیرہ ہزار روپے، اب میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہاں خرچ کروں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ذات پر خرچ کروں، دھوپ میں بیٹھ کر مولی کاٹ کر "لون" لگا کر اسے کھاؤں، مگر ایسا کر نہیں سکتا، ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔ تھوڑی سی محبت، تھوڑی سی الفت، تھوڑی سی مسکراہٹ جاری کرتے رہنا چاہیے یہ چیک کیش کرانے پر کوئی خرچہ نہیں آتا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔